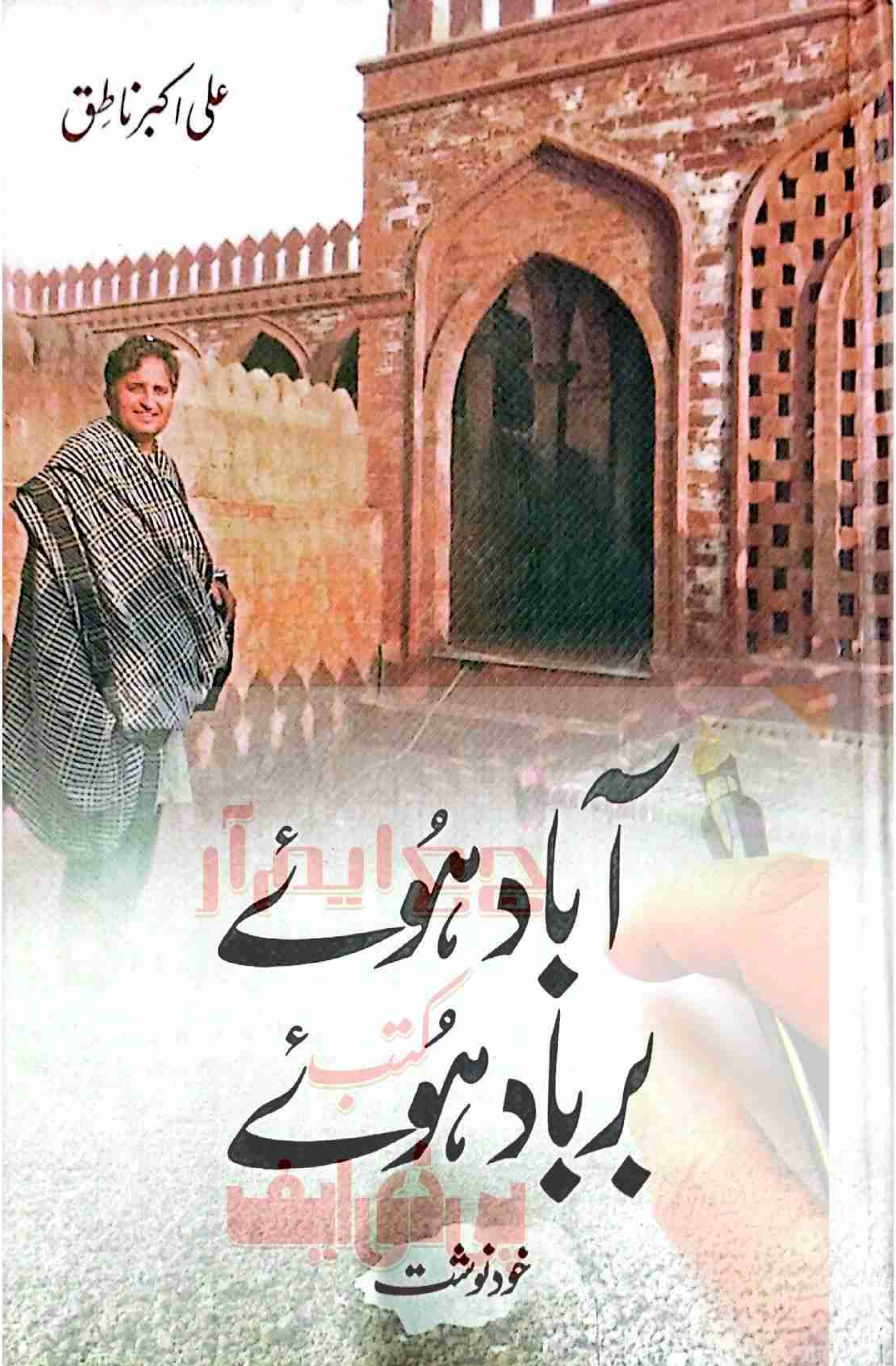
علی اکبر ناطِق
آباد ہوئے
برباد ہوئے
خود نوشت

علی اکبر ناطق ایک پاکستانی ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ ان کی وجہ شہرت ان کا ناول ''نولکھی کوٹھی'' ہے۔ اب تک ان کی شاعری اور افسانوں کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ علی اکبر ناطق کا خاندان 1947ء کے فسادات میں فیروز پور سے ہجرت کر کے وسطی پنجاب کے شہر اوکاڑہ کے نواحی گاؤں 32 ٹو ایل میں آباد ہوا۔ ناطق یہیں 1976ء میں پیدا ہوئے اور اسی گاؤں میں موجود ہائی سکول میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ایف اے کا امتحان گورنمنٹ کالج اوکاڑا سے پاس کیا۔ اُس کے بعد معاشی حالات کی خرابی اور کسمپرسی کی وجہ سے بی اے اور ایم اے کے امتحانات پرائیویٹ طور پر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے پاس کیے۔ تعلیم کے ساتھ مزدوری کا سلسلہ جاری رکھا اور بطور راج مستری پندرہ سال تک کام کیا۔ اسی دوران اُردو نثر، شاعری، تاریخ اور سماج کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ 1998ء میں کچھ عرصے کے لیے روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب اور مشرق وسطی بھی رہے۔ پاکستان واپسی کے بعد چند تعلیمی اداروں میں بطور استاد شعبہ اُردو منسلک رہے۔ کچھ عرصے بعد یونیورسٹی چھوڑ کر اپنے آبائی گاؤں اوکاڑہ منتقل ہوئے۔ 2009ء میں معروف ادبی جرائد نے ان کے افسانے اور نظمیں شائع کیں تو اچانک ان کی ادبی حلقوں میں شہرت ہوئی۔ 2010ء میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''بے یقین بستیوں میں'' چھپا اور یو بی ایل ایوارڈ کے لیے نامزد بھی ہوا۔ 2012ء میں اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''قائم دین'' چھپا، جسے آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا اور اِسے بھی یو بی ایل ایوارڈ ملا۔ ابتدا میں ایک افسانہ ''معمار کے ہاتھ'' شائع ہوا، جس کا انگریزی ترجمہ کر کے محمد حنیف نے امریکا سے شائع ہونے والے ادبی جریدے 'گرانٹا' میں بھی شائع کرایا۔ ناطق کی کچھ کتابیں انگریزی اور جرمن میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور پینگوئن انڈیا شائع کر چکا ہے۔ ناول ''نولکھی کوٹھی'' نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچائی ہے، پینگوئن انڈیا اسے انگلش میں شائع کر رہا ہے۔

علی اکبر ناطق

خودنوشت:

آباد ہوئے، برباد ہوئے

ناول:

نولکھی کوٹھی

کماری والا

افسانے:

قائم دین

شاہ محمد کا ٹانگہ

شاعری:

سفیرِ لیلیٰ (کلیات)

سبز بستیوں کے غزال

بے یقین بستیاں

یاقوت کے ورق

سُر منڈل کا راجہ

مارچ کے پھول

تصویروں کا باغ

در عدالتِ علی

دیگر:

فقیر بستی میں تھا (محمد حسین آزاد کی سوانح)

شعرِ اقبال (ہئیتِ شعر کی جمالیات اور فکری نظام)

آباد ہوئے، برباد ہوئے

خود نوشت

جی ایم آر
پی ڈی ایف

علی اکبر ناطق

بک کارنر
جہلم، پاکستان

Abaad Huay Barbaad Huay
by Ali Akbar Natiq
Jhelum: Book Corner. 2023
398p.
1. Autobiography - Memoir
ISBN: 978-969-662-484-4

© علی اکبر ناطق

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ مصنف یا ناشر کی پیشگی اجازت کے بغیر کسی بھی وضع یا جلد میں کُلی یا جزوی، منتخب یا مکرر اشاعت
یا بہ صورت فوٹوکاپی، ریکارڈنگ، الیکٹرانک، مکینیکل یا ویب سائٹ پر اَپ لوڈنگ کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

قانونی مشیر: عبدالجبار (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

بانی مہتمم اعلیٰ: شاہد حمید

ناشرین: گگن شاہد * امر شاہد

اشاعت: مارچ 2023ء

کتاب: آباد ہوئے، برباد ہوئے

مصنف: علی اکبر ناطق

سرِعنوان: محمد اقبال پارس

سرورق: محمد شکیل طلعت

تزئین و زیبائش: ابوالامہ

خطاط: احمد علی بھٹہ

کمپوزنگ و صفحہ سازی: محمد راشد حسین

کتابت: نوری نستعلیق، علوی نستعلیق

مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

ناشر: بک کارنر

ویب سائٹ: www.bookcorner.com.pk

اُن گمنام مارے جانے والے شہیدوں کے نام جنھیں 1947ء کی تقسیم کھا گئی۔

فہرست

باب اوّل

ابتدا	19
میاں شیعہ علی خاں	20
پردادا میاں خوشی علی خاں	21
پردادا کا گاؤں	21
پردادا کا چال چلن	23
کنویں کا جھگڑا	24
منڈی گرو ہرسا کا واقعہ	25
سامان لُٹ گیا	27
دادا جی میاں اللہ دین	29
ریڈیو کی کہانی	30
دادی اماں فاطمہ	43
ایک جن کا تھپڑ	44
ایک دلچسپ واقعہ	45

پٹھانوں کی ونگار 47
نواب صاحب کے ہاتھی کی چوری 49
ڈاکو میلا سجن اور والد صاحب کی کہانی 51
ستلج پار کرنے کی کیفیت 59
سوڈی والا میں پڑاؤ اور اماں زینب 62
محمد شفیع کی جنڈ والا واپسی کا عجیب واقعہ 67
والد صاحب کی کٹھن راہیں 69
دریائے بیاس میں سیلاب 72
چاچا رفیق فرشتہ 73
قصہ رفیق فرشتہ اور عاقل خاں کا 74
اللہ یار پہلوان اور چاچا رفیق فرشتہ کا واقعہ 89
چھوڑ گئے دُنیا کے میلے 91
ترکھان تیرے صدقے 92
لڑکا موچی نکلا 93

باب دوم

وے دن بھی آ گئے ہم آئے آب و گل میں 95
ہمارا پہلا گھر 95
لسوڑے کا درخت اور ربڑ کے جوتے 98
دھاگے کا اژدھا 101
خراس اور چھینے پروں کی تیتریاں 103
میرا کورٹ مارشل 105

بھٹو کی سات مرلہ سکیم	107
سفر در پیش ہے ہم سفراں	108

باب سوم

مکتب جانے کا دلچسپ قصہ	110
ماسٹر عبد الخالق	113
اُستاد فضل حسین	116
ہُد ہُد کی یاد آئی	117
اُستاد فضل حسین کا ایک دلچسپ واقعہ	118
دوسرا واقعہ	120
اُستاد فضل حسین سے پانچ روپے میں ٹیوشن	122
اکبر کی ذہانت کا قصہ	123
ماسٹر محمد لطیف	124
ماسٹر عبد الغفار	125
پانچواں اُستاد اور مھانے کا جن	126
مولوی محمد عارف	127
مولوی عبد الستار	128
مولوی عبد الستار کی ڈیڑھ اینٹ کی وضاحت	129
بچپن کے دوست	130
امان اللہ شاہ عرف مھانا	130
محمد ندیم	131
آصف علی	133

گھر کی تبدیلی	135
جنّ لڑکا اور مَیں	136
والد صاحب کی کویت سے واپسی اور ہمارے ٹھاٹھ	137
بابا صدرالدین اور مَیں	138
صدرالدین پر تیروں کی بارش	139
میاں میر میں گم شدگی	141
کتابیں اپنے آبا کی	143
روزانہ کے معمولات	145
پھاجے بھٹی اور سوَر کی لڑائی	146
بارش کا پانی اور چھمی کی لڑائی	148
جامن کے درخت اور ایک ہولناک واقعہ	150
درختوں پر مرغیاں	152
بچپن کے کھیل	153
باندر کِلہ	153
لکڑ چٹالا	154
وانجی	155
گِلی ڈنڈا	155
مقامی ہاکی کھیلنا	156
بھڑ کی پتنگ	157

باب چہارم

والد صاحب کا کاروبار کرنا	159

ہمارے گاؤں کا سرسری نقشہ 160

ڈڈرہب کے کوڑے اور ہمارا گاؤں 161

بابا شریف کا شکوہ اور بابا شریف خود 162

صوفی دین محمد اور اللہ میاں 164

ڈوبے ہوئے ڈالٹ میں ہیں 165

بابا پوملہ کا مقبرہ 167

آنگن میں لٹکے رہ جاتے ہیں 167

گھیے کی تیاری 169

گھر میں نحوست آ گئی 170

والد صاحب سوئے کوفہ و نجف 171

باغ جہاں کے گل 173

گیدڑ اکڑ گیا 174

ایک بدکار آدمی سے بچاؤ 175

دو بدمعاشوں کا انجام 176

دریا کا پاٹ اور عالو والا ٹویا 178

ننگے باراتی 180

اَچھو کی پدم ناگ سے جنگ 182

ایک طوفانی بارش کا واقعہ 185

بابا مہندا اور جوگیوں کا گروہ 191

بابا مہندہ اور پیر جتی کا دروازہ 204

دو اہم واقعے اور ڈسپنسری کا فائدہ 206

باب پنجم

دادی اماں فاطمہ چلی گئی	209
لُٹ گئی گھر کی متاع درہم و دینار ختم	211
ہیرا منڈی کا کوچہ اور ہماری دُرگت	213
میرا ہائی سکول	218
لائبریری کی چوری	218
ماسٹر شریف حسین	219
راؤ فرہاد علی	221
ماسٹر حبیب الرحمٰن صاحب	222
استاد ظفر اللہ قمر لکھوی	224
ماسٹر محبوب عالم	226
درخت پر کلہاڑی	227
جب ہم چنگیز خاں تھے	228
جاٹوں کی کہانی	231
جاٹوں کا حملہ اور عارف کمہار کا پستول	235
گنے کی چوری اور گڑ کی تیاری	237
پیر اسلم جٹ اور میرے کھیت کا پانی	240
کپاس کی چوری اور چوروں کو مور پڑنا	241
بے نظیر کی گودی میں	242
میاں انور کا قصہ	243
میاں صاحب کا اکھاڑے پر حملہ	245

گورکن سے لڑائی اور میاں صاحب کا سانپ 246
چن پیر 248
چن پیر اور شہد کی مکھیاں 249
گنے کی مل اور "پیا گر" کا صدر 250
گندم کی کاشت اور کٹائی 253
عجائب گھر کے مُردے کا قتل 255
ہیڈ پروفیسر اور گدھا 261
جماعت دہم میں ہماری کایا کلپ 266
احمد ندیم قاسمی سے ملاقات کا دلچسپ احوال 268

باب ششم

والد کے ساتھ مزدوری 274
پہلا واقعہ 275
دوسرا واقعہ 277
میٹرک پاس کا زمانہ اور لاہور کا تھانہ 279
گورنمنٹ ڈگری کالج اوکاڑا 285
عمر رفیق کاشمیری 285
طلبا تنظیموں کا میدانِ جنگ 287
پہلا عشق آم کے پیڑ تلے 289
کسووال کے دن 291
چک ۴۲ ڈی کا مینار اور قاسو بلوچ 293
گاؤں کے چار پاگل 294

حلیمہ کملی 294

شیدا کملا 295

مبین کملا 296

جاجی کملا 296

گاؤں کا مشہور کبوتر باز، شیدا کھوکھر 297

مشہور تانگے والا، شاہ محمد تانگے والا 298

گاؤں کی مشہور عورت، مائی بشیراں 299

فضل کمہار کی بکریاں چوری 301

انٹر کا دوسرا سال اور حادثات کا ہجوم 304

بابا صدرالدین اور اماں حلیمہ بھی گئے 305

باب ہفتم

ملازمت کی کوشش 307

نیسلے کمپنی میں ملازمت 309

ملک شرافت خاں کے بھیڑیے اور اماں صالحہ 310

نہر ہمیں بہالے گئی 313

سرحد پار اُتر گئے 316

ایک دلچسپ مجرم 319

بصیرپور کی ہنگامہ آرائیاں 321

ایک عرس میں جھگڑا اور حوالات میں 323

ہم پھنسے دو بھینسوں میں 327

جرائم پیشہ لوگ 329

سب انسپکٹر عابد اور احمد علی ڈھمی والا 330

بصیر پور کے چند دوست، اصغر علی عابد 332

امانت خاں وٹو 333

مقصود چھچھر مرحوم 334

ایک ایسا حادثہ جو قیامت سے کم نہ تھا 335

دُنیا ذلیل کتنی ہے 336

وہی مزدُوری، وہی روز و شب 338

بابا جی کے بھوت 339

خرگوش کا گوشت بی اے کا امتحان 344

مسجد کا مولوی اور مرزا رفیع سودا 345

ملنے آؤ اور پیسے لے جاؤ 346

ساہیوال کالج کا واقعہ 348

باب ہشتم

اوکاڑہ کا ادبی چوبارہ 352

میاں آزاد سے ملاقات 353

امتحان پاس کا قضیہ 355

احمد شہزاد لالہ اور ادبی ماحول 357

معروف شاعر مسعود احمد سے ملاقات 359

شفقت رسول قمر 362

احمد اقبال مربی کے دسترخوان کا قصہ 364

اوکاڑا کا مختصر احوال 365

اوکاڑہ کے نواح کے معروف قصبے اور لوگ 367
گوگیرہ 367
شیخو شریف 368
ملکہ ہانس 368
چک 49 تھری آر 368
دیپالپور 369
پاکپتن 369
ساہیوال (منٹگمری) 369
رینالہ خورد 370

باب نہم

شہروں ملکوں میں پھرے ہیں بگولہ صورت 371
دو خوابوں کی حقیقت 371
جدہ کا محلہ بنی مالک 373
دار لندوہ میں ابو طالب اور اہل مکہ کا ایک واقعہ 376
مدینے کی جانب 379
عرب کے گدھوں کی بدتہذیبی 381
والد صاحب کا سنایا ہوا گدھے کا قصہ 384
چوری کا کھایئے مگر بھیڑیے سے بچیے 386
حفر کشب کی منڈی اور امراؤالقیس کے قصیدے 390
عرب کے نئے لونڈے اور ہمارا امتحان 393

بابِ اوّل

ابتدا

میری خودنوشت شروع ہوتی ہے۔ ایسے شخص کی خودنوشت جس کے اجداد اصفہان و توران سے نہیں آئے۔ اگر آئے تھے تو اُس کا علم نہیں۔ محمد بن قاسم کی فوج میں تو بالکل بھی شامل نہیں تھے۔ گھوڑوں کے سوداگر بھی نہیں تھے۔ نہ سونے اور ریشمی کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ہاں دادی اماں کا ایک چچا زاد عیسیٰ خاں گڑگاؤں کے علاقے سے گھوڑے اور خچر چوری کر کے اُنھیں منڈی گرو ہرسا میں بیچا کرتا تھا اور منڈی کا مال لدھیانے میں۔ پنجاب کی تقسیم تک اُس کا یہی پیشہ تھا مگر اُس میں ہمیں دھیلے کا فائدہ نہیں تھا۔ یعنی اپنی نیک کمائی بگڑے لچھنوں میں صرف کرتا تھا۔ ہم کبھی نواب یا نواب کے وزیرِاعظم بھی نہیں رہے، نہ رام پور سے وظیفہ کھاتے تھے۔ نہ کابل سے تلواریں چلاتے ہوئے نازل ہوئے۔ نہ پنج ہزاری تھے، نہ پنج صدی۔ لکھنؤ میں آموں کے باغات تھے اور نہ ہی رام پور میں نوکری کی درخواست دی۔ ستلج کے پچھواڑے میں فیروز پور کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ بارشوں میں چنے اور جوار اُگاتے تھے۔ وہی کھاتے تھے۔ آبالاتی و مناتی بھی نہیں تھے۔ نہ آگا پیچھا حاجی لول بابا سے ملتا ہے۔ نہ ہم کشمیری پنڈت نہ برہمن۔

باپ دادا سرکاری ملازمت میں سیکرٹری نہیں تھا۔ چنانچہ اِس خدمت کے صلے میں اسلام آباد، لاہور یا کراچی میں کوئی پلاٹ بھی نہیں ملا۔ نہ اجداد میں کوئی ترقّی پسند تھا، نہ آزادی کی تحریک میں شامل ہوا۔ نہ دادا قائداعظم کو جانتا تھا، نہ قائداعظم میرے دادا سے واقف تھا۔ یہ دونوں بڑے آدمی ایک دوسرے سے اتنے ہی بیگانہ تھے جتنا ہماری اشرافیہ اپنی عوام سے۔ اجداد نے 1946ء کے الیکشن میں ووٹ بھی یونینسٹ کو دیے مگر وہ کمبخت ہار گئی۔ نہ باپ دادا علما اور صوفی تھے۔ نہ اُنھوں نے دین کی خدمت کی، نہ دُنیا کی، جس پر مجھے فخر ہوتا۔ نہ مَیں کسی علمی ادبی ادارے کا چیئر پرسن رہا۔ نہ زبان وادب کی بے پایاں خدمت کے صلے میں حکومتی ایوارڈوں سے نوازا گیا۔ میرے گھر میں ایوارڈ کے نام سے ایک ٹھیکری بھی نہیں ملے گی۔

آپ پریشان ہوں گے، اگر یہ سب کچھ نہیں تو آخر اِس خودنوشت میں بیان کرنے کے قابل کون سی بات رہ گئی؟

احباب، یہ عام آدمی کی خودنوشت ہے، اچھے اچھوں سے اچھی رہے گی۔ کیونکہ، جگر کا ایک اِک نگیں سفر میں خرچ ہو گیا۔ آیئے شروع کرتے ہیں۔ کچھ ذکر میرے اجداد کے ایک دو گُم نام افراد کا ہو جائے جنھوں نے ہماری روح کو جسم دیا۔

میاں شیعہ علی خاں

یہ میرے لکڑ دادا تھے۔ اِن کی تاریخِ پیدائش اور ولادت غیر مستند ہے۔ کہتے ہیں عمر ستّر سال کے لگ بھگ تھی جب اللہ کے ہاں جوگ پا گئے۔ روایت بر گردنِ دادا، یہی وہ پہلا فرد تھا جو پنجاب میں وارد ہوا۔ یہ دو بھائی تھے، ایک کا نام میاں علی خاں اور دوسرے کا شیعہ علی خاں تھا۔ شیعہ علی بڑا تھا۔ اُدھر یوپی فیض آباد کے علاقے سے نکلا پنجاب میں آبسا۔ میاں خاں وہیں رہ گیا۔ اللہ جانے اب اُس کی اولاد کہاں ماری پھرتی ہوگی۔ بابا صدرالدین (یہ شیعہ علی کے پڑپوتے تھے، اِن کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا) سے مَیں نے سنا، شیعہ علی خاں کسی جُرم کی پاداش میں انگریزوں سے بھاگے ہوئے نکلے تھے۔ بھیس بدل کر پنجاب کے ایک ویران علاقے ''ہریکی''

میں چلے آئے۔ جب ان کے والد نجف علی خاں اور ایک بڑے بھائی مدد علی خاں انگریزوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔شیعہ علی خاں جب وطن سے نکلے تو اُن کے پاس سواری اور بار برداری کے لیے کئی ڈاچیاں تھیں۔ یہاں پنجاب میں کم وبیش دس سال گمنامی میں رہے۔ ان دس سالوں میں اُنھوں نے ڈاچیوں کی مدد سے یہ پورا علاقہ کاشتکاری سے آباد کیا۔بابا صدرالدین کہتے ہیں اچھے خاصے آدمی تھے۔ ہاتھ پاؤں میں چاندی کے بڑے بڑے کڑے تھے۔ پہلو میں تلوار رکھتے تھے اور ڈاچی پر سواری کرتے تھے۔شاید اُس وقت یہ دونوں چیزیں عام بات تھیں۔ یہاں پنجاب ''ہریکی'' میں اچھی خاصی زمینیں اور مال مویشی بنا لیے۔علیؑ علیؑ کرتے تھے۔ ان کے چار بیٹے ہوئے۔اُن میں سے ایک ہمارے پردادا میاں خوشی علی محمد تھے۔اس سے آگے راوی خموش ہے۔

پردادا میاں خوشی علی خاں

یہ میرے پردادا حضور تھے۔ 1867ء میں ''ہریکی'' میں پیدا ہوئے لیکن وہاں ایک دفعہ ایسی خشک سالی آئی کہ چار سال تک بارش نہیں ہوئی۔ چنانچہ میاں خوشی اپنے خاندان اور مال مویشی لے کر تحصیل مکھسر کے ایک علاقے جنڈ آلے چلے آئے۔ یہ کتنے بھائی اور کتنی بہنیں تھے۔اس معاملے میں چونکہ بہت سی غیر مستند روایتیں ہیں لہٰذا میں اُن سے گریز کرتا ہوں۔ مَیں نے اِنھیں نہیں دیکھا۔ میرے ابا نے دیکھا ہے۔اُنہی کی زبانی چند باتیں اِن کی سن لیجیے۔ یہ صاحب اکثر سفر میں رہتے تھے۔شوریدہ مزاج تھے۔پل میں تولہ، پل میں ماشہ کا محاورہ اِنہی کی خاطر ایجاد ہوا۔اکثر، دہلی، فیروز پور اور لاہور کے پھیروں میں رہتے تھے۔کھتریوں سے اِن کی اینٹ کتے والی تھی۔تمام عمر نہ خود چین سے بیٹھے نہ اُنھیں بیٹھنے دیا۔

پردادا کا گاؤں

اسے میرے والد اور میرے دادا کا گاؤں بھی کہہ سکتے ہیں۔اس کا نام جنڈ آلہ تھا، فیروز پور کی تحصیل مکھسر میں تھا۔والد صاحب بتاتے ہیں کہ گاؤں کے چوک میں ایک بڑا سا کنواں تھا۔ یہ

پہلے ہندوؤں کے قبضے میں تھا اور مسلمانوں کو پانی لینا منع تھا، اُن کے ہاتھوں کے لگنے سے کنویں کا پانی بھرشٹ یعنی پلید ہو جاتا تھا لیکن ایک واقعے کے بعد مسلمان بھی پانی پینے لگے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اُس کنویں کے قریب بہت پرانا اور گھنی بادلوں کے پھیلاؤ جیسا نیم کا درخت تھا۔ اس کی چھاؤں سارا دن کنویں پر رہتی تھی۔ پورے گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں بالیاں یہاں سے پانی بھرتی تھیں۔ کنویں کا پانی بہت میٹھا تھا۔ کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس میں ایک یا دو لسوڑے کے درخت نہ ہوں۔ یہ لسوڑے کے درخت ایک تو سایہ بہت دیتے تھے دوسرا ان کا پھل بہت ہوتا تھا۔ لسوڑوں کے پھل کو کچا توڑ لیا جاتا اور اُن کا اچار ڈالا جاتا۔ لوگوں کی چاٹیاں دو چیزوں سے ہمیشہ بھری رہتیں۔ ایک اچار سے اور دوسرا لسی سے۔ لوگ دن میں ایک بار ہنڈیا پکاتے تھے، یا پھر دو تین دن میں ایک بار پکاتے تھے ورنہ اچار، پیاز، دودھ یا لسی سے ہی روٹی کھا لیتے۔ روٹی زیادہ تر باجرے اور جو کی ہوتی تھی۔ چنے بھی بہت ہوتے تھے۔ گاؤں کے ارد گرد جنڈ، وَن اور ٹاہلیوں کے بے شمار درخت تھے۔ وَن کے درختوں پر جب پیلوں لگتے تو اتنے خوبصورت ہو جاتے کہ کچھ نہ پوچھو۔ ان جنڈ اور وَن کے درختوں کے رنگ کبھی ہرے، کبھی نیلے اور کبھی پیلے ہو جاتے تھے کیونکہ اِن کی کئی قسمیں تھیں اور اُن کے پھلوں اور پتوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے تھے۔ گاؤں کی سڑکیں بہت کھلی اور چوڑی تھیں۔ والد صاحب فرماتے ہیں ان کچی سڑکوں پر جب بارش برستی تو مٹی کی خوشبو ہمارے مساموں میں اُترتی چلی جاتی۔ مٹی میں قدرے ریت کی ملاوٹ تھی اِس لیے کیچڑ کم بنتا تھا۔ گاؤں کے اردگرد زیادہ تر چنے کی فصلیں ہوتی تھیں اور اِن کی پوہلی ہم پکا کر بھی کھاتے تھے اور کونڈے میں رگڑ کر چٹنی بھی بناتے تھے۔ بہت مزا دیتی تھی۔ والد صاحب بتاتے ہیں، ہمارے گاؤں میں لوگ 80 یا 90 سال کی عمر میں مرتے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وقت بالکل رُکا ہوا ہے۔ ہر چیز ٹھہری ہوئی تھی۔ سردی بھی سخت ہوتی تھی کہ تالابوں کے پانی جم جاتے تھے اور سردیوں میں کتے اُس کے اوپر سے آسانی سے گزر جاتے تھے۔ گرمیاں ایسی بلا کی ہوتی تھیں کہ آگ کے تھپیڑے چلتے تھے اور لُو منہ جھلساتی تھی۔ لوگ گرمی میں منہ پر ڈھاٹا باندھے بغیر نہ نکلتے تھے۔ شام کو لوگ چوک میں بیٹھ کر ہیر وارث شاہ اور بلھے شاہ کو سنتے تھے۔ لوگ نمازیں بھی

پڑھتے تھے لیکن مسجدوں کی بہتات نہیں تھی۔ وہ کہتے ہیں اُن کے گاؤں میں بیشتر گھر مسلمانوں کے تھے۔ ہندوؤں کے تھوڑے گھر تھے مگر اُن کی معاشی حالت مسلمانوں سے بہتر تھی۔ 500 کی آبادی میں صرف 3 آدمیوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیا تھا باقی سب نے یونینسٹ کو دیا، مگر حیرت ہے وہ تین آدمی تقسیم کے وقت وہیں رہ گئے اور باقی سب کو گھر بار چھوڑ کے در بدر ہونا پڑا۔ پتا نہیں کس کا عمل کس کے لیے مکافات بنا۔

پردادا کا چال چلن

پردادا کی چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی تھی۔ قد چھ فٹ تھا۔ سفید لٹھے کا لباس، سفید پگڑی، جوتے دیسی چمڑے کے پہنا کرتے تھے۔ ہاتھ میں ہر وقت لکڑی کی ایک لٹھ ہوتی تھی۔ وہی ملنے جلنے والے کو مارتے تھے۔ ایک تیز طرار اور فربہ ڈاچی اِن کے سفر حضر کی ساتھی تھی۔ گھنٹوں کا سفر منٹوں میں نپٹاتی تھی۔ کھتریوں سے سُود پر پیسے لے کر کھاتے تھے اور کبھی واپس نہیں کرتے تھے۔ اصل رقم اور سُود، دونوں چکانے سے انکار کر دیتے۔ کھتری اِن پر نالش ٹھونک دیتے۔ لاہور اور فیروز پور کی کچہریوں میں تاریخیں بھگتنے آیا کرتے۔ اِسی بہانے سیر سپاٹے کرتے اور میلے ٹھیلے دیکھتے۔ سال چھ ماہ مقدمہ چلتا۔ مقدمہ ہار جاتے، اب پیسے تو چکانے کو پاس نہ ہوتے، لہٰذا عدالت میں اپنی زمین کا کوئی ٹکڑا کھتری کے نام کر آتے۔ تمام عمر یہی لچھن رہے۔ چنے اور باجرے کی روٹیاں خود کھاتے اور گندم منڈی میں بیچتے۔ تمام غلّہ اور گندم بیل گاڑیوں اور گدھوں پر لاد کر منڈی گرو ہرسا میں بیچتے تھے۔ اُن دِنوں چنوں کا بھاؤ چودہ آنے من اور گندم ایک سے ڈیڑھ روپیا من ہوتی تھی۔ تب روپیا چاندی کا ہوتا تھا اور آنے دونّیاں چونّیاں تانبے یا دیگر دھاتوں کے تھے۔ ہمارے پاس مال مویشی بہت زیادہ تھا اور یہی چیز اُس وقت امارت کی نشانی تھی۔

والد صاحب کہتے ہیں چنے اور باجرے کی روٹیاں ہمارے حلق سے نہ اُترتی تھیں۔ پردادی نے اِس کا یہ حل نکالا کہ سال بھر کے لیے اپنے کھانے کی گندم پہلے ہی ایک طرف کر لیتیں، جس کا اُنھیں علم نہ ہونے دیتی۔ باقی سب گھر گندم کی روٹیاں کھاتا اور دادا میاں کو چنے اور باجرے کی روٹی

ملتی۔ چنانچہ تمام عمر اُن کے نصیب میں باجرے اور چنے کی روٹی رہی۔ قسمت سے اِس کا اثر اُن کی صحت پر ایسا اچھا رہا کہ مرتے دم تک ہٹے کٹے رہے۔ روہی میں اُن کی زمینیں اچھی خاصی تھیں، جو کھتریوں کے ہاتھوں بِک بِک کر بہت کم ہو گئیں۔ غصّے کے بہت تیز تھے۔ اِن کے ایک بیٹے صدرالدین میرے ابا کے چچا تھے اور ہمارے ہی گھر میں رہتے تھے۔ جب مَیں ایف اے میں تھا تب فوت ہوئے۔ اُنھوں نے مجھے بتایا، ایک دفعہ میاں جی گھر میں بیٹھے ٹوکی کے ساتھ بھینسوں کا چارا کاٹ رہے تھے۔ بھائی شفیع محمد نے (میاں جی کا منجھلا بیٹا) میاں جی کے ایک لاڈلے بیل کو ڈنڈا رسید کر دیا۔ میاں جی آگ بگولا ہو گئے، وہی ٹوکی لے کر شفیع کے پیچھے دوڑے۔ شفیع میاں جی کے غصّے کو خوب جانتا تھا۔ معلوم تھا اگر ہاتھ آ گیا تو یہی ٹوکی سر پہ مار دیں گے۔ وہ جلدی سے بھاگ گیا اور میاں کے ہاتھ نہ آیا۔ اب میاں جی نے کیا کیا، وہی ٹوکی غصّے میں اپنے ہاتھ پر دے ماری اور تین انگلیاں کاٹ کے پھینک دیں۔ اُدھر بھائی شفیع ایک مہینا گھر نہ لوٹا، لدھیانے جا نکلا۔

کنویں کا جھگڑا

اِسی طرح بابا صدرالدین اُن کا ایک اور قصہ سناتے ہیں۔ گاؤں کا کنواں ہندوؤں کے قبضے میں تھا۔ مسلمانوں کو گاؤں کے باہر ایک کنویں سے پانی لانا پڑتا تھا جس میں بہت وقت خرچ ہوتا۔ کبھی کوئی عورت گاؤں کے کنویں سے پانی لینے جاتی تو اُسے ذلیل کیا جاتا۔ مسلمان تنگ تھے مگر پولیس کے ڈر سے چپ تھے۔ رفتہ رفتہ دونوں قوموں میں اِس کنویں کے مسئلے پر دراڑ وسیع ہوتی گئی۔ اب یہ ہوا کہ گاؤں کے کچھ مسلمان لونڈے میاں جی کی شہ پر آئے روز ہندوؤں کے کنویں میں گوشت کے ٹکڑے پھینک دیتے۔ بات تھانے کچہری تک چلی گئی۔ تھانے دار نے گاؤں میں پنچایت رکھ لی۔ اُس کے ساتھ آٹھ دس سپاہی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک سنتری پورے گاؤں کو باندھ لے جاتا تھا۔ پنچایت میں بات بڑھ گئی۔ میاں جی نے آوَ دیکھا نہ تاؤ یا علیؑ کا نعرہ مارا اور لٹھ اُٹھا کر بنیے کے سر پر دے ماری۔ بنیا لہولہان ہو گیا۔ تھانیدار ابھی ہونق ہی ہو رہا تھا کہ ایک ڈنڈا تھانیدار کے سر پر اُلٹا دیا۔ لیجیے ایک ہنگامہ ہو گیا۔ گاؤں میں ہراس پھیل گیا۔ سرکار کے تھانیدار کو

ونڈا مارا۔ سیدھی بغاوت تھی۔ اِدھر آنجناب نے اپنی ڈاچی پر سواری کر لی اور بجلی کی طرح گاؤں سے نکل لیے۔ اُدھر تھانیدار ہمارے سب مویشی ہانک لے گیا۔ بڑی مشکل سے چھ ماہ بعد لے دے کر چھٹکارا پایا لیکن ایک بات ہوئی، بنیوں نے کنویں سے پانی لینے کا تقاضا منظور کر لیا۔

منڈی گرو ہرسا کا واقعہ

اِسی طرز کا ایک اور قصہ بابا صدرالدین اُن کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، ایک دفعہ منڈی گرو ہرسا کے میلے میں ہم باپ بیٹا گئے۔ اُن دِنوں علاقے کھلے کھلے ہوتے تھے۔ منڈیاں بھی آج کی طرح پرچون کا مال نہیں تھیں کہ چلنے کو دو قدم کی راہ نہیں۔ چند ایک چیزیں بکنے کو پڑی ہوتی تھیں اور درمیان میں کھلے میدان تھے۔ ہم نے اپنی ڈاچی ایک پیپل تلے باندھ دی اور میلا دیکھنے منڈی میں گھس گئے۔ اُن کے ہاتھ میں وہی کالی لکڑی کی لٹھ تھی۔ رک رک کے چل رہے تھے۔ مَیں سات آٹھ برس کا تھا۔ میاں جی نے مجھے ایک ہندو حلوائی سے جلیبیاں لے دیں۔ مَیں جلیبیاں چاٹتا جاتا تھا اور میاں جی کے پیچھے پیچھے چلا جاتا تھا۔ سکھ، مسلمان، ہندو سب ہی اپنے اپنے اعتقادوں کے موافق کھیل کود کے شغل میں مست تھے۔ بازی گر بازیوں کے کرتب کرتے تھے، تھیٹر والے جانی چور کا سوانگ بھر رہے تھے۔ اِسی اثنا میں دو سکھ نوجوان میلے میں داخل ہوئے۔ سر پر توبے جیسی بڑی اور نیلے اور لال رنگ کی پگڑیاں باندھی تھیں۔ وہ ایک سانڈنی پر سوار تھے اور پہلو میں کڑے کرپانیں اور کمر بند میں تلواریں لٹکی تھیں۔ سانڈنی کی پشت پر بیٹھے بکرے بلاتے چلے آرہے تھے۔ شراب میں دُھت تھے۔ منڈی کے میلے میں ایسے داخل ہوئے جیسے بجلی کی کڑک کے ساتھ طوفان چڑھا ہو۔ اُنھیں دیکھ کر سب میلائی اور دُکانیں سجائے بیٹھے حلوائی سہم گئے۔ سکھ نوجوانوں کی حالت سے صاد تھا کہ سب تماشائیوں کی توہین کر رہے ہیں۔ اب مَیں کیا دیکھتا ہوں، میاں جی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایک دم رُکے اور مجھے کہنے لگے، صدرو پُتر بھاگ کر ڈاچی کا رسہ کھول اور وہیں کھڑا ہو جا۔ مَیں ابھی آیا۔ مَیں نے حکم کی تعمیل کی۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سکھڑے سانڈنی کو بٹھا رہے تھے۔ سانڈنی کے بیٹھنے کا عمل بھی کچھ دیر لیتا ہے۔

میاں جی اُن کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ جونہی اُنھوں نے سانڈنی کو بٹھانے کی کوشش کی۔ میاں جی نے اپنی لٹھ کے وار چلا دیے۔ یہاں تک کہ سانڈنی کے بیٹھتے بیٹھتے دونوں کے سروں پر چار چار لٹھ ایسے جمائے کہ دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اُن کا ہاتھ ہی نہ چلنے دیا کیونکہ جب تک سانڈنی نیچے نہ بیٹھتی یہ کیسے اُترتے۔ ایسے میں لڑائی کے لیے ہاتھ بھی نہ چل سکتے تھے۔ مجمع دیکھتا رہ گیا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا ہے۔ اِدھر میاں جی اپنا کام ڈال کر کہنے لگے، حرامیوں کو میلے میں کوئی مرد کا بچّہ نظر ہی نہیں آیا۔ یوں بکرے بلاتے آئے ہیں جیسے پھپھیوں کا بیاہ ہو۔ یہ کہتے ہوئے تیزی سے اپنی ڈاچی کی طرف بڑھے جسے مَیں پہلے ہی تیّار کر چکا تھا۔ ڈاچی پر ہم جونہی بیٹھے وہ اُٹھ کر ایسے دوڑی جیسے دونوں یعنی ڈاچی اور میاں جی اِسی کام کے لیے میلے میں آئے تھے۔

میاں جی سیر اور مقدمے کی پیشیوں کے واسطے چونکہ دہلی، لاہور اور فیروز پور چکّر لگاتے رہتے تھے، اِس لیے خوب جانتے تھے کیا ہونے والا ہے۔ اُنھیں پوری خبر تھی ہندوستان دو ٹکڑوں میں بٹے گا اور پنجاب آدھا کٹے گا مگر بہت عرصہ تک اُنھیں امید تھی فیروز پور پاکستان میں رہے گا۔ اس لیے کچھ عرصے سے وہ جنڈ آلہ کے ہندوؤں اور سکھوں سے بہت پیار سے رہنے لگے تھے۔ کہتے تھے بے چارے کچھ دِنوں کے مہمان ہیں۔ اُدھر کہیں دلّی پار جا بسیں گے۔ تب تک اِن کے ساتھ بھائی بندی اور پیار سے رہنا چاہیے لیکن جب تقسیم سر پر آ گئی اور دہلی، ہریانہ اور گڑگاؤں کے بے حال لوگ جوق در جوق ہمارے گاؤں کے پاس سے گزر کر جانے لگے تو میاں خوشی محمد بھی چونکے۔ اپنی ڈاچی پر بیٹھے اور منڈی گرو ہرسا کو نکل گئے تا کہ اصلی خبر لے کر آئیں کہ تقسیم کی لکیر کہاں تک کھنچی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو ہم بے خبری میں مارے جائیں۔ بابا صدر دین بتاتے ہیں۔ میاں جی اُن دِنوں بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ پہلے اُن کا مزاج جس قدر شوریدہ تھا اب اتنا ہی نرم ہو گیا تھا۔ بات بات پر کہتے، اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ انسان تو ایک دوسرے سے بچھڑتے وقت روتا ہے، جُدائی کے غم سے بے حال ہوتا ہے، یہ اُلٹا ایک دوسرے کو مارنے پر تُل گئے ہیں۔ اس کے باوجود اپنے بچاؤ کے تمام ہتھیار گھر میں لا کر رکھ دیے تھے۔ آدھی رات کے قریب منڈی گرو ہرسا سے لوٹے، سب گھر والوں کو جگایا اور اُنھیں کہا، سب اٹھو، سونے کے دن چلے گئے ہیں۔

فیروز پور انگریزوں نے بیٹے کو جہیز میں باندھ دیا ہے۔ اب یہاں سے نکلنا ہوگا۔ لیجیے گھر میں کہرام مچ گیا۔ بیٹھے بٹھائے یہ عجیب لمحہ تھا۔ بھلا اپنا گھر چھوڑ کے کوئی کہاں جاتا اور کہاں رہتا۔ خیر میاں جی کے سب بیٹوں نے اپنے اپنے گڈّے بھرنے شروع کر دیے۔

اب یہاں ایک واقعہ سن لیں۔ سب سامان بندھ چکا۔ ایک من کے قریب روٹیاں اور دوسرا کھانے کا سامان بھی رکھ لیا گیا تاکہ رُکے بغیر چلیں۔ کیونکہ خونریزی کی خبریں مسلسل آ رہی تھیں۔ گھر کے سب لوگ صحن میں جمع ہو کر امام ضامن باندھ چکے اور چلنے کو نکلے ہی تھے کہ گاؤں کی ایک عورت بی بی جیوناں گھر میں داخل ہوئی۔ پہلے تو وہ دیکھ کر کچھ حیران سی ہوئی کہ اِنھیں کیا ہوا ہے، پھر بولی، ہائیں یہ کیا ہو گیا ہے تمھیں۔ کسی دُور ملک شادی پر چلے ہو؟ خیر میاں خوشی مجھے جوار کا بیج دیتے جاؤ۔ ہم نے جوار بونا ہے، پہلی وتر پر آ گئی ہے۔ دو من جوار کا بیج دے دو۔ میاں جی نے ایک نظر اُسے دیکھا اور کہا مائی جیونے، تیرا دماغ چیلیں کھا گئی ہیں۔ لوگ گھر باندھ کر چل رہے ہیں اور تُو جوار بیجنے جا رہی ہے۔ مائی جیوناں بولی، ہائے ہائے میاں خوشی خاں، دماغ میرا تو سولہ آنے ٹھیک ہے۔ بھلا کوئی گھروں کو بھی اکیلا چھوڑ کے جاتا ہے۔ پھر بتاؤ جا کہاں رہے ہو؟

یہ تو مجھے نہیں پتا بس یہاں سے ستلج پار کرنا ہے، اُدھر ہی کہیں جا رہے ہیں۔ میاں جی نے اُسے جواب دیا۔

میاں خوشی زمانہ تو پاگل ہے پر مجھے تجھ سے یہ اُمید نہیں تھی۔ خیر اپنی اپنی بُدھی میرا تو جنڈآلے کے سوا کہیں کوئی نہیں۔ اِسے چھوڑ کر دُنیا سے جاؤں تو جاؤں۔ لا جوار کا بیج تول دے۔

میاں جی نے کہا، مائی جیوناں وہ بھڑولوں میں جوار باجرے سب بھرے پڑے ہیں، جتنا چاہے لے جا۔ پھر اپنی بیوی سے کہا، دے اِسے کنجیاں۔ یہ کہہ کر گھر سے نکل پڑے اور وہ بے چاری مائی جیوناں حیرت سے کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

سامان لُٹ گیا

جب گھر سے نکلے تو صبح کا عالم تھا۔ والد صاحب بتاتے ہیں ایک گڈّے پر میرا والد یعنی

میاں اللہ دین، ہم تین بہن بھائی اور میری والدہ تھی۔ دوسرے پردادا میاں خوشی، دادی، اُن کی بیٹی آمنہ اور اسحاق تھا۔ اسحاق کی تب تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ بابا صدر الدین اور شفیع محمد ایک تیسرے گڈّے پر تھے۔ باقی گڈّوں پر سامان تھا اور فضل علی پہلے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ یوں پورے کُنبے کو لیے پاکستان کی طرف چل دیے حالانکہ ووٹ کبھی مسلم لیگ کو نہیں دیا تھا۔ نہ چلتے تو کاٹ مار کر دیے جاتے۔ دس پندرہ پیپے چاندی کے رُوپیوں کے ساتھ تھے اور یہ چاندی کے پیپے میاں خوشی محمد کے گڈّے پر ہی تھے۔ کچھ سونے کی مہریں تھیں وہ آمنہ کے کمر بند سے بندھی تھیں۔ سب آرام سے چل رہے تھے راستے میں ایک جگہ بنگلا فاضلکا کے قریب گورکھا سپاہیوں کی پلٹن ملی۔ اُنھوں نے پہلے تو اندھا دھند گولیاں برسا دیں۔ والد صاحب کہتے ہیں اِن گولیوں سے ہم پر ایسا ہراس پھیلا کہ میرے والد نے حواس باختہ ہو کر ہمیں گڈّے (بیل گاڑی) سے اُٹھا اُٹھا کر ایسے نیچے پھینکنا شروع کیا جیسے خاکروب کچرا پھینکتا ہو۔ رفیق منہ کے بل گرا اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ یہ واقعہ والد صاحب مجھے روتے ہوئے بتاتے ہیں کہ رفیق زمین سے اُٹھا اور میاں جی سے بولا، میاں جی ہمیں اِس طرح تڑپا کے کیوں مارتے ہو، ایک ہی دفعہ گلے پر چھری پھیر دو۔ میاں جی رفیق کی بات پر تڑپ کے رہ گئے مگر یہ وقت ہی ایسا تھا۔ میاں جی نے تو جلدی سے اِس لیے گڈّے سے نیچے پھینکا کہ ہمیں گولی نہ لگ جائے۔

خیر اتنے میں گورکھا سپاہی قریب آ گئے اور ہم پر بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے۔ بولے سب اپنی جیبوں کا مال اور جو کچھ بھی ہے یہیں چھوڑ و اور یہاں سے جلدی نکلو ورنہ ابھی بھون دیں گے۔ چنانچہ سب مال وہیں رکھوا لیا اور سکندر کے دونوں خالی ہاتھوں کی مثل پاکستان روانہ کر دیا۔ یہ بھلا ہوا کہ کرپانوں کی اماں میں نہیں گئے۔ بارڈر پار کرنے کے بعد کافی عرصہ اِدھر اُدھر ٹھکانہ کیا، جس کا مذکور آگے آئے گا۔ آخر اُس گاؤں میں آ بسے جہاں مَیں یعنی علی اکبر ناطق پیدا ہوا۔ 1958ء میں اچانک اُنھیں بخار ہوا، پھر نمونیا آ گیا اور 92 بانوے سال کی عمر میں چل بسے۔

دادا جی میاں اِلٰہ دین

اِنھیں بھی مَیں نے نہیں دیکھا۔ اُدھر فیروز پور میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ میاں خوشی کے بڑے فرزند تھے اور سب اولاد میں نیک سیرت تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد اِنھیں گنٹھیا ہو گئی تھی۔ تقسیم کے بعد زمانے نے ایسا تغیّر دکھایا کہ گھر میں مفلسی نے ڈیرا جما دیا۔ اِدھر بیماری نے باندھ دیا۔ اٹھارہ بیس سال گنٹھیا کے سبب چارپائی سے بندھے رہے مگر اَنا کے بادشاہ تھے۔ سارے خاندان پر وہیں بیٹھے حکم چلاتے تھے۔ مَیں دو ڈھائی سال کا تھا کہ یہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لہٰذا اِنھیں نہ دیکھ پایا۔ میری والدہ بتاتی ہیں کہ مَیں اپنے دادا کی چارپائی کے اردگرد چارپائی کو ہاتھ ڈال کر پھرتا رہتا تھا اور اُنھیں اپنی توتلی زبان سے کہتا تھا، وے الٰہ دینا اُتھ جا، وے الٰہ دینا اُتھ جا'' یعنی چارپائی سے اُٹھ جا۔ والدہ کہتی ہیں کہ مَیں تجھے روکتی تھی کہ میاں جی کو ایسے نہ بولو، گستاخی ہوتی ہے، مگر دادا جی کہتے، اِسے بولنے دو مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ سب باتیں مجھے یاد نہیں ہیں۔

میری دادی اماں فاطمہ اُن کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اٹھارہ سال اُن کی چارپائی پر ہی خدمت کی اور ایک دن بھی ذرا سی بیزاری نہیں دکھائی۔ بے چاری بہت دُکھوں کی ماری تھی۔ میرا چونکہ اپنی دادی سے بہت پیار تھا۔ مَیں اُن کی وفات تک اُنہی کی چارپائی پر سوتا تھا۔ وہ جب فوت ہوئی مَیں آٹھویں جماعت میں تھا۔ مَیں نے اپنے دادا کے متعلق بہت سی باتیں اپنے والد اور اپنی دادی سے ہی سنی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں اگرچہ چارپائی سے اُٹھ نہ سکتے تھے مگر گھر کا کوئی فرد اُن کے حکم کی سرتابی کرنے کی جراُت نہ کرتا تھا۔ ذرا سا کوئی حکم سے انحراف کرتا تو چارپائی پر بیٹھے ایسے گرجدار آواز میں بولتے کہ سارا گھر سہم جاتا، کہتے اگر میری چارپائی کے کوئی نزدیک آیا تو۔ کیا تم نے مجھے جسم کے ساتھ ذہنی اپاہج بھی سمجھ لیا ہے؟ جس خُدا نے مجھے معذور کیا ہے وہ مجھے رزق بھی دے گا اور وہی سنبھال بھی لے گا۔ مَیں تمھارا محتاج نہیں ہوں۔ لہٰذا ہر آدمی اُن کے غصّے اور نازک مزاجی سے ڈرتا تھا۔

ریڈیو کی کہانی

والد صاحب بتاتے ہیں ایک دفعہ مَیں نے کسی کا مکان بنایا۔ اُس آدمی نے 45 روپے مزدوری کم دی اور ایک ماہ کا وعدہ کر لیا۔ ایک ماہ کی بجائے تین ماہ گزر گئے لیکن پیسے نہ دیے۔ جب مَیں نے تقاضا میں شدّت کی تو وہ کہنے لگا میاں بشیر پیسے تو میرے پاس نہیں ہیں۔ ہاں ایک بہت عمدہ ریڈیو پڑا ہے وہ لے جا۔ یہ بہت اچھا جاپانی ریڈیو ہے۔ ساٹھ روپے میں خریدا تھا، تُو اِنہی 45 روپے میں لے جا۔ مَیں نے کہا مجھے پیسوں کی ضرورت ہے، ریڈیو کو کہاں پھونکوں گا۔ پھر دل میں خیال کیا، یہ شخص پیسے ہرگز نہیں دے گا، چل جو بھی ہاتھ آئے، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میاں جی نے ریڈیو دیکھ لیا تو کہیں گے، گھر میں کنجر خانہ کھول لیا ہے اور بہت ڈانٹ پڑے گی۔ پھر بھی مَیں نے ریڈیو لے لیا۔ یہ بہت عمدہ ولایتی ریڈیو تھا۔ آواز بہت صاف تھی۔ مَیں نے گاؤں میں داخل ہو کر یہ ریڈیو اپنے ایک دوست راؤ اصغر کے پاس رکھ دیا اور جب رات ہوئی تو اُس سے لے کر چپکے سے گھر لایا اور لوہے کے بڑے صندوق میں سب سے نیچے رکھ دیا۔ ایک سال تک وہ وہیں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ چھڑ گئی۔ گاؤں میں حفیظ شیخ کی ایک دُکان تھی۔ اُس کے پاس ریڈیو بھی تھا۔ سب جنگ کا احوال سننے کے لیے اُسی دُکان پر جمع ہو جاتے۔ اِدھر میاں جی اکیلے چارپائی پر پڑے رہتے کیونکہ وہ اٹھنے سے معذور تھے۔ لہٰذا انتظار میں رہتے کہ کوئی جنگ کی خبر رکھنے والا آدمی اِدھر سے گزرے تو کسی بات کا پتا چلے۔ مگر گاؤں میں لوگوں کی ایسی چیزوں سے اتنی دلچسپی کہاں تھی کہ کوئی پہلے سب خبریں خود سنتا پھر آ کر وہ تمام رام لیلا میاں جی کو سناتا۔ مَیں اور رشید تمام دن کام کاج میں گاؤں سے باہر ہوتے۔ نذیر (رفیق سے چھوٹا) بنجارا بن گیا۔ وہ گاؤں میں رہتا ہی نہیں تھا اور کام کاج بھی نہیں کرتا تھا، اِس کا بیان آگے آئے گا۔ لہٰذا بہت بے چین رہنے لگے۔ ایک دن کہنے لگے پتر بشیر کوئی سبب بن سکتا ہے کہ جنگ کی خبروں کی تفصیل مجھے مل جایا کرے۔ اب مجھے موقع مل گیا۔ مَیں نے کہا میاں جی۔ مَیں ابھی جاتا ہوں اور کسی دوست سے ریڈیو مانگ کر لاتا ہوں۔ پھر ایک گھنٹا اِدھر اُدھر گھوم کر واپس گھر آیا

اور صندوق سے نکال کر اُس میں سیل ڈالے اور ریڈیو میاں جی کو دے دیا۔ اب وہ بیٹھے تمام دن ریڈیو سننے لگے۔ جو لوگ شیخوں کی دُکان پر جاتے تھے، وہ بھی میاں جی کی چار پائی کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ صبح چھ بجے سے رات دس بجے تک میاں جی کے کمرے میں رونق لگی رہتی۔ دن کے وقت چار پائی ٹاہلیوں کی چھاؤں میں ہوتی تھی اور رات کو اندر کمرے میں چلی جاتی۔ ایک مہینا یہ کام چلتا رہا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو جنگ کے اوپر تبصرے شروع ہو گئے اور فتح و شکست کے فیصلے ہونے لگے۔ پھر یہ سب کام ٹھنڈا پڑ گیا۔ گانے وغیرہ سننے کا شوق نہیں تھا۔ ایک دن کہنے لگے، لو بیٹا یہ جس کا ریڈیو ہے اُسے واپس کر دو لیکن چیز اچھی ہے۔ جو بندہ خبریں پڑھ نہیں سکتا، وہ سن لیتا ہے اور جی بھی لگ جاتا ہے، ویسے یہ خبریں دینے والے جھوٹ بھی بہت بول لیتے ہیں۔ مَیں ہنس دیا اور کہا، میاں جی یہ ریڈیو ہمارا ہی ہے۔ اب آپ اِسے اپنے ہی پاس رکھیں۔ پھر مَیں نے اُس ریڈیو کی ملکیت کا تمام قصہ میاں جی کو سنا دیا۔ لیجیے اب اُنھیں جب فارغ وقت ملتا، صبح دوپہر، شام خبریں سننے کا ایسا چسکا پڑا کہ الامان۔

اِس طرح کے بہت سے دلچسپ واقعات میاں جی کی زندگی کے ہیں۔ اُنھیں مَیں نے اللہ دین کی چار پائی کے نام سے لکھا ہے۔ آیئے اُنھیں اُسی طرح آپ کو سناتا ہوں:

اللہ دین کی چار پائی صبح سڑک کے کنارے جڑواں درختوں کی چھاؤں میں بچھ جاتی اور آٹھ دس مونڈھے لگ جاتے۔ یہاں روزانہ کے بیٹھنے والوں کے علاوہ راہ گیر بھی رُک جاتے، گھڑی پہر حقہ گڑگڑاتے، لسی کا گلاس پیتے، پھر صافا جھاڑ کر کاندھے پر رکھتے اور آگے چل دیتے۔ دونوں درختوں کی شاخیں ایک دوسرے میں اِس قدر پھنسی تھیں کہ گھنی چھاؤں کا ایک ہی پیڑ لگتا۔ اِن کی شاخیں لچکیلی اور پتے سیاہی مائل سبز تھے۔ شاخیں پرندوں سے بھری رہتیں۔ کسی پرندے کی بیٹ اللہ دین یا دوسرے کی پگڑی پر گر جاتی تو وہ دو چار گالیوں کے ساتھ تالی بجا کر اُسے اُڑانے کی کوشش کرتا۔ کھال کے آگے ایک چوڑی سڑک تھی، جس پر جون جولائی کے دنوں میں تیز اور چمکیلے حرارے اِس طرح دائروں میں اُٹھتے، جیسے دُھوپ کے بھوت اُڑ کر آسمان کو چڑھ رہے ہوں۔ سردیوں میں سفید دھوپ ہلکی ہلکی حرارت پہنچاتی۔ سڑک کے دوسرے کنارے بر موچی کا چھپر تھا۔

چھپر بھی کیا تھا، کوٹھے کی دیوار کے ساتھ لکڑی کے موٹے ڈنڈے گاڑ کر اُن پر کپاس کی چھڑیاں رکھ دیں اور دیواروں کی جگہ ٹاٹ کی بوریاں لٹکا دیں۔ بوریوں پر وقفے وقفے سے پانی کا چھڑکاؤ کرتا رہتا تا کہ ہوا ٹھنڈی ہو کر اندر آئے۔ ببر موچی موٹے چمڑے سے دیسی جوتے بناتا۔ کام کرتے تھک جاتا تو الٰہ دین کے پاس آ بیٹھتا، کچھ دیر حقہ پیتا پھر اُٹھ کر کام میں لگ جاتا۔ اکثر نئے جوتے پر کام کرنے سے پہلے الٰہ دین سے مشورہ کرنا اور اُسے چمڑا دکھانا ضروری سمجھتا۔ جوتا بنوانے والے بھی ببر موچی سے جوتا لے کر پہلے الٰہ دین کو دکھاتے۔ وہ جوتے کی اتنی تعریف کرتا کہ خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں خوش ہو جاتے۔ گاؤں کی بعض عورتیں بھی پھیری والوں سے کپڑے وغیرہ خرید کر سیدھی الٰہ دین کی چارپائی کا رخ کرتیں اور کہتیں، وے الٰہ دینا، یہ کپڑا تو دیکھ کیسا ہے؟ پورے چار روپے گز لیا ہے۔ الٰہ دین اُس کی اتنی تعریف کرتا کہ سننے والوں پر مبالغہ ہونے لگتا، کہتا، بیٹی، تم نے تو کپڑے والے کو لوٹ لیا ہے۔ اِتنے سستے میں ایسا اچھا کپڑا خرید لیا۔ اِس طرح کا کپڑا تو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ وہ خوشی سے بغلیں بجاتی چلی جاتی۔ ایک دفعہ الٰہ دین کی بیوی اماں فاطمہ نے کہا، یہ تم کیا ہر اچھی بری چیز کی تعریفیں کرتے رہتے ہو؟ بُری سے بُری شے کو بھی سونے چاندی سے ملا دیتے ہو۔

جواب میں الٰہ دین نے کہا، اُو بھلیے، اِس میں میرا کیا جاتا ہے؟ اب جو چیز جس نے خرید لی ہے، وہ واپس کرنے سے تو رہی۔ اگر بُری بھی ہے تو میرے بُرا کہنے سے سوائے اس کا دل دکھنے کے اور تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس سے تُو ہی بتا مجھے کیا ملے گا؟ رہی اچھی یا بُری ہونے کی بات، آخر دونوں کو فنا ہے۔

الٰہ دین کی چارپائی کے نیچے پانی کی کھال اور درختوں کی چھاؤں سے گرمی کے دن نہایت آرام سے کٹتے۔ وہ اُٹھ نہیں سکتا تھا کہ دس سال پہلے ہونے والی گنٹھیا نے اُسے چارپائی سے لگا دیا تھا۔ اِس کے باوجود اُس کے سب بیٹے اتنا ادب کرتے کہ ہلکی سی آواز پر دوڑے چلے آتے۔ ذرا سی دھوپ پڑنے پر چارپائی اُٹھا کر چھاؤں میں کر دیتے۔ کھانا وقت سے لمحہ بھر اِدھر اُدھر نہ ہوتا۔ مُنجھ کی کھری چارپائی پر کپاس کے دھاگے سے بُنی ہوئی چادر اور تکیہ اتنے صاف اور سفید تھے کہ ان

پر دھوپ کا گمان ہوتا۔ اُسی تکیے کے سہارے بیٹھا اللہ دین سفید لٹھے کے لباس اور سفید پگڑی باندھے کسی نواب سے کم نہ دکھائی دیتا۔ کڑوا تمبا کو اور ٹھنڈی لسی پاس بیٹھنے اور ملنے والوں کے لیے ہر صورت مہیا رہتی۔ سڑک پر دن بھر میں ایک آدھ گڈھ یا پھیری لگانے والا گزر جاتا۔ باقی اللہ اللہ۔

چار پائی کے گرد پڑے موڑھوں پر بیٹھنے والوں میں شریف کھوکھر، متا بھٹی، اسماعیل بھٹی، شیدا بٹیر، طفیل باجوہ، بابو رجب علی، جمال بھٹی اور دوسرے دو چار لوگ ایسے تھے کہ اُن کو موت ہی ناغہ کرائے تو کرائے۔ ہر ایک کے پاس سنانے کو پُرانے وطن کی بے شمار داستانیں تھیں۔ ہجرت کو چودہ سال گزر جانے کے بعد بھی نئے دیس کی اِن کے پاس کوئی بات نہیں تھی۔

....

جمال بھٹی نے بیٹھتے ہی سامنے والے مونڈھے کو کھینچ کر آگے کیا اور کاندھے سے پٹکا اُتار کر اُس پر رکھ دیا۔ پھر سر سے پگڑی اُتار کر زانوؤں پر رکھی اور حقے کی نے اپنی طرف کھینچ کر بولا، بھئی اللہ دین، وطنوں کے قصے بھی عجیب ہیں۔ بھلا اُجاڑے سے پہلے کسی کو پتا تھا یوں دیس دیس مارے پھریں گے؟ فیروز پور میں چوری چکاری کا چنگا بھلا کاروبار تھا اور عزت کی روٹی کھاتے تھے۔ توبہ کر کے کہتا ہوں، اِن ہاتھوں سے سیکڑوں روپے گنے۔ خُدا جھوٹوں کو اُٹھنے سے پہلے قبض کرے، فیروز پور کی پانچ تحصیلوں میں کون سی تحصیل ایسی ہوگی جہاں سے ڈھور ڈنگر گھیر نہ لائے ہوں۔ اُس وقت چوری مردوں کا گہنا تھی۔ بس اللہ دین ساری عزت اور محنت کی کمائی اُجاڑے نے کھا لی، سب کچھ لٹا کر پلّو جھاڑا اور یہاں چلے آئے۔ ہاتھ کی ڈنگوری اور یہ کاندھے کا پٹکا بچا اِس تباہی میں۔

بابا اللہ دین جو اپنے تکیے سے سہارا لیے بیٹھا تھا، تھوڑا سا اور سیدھا ہوا اور ہنس کر بولا، جمالے شکر کر تُو سلامت چلا آیا۔ اِس قیامت میں زندہ بچ کے نکل آنا بھی ولی اللہ ہونے کی نشانی ہے۔ جان ہے تو جہان ہے، قسمت میں لکھا ہے تو پھر فیروز پور میں چلے جائیں گے۔ ویسے اُجاڑے میں جس طرح ٹوکا چلا ہے، تیری گردن تو اس کی پوری حق دار تھی۔

اللہ دین کی بات پر سب ہنسنے لگے۔

اللہ دین نے کہا،" جمالے اُن خچروں کی کیا کہانی تھی؟ ذرا ہمیں بھی تو بتا۔"

جمال دین اِس بات پر کھسیانا سا ہو کر ہنس پڑا، جیسے اللہ دین نے اُس کی کمزور رگ پکڑ لی ہو۔ اُس نے بات بدلنا چاہی لیکن اب دوسرے لوگوں کا اصرار بھی بڑھ گیا کہ پہلے اللہ دین کی بات کا جواب دو۔ آخر مجبور ہو کر جمال دین نے ہلکا سا کھنکھار کر گلا صاف کیا اور حقے کی نَے حیات علی کو تھما کر بولا، ایک دفعہ ہوا یہ کہ کافی عرصہ ہمیں کسی گائے بھینس کھولنے کا موقع نہ ملا۔ مَیں اور اللہ رکھا (خُدا اُسے رب رسول (ﷺ) کے واسطے جنّت میں جگہ دے، اُجاڑے میں سکھوں کی کرپان کے صدقے چڑھ گیا) ہم دونوں مال کی تاڑ میں پھرتے پھراتے روہی جا نکلے۔ وہاں ہمیں خچر ہاتھ لگ گئے۔ اللہ دین تمھیں تو پتا ہے روہی کے خچروں کا، کتنے بڑے اور موٹے تازے تھے۔ روہی کا چھولیا کھا کھا کے دُنبے کی طرح اُن کی چکلیاں نکلی ہوئی تھیں۔ اُس وقت ہمیں اُن کی قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔ مَیں نے اللہ رکھے سے کہا، میاں رکھے اِن گدھوں کا ہم کیا کریں گے؟ اُس نے کہا، بھئی جو چار چھ روپے ہاتھ آئیں۔ اب اور کچھ نہیں ملتا تو بھوکے مرنے سے بہتر ہے اِنھی کو کھول کر لے جائیں۔ چنانچہ ہم وہ خچر لے آئے۔

اب ہمارے لیے مسئلہ پیدا ہوا کہ یہ کھوتے کہاں ٹھکانے لگائیں۔ بڑی سوچ بچار کی۔ شرم کے مارے کسی کو بتاتے بھی نہ تھے کہ لوگ کہیں گے اب جمال کھوتے چوری کرنے لگا، ڈوب کے مرجائے۔ اِسی خموشی میں کئی دن گزر گئے۔ پھر اچانک مجھے ایک طریقہ سوجھا، مَیں نے سوچا، ہم یہ مال عیسیٰ اور دلاور کو دے دیتے ہیں۔ مال کے بدلے میں مال کے طور پر۔ اللہ دین عیسیٰ اور دلاور کو تو جانتے ہو؟ یہ دونوں بھی بڑے کاری گر چور تھے۔

ایسے ویسے چور..... جمالے میں تھوڑی دیر کے لیے تیری بات کاٹتا ہوں اور ایک چھوٹا سا واقعہ عیسیٰ اور دلاور کا سناتا ہوں، بابے اللہ دین نے اپنی پگڑی کو سر سے تھوڑا سا ٹیڑھا کر کے خارش کی اور دوبارہ پگڑی درست کی، اِن دونوں کا ایک بڑا بھائی شبر علی تھا، جو آج کل لائل پور میں ہے۔ یہ چوری چکاری سے ہمیشہ دُور رہتا اور وائی بیجی کی محنت کر کے کھاتا تھا۔ عیسیٰ اور دلاور جب بھی مال مار کر لاتے، دو تین دیگیں چاولوں کی پکا کر اللہ کے نام پر غریب غربا کو کھلاتے۔ اس کے خرچے کا

تیسرا حصہ بھائی ہونے کے ناتے یہ شبر علی سے بھی وصول کرتے۔ اب اِن کا مال تو لوٹ مار کا ہوتا مگر شبر بے چارے کو اپنے خون پسینے کی کمائی سے حصہ ڈالنا پڑتا۔ دو تین سال وہ حصہ بھرتا رہا، آخر کب تک ساتھ نبھاتا۔ ایک دن تنگ آ کر کہنے لگا، بھائیو، خُدا اِسی طرح راضی ہوتا ہے تو مَیں دوزخ میں ہی اچھا ہوں۔ آئندہ تم اور تمھارے خُدا سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اِس طرح اُس بے چارے نے اپنی جان چھڑائی۔

اللہ دین کی بات پر سب ہنس پڑے۔ اِس کے بعد جمال بھٹی نے حقے کا ایک تازہ گھونٹ بھر کر بات وہیں سے جوڑ دی، تو مَیں کہہ رہا تھا بھائی اسماعیل، یہ دونوں بھائی ریاست پٹیالہ سے مال چوری کر کے فیروز پور میں لا بیچتے۔ ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے ہمارے کھوتوں کے ساتھ اپنی گائے بھینسوں کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے لیکن ہم نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ برابر برابر اُن سے سودا کر لیا۔ یعنی تین خچروں کے عوض تین گائیں۔ اس کامیاب سودے کے بعد ہم نے روہی کے خچروں پر ہی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا اور جی میں بڑے خوش کہ ہم عیسیٰ اور دلاور کو دُھونی دے رہے ہیں۔ ہم روہی کے خچر چوری کر کے اُنھیں دیتے رہے اور وہ اُن کے بدلے پٹیالہ کی گائیں بھینسیں ہمیں دینے لگے۔

یہ کام تین سال چلتا رہا اور ہم اُن کو اِس طرح احمق بناتے رہے۔ ایک دفعہ ہم خچر لے کر آ رہے تھے کہ بنگلا فاضلکا میں ہمیں ایک کمہار مل گیا۔ اُس نے کہا کہ یہ دونوں خچر مجھے بیچو گے؟ ہم نے کہا، کہیں تو بیچنے ہیں، تم لے لو۔ وہ بولا، قیمت بتاؤ؟ مَیں نے کہا تم خود ہی بتا دو؟ اُس نے کہا دونوں کے ڈھائی سو لے لو۔ یہ سنتے ہی ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ اُس وقت اچھی سے اچھی گائے کی قیمت پچاس روپے سے زیادہ نہیں تھی۔ اب مجھے پتا چلا کہ جسے ہم گدھا سمجھتے رہے وہ تو گائے سے تین گنا قیمتی تھا اور عیسیٰ ہمیں بدھو بنا کر کتنا عرصہ ہمارا کباڑا کرتا رہا۔

جمال کی اِس بات سے سب ہنس ہنس کر دہرے ہونے لگے۔ بابے اللہ دین نے ہنستے ہوئے پوچھا، پھر کیا تم نے عیسیٰ سے حساب کتاب کیا؟

حساب کیا کرنا تھا میاں اللہ دین۔ جمال تاسف سے بولا۔ اس کے بعد تو کچھ رہا ہی

نہیں۔ اُجاڑے پڑ گئے اور وہ دونوں بہشتی تحصیل مکھسر میں سکھڑوں کے ہاتھوں حلال ہو گئے۔ بس الٰہ دین جس طرح روزے مسلمانوں پر فرض کیے گئے، اسی طرح میری قسمت میں نقصان فرض کیا ہے لیکن سچ پوچھیں تو مجھے اُن کے مرنے کا بہت دُکھ ہوا۔ خُدا جانتا ہے بڑے جی دار آدمی تھے۔ ایک دفعہ جھنڈے پور میں لٹھ بازی کے مقابلے میں اُس نے پورے دس لٹھ بازوں کو ہرایا تھا۔ ہاااااا، بس رہے نام اللّٰہ کا۔

سورج اب ماتھے کے کناروں پر آ لگا تھا۔ درختوں نے اپنی چھاؤں سمیٹ کر بغل میں دبا لی۔ اُسی وقت بابے الٰہ دین کا چھوٹا بیٹا منیر باہر نکلا اور الٰہ دین کی چارپائی کھینچ کر مزید درخت کے تنے کے ساتھ لگا دی تاکہ دھوپ نہ پڑے۔ اس کے بعد ٹھنڈی لسی کا ایک بڑا دونا بھر لایا، جس سے سب نے ایک ایک تانبے کا چھنا بھر کر پیا۔ اِس طرح سب پھر تازہ دم ہو گئے اور نئے سرے سے باتوں کے طوطے اُڑانے لگے۔

بابو رجب علی پُرانے لوگوں کی کیا بتاؤں، الٰہ دین نے حقّے کا ایک لمبا گھونٹ بھر کر اُس کی نَے مستا کی طرف سَرکاتے ہوئے کہا، بس سادہ لوح بندے تھے۔ فائدہ نقصان اُن کی ضد میں تھا، اگر ضد پوری ہو جائے تو فائدہ ہی فائدہ۔ اب میرے باپ خوشی محمد ہی کو دیکھ لو۔ اللّٰہ جنّت نصیب کرے، اُن کا دماغ بھی اپنا ہی تھا، مجال ہے کسی کی بات مان جائیں۔ اُجاڑے سے آٹھ سال اُدھر کی بات ہے۔ اُس دفعہ بارشیں بہت ہوئیں اور روہی میں بارش ہونے کا مطلب وافر غلّہ تھا۔ روہی میں چنے کی فصل کا سیلاب آ گیا۔ اِس بار ہماری فصل تین ہزار من ہوئی۔ فیروز پور کی منڈی کافی دُور تھی۔ تحصیل مکھسر دس کوس پر تھی۔ اُس وقت دو بیل گڈّے ہمارے پاس تھے۔ اُن پر اِتنا غلّہ لاد کر لے جانا بہت مشکل تھا۔ ہری چند کھتری میاں جی کے پاس آیا اور ایک روپیا فی من کے حساب سے پورا غلّہ گھر سے اُٹھانے کا سودا کر لیا۔ میاں جی نے کہا کل بتاؤں گا۔ اُس کے جانے کے بعد میاں جی نے منڈی سے ریٹ معلوم کرنے کے لیے بندہ بھیج دیا۔ پتا چلا کہ منڈی کا ریٹ ایک روپیا چار آنے ہے۔ پھر کیا تھا، میاں جی کا لاٹو گھوم گیا۔ اُنھوں نے کہا، غلّہ مَیں خود منڈی لے کر جاؤں گا۔ اِس کھتری کو چار آنے کس بات کا منافع دوں؟ اب ہزار طرح سے اُن کو سمجھانے والے،

کہ میاں جی غلہ کھتری کو بیچ کر سر دردی سے بچو۔ کس جھنجٹ میں پڑنے والے ہو۔ مگر اُن کی جوتی سنے۔ بنگلا فاضلکا میں اُس کا بیلی رفیا کمہار تھا، اُس کو بلا بھیجا اور تین آنے فی من کے حساب سے مکھسر کی منڈی میں غلہ پہنچانے کا اُس سے معاہدہ کر لیا۔ وہ تیسرے دن ہی سو گدھا اور پندرہ بندے لے کر آ گیا۔ غلے کو گدھوں پر مکھسر کی منڈی میں ڈھونا شروع کر دیا۔ چل سو چل، پندرہ بندوں کی تین وقت کی روٹی اور سو گدھے کا چارا بھی ہمارے ذمے تھا اور ساتھ روز کا پانچ روپے خرچ۔ سبز چارا اُس وقت تھا نہیں۔ چنانچہ گدھے بھی چنے کھاتے اور بے حساب کھاتے۔ پورے ڈیڑھ مہینے میں پتا نہیں، سو گدھوں اور پندرہ بندوں نے کتنے چنے اور کتنی روٹیاں کھائیں اور ہمیں کیا بچا؟ بس یہ ہوا کہ میرے والد میاں خوشی محمد کی ضد پوری ہو گئی۔ ڈیڑھ مہینے بعد رفیعے کمہار کو تین آنے فی من کی مزدوری اور ایک آنہ فی من کے حساب سے انعام دے کر رخصت کیا اور بڑے فخر سے کہنے لگے، دیکھ لو، اِسے کہتے ہیں عقلمندی۔ کھتری خوامخواہ میں چار آنے بچا رہا تھا۔

اتنے میں بابے کے مجھلے بیٹے نے باہر آ کر کہا، میاں جی روٹی تیار ہے۔ اِس کا مطلب تھا، دوپہر کے سورج نے عصر تک چھٹی کا گھنٹا بجا دیا۔ سب اُٹھ کر اپنے گھروں کو چل پڑے۔ اللہ دین کا بیٹا اُسے اُٹھا کر گھر لے گیا اور چار بجے سہ پہر تک محفل برخاست ہو گئی۔

....

گاؤں میں نہ کسی کے پاس ریڈیو تھا اور نہ ہی اخبار کی آمد لیکن گاؤں شہر کے نزدیک تھا۔ اس لیے روزانہ کوئی نہ کوئی خبر پہنچ جاتی۔ جس پر اُس وقت تک گفتگو چلتی جب تک اگلی خبر نہ پہنچ جاتی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب پاکستان بنے ابھی بارہ تیرہ سال ہوئے تھے۔ برلا ٹیکسٹائل مل کی وجہ سے سرخ انقلاب کی باتیں شہر کے گلی محلوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ بابے اللہ دین کی محفل میں بھی اکثر اُس کے متعلق خبریں پہنچتیں، جو زیادہ تر راؤ اصغر کی زبانی بیان ہوتیں۔ اللہ دین کے پاس راؤ اصغر کے آنے کا وقت ٹھیک چار بجے سہ پہر کا ہوتا۔ اُس کی ہر خبر کو اس لیے مستند سمجھا جاتا کہ ایک تو وہ پوری آٹھ جماعتیں پڑھا تھا، دوم اُس کے پاس گاؤں میں ولایتی شکر کا ڈپو تھا۔ اِس سلسلے میں اُسے اکثر شہر جانا

ہوتا۔ جہاں سے وہ ضرور کوئی نہ کوئی خبر لے آتا اور جلدی سے اللہ دین کی چارپائی کا رخ کرتا۔

دُور سے راؤ اصغر دائیں ہاتھ سے اپنی دھوتی کے پلو اڑستا ہوا آتا دکھائی دیا۔ دھوتی کیا، دو گز کی لنگی تھی، جو ہمیشہ گھٹنوں سے اُوپر ہی اُوپر رہتی۔ پاؤں میں ٹائر کے جوتے، جو دُور سے ہی کھٹ کھٹ بج رہے تھے۔ پاس آکر کُرتے کی آستین سمیٹی اور ایک مونڈھے پر ٹِک گیا۔ حقے کے تین چار کش لیے، ایک بھرپور نظر اِدھر اُدھر بیٹھے لوگوں پر ڈالی، پھر اللہ دین کی طرف منہ کر کے بولا، میاں اللہ دین! بس اب کچھ ہی دن رہ گئے گریبوں کی تقدیر بدلنے کے۔ روس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان میں لال جھنڈا اب لگا ہی دیا جائے۔ روس کے صدر نے خط لکھا ہے کہ جلدی سے گریبوں کو دن میں تین مرتبہ روٹی اور گھر دے دو، ورنہ ہم چار مہینوں کے بعد خود آ کر حکومتاں کریں گے۔

کچھ دن اور تنگی کاٹ لو۔ پھر تو ہر شے مفت راشن میں آئے گی۔ برابر دال بٹا کرے گی۔ میاں اللہ دین اِن ڈاکوؤں اور سرمایہ داروں سے جان چھٹے گی، جنھوں نے یہیں بیٹھے بیٹھے مہاجر بن کے کئی کئی لاٹیں نام کرا لیں اور مِلوں کے مالک بن گئے۔ اللہ قسم، سب کچھ اِس ملک کا یہاں کے شہر میں رہنے والوں نے اور وہاں سے آنے والے شہری مہاجروں نے لوٹ لیا۔ دیہاتیوں کے ہاتھ میں ڈُگڈگی دے دی، کہ لو، بجاتے پھرو۔ اب روس اِن سے نپٹے گا۔

راؤ صاحب یہ ہر روز جو آپ سرمایہ دار سرمایہ دار کرتے رہتے ہو، آخر یہ ہے کیا بلا؟ مشتاق جلاہے نے حیرانی سے سوال کیا، مَیں نے بھی آخر بڑی دُنیا پھری ہے۔ فیروز پور، لدھیانہ، منٹگمری، ہر جگہ گیا ہوں اور پتن پتن کا پانی پیا ہے لیکن اِس جانور کو نہیں دیکھا۔

اس سے پہلے کہ راؤ اصغر مشتاق کے سوال سے چکرا جاتا، اُسی لمحے حبیب اَرائیں بول پڑا، لو جی، اِس کو دیکھو، یہ جلاہے کا جلاہا ہی رہا۔ اب جس کو سرمایہ دار کا نہیں پتا، اُسے اپنے سر کا پتا ہے۔ سر کا معنی، سر اور مایا کا معنی پیسا اور دار کھوتے کو کہتے ہیں۔ مطبل یہ کہ جس گدھے کے سر پر پیسوں کی پنڈ ہو، اُسے سرمایہ دار کہتے ہیں۔ حبیب کی اِس وضاحت پر سب اُسے تحسین سے دیکھنے لگے۔ راؤ اصغر نے بھی اُس کی تائید میں سر ہلا دیا۔

اسماعیل بھی جس کے وہ ہی کام تھے، پانچ مرتبہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنا اور پائے کا شوربا پینا، اُس نے راؤ اصغر کی بات سن کر پہلے سر سے پگڑی اُتار کر زانو پر رکھی پھر تسلی سے ٹکلے ٹنڈ پر اپنی انگلیوں سے خارش کی اور پگڑی کو درست کر کے فکرمندی سے بولا، راؤ صاحب! یہ ساری بات تو ٹھیک ہے، پر سنا ہے، روس والے پکے کافر ہیں، آ گئے تو مسجدیں بند کر دیں گے، نماز پڑھنے والوں کو کوڑے ماریں گے اور حلال گوشت بھی نہیں ملے گا۔ اسماعیل کی بات سن کر ایک دفعہ سب گھبرا گئے اور فکرمندی سے بابے اللہ دین کو دیکھنے لگے۔ راؤ اصغر نے سب کو بدکتے محسوس کیا تو فوراً ہنستے ہوئے بولا، اسماعیل تمھیں کس نے کہہ دیا وہ کافر ہیں؟ تم بھی کاٹھ کے اُلو رہے۔ بس شوربہ پی لیا اور لیٹ گئے۔ او بھائی، وہ مسلمان ہیں مسلمان، گوشت کھاتے ہیں، سر پر ٹوپیاں رکھتے ہیں اور یہ جو سرخ جھنڈا ہے، یہ علم ہے علم۔ امام حسین کا جھنڈا پہلے لال ہوتا تھا، پر تجھے کیا پتا؟

اب دوسرے لوگوں کو بھی حوصلہ ہوا اور وہ بھی اسماعیل کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اللہ دین، جو معذوری کے سبب چارپائی پر سیدھا ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا، تکیے کا سہارا لے کر پائیں کی جانب سرکا۔ اسماعیل سمیت سارا مجمع اللہ دین کی بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ سائیں لوکا، اللہ دین حقے کی نے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا! مجھے یہ بتا، اگر وہ مسلمان نہ ہوتے تو اُنھیں کیا ضرورت تھی غریبوں کو کھانا اور گھر دینے کی؟ جو ہمارے نبی نے کہا ہے وہ پورا پورا تول کر وہی کچھ کر رہے ہیں۔ اسی لیے تو امام حسینؓ کے علم کا نشان لال جھنڈا اُن کے پاس ہے۔ دوسری بات، اگر وہ کافر ہوتے تو ایران کا بادشاہ اُن کے ساتھ کیوں صلح صفائی سے رہتا؟

حیات دین جو ساری بات غور سے سن رہا تھا، اُس نے ہلکے سے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا، پر میاں اللہ دین پرسوں شیخ غلام کہہ رہا تھا، وہ شراب بھی پیتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ لوگ دوبارہ روس سے بدظن ہوتے، راؤ اصغر ہنس کر بولا، حیاتے اگر تو سال سال بھر نہائے اور دن رات افیم کھا کر مسلمان رہ سکتا ہے، تو وہ کیوں نہیں مسلمان رہ سکتے؟

راؤ اصغر کی اس پھبتی پر سب نے زوردار قہقہہ لگایا اور حیات خاں کھسیانا سا ہو کے حقہ پینے

لگا۔ اس کے بعد راؤ اصغر اٹھ کر چلا گیا۔ ابھی وہ تھوڑی دُور ہی پہنچا تھا کہ شیدا بٹیر ایک بٹیرے کو مٹھلاتے ہوئے آن بیٹھا۔ اُس کے ایک کندھے پر تکونی رومال تھا، جسے وہ روزانہ اپنے ہاتھ سے دھوتا اور کاندھے پر ڈال لیتا لیکن دوسرے کپڑے ہفتے بعد ہی بدلتا۔ باپ سے آٹا پیسنے کا خراس وراثت میں ملا تھا جس کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ پتھر کے پڑ گھس گھس کر آدھے رہ گئے تھے اور اُونٹ کے خوراک کی کمی کی وجہ سے جگہ جگہ کوہان نکل آئے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شیدے کو سوائے بٹیروں کے کسی بات سے علاقہ نہیں تھا۔ بابے اللہ دین کے پاس آ کر بیٹھنے والا ہر شخص اپنی ذات میں عجوبہ تھا لیکن شیدے بٹیر کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اسے دیکھ کر ہر شخص چہک اُٹھتا۔ شیدا بٹیر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چراغ ارائیں آ گیا۔ دونوں کی خوب لگتی تھی، اِس لیے محفل خوب گرم ہو گئی۔ اللہ دین نے شیدے سے اُس کے بٹیرے کا حال احوال پوچھا اور ابھی وہ جواب دینے ہی لگا تھا کہ چراغ بول پڑا، اللہ دین، بٹیرے کا حال کیا ہوگا۔ اِس بے چارے کی جان تو اِس کے ہاتھوں کی بدبُو سے ہی قبض رہتی ہے۔

چراغ کی پھبتی پر سب ہنس پڑے لیکن شیدے بٹیر نے ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ چراغ ارائیں کی بولتی بند ہو گئی، بولا! دیکھ اللہ دین اِس تھوم خور کو سمجھا، جس کی بیوی صرف اس لیے طلاق لے گئی کہ یہ رات کو پادیں مار مار کر اُس کو ہیضہ کر دیتا اور بے چاری کو سونے نہیں دیتا تھا۔ اسی لیے اُس کی بیماری نہیں جاتی تھی۔ بے چاری سارا دن باولی باولی پھرتی رہتی۔ آخر اُس نے سوچا، جان ہے تو خاوند بہت اور چھوڑ کر چلی گئی مگر اِس ڈھیٹ کو شرم نہ آئی۔ اِسی بٹیرے کی قسم، مَیں ہوتا تو نیلا تھوتھا کھا کے مر جاتا۔ مگر مَیں بھی کس کو کہہ رہا ہوں؟ یہ باتیں تو غیرت مندوں کے لیے ہیں۔

شیدے کے جوابی حملے پر سب کی طرف سے زوردار قہقہہ لگا اور چراغ ارائیں بے چارا بجھ گیا۔ انہی قصوں، آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں میں بابو رجب علی کی شاعری چل پڑتی جس پر خاص کر مشتاق جلاہا جھوم جھوم کر واہ واہ کرتا۔ شام چھ بجے چونکہ لوگ اپنے کام کاج نپٹا کر فارغ ہو جاتے تھے، اس لیے پورے دن کے معمول سے آٹھ دس لوگ اور بڑھ جاتے اور یہی وقت بابو رجب علی کی شاعری کا ہوتا۔ بابو رجب علی کا دادا پہلے پہل مسلمان ہوا تھا اس لیے لہجہ خالص سکھ تھا،

جس میں رجب علی کمشری پڑھتے ہوئے لہریں لیتا نظر آتا۔حتیٰ کہ عشا کی اذان اس محفل کو برخاست کروادیتی۔

....

میاں جی کو چارپائی پر بیس سال ہو گئے تھے۔ اِس عرصے میں اُن کے ساتھ والے پنچھی ایک ایک کر کے اُڑ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ منگل وار آٹھ جولائی کا دن تھا۔ گرمی سے زمین کا سینہ تپ کر ایسا، جیسے آگ پر تانبا چڑھا ہو اور سورج کی شعاعیں آدمی تو ایک طرف پانی کا کلیجا چیر رہی تھیں۔ میاں جی کی چارپائی معمول کے مطابق مَیں خود درختوں کی چھاؤں میں رکھ کر اور مونڈھے بچھا کر کام پر چلا گیا۔ اُس دن مجھے رینالہ جانا تھا اور نذیر ہمیشہ کی طرح آج بھی گھر پر نہیں تھا۔ اماں رفیق کے ساتھ اُس کے سسرال گئی تھی۔ مجھے یقین تھا، مَیں دوپہر تک لوٹ آؤں گا مگر دیر ہو گئی۔ میاں جی کی مجھے فکر تو کافی تھی لیکن تردد اِس لیے زیادہ نہیں تھا کہ آس پاس بیٹھنے والے اُس کی خبر رکھیں گے لیکن مَیں جو تین بجے سہ پہر وہاں پہنچا تو کلیجا دہل کر رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں، میاں جی اکیلے چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ کوئی آدم زاد وہاں موجود نہیں اور وہ چارپائی پر بیٹھے دھوپ کی کڑاہی میں پک رہے ہیں۔ جولائی کی اِس سخت دھوپ میں معذور اور اُٹھنے سے لاچار میاں جی اپنے ہی پسینے میں بار بار بھیگ رہے تھے اور بار بار سورج کی آگ اُسے بھاپ بنا کر اُڑا رہی تھی۔

بیٹا کیا بتاؤں، اُس دن تیرے دادا کو یوں دھوپ کے آگے لاچار دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی۔ دل دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ جی چاہا سڑک پر ٹکریں ماروں اور ایسا پاگل پن چھایا کہ سڑک پر کھڑے ہو کر گاؤں والوں کو گالیاں دینے لگا کہ میاں جی دھوپ میں جلتے کسی کو نظر نہ آئے؟ حرامزادے دیکھ کر گزرتے رہے اور کسی نے چارپائی اُٹھا کر چھاؤں میں نہیں کی۔ اِسی غصے اور باؤلے پن میں کئی گالیاں میاں جی کو بھی دے گیا کہ اُس نے کسی راہگیر کو کیوں نہیں کہا، چارپائی اُٹھا کر سائے میں کر دے۔ میاں جی سر نیچا کیے مسلسل چپ بیٹھے میری گالیاں سنتے رہے

اور کچھ منہ سے نہ بولے۔ اِسی غصّے میں اُن کو اُٹھایا اور گھر کی طرف لے کر بھاگا۔ جسم اتنا گرم تھا، ایسے لگا جیسے مَیں نے آگ کے کوئلے پکڑ لیے۔ جلدی سے لے جا کر نلکے کے نیچے بٹھایا اور ٹھنڈا پانی اُوپر پھینکنے لگا۔ پانی پھینکتا جاتا تھا اور لوگوں کو گالیاں دیتا جاتا تھا۔ نہلانے کے بعد مَیں نے اُنھیں گھر میں موجود شہتوت کے نیچے بٹھایا اور بڑی دیر تک دستی پنکھا جھلتا رہا اور بڑبڑاتا بھی رہا۔ اِس کے بعد مٹّی کی کوری چاٹی سے پیتل کے دو گلاس ٹھنڈی لسّی کے بھر کر پلائے اور کھانا کھلایا۔ اِس سارے عرصے میں وہ بالکل بھی نہیں بولے۔ اتنے میں پانچ بج گئے اور اماں بھی آ گئی۔ مَیں اس قدر شرمندہ تھا کہ اماں سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ اماں جو سارا دن میاں جی کی پل پل خبر رکھتی، آج ہی گھر نہ تھی تو اُس کی یہ حالت ہو گئی۔ مَیں خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ اماں کو کچھ پتا نہ چلا کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ دوسرے دن مَیں صبح اذان کے وقت اُٹھا کہ میاں جی کا حقہ تازہ کر دوں۔ صبح کاذب کے حقہ تازہ کرنے کا کام برسوں سے میرے ہی ذِمے تھا۔ جب مَیں نے حقے پر چلم رکھ کر اُن کی چارپائی کے پاس رکھا تو اُنھوں نے مجھے کہا، بیٹا! یہاں بیٹھو۔ اب میرا کل والا جوش ٹھنڈا ہو چکا تھا اور پورے حواس میں تھا۔ اِس لیے ڈرنے لگا کہ میاں جی پتا نہیں کیا کہیں؟ ڈرتے ڈرتے ادوائن کی طرف بیٹھ گیا۔ وہ آہستہ سے بولے، بیٹا مجھے ایک بات بتا، تم لوگوں نے میری کتنے سال خدمت کی ہے؟

مَیں چپ رہا اور کچھ جواب نہ دیا۔ آنکھیں بھی نیچے کیے رکھیں۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ خود ہی بولے، دیکھ بیٹا، آج اِس چارپائی پر مجھے بیس سال ہو گئے۔ اِس عرصے میں تم نے اور تمھاری ماں اور بھائیوں نے میری خدمت کا حق ادا کر دیا۔ جس کا اجر خُدا ہی کے پاس ہے، لیکن دُنیا کانچ کے پیڑ کی طرح ہے، جس کا نہ تو سایہ ہے اور نہ ہی اس کا پھل ہضم ہوتا ہے۔ اگر کل مَیں کسی کو کہہ دیتا کہ میری چارپائی چھاؤں میں کر دے۔ وہ چارپائی تو چھاؤں میں کر دیتا مگر سارے گاؤں میں کہتا پھرتا، دیکھو بھائی، خون سفید ہو گیا ہے، اللہ دین کے پانچ بیٹے ہیں مگر وہ بے چارا دھوپ میں لاچار پڑا جل رہا تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ مَیں نے اُس کی چارپائی اُٹھا کر سائے میں کی اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ بس خُدا کسی کو نافرمان اولاد نہ دے اور معذور ہونے سے پہلے ہی اُٹھا لے۔

بیٹا مجھے بتا، پھر تمھاری ساری عمر کی خدمت اور میری عزت بازاروں میں کس بھاؤ بکتی؟ اور دُنیا کے آگے میرا کیا وقار رہتا؟ لیکن کل مَیں اِس لیے چُپ رہا کہ غصّے میں آدمی کا دماغ کسی بات کو نہیں مانتا۔

میاں جی کی اس بات میں ایسی شفقت اور محبت تھی کہ میرے آنسو نکل آئے اور مَیں رونے لگا۔ اسی حالت میں انھوں نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا جس میں پوری کائنات کا پیار بھرا تھا۔ اِس واقعے کے چوتھے دن ہی میاں جی کی چارپائی اُٹھ کر اِس قبرستان میں آ گئی۔

دادی اماں فاطمہ

مَیں اُن کو اماں دادی کہتا تھا۔ فیروز پور کا ایک علاقہ مالہم تھا۔ یہ ایک قصبہ تھا۔ اس میں ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ اِسی کا ایک گاؤں پلیے والا تھا۔ وہاں ایک آدمی نور محمد تھا۔ نیک طینت آدمی تھا، زمینداری کرتا تھا۔ اُس نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی سے میری دادی پیدا ہوئی اور اُس کے تین سال بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اسماعیل تھا۔ یہ دادی اماں کا سگا بھائی تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد اِن کی والدہ فوت ہو گئی۔ پھر نور محمد نے دوسری شادی کی جس کے پہلے خاوند سے تین بیٹے تھے۔ ایک کا نام نظام دین تھا اور دوسرے کا چراغ دین۔ اسماعیل پنجاب کی تقسیم سے دس سال پہلے فیروز پور چھوڑ کر ہندوستان کے ایک شہر مندرہ میں چلا گیا۔ بعد میں اِس کی کوئی خبر نہ لگی کہ کہاں گیا۔ چنانچہ پاکستان میں دادی اماں کا کوئی بھی بھائی سگا نہیں تھا۔ ہاں اِن کے چچا کے بیٹے تھے اُن کا ذکر آگے آئے گا۔ نظام دین جو دادی کی دوسری والدہ کا بیٹا تھا، وہ شکل و صورت میں بہت خوبصورت اور جوان تھا۔ ایک بار گھر سے غائب ہو گیا اور کئی سال غائب رہا۔ آخر اُس کی لاش ملی۔ دادی اُس کے لیے بہت روتی تھی۔ کہتی تھی اُسے کسی بدکار عورت نے زہر دے دیا تھا۔

مجھے اوروں کی دادیوں کی تو خبر نہیں مگر دعوے سے کہتا ہوں میری دادی اللہ کی ولی تھی۔ پانچ وقت کی نماز اور تہجد قضا کرتے اُسے مَیں نے نہیں دیکھا۔ مَیں جب آٹھویں جماعت میں تھا، تب فوت ہوئی۔ آلِ محمد ﷺ کی عاشق تھی۔ افلاس اور غربت کے دنوں میں بھی نیاز دلوانے سے نہیں

رہی۔ عمر بھر کی دُکھی اور مصیبت زدہ تھی۔ مَیں ہر وقت اپنی دادی کے ساتھ رہتا تھا۔ اُسی کی چارپائی پر اُسی کے ساتھ سوتا تھا۔ مجھے آلِ محمد ﷺ اور اہلِ بیت کے واقعات سنایا کرتی تھی۔ کربل کتھا اور مختار کا انتقام سناتی تھی۔ اپنے وطن کے قصے بتاتی تھی۔ صاف ستھرا لباس پہنتی۔ اُس کا معمول تھا کہ صبح کاذب کے عالم میں بستر سے اُٹھ جاتی۔ شام ہی سے ایک دیگچی پانی کی پاتھیوں کی آگ میں دبا کر رکھ دیتی۔ یہ دیگچی کا پانی صبح تک گرم رہتا تھا۔ اُسی سے وضو کرتی اور تہجد پڑھتی۔ پھر دودھ کی چاٹی میں مدھانی ڈال کر دودھ بلونا شروع کر دیتی۔ مَیں بستر میں پڑا مدھانی کی گھوں گھوں سنتا رہتا۔ تھوڑی دیر میں سورج نکلنے سے پہلے دودھ بلو کر مکھن نکال لیتی۔ پھر فجر کی نماز پڑھتی۔ اتنے میں سب گھر جاگ جاتا۔ دن کے وقت کبھی فارغ نہ بیٹھتی تھی۔ کچھ نہ کچھ کام کرتی رہتی۔ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے منیر احمد یعنی میرے چچا کے ساتھ رہتی تھی۔ چچا منیر کے پاس ایک بھینس تھی۔ یہ اُسی بھینس کی خاطر میں اکثر رہتی تھی۔ گھر ہمارا ایک ہی تھا لیکن بھینس کی ملکیت چچا کی تھی جسے دادی اماں دیکھتی بھالتی۔ مَیں بھی دادی اماں کے اتباع میں اُس بھینس کو نہلاتا اور اُس کے آگے چارا ڈالتا تھا۔ یہ تب کے زمانے ہیں جب میں چوتھی پانچویں جماعت میں تھا۔ اُنہی دِنوں کا ایک واقعہ مجھے اب تک نہیں بھولتا۔ ہمارے گھر کے سامنے یونین کونسل کا دفتر تھا۔ اُس میں بہت اونچے اور گھنے ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ جنھیں دیکھ کر خوف آتا تھا۔ مَیں اکیلا کبھی اِس کے احاطے میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ صحن میں بہت گھنی اور لمبی گھاس لگی ہوئی تھی جو بارشوں سے نہایت چمکیلی اور گھنی ہو گئی تھی۔

ایک جِنّ کا تھپڑ

ایک دن دادی اماں نے یونین کونسل کے صحن میں گھاس دیکھی اور سوچا کہ اِسے ہماری بھینس کھائے گی تو کتنا اچھا ہوگا۔ مَیں اور دادی اماں وہ گھاس کاٹنے صحن میں داخل ہو گئے۔ دادی اماں گھاس کاٹنے لگی اور مَیں اُسے اٹھا کر کپڑے میں ڈالنے لگا۔ اتنے میں یوں ہوا کہ ایک زوردار چانٹا مرے گال پر لگا۔ یہ اتنے زور کا تھا کہ مَیں چکرا سا گیا اور گال سینکنے لگا۔ ڈرا ہوا مَیں پہلے ہی تھا کہ اِن ٹاہلیوں کی شاخوں پر جن بھوت رہتے ہیں۔ اب اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی شے نظر نہ آئی۔

مجھے یہ تھپڑ شدید بھاری لگا لیکن ابھی تک مَیں نے دادی سے کچھ نہ کہا اور سوچنے لگا کہ یہ آخر کس طرف سے لگا ہے۔ سات آٹھ برس کی عمر تھی۔ زیادہ غور وفکر کرنے کی تاب نہ تھی۔ اتنے میں پھر ایک تھپڑ اُس سے بھی شدید میرے گال پر لگا اور مَیں تیورا کر گر پڑا اور چیخیں مار کر رونے لگا۔ اِس میں ایک تو تھپڑ کا درد تھا دوم بھوت کا خوف یقین میں بدل گیا تھا۔ میری حالت دیکھ کر دادی بھی گھبرا گئی۔ اب غالباً تھپڑ کی آواز اُس نے بھی سن لی تھی۔ دادی نے جلدی وہ گھاس اٹھائی اور مجھے بازو سے پکڑا اور بھاگ نکلی۔ پھر یہ واقعہ سب کو سنایا۔ سب ہنستے تھے اور یقین نہ کرتے تھے لیکن اُس کے بعد مَیں اور دادی اُس وقت تک اُس جگہ نہ داخل ہوئے جب تک یہ راز کھل نہ گیا کہ تھپڑ مارنے والا کون تھا۔ دراصل یہ ایک بڑا سا پرندہ تھا جس نے وہاں بچّے دے رکھے تھے۔ اُس پرندے نے میرے گال پر زور سے اپنے پر مارے تھے جو مجھے تھپڑ کی طرح لگے تھے۔ یہ بات ایسے پتا چلی کہ ایک دن اُس نے یونین کونسل کے چپڑاسی پر بھی ویسے ہی وار کیا تھا اور پہچان لیا گیا تھا۔ وہ بے چارا بھی سٹپٹا گیا تھا۔ مَیں آج بھی سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں۔ ایک پرندے کے پروں میں اتنی طاقت کہاں سے آئی کہ آدمی کو چکرا دے۔

ایک دلچسپ واقعہ

دادی اماں نے جس قدر مجھ سے اپنی زندگی کی روایات بیان کی ہیں وہ دلچسپ سے زیادہ غم انگیز اور کربناک ہیں۔ مجھے اُن واقعات کے بیان کرنے سے وحشت ہوتی ہے اس لیے اُن سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔ البتہ والد صاحب کی زبانی اُن کے چچازادوں کے متعلق دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ والد صاحب بیان کرتے ہیں۔ ایک دفعہ مَیں اپنی ماں کے ساتھ اُن کے میکے گیا یعنی اپنے نانا کو ملنے۔ وہ مندرہ میں رہتے تھے۔ یہ قصبہ ہمارے گاؤں سے سو میل دُور تھا۔ ہم ماہلم سٹیشن پر اُترے۔ یہاں سے مندرہ پندرہ کوس یعنی پینتیس کلومیٹر پیدل چل کر آتا تھا، جسے ایک دن میں طے کرنا بہت مشکل تھا۔ میں نو سال کا تھا۔ ویسے تو ہر وقت پیدل چلتے تھے لیکن ایک ہی دن میں اتنا فاصلہ نپٹانا ذرا میرے لیے مشکل تھا۔ جب ہم نے آٹھ کوس طے کر لیا تو میری ماں نے

فیصلہ کیا کہ رات عیسیٰ خاں اور دلاور کے پاس رُک جاتے ہیں۔ یہ دونوں اماں کے چچازاد تھے لیکن چوری اور ڈکیتی اِن کا پیشہ تھا۔ ہر وقت لڑائی بھڑائی میں مصروف رہتے۔ آدھی زندگی تھانے کچہری میں گزرتی اور آدھی چوریوں میں۔ ماں نے مجھے کہا بیٹا یہاں سے ایک میل پر شاہوالا گاؤں ہے۔ یہاں تیرے ماموں عیسیٰ خاں اور دلاور خاں رہتے ہیں۔ وہیں رُک جاتے ہیں۔ ویسے بھی وہ گِلہ شکوہ کرتے ہیں کہ مَیں اُنھیں کبھی ملنے نہیں آئی۔ رات رُک جاتے ہیں۔ کل یہاں سے مندرہ چلے جائیں گے۔ چنانچہ ہمارا رُخ شاہوالا کی طرف ہو گیا۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچے ایک نئی اور بالکل عجیب دُنیا تھی۔

حویلی کا دروازہ ہاتھی گیٹ کی طرح بہت بڑا تھا اور کم و بیش ایک ایکڑ کی حویلی تھی۔ مکان بھی پکے اور دو منزلہ تھے۔ جیسے ہی ہم گیٹ پر پہنچے میرا ماموں عیسیٰ خاں اندر سے نکلا اور ہمیں دیکھتے ہی باغ باغ ہو گیا۔ لو بھائی اُس نے تو وہ آؤ بھگت کی کہ اللہ اللہ۔ دیسی مرغے حلال ہو گئے۔ پورے گھر کی عورتیں اور بچّے یوں گرد جمع ہو گئے جیسے ہم پیروں فقیروں کی اولادیں ہیں۔ ایک طرح سے عید ہو گئی۔ جب اُن کے کمروں میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ہر کمرہ تیس فٹ چوڑا اور چالیس فٹ لمبا تھا اور بیس فٹ اونچا ہوگا۔ تین چار کمرے تھے اور سب اتنے ہی لمبے چوڑے تھے۔ اندر ہی آگ جل رہی تھی، اندر ہی بستر لگے۔ کمروں کی چھتوں پر بڑے بڑے شہتیر تھے۔ یہ شہتیر درختوں کے ثابت تنوں پر ٹیڑھے میڑھے رکھے تھے اور اِن کے اوپر بڑے بڑے آنکڑے تھے۔ جن پر جنتر کی چھڑیوں کی چھتیں تھیں۔ کمرے کے اندر چھتوں کو سہارا دینے کے لیے ستون بھی درختوں کے تنوں کے تھے اور یہ سب مال چوری کا تھا۔ نہروں اور جنگلوں سے مفت کاٹ کر یہاں ڈالا گیا تھا ورنہ اتنی زیادہ لکڑی کے تنے شریف آدمی کو کہاں میسّر ہو سکتے تھے۔ اِن ستونوں کے ساتھ برچھیاں، چھویاں، تلواریں، ڈانگیں اور گنڈاسے بے ترتیبی سے لگے ہوئے تھے۔ ماما عیسیٰ، دلاور اور ولی محمد تینوں اِسی حویلی میں رہتے تھے۔ اکٹھی اِن کی روٹی پکتی تھی۔ اُنھوں نے ہمارے لیے طرح طرح کی چیزیں پکائی۔ مَیں اُن کی آؤ بھگت دیکھ کر دل ہی دل میں اماں کو کوس رہا تھا کہ اُس کے چچازادا تنے اچھے ہیں پھر یہ اِن سے ملنے کیوں نہیں آتی۔ ایک رات

اِسی طرح گزر گئی۔ اب اُنھوں نے ضد کی کہ دوسری رات بھی یہیں رُکیں۔ خیر ہم رُک گئے لیکن جب آدھی رات ہوئی تو ایک دم ہنگامہ سا پیدا ہوا۔ جیسے ہڑبونگ سا مچ گیا ہو۔ اِدھر عیسیٰ خاں، دلاور خاں اور ولی محمد ایک کے بعد ایک ستونوں کے ساتھ سے کوئی برچھی اٹھا کے باہر بھاگ رہا ہے، کوئی تلوار اُٹھا کے نکل گیا اور کوئی گنڈا سا لے بھاگا۔ اُن کے بیٹے بھی اِسی طرح سارا اسلحہ ایک ایک اُٹھا کر حویلی سے باہر بھاگ گئے۔ اب مَیں اور اماں بہت پریشان ہو گئے کہ یہ اچانک کیا وبال آ پڑا۔ جبکہ اُن کے گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچّے بالکل پُرسکون لیٹے ہوئے تھے۔ ہمیں پریشان دیکھ کر ماموں عیسیٰ کی بیوی بولی کوئی پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ ستی والا کے پٹھانوں نے گاؤں میں لوٹ مار کے لیے حملہ کر دیا ہے۔ ذرا اُنھیں سبق سکھانے گئے ہیں۔ خیر فجر کے وقت تک سب صحیح سلامت واپس لوٹ آئے۔ کہنے لگے پٹھانوں نے سمجھ رکھا تھا گاؤں زنخوں کا ہے اور وہ گاؤں کا مال کھول کر لے جائیں گے۔ ہم نے مار مار کر جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی کو پھیر دیے۔

پٹھانوں کی ونگار

اگلے دن ہم نے بڑی مشکل سے جلدی صبح اُن سے اجازت لی اور چل نکلے۔ مسلسل چلتے ہوئے اپنے نانا کے گھر پہنچے۔ گھر پہنچ کر اماں نے اپنے والد نور محمد سے سارا واقعہ بیان کیا کہ رات ہم عیسیٰ خان کے پاس رُک گئے تھے، وہاں رات کو یہ کچھ ہنگامہ ہوا تھا۔ پٹھانوں نے اُن کے گاؤں پر حملہ کر دیا تھا۔ نانا میری ماں کی بات سن کر ہنس پڑا۔ کہنے لگا، پٹھانوں بے چاروں نے کیا حملہ کرنا تھا۔ اصل قضیہ مَیں تمھیں سناتا ہوں۔ معاملہ یہ ہوا کہ تین مہینے پہلے کی بات ہے۔ ولی محمد لدھے وال جا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اور پیدل ہی چل رہا تھا۔ راستے میں یہی پٹھان مل گئے۔ یہ نہر سے اپنے خچروں کے ذریعے مٹّی نکال رہے تھے۔ یہ دوپہر کا عالم تھا اور پٹھانوں کے کھانا کھانے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ ولی محمد نے دیکھا پٹھان بیٹھے ہیں اور اُن کے پاس حقہ بھی ہے اور وہ دہک بھی رہا ہے۔ یہ حضرت پٹھانوں کے گروہ میں جا بیٹھے اور اُن سے حقہ پینے لگے۔ اِنھیں باتیں کرنے کا شوق بہت تھا۔ پٹھانوں کو مفت کے مشورے بھی دینے لگے۔ وہ بڑے پیار

سے اِن کے مشورے سنتے رہے۔ اتنے میں کھانا آ گیا۔ ولی محمد نے اُٹھنے کی اجازت مانگی اور سلام دعا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک پٹھان بولا، میاں آپ ایسے کیسے جا سکتے ہیں، کھانا کھا کر جائیں۔ یہ نہیں نہیں کرتے رہے لیکن پٹھان نہیں مانے ضد کر کے اِنھیں کھانے پر ساتھ بٹھا لیا۔ ولی محمد نے جی بھر کے اُن کے ساتھ کھانا کھایا۔ اُس کے بعد کہا لو میرے پٹھان بھائیو اب مَیں چلتا ہوں اور اپنا ڈنڈا اٹھا کر چلنے لگے۔ اُسی وقت ایک پٹھان نے اِن کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور کہا، خو کہاں جاتا ہے؟ ابھی آپ نے کھانا کھایا ہے۔ اب ہمارے ساتھ کام کرو نا۔ اِس نے کہا بھئی کھانا تو آپ نے اپنی خوشی سے کھلایا ہے، کام کروانے کے لیے تھوڑی کہا تھا۔ وہ بولا خو تم نے بھی خوشی سے کھایا ہے۔ دونوں میں رضامندی تھی۔ اِس لیے شام تک کام کرو۔ شام کو چھوڑیں گے۔ چنانچہ زبردستی اپنی خچروں کے پیچھے لگا لیا اور کام لینے لگے۔ چنانچہ ولی محمد نے شام تک اُن کی خچروں پر نہر سے مٹی ڈھوئی اور باہر نکالی۔ جب شام ہوئی تو پٹھانوں نے کہا خو اب تم نے اتنا کام کیا ہے۔ ابھی کھانا ضرور کھاؤ۔ اب ولی محمد نے انکار کر دیا لیکن اُنھوں نے زبردستی کھانا کھلا دیا اور پھر وہی دباؤ ڈالا کہ اِس کھانے کا بدلا یہ ہے کہ کل دوپہر تک کام کرنا ہے۔ لہٰذا ایک مہینے تک وہ اِن سے کام کرواتے رہے اور کھانا کھلاتے رہے۔

اِدھر گھر میں بوال مچ گیا کہ ولیا بھائی کدھر گم ہو گیا۔ چاروں طرف ڈُھنڈیا پڑ گئی۔ بہت پریشانی ہوئی۔ ہر جان پہچان والی جگہ تلاش کیا لیکن وہ نہ ملا۔ قدرت سے ایک دن اِن کے گاؤں کا آدمی اُدھر سے ایک دن گزرا اور اُس نے دیکھ لیا کہ ولی محمد کو پٹھانوں نے کام پر لگایا ہوا ہے لیکن اُسے پٹھانوں نے نزدیک نہ جانے دیا اور کہا کہ یہ آدمی ہمارا گروی رکھا ہوا ہے۔ اِس نے اتنا کھانا کھا لیا ہے جب کھانے کی قیمت پوری ہو گی تو پھر چھوڑیں گے۔ وہ آدمی اپنے گاؤں واپس آیا اور عیسیٰ خاں کو بتایا کہ آپ کا بھائی تو پٹھانوں نے پکڑ رکھا ہے۔ روز کھانا کھلا دیتے ہیں اور روز کام پر لگا دیتے ہیں۔ یہ سنتے ہی تمام گاؤں اپنے ڈانگیں اور برچھیاں نکال کر وہاں پہنچ گیا اور اُن سے ولی محمد کو چھڑا کر لائے۔ اُس کے بعد دس دن ٹھہر کر عیسیٰ اور دلاور نے اُن کے خچر چُرانے کا فیصلہ کیا۔ دس پندرہ دن تک چوری کے سارے اسباب جمع کیے اور ایک رات دس بندے لے کر پہنچ

گئے۔ پٹھان دن بھر کام کرنے کی وجہ سے نڈھال سوئے ہوئے تھے۔ انھوں نے جاتے ہی چوکیداروں کو دبوچ لیا اور باڑے میں بندھے تمام خچر کھول لیے اور انھیں راتوں رات منڈی گرو ہرسا میں لے گئے۔ وہاں ایک آدمی پہلے ہی لدھیانے کا موجود تھا۔ عیسیٰ خاں نے وہ سب خچر اُس کے حوالے کیے۔ وہ یہ خچر گڑ گاؤں لے گیا۔ لیجیے مال سب ہضم۔

یہ ایک مہینا پہلے کا واقعہ ہے۔ اب پٹھانوں کی روزی روٹی کا سہارا وہی خچر تھے جنھیں ان لوگوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ پٹھان باؤلے ہو چکے ہیں اور مرنے مارنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ وہ روز کسی نہ کسی گاؤں میں داخل ہو جاتے ہیں اور پورے گاؤں کی تلاشی شروع کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے سارا علاقہ پٹھانوں نے اپنے خلاف کر لیا ہے۔ اب اُنھیں کسی نے مخبری کی ہوگی کہ اُن کے خچر اس حویلی میں ہیں لیکن یہ تو دوزخ کے وہ کنویں ہیں جہاں جو کچھ گرا پل میں بھسم ہو گیا، ثابت چیز واپس نہیں ملتی۔ پٹھان رو پیٹ کر آخر یہاں سے نکل جائیں گے۔ پٹھانوں کو کیا پتا تھا اُنھوں نے جس آدمی کو ونگار پر لگا لیا ہے، وہ اُن کی اپنی روٹی بھی چھین لے گا۔

نواب صاحب کے ہاتھی کی چوری

عیسیٰ خاں کی چوریوں کی بابت اگرچہ بہت سے افسانے ہیں۔ جن میں سے اکثر مبالغہ کی نہج تک پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ بات تو درست ہے کہ ایک ایسا آدمی جس کا کام ہی چوری اور رہزنی تھا، اُس کے ساتھ بیسیوں ایسے واقعات پیش آئے ہوں گے جن میں کئی قابلِ ذکر اور دلچسپ بھی ہوں گے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ اپنے علاقے میں اپنے دَور کا طاقتور اور دلیر آدمی ہو۔ کیونکہ اُن وقتوں میں چوری اور رہزنی کے لیے کمزور جسم والا آدمی چل ہی نہیں سکتا تھا۔ بندوقوں کا زمانہ نہیں تھا کہ دُور سے بیٹھے گولیاں چلاتے جائیں۔ وہاں تو ڈانگوں، برچھیوں اور چھویوں سے کام تھا۔ جگہ جگہ واہریں گھیر لیتی تھیں جن کا مقابلہ اپنی جسمانی طاقت اور ہاتھ پاؤں کی پُھرتی سے کرنا ہوتا تھا۔ پھر میلوں بھاگنا پڑتا تھا۔ جس کے لیے ایک دلیر اور طاقت ور آدمی ہی چاہیے تھا۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا مگر شفیع محمد یعنی میرے والد کے ایک چچا اُن کا ایک واقعہ بیان کرتے تھے جو سراسر

مبالغہ تھا۔ آپ بھی سنیے:

کہتے ہیں ایک دفعہ اُن کی صلاح ٹھہری کہ فرید کوٹ کے نواب صاحب کی سواری کا ہاتھی چُرایا جائے۔ یہ ہاتھی بہت بڑا تھا اور ہزاروں روپے اُس کی قیمت تھی۔ اُس کے جسم پر زیور ہی ہزاروں روپے کا تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ ہاتھی ایک ایسے باڑے میں بند ہوتا تھا جس کی دیواریں بیس فٹ اونچی تھیں اور باڑے کا دروازہ آٹھ سوتر موٹی لوہے کی چادر کا تھا جس پر چوکس پہرے دار ہر وقت موجود تھے۔ خیر پہرے داروں کی تو کوئی بات نہیں تھی، دو دو ہاتھ ہو ہی جاتے مگر گیٹ کا پندرہ سیر کا بھاری قفل کون توڑتا۔ لہٰذا دروازے سے تو اندر داخل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں تھا۔ اِس لیے کوئی دوسرا حل نکالنا تھا۔ اب یہ دونوں بھائی رات کے پچھلے پہر اُس قلعہ نما باڑے کے قریب پہنچ گئے۔ سردیوں کی رات تھی۔ جگہ جگہ آگ جلا کر سینکتے بھی گئے۔ جب یہ دیوار کے پاس پہنچے تو آگ سینکنے کے سبب جسم میں طاقت کی تھوڑی سی کمی محسوس ہوئی۔ اب عیسیٰ خاں نے دلاور سے کہا، بھائی دلاور ایک ہی حل ہے۔ اوّل تو مَیں دیوار پر چڑھ کر پار اُترتا ہوں اور تُو باہر یہیں رُک جا۔ مَیں اندر جا کر ہاتھی کو اُٹھا کر باہر پھینکتا ہوں اور تُو اُسے نیچے گرنے سے بچانا اور اپنے کاندھوں پر اُٹھا لینا۔ اگر یہ نہیں کر سکتا پھر تم اندر جاؤ، مَیں باہر کھڑا ہوتا ہوں۔ تم اندر سے ہاتھی پھینکنا اور مَیں اُسے پکڑ لوں گا۔ دلاور نے سوچا، چونکہ اِس وقت جسم میں مسلسل آگ سینکنے کے سبب اضمحلال سا آ گیا ہے۔ اگر خُدانخواستہ مجھ سے ہاتھی دیوار پر سے پھینکا نہ گیا تو بڑی نموشی ہوگی۔ باہر ہی کھڑا ہو جاتا ہوں۔ گرتا ہوا کاندھوں پر نہ لیا گیا تو نیچے تو گر ہی جائے گا۔ لہٰذا دلاور نے کہا بھائی عیسیٰ تُو اندر جا اور مَیں یہاں باہر رُکتا ہوں۔ چنانچہ عیسیٰ خاں نے ایک ہی زقند بھری اور دیوار کے اوپر جا کھڑے ہوئے۔ پھر اگلے ہی لمحے باڑے کے اندر داخل ہو گئے لیکن خُدا کی قدرت دیکھیے کہ رات کے پچھلے پہر پوری ایک پلٹن نواب صاحب کی باڑے میں موجود تھی۔ اُنھوں نے تلواریں نکال لیں، جیسے ہی تلواروں کی جھنکار بلند ہوئی، دلاور نے سوچا، بھائی عیسیٰ خاں اندر پھنس گیا مردودوں میں۔ پل جھپکتے خود بھی دیوار پر پھلانگ کر اندر داخل ہو گئے اور بس پھر میدان بج گیا۔ دونوں بھائیوں نے آپس میں کنڈیں ملا لیں اور ڈانگوں پر برچھیاں چڑھا لیں لیکن یہاں

نواب صاحب کے پچاس پچاس کے جتھے ایک کے بعد ایک باڑے میں داخل ہونے لگے۔ جب عیسیٰ خاں اور دلاور خاں کو لڑتے ہوئے کافی دیر ہوگئی اور اُدھر نواب صاحب کی پلٹنیں بھی مسلسل جمع ہونے لگیں تو عیسیٰ خاں نے دلاور سے کہا، بھائی دُلے، جس طرح نواب کی پلٹنوں کے بادل چڑھ رہے ہیں اِن کا مقابلہ تو گوروں کی کمپنی بہادر ہی کر سکتی ہے۔ اتنے لوگوں میں رُک کے رہنا بھی کوئی بہادری نہیں ہے۔ زندہ رہے تو ہاتھی بہت، اِس وقت نکلنا چاہیے۔ چنانچہ دونوں نے لڑتے لڑتے ایک ہی دم زقندیں بھریں اور باڑے کی دیوار سے باہر ہوگئے۔ اپنی گھوڑیوں پر بیٹھے اور یہ جا وہ جا، مندرہ میں آ کر دم لیا لیکن اُنھیں ہاتھی وہیں چھوڑ کر آنے کا بہت غم ہوا۔ ایک عرصہ تک اُسے یاد کرتے رہے۔

بابا شفیع بات کرتے ہوئے کہنے لگا، یہ تھے وہ جوان اور آج کے جوان دیکھ لو، پلے پلائے ہاتھی کو بیس فٹ اونچی دیوار کے اوپر سے پھینکنا تو ایک طرف یہاں نالے کے پار نہیں پھینک سکتے۔

والد صاحب نے ہنس کر کہا، یہ بتایئے آج کے جوان اُٹھا تو لیتے ہیں نا؟

یعنی مَیں مانتا ہوں یہ لوگ بہت بہادر ہوں گے، بہت کچھ غیر معمولی واقعات بھی کرتے ہوں گے لیکن اکثر خود ساختہ کہانیاں ہیں جو ہر جگہ جنم لے لیتی ہیں۔ ایسی کئی خود ساختہ کہانیاں ہمارے اجداد نے بھی بنا رکھی تھیں جنھیں مَیں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

خیر دادی اماں کا ذکر آگے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا کیونکہ اِن کے بہت سے واقعات والد صاحب کے ساتھ مُنسلک ہیں۔

ڈاکو میلا سجن اور والد صاحب کی کہانی

ہمارا اصلی گاؤں جنڈ آلہ ضلع فیروز پور تھا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں دو سو گھر تھے اور سارے کے سارے کچے تھے۔ گاؤں کی سڑکیں بھی کچی تھیں۔ عین درمیان میں ایک بڑا سا کنواں تھا۔ کنویں کے اردگرد چوڑا تھڑا تھا۔ یہ واحد شے تھی جو پکی اینٹوں سے بنی تھی۔ سارے گاؤں میں پانی اِسی کنویں سے پیا جاتا تھا۔ عورتوں کو اپنے پورے وقت میں آدھا حصہ اِس کنویں سے مشکیں

کھینچتے گزرتا۔ اِس کے ساتھ ہی ایک شریہنہہ اور دو جنڈ کے درخت تھے۔ جنڈ جب اپنی بہار پر آتا تو باریک اور نرم پتیوں سے کچھ نہ پوچھیں کیسے کیسے رنگ پھوٹتے تھے۔ سامنے کچھ قدموں پر ایک لمبی چوڑی بیری تھی۔ اِس بیری نے اصل میں پورے چوک کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اکثر مسافروں کے اونٹ گھوڑے اور دوسری سواریاں اِسی بیری کے نیچے آن رُکتی تھیں۔ کنویں کے تھڑے سے ایک پانی کی نالی اِس بیری کے تنے تک چلی گئی تھی۔ عورتیں جب پانی کھینچتیں تو جو پانی نیچے گرتا وہ نالی میں سے ہو کر بیری کے تنے تک پہنچ جاتا۔ اِس کی وجہ سے اِس کے پتے بہت نرم ہرے اور لچکیلے ہو گئے تھے۔

جس علاقے میں ہمارا گاؤں تھا یہ روہی کہلاتا تھا اور چنوں کی فصلیں بہت ہوتی تھیں۔ دُور تک کھلے کھلے کھیت تھے۔ اِن علاقوں میں ابھی انگریز سرکار نے نہریں جاری نہیں کی تھیں۔ اُس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ریت کے ٹیلے دُور تک پھیلے ہوئے تھے اور زمین اونچی نیچی تھی۔ فصلیں بھی بارانی تھیں۔ بارشیں ششماہی ہوتی تھیں۔ اِس لحاظ سے فصلیں بھی ششماہی بوتے تھے۔ فصلیں چنے اور باجرے کی عام ہوتی تھیں اور اِنہی کو پیس کر سب روٹیاں پکاتے تھے۔ چنے کی روٹی گلے میں پھنس کے رہ جاتی۔ اُن وقتوں میں جو گھر گندم کی روٹی کھاتا تھا اُسے رئیس سمجھا جاتا تھا۔

مَیں چھوٹا سا تھا۔ دس بارہ سال کا ہوں گا۔ اُس وقت بکریاں چَراتا تھا۔ مَیں کیا سب گاؤں کے بال بھیڑ بکریاں چَراتے تھے۔ ایک دفعہ انگریزوں نے ہمارے گاؤں میں سکول بنا دیا۔ یہ سکول پانچویں جماعت تک تھا مگر سکھوں اور مسلمانوں کے خاندانوں میں سے کسی نے اپنا بچّہ سکول میں نہیں بھیجا۔ سکھ تو کہتے تھے ہمارے بچّے بھرشٹ ہو جائیں گے اور مسلمانوں کو اُن کے مولویوں نے بتا دیا تھا کہ گوری سرکار ہمارے بچّوں کو کرسٹیان بنانا چاہتی ہے۔ اِس لیے دونوں قوموں نے سکول پر لعنت بھیجی اور اپنے دھندے میں لگے رہے البتہ ہندوؤں نے اپنے لڑکے بھیج دیے۔ ہمارے گاؤں میں چوہڑوں کے کچھ گھر تھے۔ اُنھوں نے اپنے سارے بچّے سکول بھیج دیے۔ سکول میں اُستاد ہندو تھے۔ چوہڑوں کو نہ دین بھرشٹ ہونے کا خطرہ تھا اور نہ اُنھیں کرسٹیان بننے میں کوئی بُرائی نظر آتی تھی۔ مَیں اور میرے ساتھ گاؤں کے پندرہ بیس لڑکے سارا

دن گاؤں کے باہر کھیتوں اور ریتلے علاقوں میں بکریاں چَراتے اور شام کو اُنھیں ہانک کر گاؤں لے آتے۔ بکریاں چَرانے کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ مضافات میں فصلیں تو نام کی ہوتی تھیں۔ ون، کریر، جنڈ، کیکر، پیلوں اور اِسی طرح کے درختوں کا علاقہ تھا۔ اِن درختوں کے پتے بہت کرارے اور بکریوں کے کھانے میں عمدہ مزا دیتے تھے۔ ہم سب لڑکے بالے اپنی اپنی بکریاں اور بھیڑیں گاؤں سے باہر لے جا کر کھلی چھوڑ دیتے۔ وہ تمام دن اِدھر اُدھر چرتی رہتیں اور ہم سب چور سپاہی اور جنگل واسی کھیل کھیلتے رہتے۔ چنوں کے کھیت میلوں تک پھیلے ہوتے تھے۔ اگر چنوں کا موسم نہ ہوتا تو باجرے کا ہوتا۔ اِن دونوں کو ہم جانوروں کی طرح چَرتے تھے اور کوئی روکنے والا نہ تھا۔ ہماری بکریاں بھی اکثر باجرے اور چنوں کے کھیتوں میں گھس جاتیں اور کھاتی رہتیں۔ یہ سب اپنے ہی کھیت تھے۔ یہ ایسی فصلیں تھیں جن پر محنت نہیں ہوتی تھی۔ بس لوگ بیج پھینک دیتے تھے اور اللہ پر چھوڑ دیتے تھے۔ اللہ ایک دو بارشیں بھیج دیتا۔ وہی اِن کو کافی ہوتیں۔ اِس لیے ہمیں بھی کھیلنے کے لیے سارا سارا دن مل جاتا تھا۔ میرے پاس دو سو بکریاں تھیں اور اِسی قدر باقی لڑکوں کے پاس بھی تھیں۔ جب اُن ریت کے ٹیلوں پر بارشیں ہوتیں تو ہر طرف سبزوں کی ایسی ایسی کونپلیں نکلتیں جیسے میلوں میل تک ہری مخملیں بچھی ہوں۔ بارشوں کے دن لڑکوں کے لیے بہت جوش والے ہوتے تھے۔ جسم میں ایسے طاقت بھر جاتی جیسے بارش نہیں ہمیں دودھ اور گھی پلا دیا گیا ہو۔ کئی میل ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے۔

ایک دن کی بات ہے ہم سب اپنی بکریاں صحرا کے سبزوں میں چھوڑ کر کریر کے ٹیڑھے میڑھے درختوں پر لکڑ میٹی کھیل رہے تھے۔ یہ کھیل ایسا تھا کہ ایک لڑکا اپنی ٹانگ کے نیچے سے لکڑی دُور پھینکتا اور دوسرا لڑکا بھاگ کر اُسے پکڑ کے لاتا تھا۔ جب تک وہ لکڑی پکڑ کے لاتا ہم کریر اور جنڈ کے درختوں پر چڑھ جاتے تھے۔ پھر اُس لڑکے نے ہمیں درختوں پر چڑھ کر چھونا ہوتا تھا۔ جس کو چھو لیتا تھا اُسی کی اگلی باری لکڑی اُٹھانے کی ہوتی۔ ہم سب لڑکے اِس میں بہت مگن تھے۔ مَیں جنڈ کے درخت کی اُونچی شاخوں پر چڑھ کر ایک لچک دار شاخ پر جھولے بھی لے رہا تھا اور قریب کے دوسرے درخت پر چھلانگ لگانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ہمیں دُور سے اُڑتا

ہوا ایک غبار سا دکھائی دیا۔ میں حیرانی سے اُس غبار کو دیکھنے لگا۔ ہماری بکریاں بھی اُس غبار کو تکنے لگیں اور سب کی گردنیں جھاڑیوں سے اُوپر اُٹھ گئیں جیسے کسی خطرے کو سونگھ رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ غبار نزدیک آ گیا۔ ہم سب لڑکے دبک کر درختوں میں ہی بیٹھے رہے۔ غبار کے اندر سے پہلے گھوڑوں کی گردنیں نمودار ہوئیں اور پھر اُن کے سوار نظر آنے لگے۔ یہ دس بارہ لوگ تھے۔ اُن کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور سروں پر بڑے پگڑ باندھے تھے۔ اِن میں جو سب سے نُمایاں تھا اُس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی بندوق تھی۔ ہم نے پہلے بندوق کا صرف نام سنا تھا، دیکھی نہیں تھی۔ مَیں نے اپنے دادا سے اکثر سنا تھا کہ جب وہ اپنے ساہوکار کھتری کے مقابلے میں کورٹ کی تاریخ پر انگریز بہادر کی کچہری میں گیا تھا تو وہاں اُس نے بندوق دیکھی تھی۔ اُس وقت میرے دادا نے جو بندوق کی شکل بتائی تھی وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی اِس بندے کے پاس تھی۔ باقی بندوں کے پاس چھویاں اور کرپانیں تھیں اور سب کی آنکھیں خون کی طرح سُرخ اور انگارے کی طرح لال تھیں۔ ہمیں دیکھ کر اُن میں ایک آدمی بولا، سب لڑکے نیچے آ جاؤ، کیسے باندروں کی طرح اُوپر لٹکے ہوئے ہو۔ ہم سب پر خوف طاری ہو گیا، کہ اللہ جانے یہ کیا کہیں گے اور کس طرح ہمارے ساتھ پیش آئیں گے اور یہ کون ہیں۔ ہم نے میلا سجن کا نام بہت سنا تھا۔ کہیں وہی میلا سجن ڈاکو نہ ہو۔ میلا سجن کے انگریز پلسیوں سے بہت مقابلے ہو چکے تھے۔ اُس نے بڑے لوگوں کو قتل کیا تھا۔

سب لڑکے حکم سن کر نیچے اُتر آئے اور ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ ہماری بکریوں نے کچھ دیر تو اُنھیں دیکھا لیکن جب اُنھیں گھوڑے والوں سے خطرہ دکھائی نہ دیا تو دوبارہ جھاڑیوں میں منہ ڈال کر گھانس پھونس کی پتیاں کھانے لگیں۔ اب ہم سب اُن کا منہ دیکھنے لگے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ ہماری سب بکریاں ہانک کر لے جائیں گے اور جا کر دوسرے لوگوں کو بانٹ دیں گے۔ میلا سجن کے بارے میں یہ بات بہت مشہور تھی کہ وہ مال والوں سے مال چھین کر اُنھیں دے دیتا تھا جن کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ یہ سرسا علاقے کا ایک مشہور بدمعاش تھا، پورے مشرقی پنجاب میں اِس کی دھاک دلوں پر چڑھی تھی۔ اِس کے سر کی قیمت گوری سرکار نے مقرر کر رکھی تھی مگر اُن کے ہاتھ نہ لگا تھا۔

ہمیں دیکھ کر ایک ڈاکو نے دوبارہ حکم دیا اور بولا، سب اپنے اپنے کُرتے اُتار دو۔ یہ حکم ہم پر بجلی بن کر گرا۔ تب ہم صرف لمبا سا کُرتا ہی پہنتے تھے اور نیچے چوتڑوں پر کوئی کپڑا یعنی شلوار وغیرہ نہیں ہوتی تھی۔ بس یہ لمبا سا کُرتا ہی سب کچھ ڈھانکے رکھتا تھا اور ٹخنوں تک پھیلا ہوتا تھا۔ ہم سب لڑکے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اِسی اثنا میں اُس نے زیادہ رُعب دار آواز میں حکم دیا اور بولا، کیا میری بات سمجھ نہیں آئی۔ اپنے کُرتے جلدی سے اُتار کر اُس بڑے جنڈ کے نیچے بچھا دو۔ یہ جنڈ سیکڑوں سال پُرانا تھا اور بہت شاخیں تھیں۔ اِدھر اُدھر اتنی شاخیں پھیلی تھیں جیسے اُس کے کئی کمرے بن گئے ہوں۔ ہم سب نے جلدی سے اُن کا حکم مانا اور اپنے سب کُرتے اُتار دیے اور اُس جنڈ کے نیچے بچھا دیے۔ اب ہم سب ننگے ہو گئے۔ ڈاکوؤں نے اپنے گھوڑے اُن جنڈ کے درختوں کی شاخوں سے باندھ دیے اور اُس کے سائے میں بیٹھ گئے اور ہمیں کہا دیکھو تم میں سے ایک بچہ گاؤں جائے اور اُنھیں کہے۔ میلا ڈاکو یہاں لیٹا ہوا ہے۔ ہمارے لیے کھانا لے آؤ۔ باقی یہاں ہی رہو۔ ہم سب رونے لگے کہ ہم تو ننگے ہو گئے ہیں۔ مگر اُنھوں نے ہماری ایک بات نہیں سنی اور بولے دیکھو، اگر تم ہمارے لیے کھانا نہیں لاؤ گے تو ہم تمھاری بکریاں لے جائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ تم ابھی یہاں سے جاؤ اور ہمارے لیے کھانا لے آؤ۔ ہم تھکے ہوئے بھی ہیں اور بھوکے بھی ہیں۔ ہمارا ایک بندہ تاجا تمھارے ساتھ جائے گا۔ گھوڑے پر اِس کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میرا کُرتا اُنھوں نے مجھے واپس کر دیا۔ اب کیا ہوا میں تاجے کے پیچھے بیٹھ گیا اور ہم اپنے گاؤں کی طرف چل دیے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمارا گھر آ گیا۔ ہمارا گھر بہت بڑا تھا۔ گھر کی دیوار نہیں ہوتی تھی بلکہ گاؤں میں کسی کے گھر کی دیوار نہیں تھی۔ کیکر اور جنڈ کی لکڑیوں سے ہی احاطے کو گھیرا ہوتا تھا۔ ہم نے بھی اُسی احاطے کو گھیرا ہوا تھا اور درمیان میں ایک بڑا صحن تھا اُس میں بھی ایک بہت بڑا نیم کا درخت تھا۔ اِس کی چھاؤں پورے صحن کو گھیرتی تھی۔ صحن کے دائیں کونے پر دو بڑے بڑے کوٹھے تھے۔ لمبے اور چوڑے کوٹھے ہمارے لیے سونے کے کمرے بھی تھے، وہی کمرے سردیوں میں کچن کا کام بھی دیتے۔ اِن کے دائیں طرف دو بڑے کمرے مویشی باندھنے کے تھے۔ صحن میں ایک طرف بیری کے نیچے آٹا پینے کی چکّی تھی۔ اِس چکّی پر گندم، چنے، باجرہ اور کبھی

کبھی جَو پیس کر اُن کی روٹیاں بناتے تھے۔ میری دادی صبح اُٹھ کر سب سے پہلے چکّی پیستی اور بے بے یعنی میری والدہ دودھ میں مدھانی ڈال کر اُسے بلونے لگ جاتی تھی۔ آٹا پینے کا کام روز ہوتا تھا۔ ہاتھ سے پینے والی چکّی تھی اور اُس پر زیادہ سے زیادہ ایک وقت میں پانچ کلو پیس سکتے تھے۔ یہ پتھر کی چکّی بہت بھاری تھی۔ اِس کو گھمانے کے لیے بہت زور لگانا پڑتا تھا۔ اُن دِنوں عورتیں اِس لیے بھی زیادہ طاقت ور ہوتی تھیں کہ اُنھیں صبح اُٹھ کر چکّی پیسنا ہوتی تھی اور دودھ بلونا ہوتا تھا اور یہ دونوں کام کسی پہلوان کی ورزش سے کم نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عورت بچّہ پیدا کرتے ہوئے فوت نہیں ہوتی تھی۔ اُسے تکلیف اور درد سہنے کی عادت ہو جاتی تھی۔ مردوں کی نسبت عورتوں کا کام دگنا ہوتا تھا۔ میری دادی بیری کے نیچے بیٹھی چنوں میں سے چھج کے ساتھ بھوسا اُڑا کر الگ کر رہی تھی۔ اُس نے جونہی دیکھا ایک ہٹا کٹا آدمی میرے پوتے کو گھوڑے کی پشت پر لادے ہمارے گھر میں گھسا آتا ہے فوراً ڈنڈا پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے اِس حالت میں دیکھ کر بے بے بھی دوڑی آئی۔ گھر میں اُس وقت کوئی مرد نہیں تھا۔ یہ عام بات تھی کہ دن کے وقت مرد گھروں میں کم ہی رہتے تھے۔ اوّل کام کاج کے لیے کھیتوں میں ہوتے تھے، مال ڈنگر کو چارا ڈال رہے ہوتے تھے، یا پھر گاؤں کے تین چار چوک تھے۔ اُن چوکوں میں ٹولیاں بنا کر بیٹھے گپیں ہانکتے تھے اور حقہ پیتے تھے۔ اُنھیں فارغ بیٹھ کر حقہ پینے کا وقت تو کم ہی ملتا تھا کیونکہ چھ چھ ماہ گاہن پڑا رہتا تھا۔ وہ بیلوں کو جوت کر گہن میں دوڑاتے رہتے تھے اور بھوسے کو گندم یا چنوں سے الگ کرتے رہتے تھے۔ تب بھوسے سے غلّہ الگ کرنے والی مشینیں نہیں ہوتی تھیں۔ ایک کھلے میدان میں غلّہ اپنے بھوسے یا سوکھے پودوں سمیت پھینک دیتے تھے۔ اُس کے بعد اُن کو دھوپ لگنے کے لیے رکھا رہنے دیتے۔ اگر بیچ میں بارش ہو جاتی تو مزید دیر ہو جاتی اور بارشیں اکثر ہو جایا کرتی تھیں۔ اِس طرح چھ چھ ماہ غلّہ وہیں پڑا رہتا۔ جن بیلوں سے اُس کا گاہن کرتے تھے وہ بیل اُسی غلّے پر پیشاب بھی کرتے تھے اور گوبر بھی کرتے تھے۔ مگر اس چیز کو برکت میں شامل کیا جاتا تھا کیونکہ اس کے علاوہ چارا نہیں تھا۔ بعد میں اُنھیں کئی کئی دن دھونے اور سکھانے کا کام جاری رہتا۔

القصہ میری دادی ڈانگ اُٹھائے کھڑی تھی اور اِس سے پہلے کہ وہاں کوئی بلوہ ہو جاتا، اُس آدمی نے گھوڑے سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ مَیں نے خود چھلانگ لگا دی اور فوراً کہا، اماں خطرے کی بات نہیں ہے، یہ اچھے ڈاکو ہیں۔ اِنھیں روٹیاں چاہئیں، بھوکے ہیں۔ میرے اِس جملے سے شاید اُس تاجا ڈاکو کو اپنی اَنا مجروح ہوتے نظر آئی۔ اُس نے مجھے روک کر، خود بولنا شروع کر دیا اور بولا، بڑی بی بی جی، مَیں سجن ڈاکو کا ساتھی ہوں۔ ہم روہی کے جھاڑ میں اُترے ہیں اور جیسل پور جا رہے ہیں۔ ہمیں بھوک لگی ہے اور تھکے ہوئے بھی ہیں۔ بس ہمیں روٹیاں پکا دیں تاکہ اگلا سفر جاری رکھ سکیں۔ میری اماں نے یہ بات سن کر فوراً ڈنڈا ہاتھ سے نیچے رکھ دیا اور اُسے کہا وہاں منجی پر بیٹھ جائیں، ہم پکا دیتی ہیں۔ ہمارے گھر میں گڑ شکر بھی بہت تھا۔ اِتنے میں میری والدہ بھی قریب آ گئی۔ دادی بہت جہاندیدہ اور سلجھی ہوئی عورت تھی اور پورے گھر پر اُس کا رعب تھا۔ مجال ہے میرا ابا یا دادا اُس کے حکم سے باہر ہوتے۔ ہم پوتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اُس نے میری والدہ سے کہا، لا مجھے گندم نکال کے دے۔ اِن بے چارے مسافروں کو گندم کی روٹیاں پکا کے دوں۔ تُو چولہے پر دال چڑھا دے اور مَیں اتنے میں آٹا پیس دیتی ہوں۔ پھر ڈاکو کی طرف مخاطب کر کے بولی، بیٹے پُتر! چاہے تو یہیں بیٹھ جا اور روٹیاں لے کر چلے جانا، چاہے تو اپنے بیلیوں کو بھی یہیں لے آ۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے کھانے کو۔ مَیں تیرے ساتھ بھی باندھ دوں گی۔ اُس نے تھوڑی دیر اِدھر اُدھر دیکھا اتنے میں میرا دادا آ گیا۔ میرا دادا خوشی محمد بہت غصّے کا تیز تھا مگر جب دادی کو دیکھتا کہ وہ کسی کام میں دخل دے رہی ہے تو چُپکا ہو کر بیٹھ جاتا۔ اُس نے جب ایک پرائے آدمی کو اپنے گھر میں دیکھا تو حیران ہوا کہ یہ گھوڑی والا آدمی ہمارے گھر میں کون آ گیا۔ پہلے نہ کبھی دیکھا نہ بھالا۔ خیر سلام لے کر اُس کے پاس بیٹھ گیا اور بولا، بھائی پہلی دفعہ تجھے دیکھا ہے۔ آگے سے وہ بولا، میاں جی جب آیا ہی پہلی دفعہ ہوں تو پہلی دفعہ ہی دیکھو گے نا؟ یہ الفاظ سنتے ہی میرا دادا ایک دم بھڑک اُٹھا، لو بھئی نادر شاہ کے جوائی ہو جو اِس طرح بغیر کہے سنے یہاں آ گئے ہو۔ پھر اِس سے پہلے کہ میلا سجن کا ساتھی میرے دادا کے سر پر کرپان چلاتا، دادی فوراً بولی، خوشی علی کسی وقت تو سر نے کی آگ بجھا لیا کرو۔ میلا سجن کا ساتھی ہے۔ بے چارے بھوکے ہیں اور ہمارے پنڈ کے پوا ہے

اُترے ہیں۔ تُو زیادہ سیانا نہ بن۔ یہ کہہ کر دادی اماں چکّی پیسنے بیٹھ گئی اور دادا جی بڑبڑاتے رہ گئے۔ ہاں ہاں اِنھیں پیٹ بھر کے کھلا۔ گندم کھلا، گندم کی روٹیاں کھلا، جیسے تیرے براتی ہیں۔ تیرے نانکے لگتے ہیں نا اور ڈنگوری پکڑ کر باہر چلے گئے۔ دادی نے میری والدہ سے گندم کا چھابا پکڑا اور چکّی پیسنے بیٹھ گئی۔ اِک پہر کے تیسرے حصے میں روٹیاں اور سالن تیار ہو گیا۔ اماں نے ایک بڑے سے چھابے میں روٹیاں رکھ دیں اور ایک لکڑی کے کھانچے میں مٹّی کی سالن والی ہانڈی رکھ دی۔ مَیں نے وہ سب سامان پکڑا اور تاجے ڈاکو کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پھر ہم کچھ ہی دیر میں وہاں آ گئے جہاں اُنھیں چھوڑ کر گئے تھے۔ میلا سجن کے دو ساتھیوں نے ہم سے سارا سامان پکڑا اور جنڈ کے نیچے رکھ دیا۔ اِس کے بعد ہم دونوں بھی اُتر کر جنڈ کے سائے میں آ گئے۔ میلے ڈاکو نے ہم سب لڑکوں سے کہا میاں جاؤ اب تم کھیلو، ہم پیٹ سیوا کر لیں۔ وہ روٹی کھانے لگے اور ہم سب لڑکے بالے سہمے ہوئے دُور جا کر بیٹھ گئے۔ ہمیں خطرہ تھا جاتے ہوئے ہماری بکریاں بھی ہانک لے جائیں گے۔ وہ تھوڑی دیر میں سب کچھ چٹ کر کے گھوڑوں پر بیٹھے اور چل دیے۔ ہم نے اللہ کا شکر کیا کہ ڈاکوؤں سے جان چُھٹی۔ شام کے چوتھے پہر جب وہ چلے گئے تو ہم نے اپنی بکریاں ہانکیں اور گاؤں لوٹ آئے۔ اِدھر گاؤں میں پھڑتل مچ چکی تھی کہ جنڈ آلہ سے میلا ڈاکو گزرا ہے۔ اتنے میں عصر کا وقت آ گیا تھا۔ ہم نے بکریاں اپنے باڑوں میں ہانک دیں اور جنڈ آلے چوک میں آ گئے۔ یہ گاؤں کا سب سے بڑا اور کھلا چوک تھا۔ جنڈ کی شاخیں اور پتّے اتنے دُور تک پھیلے تھے کہ چوک کے ارد گرد میں موجود کچے مکانوں کی چھتوں تک چلے گئے تھے۔ ہم اکثر اِن شاخوں پر چڑھ کر لوگوں کے کوٹھوں پر جا چڑھتے تھے اور رات کو لُکن میٹی کھیلتے تھے۔ اب جو مَیں نے دیکھا، پورے گاؤں کے لوگ چوک میں جمع ہیں۔ میرا دادا خوشی خاں بھی یہیں تھا۔ مُنج کے بان کی چار پائیوں پر بیٹھے، میلا سجن کی آج کی کارروائی پر باتیں کر رہے تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ میرا دادا ایسے رُعب سے بولے جا رہا تھا جیسے اُس نے ڈاکوؤں کو پکڑ کر آزاد کیا ہو۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے میلا ڈاکو کو پکڑ کر گورنمنٹ بہادر کے سپرد کر دینا چاہیے تھا اور اُس کے عوض انعام وصول کرتے۔ کوئی اس بات پر لعن طعن کر رہا تھا اور گھر آئے مہمان کے ساتھ بندوں والا سلوک

کرنے کی بابت مثالیں دے رہا تھا۔ سچ بات یہ تھی اِس گاؤں والوں کی جرأت نہیں تھی میلا ڈاکو کو پکڑ کر انگریز بہادر کے حوالے کر سکتے مگر چوک میں بیٹھے ہوئے اُن کو ایسی باتیں کرنے سے کون روک سکتا تھا۔ مَیں اور دوسرے کئی لڑکے وہاں باتوں کا چسکا لینے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی واردات بتا رہا تھا جس میں کوئی نہ کوئی کسی مشہور ڈاکو سے مل چکا تھا یا اُسے اپنے گھر میں چھپا کر پولیس سے بچا چکا تھا۔ عشا کے وقت تک اِسی طرح سب لوگ کہانیاں سناتے رہے۔ اُس کے بعد سب اٹھ کر اپنے گھروں میں چلے گئے۔ عشا کی اذان کے بعد کسی کا جاگنا نحوست سمجھا جاتا تھا اور اِسی طرح صبح کی اذان کے بعد تک سوئے رہنا نحوست خیال کیا جاتا تھا۔ اگلے کئی دنوں تک اِسی طرح میلا سجن کا ذکر چلا کہ وہ ہمارے گاؤں سے گزرا تھا۔ کئی لوگوں نے بعد میں جھوٹ موٹ مختلف جگہوں پر اُس سے ملاقات کا افسانہ بھی سنایا تھا لیکن میری اُس کے بعد کبھی میلا سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ نہ وہ دوبارہ ہمارے گاؤں سے گزرا بلکہ جب ایک دفعہ ایک گاؤں سے گزر جاتا تھا پھر دوبارہ وہاں سے نہیں گزرتا تھا اور یہی اُس کے نہ پکڑے جانے کی وجہ تھی۔ یہاں تک کہ تین سال اِس وقت کو گزر گئے اور اُجاڑے کے دن آ گئے۔

ستلج پار کرنے کی کیفیت

کہتے ہیں جب ہم اپنے گاؤں سے نکلے تو تمام راستے لاشوں سے اَٹے پڑے تھے۔ لوٹ مار کرنے والے آدمی کی گردن ایسے اڑاتے تھے جیسے مکئی کا بھٹا کاٹ کے پھینک دو۔ جب گھر کو چھوڑا تھا تو کئی گڈّ، جینے مرنے کا سامان اور روپے پیسے ساتھ تھے۔ مگر ایک جگہ سارا سامان گورکھا فوج نے چھین لیا۔ ہم گڈّوں سے پیدل ہو گئے۔ حتیٰ کہ جسم سے کپڑے تک کھینچ لیے اور رائفلوں کی سنگینوں سے کچوکے دے کر آگے دھکیلا۔ اِس حالت میں بھی ہم نے جان بچنے کا شکر کیا اور اللہ کا نام لے کر چل دیے۔ تب ساون ایسا برس رہا تھا کہ تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ہم سب ننگ دھڑنگ تھے۔ مردوں کے لباس فقط دھوتیاں تھیں اور عورتوں کے جسم پر پھٹے کٹے کُرتے تھے۔ آٹا دانہ کچھ پاس نہیں تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے ہم دادا خوشی علی اور اپنے دوسرے رشتے داروں سے جُدا

ہوئے اور تین مہینے بعد حویلی لکھا میں جا کر ایک دوسرے سے ملے۔ بنگلا نہر پر ایک جگہ ہم گزر رہے تھے کہ کئی میل تک نہر کی پٹڑی پر عورتوں، مردوں اور بچّوں کی لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ ہمیں اُنھی لاشوں پر پاؤں رکھ کے چلنا پڑا۔ ایک وقت تھا جب مغرب کی طرف سے لال آندھی اُٹھتی تو سمجھا جاتا آج کوئی قتل ہوا ہے اور لوگ استغفار پڑھتے۔ ہم ایسے لوگ جنھوں نے کبھی لاش کا منہ نہ دیکھا تھا، اب لاشوں کی پٹڑی پر چل رہے تھے۔ اللہ جانے کن کے گناہوں کا صلہ تھا کہ ہم بے قصوروں کے حق میں لکھا گیا۔ جان ضیق میں آئی ہوئی تھی۔ بلوائیوں کے حملوں کی خبریں دل نکالتی تھیں۔ کبھی ایک جگہ قافلہ لٹنے کی خبر ملتی کبھی دوسری جگہ لیکن خُدا کا شکر کئی دن چلنے کے بعد ہیڈ پر پہنچ ہی گئے۔

یہاں جس طرف دیکھتے تھے بے طرح پھیلی ہوئی بے سمت خلقت کیڑوں مکوڑے کی صورت بکھری پڑی تھی۔ ہیضے پھوٹ پڑے تھے اور نمونیا چل رہا تھا، جس کے سبب روزانہ سو دو سو جنازہ اُٹھ رہا تھا۔ جو کرپانوں اور چھویوں سے بچ گئے تھے وہ یہاں مر رہے تھے۔ اب کون اِتنے جنازے پڑھتا اور کون دفن کرتا۔ پہلے پہل تو مروت میں لوگ گڑھے کھود کر مجموعی لاش بندی کرتے رہے مگر جب مرنے والوں کا لشکر ٹڈی دل کی طرح پھیل گیا تو لاشیں دریا میں پھینکنے لگے۔ سچ ہے چیزوں کی زیادتی اُن کی بے وقاری کا سبب بنتی ہے۔ چاہے لاشیں ہوں یا آلو ہوں۔ خُدا کی پناہ اس حالت میں بھی کچھ لوگ ہوس کے مارے تھے۔ بنگلا فاضلکا کے قریب کے گاؤں کے چار آدمی جن کا پیشہ پہلے بھی چوری چکاری تھا۔ بعد میں اِن کے سب بھائی بند اوکاڑہ کے اُسی گاؤں میں آ بیٹھے جہاں ہم آئے۔ اِن چاروں بھائیوں نے جب دیکھا کہ لوگ اپنا مال مویشی چھوڑ کے بھاگ رہے ہیں تو اِس موقع کو غنیمت جان کر اِنھوں نے لوگوں کی ڈھائی تین سو بھینس اپنے آگے لگا لی اور وہ ہانک کر پاکستان لانے لگے۔ اُس وقت دریا کا پاٹ دو میل تک چلا گیا تھا۔ مسلسل بارشوں اور ساون بھادوں کے دنوں کے سبب پانی بہت گہرا اور تیز تھا۔ قدرت خُدا کی جب یہ دریائے ستلج کے قریب پہنچے تو پیچھے سکھوں نے آن پکڑا۔ انھوں نے جلدی سے بھینسیں دریا میں ڈال دیں، دو بھائیوں نے خود بھی دریا میں چھلانگیں لگا دیں لیکن ایک بھائی دریا کے پانی سے ڈر گیا۔ سکھوں نے

نے تو وہیں برچھیوں میں پرو دیا۔ دریا میں کودنے والوں میں سے ایک دریا برد ہو گیا باقی دو بچ گئے۔ اللہ کا قانون دیکھیے ہمارے گاؤں میں آ کر بھی اُن کا پیشہ وہی چوری ہی رہا۔ ساری عمر غریب غربا کا مال ہی کھاتے رہے۔

خیر ایک دن ایک آدمی ہیڈ پر نمودار ہوا۔ یہی میلا سجن تھا۔ جب اُس نے خلقِ خدا کو یوں بے آسرا دیکھا تو بے اختیار رو دیا اور جرأت کر کے پہرے دار کے قریب ہو گیا۔ پہریداروں نے اُس پر بندوقیں تان لیں مگر یہ پیچھے نہ ہٹا اور بولا تم سے ایک بات کہنا ہر صورت واجب ہے، چاہے اُس کے بعد توپ کے منہ سے باندھ دینا۔ ہیڈ کو بند کیے بیٹھے ہو اور دونوں طرف کے لوگ مجھوں میں بدلے جاتے ہیں۔

اِس کے جمے ہوئے استقلال کو دیکھ کر پہریدار ذرا نرم ہوا اور کہا، جلدی سے اپنی بات کہو اور پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہ آگے ہوا اور جلد نجانے اُنھیں کیا کہا کہ ہیڈ کے گورکھا پہرے داروں کے چہرے بارونق ہو گئے۔ اُن سے رشوت پر معاملہ طے ہوا۔ فی آدمی ایک روپیا لے کر ہیڈ پار کرانے لگے۔ یوں بھیڑ چھٹنے لگی۔ دو تین دن بعد وہی پڑے رہ گئے جن کے پاس کچھ دینے کو نہ تھا۔ اُن میں وہ آدمی بھی تھا جس نے معاملہ طے کیا تھا۔ گورکھا پہرے دار نے اُسے کہا، آپ بھی ایک روپیا دو اور نکل جاؤ، وہ بولا میرے پاس روپیا نہیں ہے۔ گورکھا بولا، کوئی بات نہیں بغیر پیسے دیے گزر جاؤ۔ وہ کہنے لگا کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا مَیں اپنی آنکھیں ہیڈ پر چھوڑ کر یہاں سے اندھا نکل جاؤں؟ یہ بے سہارا خلقت کیا کہے گی؟ اپنے رسول اور خُدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ چنانچہ ہمارے ساتھ ہی ہیڈ پر بیٹھ گیا اور ہیڈ کو پار نہیں کیا۔ یہاں اِس کی ذات سے ایک فائدہ اور ہوا کہ لوگوں کے اندر سے بلوائیوں کا خوف کم ہو گیا۔ اُس نے سب کو دلاسا دیا اور کہا، یہاں آرام سے بیٹھو، جو بھی تم پر فسادی حملہ کرنے آئے گا اُسے دیکھ لوں گا۔ اُس کے بعد سب لوگوں کے پاس جو کچھ آٹا دانہ موجود تھا، اُسے اکٹھا کیا اور تمام خلقت میں تھوڑا تھوڑا تقسیم کرنے لگا۔ تاکہ کوئی بھوک سے نہ مرے۔ حتیٰ کہ ایک دن گورکھا سپاہیوں نے ہیڈ پر بیٹھے تمام لوگوں کی تلاشی لے کر اُنھیں بھی چھوڑ دیا کہ جاؤ اب اگلی زندگی پاکستان میں لنواؤ۔

ہم سب بہن بھائی اپنے والدین سمیت پنجاب تقسیم کرنے والوں کو گالیاں دیتے اور لعنتیں بھیجتے ہیڈ سلیمانکی پار کر گئے۔ ہیڈ پار کرنے کے بعد آگے پیچھے کوئی سہارا نہیں تھا۔ کچھ بھوک سے مر گئے تھے کچھ مر رہے تھے۔ بیماریاں پھیلی ہوئی تھیں، بارشیں مسلسل ہو رہی تھی۔ دریا چڑھے ہوئے تھے، چلنے کو راستے ناپید تھے۔ ساون کے دن پوہ ماگھ لگتے تھے۔ کھانے کو اور پہننے کو تنکا تک نہیں تھا۔

سوڈی والا میں پڑاؤ اور اماں زینب

یہاں سے ہم پچاس کوس چل کر سوڈی والا پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا قصبہ نما شہر تھا۔ جہاں ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ ریل یہاں سے حویلی لکھا اور پاکپتن کو جاتی تھی اور دوسرے طرف قصور اور لاہور کو نکلتی تھی لیکن اب نہ تو ریل کا کوئی انتظام تھا۔ نہ ریل آنے کا کوئی وقت تھا۔ ریل کی پٹڑی بارشوں کے پانی سے نہر کی طرح بہہ رہی تھی۔ اللہ جانے اتنی بارشیں نوح کے طوفان میں نہ ہوئی ہوں گی۔ لوگوں کے دل تک پانی میں ڈوب گئے تھے۔ دُور تک مہاجرین کا جم غفیر تھا، جنھیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہاں سے کس طرف کو منہ کریں۔ میاں جی کو معلوم تھا اُن کے ایک بھائی صدرالدین اپنے سُسرال میں لاہور چلے گئے ہوں گے۔ جان پہچان کے لیے وہی شہر بہتر تھا مگر اس میں ایک خرابی یہ تھی کہ اس وقت کم و بیش تمام مہاجرین کا رُخ اُسی شہر کی جانب تھا۔ اِس بات سے میاں جی گھبراتے تھے کہ اکیلا شہر اتنے لوگوں کا بوجھ کیسے سہارے گا۔ پھر یہ بھی کہ بارش دم لینے دے تو کچھ آگے سوچا جائے۔ سواری اور کھانے پینے کو ایک لقمہ تک پاس نہ تھا، نہ پیسے تھے۔ مقامی آبادی مہاجروں کو گدا گر سمجھ کر کچھ کھانے پینے کو دیتی تھی۔ اکثر مہاجر مقامی لوگوں سے خود گھر جا جا کر مانگنے لگے۔ ہم تین دن سے بھوکے پیاسے کسی معجزے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ کسی سے کچھ مانگنے کی جرأت نہ پڑتی تھی۔ بھوک میں نیند بھی نہ آتی تھی نیند آئے بھی تو سوئیں کہاں؟ بارش کے خیموں میں تو سونے سے رہے۔ ایک دن میری ماں نے میرے ابا سے کہا، اللہ دین، یہاں کچھ کام کرنے کو نہیں ہے، کب تک یوں چلے گا؟ تین دن سے بچوں نے ایک تنکا تک منہ میں نہیں

ڈالا۔ مجھے تو ڈر ہے خُدا نہ کرے کسی کو نمونیا ہو گیا تو کس حکیم کا منہ دیکھیں گے۔ خُدا کا واسطہ ہے کچھ کرو۔ بچوں کی آواز تو بند ہو چکی ہے کہیں سانس بھی نہ رُک جائے۔ تُو بھی کسی سے جا کر کچھ کھانے کو لے آ ورنہ بچے تو بھوک سے مر جائیں گے۔

میرے والد ایسے اُٹھے جیسے کوئی مُردہ اٹھتا ہے۔ پاؤں دو دو من کے بھاری ہو گئے تھے۔ رُکتے تھے اور چل پڑتے تھے۔ انتہائی بے دلی سے چند قدم چلے پھر ایک ہی دم بھاگ کر واپس آ گئے اور رو کر بولے، دیکھ فاطمہ، یہ ہمارے بال بچے اور ہم بھوک سے مرتے ہیں تو مر جائیں، جب خُدا کو ہی اِن کا خیال نہیں ہے تو مَیں کیا کروں؟ کیا مَیں بھی بھکاری بن جاؤں؟ کس منہ سے کسی کو جا کر کہوں گا، مجھے آٹا دانہ کھانے کو دو۔ خُدا کی قسم موت آ جائے گی مگر مانگ نہ سکوں گا۔

یہ کہہ کر وہ ایک دیوار کے ساتھ گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گئے۔ بارش اتنی زیادہ تھی کہ اب نہ کوئی دیوار نہ درخت اور نہ کوئی اور سہارا اُس سے بچا پا رہا تھا۔ ہم سب پالے سے سکڑے پڑے تھے گویا کوئی دیر میں جان نکل ہی جائے گی اور اِس دُنیا سے جان چھوٹے گی۔ کبھی اماں کہتی، گھر سے نہ نکلتے تو اچھا تھا، اگر قسمت میں موت لکھی تھی تو سکون سے اپنے وطن میں مرتے۔ اپنی مٹی میں تو دفن ہوتے۔

یہ سوڈی والے کی منڈی کا سٹیشن تھا لیکن اِس بارش میں تو یہاں ہُو کا عالم تھا۔ سب دُنیا ایسے خموش تھی جیسے اپنی موت کا انتظار کر رہے ہوں اور ہم یہاں قضا و قدر کا حکم دیکھنے کو بیٹھے تھے۔ سب سے پریشان حالت میری ماں کی تھی۔ مسلسل دعائیں مانگ رہی تھی۔ ایسی حالت میں جہاں زمین و آسمان کی ہر شے کو اپنی پڑی تھی، میری ماں بی بی فاطمہ کے صدقے دے کر دعائیں کرتی جاتی تھی کہ کائنات میں یہ اور اِن کے گھر والے واحد ہستیاں تھیں جو مدادا بنیں۔ میاں جی کو ابھی دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اِسی اثنا میں ایک بوڑھی خاتون بارش سے بھیگتی ہوئی ہمارے پاس آئی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر سیدھی ہماری طرف بڑھی جیسے ہمیں پہچان لیا ہو۔ اُس کے پاؤں میں ٹوٹی سی لکڑی کی جوتی تھی اور سر پر کھدر کی موٹی سی بوری نما چادر تھی۔ ایک سیپے کی بوری بارش سے بچنے کے لیے چھتری کی طرح سر پر رکھی ہوئی تھی۔ اُس کی عمر ساٹھ سال کے لگ

بھگ ہوگی۔ پاس آ کر کہنے لگی۔ آئے ہائے، کیسے بجڑے کے بچے بنے یہاں بھوک اور بارش سے مر رہے ہو۔ چلو اُٹھو میرے ساتھ یہاں سامنے والی گلی میں ہمارا گھر ہے۔ چلو، گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ روٹی پانی، آگ، منجی بستر ا۔ چلو اٹھو جلدی کرو۔ ہم تو گویا اُس کے منتظر تھے، سب اُٹھ کھڑے ہوئے، میرے چھوٹے بھائی نذیر علی کو اُس نے گود میں اٹھا لیا۔ رفیق، مَیں اور شریفاں پیدل تھے، ابا میاں ہم سب کے پیچھے چل رہے تھے۔ میری ماں ہمیں لیے ایسے اُس بوڑھی خاتون کے پیچھے چل رہی تھی جیسے جانتی ہو کہ بوڑھی عورت کو کسی نے ہمیں لینے کے لیے بھیجا تھا کہ جاؤ میرے مہمانوں کو لے کر آؤ۔ تھوڑی دیر چل کر اور مختلف گلیاں گزرنے کے بعد وہ عورت ہمیں ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے لے آئی۔ گھر کی دیواریں اور مکان کچے تھے۔ اُس کی ہیئت کو دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ عورت بالکل غریب سی خاتون ہے۔ گھر کے ایک پہلو میں چھوٹی سی پرچون سودے کی دُکان تھی جس کی کھڑکی گھر کے اندر کھلتی تھی۔ دُکان میں اُس اماں کا بیٹا بیٹھا ہوا تھا۔ یہ پچیس یا تیس سال کی عمر کا تھا۔ ایک چوڑا سا کُرتہ اور لنگی اُس کا لباس تھا، یہ بھی کھدر کا تھا۔ ہاتھ کی موٹی سلائی سے سیا ہوا۔ اُس کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ چہرے کا رنگ بھی گندمی سا تھا اور ہلکی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ دُکان کی پچھلی کھڑکی میں سے اپنے گھر میں داخل ہوا اور جلدی سے گھر کے مرکزی دروازے کا کُنڈا کھول دیا۔ بی بی ہمیں لیے گھر میں داخل ہو گئی۔ اُن کے دو کمرے تھے۔ ایک اتنے ہی سائز کا برآمدہ بھی تھا۔ صحن میں شریںہہ کا درخت تھا۔ یہ کچا گھر تھا لیکن اندر داخل ہوتے ہی ایسے احساس ہوا جیسے زندگی نے اپنی بانھوں میں بھر لیا ہو۔ بوڑھی اماں نے جلدی سے آگ جلائی۔ ہم سب اُس آگ کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ اُس نے گھر میں جتنے بھی نئے پُرانے کپڑے تھے نکال کر ہمیں دیے اور کہا اِنھیں پہن لو اور خود روٹیاں پکانے بیٹھ گئی۔ اُس کا بیٹا دُکان سے ٹانگر، پھلیاں، گڑ اور جو کچھ بھی تھا، ہمارے کھانے کے لیے نکال لایا۔ یہ دو ماں بیٹا ہی گھر میں تھے اور کوئی فرد ہمیں نظر نہیں آیا۔ گرم گرم روٹیاں پکا کر ہمارے آگے رکھنے لگی اور ہم کھانے لگے۔ ہم کھا رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھی، کھاؤ کھاؤ یہ اللہ کا مال ہے۔ آج مَیں گھر میں بیٹھی تھی کہ اچانک دل میں ہَول سا اُٹھا۔ مَیں بے سوچے باہر بھاگ اُٹھی، آگے سے تم

سامنے بیٹھے مل گئے۔ بس اب اس گھر کو اپنا سمجھو اور بے دھڑک کھاؤ پیو۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری جان بحال ہو گئی۔ تین چار دن کے بھوکے اور کتنے ہی دن کے ہم مسافر اور بے گھر جب اس چھت میں بیٹھے تو گویا دُنیا جہان کی نعمتیں مل گئیں۔

والد صاحب مجھے یہ قصہ سناتے ہوئے بہت روئے اور کہا، اللہ اُس مائی کو اگلے جہان کی ساری نعمتیں دے، پترا کبر اگر دُنیا کی ہوس نہ ہو تو سمجھ لے، دو وقت کی سوکھی روٹی اور ایک کچی پکی چھت ہی اصل زندگی کا سرمایہ ہے۔ باقی سب لالچ، ہوس اور ظُلم ہے۔ خیر ہم اس بوڑھی خاتون کے گھر میں چھ سات روز رہے۔ بارشیں لگی ہوئی تھیں۔ جب تک نہ رُکیں، اُس اماں نے ہمیں گھر سے نہ نکلنے دیا۔ چوتھے دن میاں گھر سے نکلے کہ زمانے کی خبر لیں۔ اماں کا بیٹا میاں جی کے ساتھ گیا۔ یہ دونوں وہاں سے منڈی ہیرا سنگھ پہنچے۔ یہاں اُنھیں پتا چلا، کہ ہندوؤں کی ایک ریل کٹی پڑی ہے اور ریل کی پٹری لاشوں سے اٹی ہوئی ہے۔ پندرہ سولہ سو عورتیں، بچے اور مرد، جتنے بھی اس ریل میں تھے، سب مار دیے گئے تھے۔ مگر حیرت کی بات تھی ریل کو کاٹنے والے لوگ مقامی نہیں تھے، کہیں تلواروں اور برچھیوں سے لیس جتھے آئے تھے۔ اُنھوں نے بے رحمی سے سب کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ پھر ان دونوں کے دیکھتے ہی دیکھتے میونسپلٹی کے ٹرک آ گئے۔ اللہ جانے یہ سب انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ اُنھوں نے لاشوں کو ٹرکوں میں بھرا اور لے گئے۔ اُسی لمحے پھر بارش آ گئی۔ اُس نے خون سب صاف کر دیا اور سٹیشن بالکل صاف ہو گیا۔ اِن کے پاس جو کچھ مال اسباب تھا وہ بھی میونسپلٹی اور جتھے لے گئے۔ اِس پورے عمل سے میاں جی کو اتنی وحشت ہوئی کہ سوڈی والے میں نہ رُکنے کا تہیہ کر لیا۔ اماں جی کے بیٹے سے کہا، بھائی ممکن ہو تو میرے ساتھ حویلی لکھا تک چلے چلیں، وہاں کوئی چھت ڈھونڈیں۔ تب وہ میاں جی کو لے کر حویلی لکھا گیا۔ وہاں ایک چھوٹے سے گاؤں میں اُنھیں ایک خالی مکان ملا۔ اِنھوں نے گاؤں کے ایک آدمی سے بات کی اور دوسرے ہی دن سوڈی والا واپس آ گئے۔ یہاں تین دن ہم مزید رہے۔ آخر حویلی لکھا کی طرف چل پڑے، اماں جی نے گھر کی کوئی شے ہم سے نہ چھپائی تھی۔ ہم یہاں ایسے رہے جیسے مدّتوں سے یہ گھر ہمارا ہی ہے اور رخصت کے وقت چاندی کے پانچ روپے بھی دیے۔

کہنے لگی بیٹا یہی میرے پاس نقدی تھی۔ دو تین روپے ہم نے رکھ لیے ہیں اور یہ تم رکھ لو۔ ان سے مہینا گزر جائے گا، اللہ تمھارا مالک ہے، وہ اور بھی دے گا۔

مَیں نے کئی بار یہ واقعہ اپنی دادی اماں فاطمہ سے بھی سنا، وہ اپنی ہر نماز میں بی بی فاطمہ کا واسطہ دے کر اُس کی مغفرت کی دعائیں کرتی تھی اور کہتی تھی بیٹا وہ بوڑھی عورت خود نہیں آئی تھی، مَیں نے دل ہی دل میں بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا کی جناب میں عرض کیا تھا کہ اے رسول زادی، اے کائنات کی ملکہ جب تُو ہے تو ہم بھیک کس سے مانگیں؟ دیکھ اب ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ جو کچھ کرنا ہے تُو نے ہی کرنا ہے۔ تیرے خاوند کی شاہی پوری کائنات میں ہے لاہمیں اپنی جناب سے کچھ دے ورنہ سوڈی والا میں ہی بیٹھے مر جائیں گے۔ بس یہ جملے کہے تھے کہ یہ بوڑھی عورت وہاں پہنچ گئی اور ہمیں لے جا کر روٹیاں کھلائیں۔ مَیں تو اُسی وقت سمجھ گئی تھی اِس نیک بی بی کا گھر ہی ایسا پاک اور رزق حلال کا ہوگا جس کا ہمیں مہمان کیا ہے۔

اُس اماں کا قصہ سناتے ہوئے میرا والد اکثر رو پڑتا ہے۔ کہتا ہے یہ ایک معجزہ مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ اماں ایک فرشتہ تھی۔ مجھے سب کچھ بھول سکتا ہے مگر وہ بوڑھی اماں نہیں بھول سکتی۔

خیر والد صاحب سب بہن بھائیوں میں بڑے ہیں اور حیات ہیں، خُدا زندگی دے، سو سال سے اُوپر جائیں گے۔ سوڈی والا سے منڈی احمد آباد پہنچے وہاں سے حویلی لکھا آئے۔ حویلی لکھا میں چھ سات برس گزارے۔ یہاں دادا کے والد میاں خوشی علی اپنے دو بیٹوں صدیق اور اسحاق اور ایک بیٹی آمنہ کے ساتھ اُن سے آملے۔ یہیں بعد میں اُن سے محمد شفیع بھی اپنے بیلوں سمیت آن ملا۔ اسحاق کے کرتوت اچھے نہ تھے۔ یہاں اُس نے ایک بندہ مار دیا اور جن کا بندہ مارا، سارا گاؤں اُنھی کا تھا۔ تب یہ یہاں سے نکلے۔ پہلے لاہور گئے جہاں صدرالدین کے سسرال تھے۔ وہاں سے اوکاڑہ آ گئے۔ باقی دو بھائی شفیع محمد اور فضل دوسرے علاقوں کی طرف منہ کر گئے۔ صدر الدین اور اُن کی بیوی اماں حلیمہ اپنی زندگی کے آخر تک ہمارے ساتھ ہی گھر میں رہے۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ یہی صدر الدین ہیں جن سے مَیں نے تقسیم اور فساد کے

واقعات کی اکثر روایتیں سنیں۔ یہ قائداعظم اور پوری مسلم لیگ کے خلاف تھے۔اُن کے معاملے میں ایسی بری زبان بولتے تھے کہ کسی نے نہ سنی اور نہ بولی۔

محمد شفیع کی جنڈآلہ واپسی کا عجیب واقعہ

یہاں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے جو شفیع محمد کے ساتھ پیش آیا۔فساد کے دَوران جب یہ لوگ اپنے گھروں سے نکلے اور چالیس کوس طے کر لیا تو بابا خوشی محمد کو یاد آیا کہ اُن کی ایک بیلوں کی جوڑی حویلی کے ایک ایسے حصے میں بندھی ہوئی ہے جہاں کسی کی نظر نہیں جا سکے گی۔ وہ بے چارے وہیں بندھے بندھے مرجائیں گے۔اب میاں خوشی علی نے اُسے حکم دیا کہ جا کر بیلوں کی رسیاں کھول دے تاکہ جدھر منہ آئے نکل جائیں۔ سب کو ہول سا اٹھا کہ شفیع کا واپس جانا ٹھیک نہیں ہے لیکن میاں جی کی ضد ٹوٹ نہیں سکتی تھی۔ کہنے لگے، ہم اپنی جان بچانے کے لیے سیکڑوں کوس چل رہے ہیں۔کیا اُن کی جان لکڑ پتھر ہے؟ وہ بے زبان وہیں بھوکے پیاسے اپنے مالکوں کو یاد کرکر کے مرجائیں گے اور یہ ایسا ظلم ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہوگی۔میاں خوشی نے بیٹے شفیع کو حکم دیا کہ واپس جا کر بیلوں کی رسیاں کھول دے۔ اِس قضا پر سارے کنبے میں کہرام مچ گیا کہ اب شفیع ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گیا۔ اِسے تو راستے میں شر نار تھی کاٹ ہی دیں گے۔ لیجیے وہ امام ضامن باندھے رخصت ہوا اور واپس جنڈآلے چل دیا۔کھیتوں کھلیانوں اور اندھیروں میں سفر کرتے ہوئے جب حویلی میں پہنچا تو صبح ہو چکی تھی اور بیلوں کی جوڑی اپنی جگہ کھڑی زمانے کی نیرنگی کو دیکھ رہی تھی۔ بیلوں کی حالت بھوک اور پیاس سے مردہ ڈھانچوں کی سی ہو گئی تھی۔اُنھیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بیٹھے بٹھائے انسانوں پر کیا بیت گئی ہے؟ اپنے گھروں سے نکل کر میدانوں میں جا پڑے ہیں۔ شفیع نے دونوں بیلوں کی رسیوں کو کھولا لیکن وہ بیل شفیع کا منہ دیکھنے لگے اور اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ شفیع محمد نے گھر کے نلکے سے پانی لے کر سامنے رکھا اور گھر میں جو دانے اور چنے جو وغیرہ تھے، جنھیں ساتھ نہ لے جا سکتے تھے، وہ نکال کر اُن کے آگے رکھے تاکہ کھالیں۔ بیل پانی پی کر جو، باجرہ وغیرہ کھانے لگے۔

اِسی طرح اُنھیں حویلی میں شام ہوگئی۔ شام کے اندھیرے میں یہ گھر سے نکلے۔ اُن کے ساتھ بیل بھی چل پڑے۔ شفیع نے سوچا مَیں اِن بیلوں کو مائی جیوناں کے گھر چھوڑ دیتا ہوں تا کہ وہ اُنھیں رکھ لیں۔ یہ وہی مائی جیوناں تھی جو میاں خوشی علی سے جوار کا بیج لینے آئی تھی۔ گاؤں میں ہر طرف سناٹا تھا۔ شفیع کو بھوک لگی ہوئی تھی، اُس نے سوچا، مائی جیوناں کے گھر سے کھانا مل جائے گا، وہ کھا کر اور بیل اُن کے حوالے کر کے رات کے سناٹے میں نکل جاؤں گا۔ مگر جیسے ہی اُن کے گھر کے قریب پہنچا، ایک ڈرا دینے والی خموشی اور ہولنا کی نے اُس کے قدم روک دیے۔ گھر خالی پڑا تھا۔ کوئی آواز اور کوئی روح تک نہیں تھی۔ شفیع ڈرتے ڈرتے صحن میں داخل ہوا تو آگے مائی جیوناں، اُس کے دو بیٹوں اور دونوں بہوؤں کی لاشیں کٹی پڑی تھیں۔ شفیع ایک دم ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ بیل بھی ڈر گئے تھے۔ گھر ویسے کا ویسا خالی پڑا تھا۔

محمد شفیع جلدی سے وہاں سے نکلا اور گاؤں کے باہر کی سڑک پر چلنے لگا۔ دونوں بیل بھی اُس کے پیچھے چلنے لگے۔ بارش برسنے لگی تھی، اُسی بارش میں یہ تمام رات چلتے رہے۔ ایک جگہ باجرے کا بڑا سا کھیت نظر آیا۔ شفیع نے بیلوں کو تھوڑی دیر کے لیے باجرے کے کھیت میں چھوڑ دیا اور خود بھی باجرے کے سٹے توڑ توڑ کے کھانے لگا تا کہ بھوک کم ہو جائے۔ تھوڑی دیر میں دن چڑھ آیا۔ تب یہ اپنے بیلوں سمیت باجرے کے کھیت میں ہی چھپ گیا اور سارا دن وہیں بیٹھا رہا تا کہ اندھیرا ہو جائے اور دوبارہ سفر شروع کیا جائے۔

شام کو باہر نکلا اور چلنے لگا۔ یہ شفیع کو تیسرا دن چڑھ گیا تھا۔ اُس نے سوچا اب جو بھی ہو سفر جاری رکھنا ہے۔ حتیٰ کہ راستے میں اُسے ایک جگہ کچھ سکھ سردار آتے دکھائی دیے۔ اُن کے ہاتھوں میں تلواریں اور کرپانیں تھیں لیکن دیکھنے سے لگ رہا تھا کہ اُن کی حالت اچھی نہیں ہے۔ لباس پھٹے ہوئے تھے، جوڑے کھلے ہوئے تھے۔ پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ نہ اُن کے پاس سواریاں تھیں۔ پیدل تھے اور تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پھر بھی اُن کے ہاتھ میں ننگی تلواریں دیکھ کر ڈر گیا اور سکڑ اور سہم کر ایک طرف ہو گیا۔ بیل بھی اُن کی طرف دیکھ کر خموش کھڑے ہو گئے۔ سکھوں نے جونہی اسے سہمے ہوئے دیکھا تو ایک سکھ جلدی سے آگے بڑھا اور کاندھے پر

ہاتھ رکھ کر روتے ہوئے بولا، اوئے کاکا، ساڈے کولوں نہ ڈر، اسیں تاں پہلے لٹے پٹے مسافر آں، لائل پوروں چلے ساں تے ڈیڑھ سو بندے ساں، ہُن تیرے سامنے پنج ست کھڑے آں۔ جا گرو جی دی رکھ ہووے۔ یعنی اے لڑکے ہم سے مت ڈر، ہم تو پہلے ہی لٹے ہوئے مسافر ہیں۔ جب لائل پور سے چلے تھے تو ڈیڑھ سو افراد تھے اور اب تمھارے سامنے پانچ سات لوگ زندہ بچے ہوئے کھڑے ہیں، باقی مارے گئے ہیں۔ جاؤ گرو جی آپ کو سلامت رکھے۔

چنانچہ وہ چلتا رہا اور بیل اُس کے پیچھے چلتے رہے لیکن یہ سفر سیدھے رستے کا نہیں تھا۔ کھیتوں، کھلیانوں اور بیابان راہوں کا تھا تا کہ جتنا ممکن ہو سکے لوٹ مار کرنے والوں سے محفوظ رہ سکے۔ یوں ایک دن کی راہ کئی دنوں تک پھیل گئی۔ ایک جگہ دو سے تین دن تک ریت کے ٹیلوں میں بسر کیے۔ آخر کار خُدا کے کرم سے صحیح سلامت ہیڈ پر پہنچ گیا۔ اتنے عرصے میں اُس کے عزیز یعنی ماں باپ، خوشی علی اور دیگر سب بھائی آگے جا چکے تھے۔ یوں یہ اُن سے بچھڑ گیا مگر ہیڈ پار کر کے پاکستان آ گیا اور ایک سال بعد جا کر بیلوں سمیت حویلی لکھا میں ملا۔ قدرت کے کام دیکھو وہ بیل اُسی طرح اُس کے ساتھ تھے۔ یہی واحد بیلوں کی جوڑی تھی جو فیروز پور سے ہمارے خاندان تک پاکستان پہنچی اور اُس وقت بِک گئی جب اسحاق نے حویلی لکھا میں ایک بندہ لڑھکا دیا۔

والد صاحب کی کٹھن راہیں

والد صاحب کے باب میں اور بھی بہت سے واقعات تقسیم کے گاہے گاہے آتے رہیں گے۔ قصہ مختصر اِن کے والد یعنی میرے دادا اللہ دین 1955ء میں حویلی لکھا چھوڑ کر اوکاڑہ کے موجودہ گاؤں میں آ گئے اور آتے ہی اُن کو دو تین سال بعد گنٹھیا بیماری نے آ لیا جس کا ذکر دادا کے باب میں ہو چکا ہے۔ اب وہ چار پائی پر ہو گئے اور والد صاحب جو گھر میں سب سے بڑے تھے، گھر کا تمام وبال اِنہی کے کاندھوں پہ آ پڑا۔ یہ محنت مزدُوری کرنے لگے۔ شروع میں ایک دُکان ڈالی لیکن وہ نہ چلی پھر مزدُوری کرتے رہے مگر حالات نہایت سخت تھے۔ مزدُوری اوّل تو اتنی اُن دنوں ہوتی نہیں تھی، اگر کبھی مل گئی تو معاوضہ بہت کم تھا۔ کئی روز فاقے میں نکلتے تھے۔ بابا

صدرالدین لاہور میں رہنے لگا۔ دادا کے دوسرے بھائی اِدھر اُدھر شہروں میں نکل گئے۔ میرا والد اور اُن سے چھوٹا رفیق دن رات سخت محنت کرتے تھے۔ دوسری طرف دادا کا علاج چل رہا تھا، جو کچھ کماتے اُن کے علاج میں صرف ہو جاتا۔ آخر والد صاحب ایک دن افلاس سے تنگ آ کر گھر سے نکل گئے اور بغیر بتائے لاہور چلے آئے۔ یہاں وہ صدرالدین کے سسرال کے ہاں گئے تاکہ اُنھیں کسی کام پر لگا دیں۔ اِن میں سے کسی آدمی نے اُنھیں ایک برف خانے میں دیہاڑی پر لگا دیا۔ چنانچہ کام کرنے لگے۔ برف خانے میں ہی سوتے تھے۔

اُدھر گھر والوں میں کہرام مچ گیا۔ میری دادی رو رو کر ایک قسم کی اندھی ہو گئی۔ حالات اِس طرح کے تھے کہ نہ خط پتر چلتا تھا، نہ پتا چلانے کا دوسرا سہارا تھا۔ پیروں فقیروں سے کشف و کرامات کرائی گئیں، دعائیں اور منتیں مانی گئیں۔ ارد گرد کے تمام علاقوں اور جاننے والوں سے پوچھ گچھ کی گئی مگر کچھ پتا نہ چلا کہ بشیر کدھر گیا ہے۔ معذور باپ چار پائی پر بیٹھا بالکل خموش اندر ہی اندر گھلنے لگا۔ بجھے دل سے اپنی بیوی کو بھی دلاسے دیتا تھا۔ اِدھر دادی اماں غموں کی ماری چھوٹے بیٹے کو ساتھ لے کر پہلے دس میل پیدل طے کر کے شہر جاتی۔ منڈی سے چھوٹا موٹا سودا سلف لاتی اور گاؤں میں بیچ دیتی۔ جو ایک آدھ روپیا منافع ہوتا، اُسی سے روٹی پکتی۔ یہ خشک روٹی سبز مرچوں اور ساگ وغیرہ سے کھا کر شکر خُدا کا کرتے۔ مگر دُکھوں کی ماری اماں دادی کو روٹی روزی سے زیادہ اب بیٹے کی فکر کھاتی تھی۔ میرے والد کو جب ڈھائی ماہ ہو گئے تو ایک دن گھر کو چل دیے۔ تب اُن کی جیب میں 29 روپے تھے۔ یہ اُس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ والد صاحب بتاتے ہیں اصل رقم تو دن رات کام کر کے پچاس روپے کمائی تھی مگر ظالموں نے باقی سب روٹی میں کاٹ لیے اور 30 روپے مجھے دیے۔ جن میں سے ایک روپیا کرایہ دے کر باقی جیب میں رکھے اور گھر کو چل نکلا۔ اوکاڑہ شہر میں جب پہنچا تو سہ پہر کے تین بجے ہوئے تھے۔ شہر سے ہمارا گاؤں دس کلومیٹر تھا۔ پیدل دو گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ پانچ بجے گاؤں کے مضاف میں پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر ایسے لگا جیسے کئی صدیاں گزار کر لوٹا ہوں اور اب کوئی پہچان والا ملے گا ہی نہیں۔ رات ہونے تک گاؤں سے باہر ہی بیٹھا رہا۔ یہ سردیوں کی راتیں تھیں مگر اپنے گاؤں کا قریب دل کی گرمی بڑھائے ہوئے تھا۔ جب

رات کے بارہ بجے تو گاؤں میں داخل ہوا اور گھر کی جانب چل دیا۔

دُھند کی رات تھی، ہاتھ کو ہاتھ نہ دِکھتا تھا۔ اُن دِنوں مفلس گھروں کی چار دیواریاں ہو جائیں تو غنیمت تھی دروازے لگانے کی رقم کسے نصیب تھی۔ ویسے بھی گھر میں تھا کیا جسے کوئی غارت کرتا۔ عام طور پر سیبے کی بوریاں دروازے پر لگا کر پردہ کر لیا جاتا تھا۔ وہ ہم نے بھی کر لیا تھا۔ مَیں نے آہستہ سے بوری کا پردہ ایک طرف ہٹایا اور دبی چاپ کے ساتھ سے اندر داخل ہو گیا۔ اندھیری رات میں مجھے گمان تھا کہ کوئی نہیں دیکھے گا اور آہستہ سے جا کر پاتھیوں کی کوٹھڑی میں رات گزار لوں گا، صبح گھر والوں کو خبر ہو گی۔ مگر جیسے ہی مَیں نے گھر میں قدم رکھا میرے والد کی آواز گونجی، بشیر ہے؟ مَیں نے تڑپ کر کہا، جی میاں جی مَیں بشیر ہوں اور ایک دم بھاگ کر اپنے باپ کی چار پائی پر گر پڑا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرا باپ میرے جانے کے بعد کبھی نہیں سویا تھا۔ ہم دونوں دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ میرا سر میاں جی کے سینے پر تھا۔ رونے کی آواز سن کر میری ماں بھاگی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی اُس کے بعد تو سارا گھر جمع ہو گیا۔ مجھے اُس دن اپنی والدہ کا چہرہ اچانک اتنا بوڑھا لگا جیسے اُس کی عمر صدیوں کے برابر ہو گئی ہو۔ وہ اتنے قلیل وقت میں اچانک اتنی بوڑھی ہو گئی تھی۔ مَیں نے اپنی ماں کو بھینچ لیا اور چھوٹے بچوں کی طرح رونے لگا۔ وہ میرے سر پر مسلسل ہاتھ پھیرتی رہی اور مجھے اپنی بپتا سناتی رہی۔ میرے چھوٹے بھائی بھی مجھے لپٹ گئے۔ ایک غربت، افلاس اور غموں کے مارے گھر میں رات کے اِس وقت اگرچہ خوشی کے آنسو تھے مگر اِن میں زمانوں کا دُکھ، ہجرتوں کا دُکھ، بیتے سمے کی خوش حالی کا دُکھ، تمام دکھ جمع ہو چکے تھے۔

والد صاحب کہتے ہیں اگلے دن اِن مختصر پیسوں سے ہم نے اُس دُکان میں مزید چیزیں رکھ لیں لیکن دُکان اتنی چلتی نہ تھی کیونکہ ایک تو گاؤں میں دوسری بھی دُکانیں تھیں، پھر زمانہ ایسا تھا کہ لوگوں کی خریداری کرنے کی طاقت زیادہ نہ تھی چنانچہ گاؤں گاؤں پھیری لگا کر سبزی بیچنے نکل جانے لگا۔ اِس میں یہ ہوا کہ روزانہ کی ایک روپے کی بچت ہو جاتی۔ یہ اُس دَور کی بہترین کمائی تھی اور گھر کا نظام چلنے لگا۔ میاں جی کو اُن دِنوں چائے کا چسکا تھا۔ اُن کی چائے پوری ہونے لگی۔

دریائے بیاس میں سیلاب

1958ء کا زمانہ تھا۔ حالات قدرے بہتر چل رہے تھے۔ ہندوستان سے جتنے لوگ پاکستان آئے تھے، بالخصوص ہمارے گاؤں میں، اُنھوں نے کم از کم اپنی ایک وقت کی روٹی کا بندوبست کر لیا تھا۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا کہ کوئی شخص بھوک پیاس سے مرتا۔ عین اُسی وقت ایک اور مصیبت سر پر ٹوٹ پڑی۔ دریائے بیاس میں سیلاب آ گیا۔ یہ دریا نامعلوم وقت سے سوکھا پڑا تھا اور اس کا پانی دریائے ستلج میں جذب ہو گیا تھا۔ دریا کے پاٹ میں جڑی بوٹیاں، عک کے پودے اور ون کریر اُگ چکے تھے، جہاں چرواہے بکریاں چراتے تھے۔ کسی کے خواب میں بھی نہیں تھا کہ بیٹھے بیٹھے اِس میں پانی کا ریلا آ جائے گا۔ اچانک دریا میں پانی آ گیا اور اتنا زیادہ آیا کہ دریا کا پاٹ تین میل چوڑائی میں پھیل گیا۔ کئی گاؤں ڈوب گئے۔ لوگوں کا مال مویشی بہہ گیا۔ مکانوں کی چھتیں دریا لپیٹ کر لے گیا اور کوئی شے نہ بچی جسے دریا نے چھوڑا ہو۔ ہمارا چک یعنی 32 ٹو ایل تو عین دریا کے کنارے پر تھا۔ وہ سب سے پہلے لپیٹ میں آیا۔ لوگ جو کچھ سنبھال سکے وہ سنبھال لیا اور جلدی میں گاؤں سے نکل لیے۔ گاؤں سے پانچ کلومیٹر مغربی طرف کچھ بلند ٹیلے تھے۔ یہاں پیر جتی شاہ کا مقبرہ تھا۔ یہ ٹیلے بہت دُور تک پھیلے ہوئے تھے اور دریا کی پہنچ سے بہت دُور تھے۔ اردگرد کے دسیوں گاؤں یہاں جمع ہو گئے اور پیر جتی شاہ کے اردگرد گویا ایک شہر بس گیا۔ ہم یعنی میرے والد اور چچاؤں نے بھی اپنا سب کچھ سمیٹا اور یہیں آ بیٹھے۔ دریا کا پانی ہمارے گاؤں کے کوٹھوں سے اوپر نکل گیا تھا۔ دو مہینے بعد پانی گاؤں سے نکلا اور لوگ اپنے اپنے گاؤں واپس پہنچنے لگے۔

والد صاحب کہتے ہیں، ہم بھی لوٹ آئے مگر ہر شے تہس نہس ہو چکی تھی۔ چنانچہ دن رات محنت کر کے نئے سرے سے کچے مکان کھڑے کیے۔ بس یوں سمجھ لیں زندگی مسلسل سفر کے اونٹ پر تھی جس کا پڑاؤ ٹھانہ کوئی منزل تھی۔ پھر بھی دو سال تک مسلسل جدوجہد کے بعد دو تین کوٹھے بنا ہی لیے۔ اس عرصے میں رفیق نے اتنی محنت اور کام کیا کہ کسی دیو کے بس میں نہیں تھا۔ اِن دو سالوں میں اُس نے مال مویشی بھی پیدا کر لیا اور معیشت کا سامان چل نکلا۔

چاچا رفیق فرشتہ

والد صاحب کہتے ہیں مجھ سے چھوٹا رفیق ماشااللہ دِنوں میں اتنا جوان ہو گیا کہ وہ چھ فٹ دو انچ قد نکال لایا اور اُس کے جسم میں طاقت اتنی پیدا ہو گئی کہ اچھے خاصے بیل کو مکا مار کر بٹھا دیتا تھا۔ اِس حالت کو دیکھ کر لوگ اُسے فرشتہ کہنے لگے۔ ہمارے مویشی بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ تین سال کے بیچ بیچ چار بھینسیں ہو گئیں جن کا چارا وہ اکیلا ہی پورا کرتا تھا۔ ایک ہی گٹھڑی میں تین چار من چارا باندھ کر اکیلا ہی سر پر اٹھا لیتا تھا۔ نہایت کریم النفس تھا، گاؤں میں ہر کسی کے کام آتا لیکن کسی کا مذاق یا اپنی توہین برداشت نہیں کرتا تھا۔ اِس بات کے کئی واقعات ہیں۔ ایک دو واقعے آپ بھی سن لیں۔

ایک دن ایک چونبے (گڑ بنانے والی بھٹی) پر بیٹھا کڑاہے میں پڑی ہوئی گڑ کی پت میں چھاننی مار رہا تھا۔ زمینداری سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ یہ گڑ بننے کے قریب شیرہ جسے تیار پت کہتے ہیں کتنی گرم ہوتی ہے۔ چاچا رفیق اُس میں چھاننی مار کر اُسے پھینٹ رہا تھا۔ اُدھر ایک آدمی سجاول اُسے مذاق سے کڈھن (چونبے میں آگ کے لیے ایندھن ڈالنے والی لکڑی) کبھی دائیں پہلو میں گھسا دیتا، کبھی بائیں پہلو میں۔ چاچا رفیق اُسے بار بار منع کر رہا تھا لیکن وہ باز نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایک ہی دم اِسے غصّہ آ گیا۔ اِس نے وہی پت میں لتھڑی ہوئی گرم ترین چھاننی سجاول کے منہ پر دے ماری۔ وہ منہ کے بل گر گیا اور منہ سارا جل گیا۔ پاس بیٹھے لوگ سب سہم گئے اور اُسے اُٹھا کر جلدی ہسپتال لے گئے لیکن سجاول کے رشتے دار، جو تعداد میں بہت تھے اور گاؤں میں ایک طرح سے اپنی طاقت بھی دکھاتے رہتے تھے، چاچے رفیق کے قریب بھی نہیں پھٹکے، اُلٹا اُس کی خوشامد کرنے لگے۔

گاؤں میں چاچے رفیق کا ایک ہی دوست تھا۔ اِس کا نام عاقل تھا۔ یہ بنیادی طور پر سکھ مزاج آدمی تھا۔ خود بھی بہت جوان اور جسمانی طور پر طاقت ور تھا۔ اِسے مَیں نے خود دیکھا ہے۔ آخری عمر تک بہت کھڑکے کا آدمی رہا۔ گاؤں کے عین پہلو میں اِس کی زمین تھی جہاں جامنوں اور مالٹوں کا باغ بھی لگایا۔ ایک رہٹ بھی اِس کا تھا۔ اِس کا نہ کوئی بیٹا تھا، نہ بیٹی۔ ایک بھتیجا تھا، بعد

میں تمام زمین اُسی بد بخت کے حصے میں آئی۔ عاقل کے مرنے کے بعد اُس بد بخت نے تمام باغ کاٹ دیا۔ اب وہاں اُجاڑ پڑی ہے۔

الغرض چاچا رفیق اور یہ عاقل آپس میں دوستی دشمنی کا سوانگ بجاتے رہتے تھے جنھیں مَیں نے عاقل خاں اور اپنے والد کی زبانی درج ذیل طریقے سے قلم بند کیا ہے۔ اِس قصے کا نام ''کَت'' افسانے کے نام سے رکھا ہے۔ یہ اِن کا حقیقی روپ تھا۔ ذرا پڑھیے، بہت لطف آئے گا۔

قصہ رفیق فرشتہ اور عاقل خاں کا

رفیق چھ فٹ دو انچ قد اور چوڑی چھاتی کے ساتھ چھ بھینسوں کا مالک تھا۔ ڈانگ لکڑ ہاتھ میں لے کر نہ چلتا لیکن سامنے شیر بھی آ جاتا تو فوراً ٹکرا جاتا۔ آنکھیں موٹی اور سُرخ انگارہ تھیں مگر کم لوگوں کے ساتھ اُس کا دنگا ہوا۔ ایک عیب اُس میں ضرور تھا۔ بعض اوقات جب اُس کا اپنا چارا ختم ہو جاتا، لوگوں کے کھیتوں سے چارا کاٹ کر لے جاتا۔ عاقل خاں اُس کا ایک ہی دوست تھا جس کے ساتھ اِس کا بیٹھنا اُٹھنا تھا۔ جُثے اور قد کاٹھ میں عاقل خاں رفیق سے بھی نکلتا تھا۔ عاقل کے ہاتھ میں ہر وقت پانچ فٹ لمبی ڈانگ ہوتی۔ جسے زمین پر کھڑ کھڑ بجاتا ہوا جاتا۔ بختو نام کی ایک کتیا ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتی۔ کتیا اتنی خطرناک اور کاٹنے والی تھی کہ دیو بھی اُس کے نزدیک آنے سے ڈرتا۔ بختو ایک قسم کی اُس کی روح تھی۔ رفیق کی نسبت عاقل خاں عقل کا موٹا اور ہاتھ کا تیز تھا۔ ذرا سی بات پر سامنے والے کو جھانپڑ لگا دیتا اور مار پیٹ کے بعد معافی مانگ لیتا۔ یہ بھی ایک طرح سے لوگوں کی انا کو مجروح ہونے سے بچانا تھا۔ عاقل خاں رفیق کی طرح چوری تو نہ کرتا لیکن گاؤں میں ہاہاکار مچائے رکھتا۔ کمزوروں کی خدمت کا ایسا لپکا تھا کہ جو پہلے شکایت لے کر آ گیا، اُسی کے ساتھ ہو لیتا، پھر دُنیا کی کوئی دلیل اُس کے سامنے مخالف کا حق پر ہونا ثابت نہ کر سکتی۔ اپنی خوشامد سن کر پھول جاتا اور کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا۔ اکثر لوگ شغل میں ہی اُس کے ہاتھ سے ایک دوسرے کی دھلائی کرا دیتے۔ جس گدھے پر چارا ڈھوتا، بعض اوقات اُسی سے زور آزمائی شروع کر دیتا۔ گدھا تو گدھا ہوتا ہے، کبھی اَڑ پھنس کی، یہ اُسے چت کرنے کے لیے کُشتی شروع کر دیتا۔

پھر آدھے گھنٹے بعد دونوں ہانپ کانپ کر گر جاتے۔

کچھ دن سے یار لوگ عاقل خاں کو رفیق سے بھڑ جانے پر اُکسا رہے تھے اور ایسی ترکیب کی تلاش میں تھے کہ دونوں کا جوڑ پڑ جائے۔ ایک دن عاقل خاں اپنی بختو کی زنجیر پکڑے مسجد کے بڑے کنویں کی منڈیر پر بیٹھا تھا کہ کچھ خوشامدیوں نے گھیر لیا اور اُس پر پھبکیاں چڑھانے لگے۔

حبیب جٹ بولا، میاں شیرے تمھاری کیا بات ہے۔ چاہو تو ہاتھی کی سونڈ پکڑ کر گاؤں کے چوک میں کھڑے پیپل سے باندھ دو اور شیر تمھارے سامنے کتّے کا پلاّ ہے۔ گینڈے اور سانڈ تک تمھاری پھونک سے اُڑ جائیں۔ پھر دوسرے لوگوں کی طرف منہ کر کے، بھئی تمھیں عاقل کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ مَیں نے ایک دن اپنی ان شیشے جیسی آنکھوں سے دیکھا، شیرے نے ہل جوتا ہوا تھا۔ دوپہر سر پر تھی۔ گرمی کی وجہ سے پسینے کی نہریں جاری تھیں۔ شیرا ہل کی اَرلی پکڑے ساڑیں لگا رہا تھا۔ ایک جگہ شیرے کا بیل لاکھا اڑ گیا۔ اس نے دُم کو مروڑا، چوب ماری، ہشکارا بھرا مگر وہ سؤر کی طرح وہیں اکڑ گیا۔ نہ آگے جاتا ہے نہ پیچھے ہٹتا ہے۔ مَیں دیکھ رہا تھا اور سوچ جا رہا تھا، لاکھے کی شامت آئی کہ آئی۔ کچھ دیر بعد وہی ہوا، شیرے نے غصّہ کھا کے لاکھے کی کمر پر یہ زور کی کہنی ماری کہ اللہ معاف کرے۔ میرے پاؤں کی زمین ہل گئی۔ میں سمجھا زلزلہ آ گیا۔ کہنی کی ضرب سے لاکھا نیچے ہی بیٹھتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جو بے زبان کو ہوش آیا اور سُرت بحال ہوئی تو ایک دم اُٹھ کے بھاگا اور سہ پہر تک ایک ایکڑ زمین تلپٹ کر دی۔ کیوں شیرے، بتانا ذرا انھیں وہ قصہ۔

اس بات کو چھوڑو، عاقل نے بختو کی زنجیر اپنی ٹانگ سے باندھ کر ہاتھوں کو آزاد کیا اور بولا، ایک بار مَیں یونہی پگڈنڈی کنارے جا رہا تھا۔ یہ بھاگاں والی بختو آگے آگے مٹکتی جاتی تھی۔ ہم پگڈنڈی پر تھے اور دونوں جانب اُونچے اُونچے کماد کے کھیت تھے۔ اچانک ایک ہی بار جھٹکا سا ہوا اور میرے دیکھتے ہی بختو غائب۔ چوں تک نہ کی بے چاری نے۔ بس ایک جھپکے کی دیر میں کماد سے گھبیاڑ نکلا اور دیکھتے ہی بختو کو گردن سے دبوچ کر اُسی کماد میں جا گھسا۔ تمھیں تو پتا ہے میری

اس کر ماں والی میں جان ہے۔ مَیں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پیچھے چھلانگ لگا دی۔ اب جو دیکھا تو تین تین گھباڑ تھے۔ بختو بے چاری مدھولی جا چکی تھی۔ ایک منٹ مَیں نہ پہنچتا تو اس کی انتڑیاں کماد کی جڑوں سے لپٹی جا چکی ہوتیں۔ جیسے ہی گھباڑوں نے مجھے دیکھا، آئے میری طرف۔ یہ بڑے بڑے ڈیلے نکال کر۔ لوجی اُس وقت مَیں نے بھی دلیری پکڑی اور گھباڑ ہی تو بن گیا۔ خون میری آنکھوں میں اُتر آیا اور جنگ شروع ہوگئی۔ کسی کا پنجہ بچاتا ہوں تو کسی کے دانت۔ ایک گھباڑ نے میری لنگی کو اپنے جبڑوں میں ایسے دبوچ کر کھینچا کہ پَل میں لیرو لیر ہوگئی اور مَیں الف ننگا۔ وہ تو بچت یہ ہوئی کہ اُس کے جبڑوں میں میرا الف نہیں آیا ورنہ تو میں سرے سے ہی کام سے گیا تھا۔ جو اُن میں سب سے بڑا تھا، اُس کو آخر مَیں نے یہ جھانبڑ لگائی کہ تین قلابازیاں کھا گیا۔ دوسرا سیدھا اُستروں جیسے پنجے اور برچھی کی طرح دانت نکال کر میرے منہ کی طرف آیا۔ میں نے ٹوکی کا وار یوں اُس کے پیٹ میں اُتارا کہ وہ تو خنزیر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ ایک جو پہلے والا تھا جس نے مجھے ننگا نچا دیا تھا، اُس کو بائیں ہاتھ سے دھوبی پٹڑا دیا اور دے زمین پہ مارا۔ وہ بھی بہت تیز تھے۔ آنکھ جھپکتے ہی دوبارہ حملہ کر دیتے۔

اور تمھاری بختو نے ساتھ نہیں دیا؟ غلام محمد نے پوچھا۔

عاقل ہنس کر بولا، تم بھی بادشاہ ہو بھئی غلام محمد۔ یہ بے چاری تو بے سُتی ہوئی پڑی تھی۔ مجھے تو فکر تھا کہیں مر ہی نہ گئی ہو۔ اس کو اُس وقت ساتھ دینے کے کہاں ہوش تھے۔ ظالموں نے ایک ہی منٹ میں اسے رگڑ دیا۔ خیر بھئی، یہ لڑائی دو گھنٹے جاری رہی۔ دو کنال کماد کا صفایا ہوگیا۔ اللہ اللہ کر کے وہ تینوں گھباڑ مَیں نے اُسی ٹوکی سے کاٹے۔ میرا اپنا جسم بھی لہولہان ہوگیا۔ بختو کو اُٹھا کر گھر لایا۔ شوہدی کو شام تک کہیں جا کر ہوش آیا۔

شریف بولا، یہ بات تو ہے شیرے تم میں۔ ہم ہوتے تو وہیں مُوت نکل جاتا اور بختو کو گھباڑوں کے صدقے کر کے گھر کی طرف دُڑکی لگا دیتے۔ خُدا کی قسم آج راجہ ارجن ہوتا تو تیرا پانی بھرتا۔

دل گیر جو ایک طرف چُپ کھڑا تھا، شریف کی بات سن کر بولا، واہ شریفے، تُو بھی کتنی اوچھی

اور دُور کی کوڑی لایا ہے۔ بھلا ہنومان اور ارجن پتلے دار کا عاقل سے کوئی میل ہے؟ اپنا عاقل ہے علیؑ کا شیر اژدروں کو پھاڑنے والا اور وہ صرف رام کے چیلے چانٹے۔ پھر عاقل کی طرف منہ کر کے بولا، پر ایک بات تمھیں بھی ماننی پڑے گی شیرے۔ جگرے والا اپنا رفیق محمد بھی بہت ہے۔ چاہے رام لشمن دونوں آجائیں، رفیق خاں، علی مولا کا نام لے کر دونوں کو اُنگلی پر اُٹھا لے گا۔ بھائی اُس کے ہاتھ کیا ہیں؟ لوہے کی سیخیں ہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ عزرائیل کے پنجے ہیں۔ جس پر جا پڑتے ہیں روح قبض کیے بنا نہیں چھوڑتے اور دلیر ایسا کہ نادر شاہ کی فوجوں پر اکیلا جا چڑھے۔ پورا لشکر ایک طرف ہو جائے تو بھی ماں کا جنا پیٹھ دکھا کے نہیں بھاگتا۔

ہاں، غلام محمد بولا، اور مَیں تو کہوں گا، اِدھر اُدھر دس بارہ گاؤں میں تو اُس کے توڑ کا آدمی کوئی نہیں۔ پندرہ بھینسوں کا چارا تین میل سے سر پر اُٹھا کر لے آئے۔ مجال ہے اُس کی گردن میں موڑ آئے۔

شمشیر خاں کو غلام محمد کی یہ بات اچھی نہ لگی، وہ بولا، یہ کون سا بڑا کام ہے۔ یہ تو میں بھی کر لوں گا۔

دل گیر علی دوبارہ بولا، عاقل خاں اِس کام میں تو وہ تم سے آگے ہے۔ یہ تو تم کو بھی ماننا پڑے گا۔ پھر شرارتاً مسکرا کر، عاقل خاں ویسے تھوڑا تھوڑا تم اُس سے ڈرتے بھی ہو۔

عاقل خاں غصّے سے لال ہو گیا اور کھینچ کے ایک لمبا ہاتھ دلگیر کے مارا اور سر گھما دیا۔

دل گیر گال لوستے ہوئے بڑبڑایا، ہمیں کیوں مارتے ہو؟ کمزور پر ہر کوئی ہاتھ اُٹھا لیتا ہے۔ مزا تو جب ہے، رفیق سے پیچا ڈالو۔

حبیب جٹ نے کہا، عاقل خاں یہ تم نے مَردوں والی نہیں کی۔ بے چارے دلگیر کا کیا گناہ ہے؟ اسے مار لیا دیوار کو مار لیا ایک جیسا ہے۔ درانتی ہرا گا چا تو مزے سے کاٹتی ہے، پکی چری پر چلے تو دانت کھٹے ہو جائیں۔

عاقل نے شرمندگی سے حبیب جٹ کی طرف دیکھا تو وہ دوبارہ بولا، بات تو عاقل خاں، دلگیر نے حق سچ کی ہے۔ تمھارا جوڑ اصل میں رفیق سے بنتا ہے۔ ہمارے سر پر تو مفت میں گنکے

جماتے رہتے ہو۔

عاقل خاں اب پوری طرح طیش میں آ گیا، بولا، لو مَیں کل ہی فیکے کو چیلنج دیتا ہوں۔ پھر جھجکتے ہوئے بولا، پر یہ اچھی بات نہیں۔ وہ ہے میرا یار۔

اب غلام علی نے آگ پر مزید تیل چھڑکا، تو کیا اتنی سی بات سے یاری ٹوٹ جائے گی؟ اگر ایک چیلنج سے یاری ٹوٹتی ہے تو یاری نہ ہوئی، سُوت کا دھاگا ہوا۔

ٹھیک ہے میاں، عاقل خاں نے اپنے گھٹنے سے بختو کی زنجیر کھولی اور اُٹھ پڑا۔ کل دوپہر صید شاہ کے نیم والے تھڑے پر آ جانا۔ وہیں چیلنج دوں گا۔

....

نیم کی گنڈولیاں پک کر پیلے رنگ کی ہو گئی تھیں اور شاخوں پر پتوں کی سبز چھاؤں کو گوڑھا کر رہی تھیں۔ یہ دن اگست کے شروع کے تھے، جب بارشیں اور حبس پورا مہینا ایک ساتھ رہتے ہیں لیکن آج خوشگوار دن تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چار پائیاں گھنے پیڑ کے نیچے رکھے، حقے کا دھواں اُڑا رہے تھے۔ ارد گرد بیٹھے لوگ، جنھیں خموش بیٹھ کر تماشا دیکھنے کی اجازت تو تھی، بولنے کی نہیں، وہ خموشی سے دیکھنے لگے۔ رفیق سارے معاملے سے بے خبر تھا۔ عاقل نے ایک دو دفعہ رفیق کو گہری نظر سے دیکھا اور بولا، فیکے مَیں آج تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ لوگوں کا زبردستی یا چوری چارانہ کاٹا کر۔

تمھیں اِس کا ٹھیکا ہے۔ رفیق عاقل کی اِس اچانک بے سُری بات پر غصّے سے بولا۔

بھئی لوگ مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ فیکا تیرا یار ہو کر ہمارا نقصان کرتا ہے۔ تُو اُسے روکتا کیوں نہیں۔

رفیق: تو نہ سنا کر طعنہ۔ سیدھا میرے گھر کا رستہ بتا دیا کر۔ پھر مَیں جانوں اور وہ۔

عاقل: اِن مظلوموں کی بات سننا بھی تو میرا کام ہے۔

عاقل اِن باتوں سے تیرا مطلب کیا ہے؟ رفیق نے طنزاً مسکرا کر کہا، کیا تو گاؤں کا تھانیدار ہے یا دروازے پر عدل کی زنجیر لٹکائی ہے؟ اپنے کام سے کام رکھا کر۔

عاقل بولا، فیکے میں گاؤں کا تھانیدار یا بادشاہ تو نہیں، پر یہ جان لے، اگر کوئی تیرے علاوہ اِس گاؤں کا نقصان کرتا تو مَیں کب کا اُس کی موچھیں مونڈ کر اور اُن کی رسی بٹ کر اِس نیم کے تنے سے باندھ چکا ہوتا۔

رفیق نے کہا، عاقلے تُو کس سے بات کر رہا ہے؟ لگتا ہے آج بھنگ زیادہ چڑھ گئی ہے۔ مَیں تیرے سامنے رفیق خاں فرشتہ بیٹھا ہوں، کوئی پھجا لنگڑا نہیں ہوں۔

مَیں بھی جانتا ہوں تُو اپنا فیکا ہی ہے، وہی فیکا جس نے پورے گاؤں میں اندھیر مچا رکھا ہے۔

رفیق نے اب دھیمے لہجے میں کہا، عاقل خاں آخر تُو چاہتا کیا ہے؟ کیا مَیں نے کبھی تیرے چارے کو ہاتھ لگایا ہے؟

لگا کے دیکھ لے، عاقل نے آنکھ میں آنکھ ڈال کر کہا۔

عاقل آج تُو کدھر سے بول رہا ہے؟

بات یہ ہے فیکے، عاقل نے آنکھوں کے ڈیلے باہر نکالے اور کہا، کِلے سے بکری کی ٹانگ باندھنا ایک بات ہے اور سرکاری سانڈ کے سینگوں پر ہاتھ ڈالنا دوسری بات۔ مانا کہ گاؤں کا کوئی بندہ تم نے نہیں چھوڑا، جس کا چارا کاٹ کر نہیں لے گیا اور اُس کی فصل کا اُجاڑا تم نے نہیں کیا مگر وہ تو بے چارے نری گابھن بھیڑیں ہیں۔ تیرا اُن کے ساتھ مقابلہ اصولی بنتا نہیں۔ چھ انچ لمبی مونچھ پر ہاتھ پھیر کر، جب مانوں، جب تُو میرے گاچے پر درانتی رکھے گا۔ فیکے، بلی کی مونچھ کا بال کھینچنا مردوں کا کام نہیں، شیر کے دانت گن کے دکھا، پھر تماشا دیکھ۔

عاقل کی باتیں سن کر اور بھرے مجمعے کو دیکھ کر فیکا سمجھ گیا کہ یار لوگوں نے ہوا بھری ہے، اس لیے تحمل سے بولا، شیرے اِس گاؤں میں تُو میرا ایک ہی یار ہے۔ اب تیرے کھیت میں چوری کرتے کیا مجھے شرم نہ آئے گی؟ دُنیا کہے گی، فیکا یار مار ہے۔

اوچھڈ فیکے شیرا، یاری اپنی جگہ، مرد کی موچھیں اپنی جگہ۔ مَیں جانتا ہوں، تیری زوراوری نے بڑے پہلوانوں کے منہ پھیر دیے، پر میرا دل کرتا ہے ذرا مجھ سے بھی تیری بینڈی پھنسے تو مزا آئے۔ کسی دن میرے چارے کی کرونبلیں کاٹو گے تو لوہے کا کڑیالا منہ میں نہ دیا تو باپو نے

شمشیر خان نام نہیں رکھا۔ میں سمجھوں گا اپنی ماں کا نہیں کھوتی کا دودھ پیا ہے۔

رفیق خاں اب غصے سے بولا، شمشیر خان، تجھے پتا ہے، اتنے چیلنج میرا باپ بھی دے تو میں اُس کی دُم پیچھے سے باندھ دوں، پھر بھی تجھے بڑھکیں مارتے خوف نہیں آتا، حقے کا لمبا گھونٹ بھر کر دھواں نتھنوں سے ہلکا کر کے نکالتا ہے، جا، اگر تیری یہی منشا ہے تو فیکے کا تجھ سے وعدہ ہے۔ تیرا کُترا ہوا چارا لے کر جاؤں گا اور یہ بھی بتا دوں، یہ کام اِسی ہفتے کروں گا۔ اگر غیرت مند ہو تو مونچھ کی حفاظت کرنا۔ میں چارا لے گیا تو اپنی مونچھ منڈواؤ گے؟

لا ہاتھ، عاقل نے چیلنج پکا کرنے کے لیے فیکے سے ہاتھ ملایا، اب جو اپنی بات سے پھرے، اُس کی مونچھیں گدھی کے دودھ سے مونڈی جائیں گی۔

پاس بیٹھے سب لوگوں نے گواہی کے طور پر تالی بجائی۔

....

شرط کو چار دن ہو گئے۔ دونوں کی عزت کا مسئلہ تھا۔ پچھلی رات رفیق نے اپنی شرط پوری کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ رات کے دو بجے اُٹھا، دھوتی باندھی، چار بَر کی چادر بغل میں دبائی اور عاقل خاں کے مویشیوں والے باڑے کی طرف چل دیا۔ یہ باڑہ گاؤں سے نصف کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہیں چارا کاٹنے والی مشین تھی۔ عاقل خاں کا نوکر شام کے وقت تمام چارا کاٹ کے رکھ دیتا، تاکہ صبح بھینسوں کا دودھ دوہنے کے لیے بھاڑے کی آسانی رہے۔ عاقل صبح سویرے دودھ لینے کے لیے ایک ہاتھ میں منکا اور دوسرے میں بختو کی زنجیر پکڑے باڑے کو روانہ ہوتا، دوپہر تک وہیں رہتا، نوکر کا ہاتھ بٹاتا اور بارہ بجے دودھ لے کر واپس گاؤں آ جاتا۔ بختو ساتھ منگتی آتی۔ یہ اُس کا معمول تھا لیکن جب سے رفیق کو چیلنج دیا تھا، یہ دودھ کسی کے ہاتھ گھر بھجوا دیتا اور خود بختو کے ساتھ وہیں راتیں گزارنے لگا۔ ساری رات جاگتا۔ سونے کو اپنے اُوپر گویا حرام کر لیا۔ چارپائی کُترے ہوئے چارے کے بالکل ساتھ رکھ کے لیٹتا۔ پچھلی رات نیند غلبہ کرتی اور آنکھیں زبردستی بند ہو جاتیں تو اُسے رفیق اپنی چادر میں چارا اُڑاتے نظر آتا، وہ فوراً ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا لیکن

اِدھر اُدھر کچھ نہ پا کر پھر لیٹ جاتا۔ بختو آرام سے چار پائی کے ساتھ بیٹھی رہتی یا آس پاس ٹہل لیتی۔ اگر یہ شرط فیکے کی بجائے کسی اور سے لگی ہوتی تو زیادہ فکر نہیں تھی۔ بختو سب کچھ سنبھال لیتی مگر مصیبت یہ تھی کہ بختو جس قدر عاقل سے واقف تھی، اِسی قدر فیکے سے بھی تھی۔

آج عاقل نیند کے غلبے سے اِس قدر بوجھل تھا کہ دن کے وقت بھی نشے کی حالت میں لگ رہا تھا۔ رفیق جس وقت باڑے میں پہنچا، سوائے بختو کے باڑہ سویا ہوا محل بن چکا تھا۔ عاقل کے خراٹے دغدغہ بجا رہے تھے۔ رفیق نے باڑے کی یہ حالت دیکھی تو ہلکا سا مسکرا دیا۔ پھر چار پائی کے ساتھ پڑا گنکا اور لالٹین اُٹھا کر کماد کے کھیت میں پھینک دی۔ بختو نے اُس کی بُو سونگھ لی اور بھاگ کر قدموں سے لپٹنے لگی۔ فیکا آرام سے آگے بڑھا، کُترے ہوئے چارے کے پاس چادر بچھائی، اُس میں چارا ڈالا، پھر چادر کو چاروں کونوں سے باندھ کر بھاری پنڈ بنالی اور ایک ہی ہلّے میں اُٹھا کر سر کی طرف لے گیا۔ چارا سر پر رکھ کر دو قدم چلا، پھر خیال آیا، ایسا نہ ہو عاقل کہے، اُس کا چارا چوری ہی نہیں ہوا۔ وہ پیچھے ہٹا، ایک زور کی ٹھوکر عاقل کی چار پائی کو لگائی لیکن وہ سویا رہا۔ رفیق نے مزید دو ٹھوکریں ماریں، وہ پھر بھی نہ اُٹھا تو اُس نے گٹھڑ ہی اُوپر پھینک دیا۔ گٹھڑ کا گرنا تھا کہ عاقل کو لگا جیسے بھونچال آ گیا۔ بڑی مصیبت سے اُس کے نیچے سے نکلا اور ابھی نیند اور گٹھڑ کی ضرب سے ہوش بحال بھی نہ ہوئے تھے کہ رفیق نے جلدی سے گٹھڑ دوبارہ سر پر رکھا اور چل دیا۔ کالی رات کا اندھیرا تھا اور نزدیک ہی گنے کا کھیت۔ رفیق کھیت میں گھس گیا۔ عاقل نے اِدھر اُدھر لالٹین کو ٹٹولا مگر وہ غائب تھی۔ غنودگی میں اُسے کچھ نہ سوجھا کہ کیا کرے؟ بختو کو ہشکار کر پیچھے لگایا۔ کُتیا نے عاقل کے کہنے پر رفیق کا پیچھا کیا مگر پاس پہنچ کر خود بھی ساتھ چلنے لگی۔ عاقل کو شدید اُلجھن نے گھیر لیا۔ ساری زندگی بختو اور گنکے کے بغیر ایک قدم نہ چلا اور اب یہ دونوں چیزیں غائب تھیں۔ اُسے رہ رہ کر اپنے آپ پر، اُن لوگوں پر، جنھوں نے شرط لگانے پر اُکسایا، حتیٰ کہ بختو پر، جو آرام سے فیکے کی ڈولی چڑھ گئی تھی، شدید غصہ آنے لگا۔ عاقل نے کئی بار بختو کو ہشکارا لیکن اُس کی آواز نہ آئی نہ خود آئی۔ آخر عاقل نے تھک کر رفیق کو آواز دی، او فیکے شیرا، جو بھی ہو گیا، ٹھیک ہے، پر بختو کو چھوڑ دے۔

رفیق نے عاقل کی رُندھی سی آواز سنی تو اُس نے بختو کو چھوڑ کر باڑے کی طرف بھگا دیا اور چارا لے کر گھر آ گیا۔ عاقل نے بختو کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔ اُس نے چارے پر لعنت بھیجی، بختو کو گود میں لیا اور دوبارہ نچنت ہو کر سو گیا۔

عاقل صبح اُٹھا تو نیند کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور رات کا واقعہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ اُس نے خجالت سے بچنے کے لیے فیکے کے ساتھ کھلا اعلانِ جنگ کر دیا اور کہا، اِس بختو کی اور میرے باپ کی قسم، آج سے مجھ پر لسی حرام ہے جب تک فیکے کو قتل نہ کر دوں۔

ایک شخص ہمت کر کے بولا، عاقل خاں بختو کی قسم تو خیر ٹھیک ہے لیکن تمھارا ابا تو دس سال پہلے ہی بیل نے سینگ مار کے مار دیا تھا، اُس کی قسم کیسے ہو گئی؟

عاقل خاں نے جواب دینے کی بجائے اُسے ایک اُلٹے ہاتھ کی دَھول جمائی۔

....

عاقل باڑے سے سیدھا صادق لوہار کی دُکان پر پہنچا۔ دُکان کیا تھی، کیکر کی لکڑی کے چار ستونوں پر بانس کے آنکڑے ڈال کر ایک چھپر سا کھڑا کر لیا تھا۔ اس کے نیچے آگ کی بھٹی، لوہے کے مختلف اوزار اور دس بارہ موڑھے پڑے رہتے۔ صادق دھونکنی کے پہیے کو چکر دیتا رہتا اور لوہا سُرخ کر کر کے کوٹتا رہتا۔ بعض دفعہ وہاں بیٹھا کوئی نہ کوئی چکر گھمانے میں صادق کا ہاتھ بٹا دیتا۔ دُکان پر سارا دن گاؤں کے دس بارہ لوگ بیٹھے سمندر پار کی ہانکتے۔ اِن میں بوڑھے، جوان، ادھیڑ عمر، سبھی ہوتے۔ بوڑھے زیادہ ہوتے۔ صادق کی دُکان پر رونق کی سب سے بڑی وجہ وہاں ہر وقت جلتی آگ تھی، جس کے تازہ اور موٹے انگارے اتنے خوب صورت تھے کہ اُنھیں کھانے کو دل کرتا۔ مفت کی آگ اور تازہ حقہ اتنی آسانی سے کہیں میسّر نہیں تھا۔ اس لیے جو خبر یہاں آتی، ہوا کی طرح گاؤں میں پھیل جاتی اور اُس وقت تک اُس پر تبصرہ چلتا جب تک اُس سے بڑی خبر اُس کی جگہ نہ لے لیتی۔

پچھلے چار دن سے گاؤں میں عاقل اور رفیق کی شرط ہی زیرِ بحث تھی۔ ہر شخص پُر جوش تھا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا، کیا ہونے والا ہے۔ دونوں برابر جوڑ کے سورمے تھے۔ بس اِتنا تھا کہ عاقل ذرا

عقل کا موٹا تھا۔ ہر ایک تذبذب میں تھا، دیکھیں کیا ہو؟ صبح جیسے ہی یہ قصہ صادق لوہار کی دُکان پر پہنچا اور واقعہ نگار نے خوب نون مرچ لگا کر عاقل کی خجالت بیان کی تو سب دنگ رہ گئے اور بحث چھڑ گئی کہ عاقل کی مونچھیں کاٹنے کے لیے کون سی گدھی کا دودھ اور کس نائی کا اُسترا ٹھیک رہے گا۔ حقے کے دھویں کے سائے میں تجویزیں پیش ہونے لگیں۔ اتنے میں اُنھیں عاقل آتا دکھائی دیا۔ اُسے دیکھ کر سب نے خموشی اختیار کر لی اور بیٹھنے کو جگہ دی اور ایسا تاثر پیش کیا کہ اُن کو کسی بات کا پتا نہیں۔ عاقل نے مونڈھے پر بیٹھنے سے پہلے ہی بڑے غصّے میں صادق کو مخاطب کیا، اوّے صادق، ہتھوڑے کو نیچے رکھ اور میری بات سن، مجھے دس انچ چوڑے پھل کی کلہاڑی چاہیے، دیگی لوہے کی، وزن اُس کا دس سیر سے کم نہ ہو، تین فٹ لمبے توت کے دستے کی۔ یہ کلہاڑی آج شام تک مجھے ہر صورت چاہیے۔

حکم دیتے ہوئے عاقل کے تیور اتنے بھڑکیلے تھے کہ سب حواس باختہ ہو گئے اور کسی کو عاقل سے پوچھنے کی طاقت نہ رہی کہ فیکے کے ساتھ کیا بنا؟ صادق لوہار نے ہمت کر کے پوچھا، خیر ہے بھائی عاقل، اتنے غصّے کی کیا بات ہو گئی؟ کلہاڑی کیا کرنی ہے؟

کیا کرتے ہیں اِس طرح کی کلہاڑی سے؟ تجھے نہیں پتا؟ عاقل گرج کے بولا، مجھے لدھو بن کے دکھاتے ہو۔

تم نہیں بتاؤ گے تو کیا مجھ پر الہام ہو گا؟ صادق نے ترکی بہ ترکی کہا۔

فیکے کا کِریا کرم کرنا ہے۔ اِس کلہاڑی سے اُس کا سر تن سے جُدا کر کے چوک والے کنوئیں کی مہال سے لٹکانا ہے اور سب کو دکھانا ہے کہ شیر اپنے کہے سے نہیں ٹلتے، عاقل نے یہ جملے اتنی کرختگی سے ادا کیے کہ سب گھبرا گئے۔ اُنھیں گدھی کا دودھ اور اُسترے بھول گئے۔

اُسے کیوں قتل کرنا ہے، کوئی وجہ تو ہو گی؟ صادق لوہار نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

بس ایسے ہی، مرد وجہ نہیں بتاتے، عاقل نے دوٹوک جواب دیا۔

لیکن وہ تو تیرا یار تھا، یہ ایک دم کیا ہو گیا؟

یار تو تھا لیکن صادق میاں، مَیں نے سوچا، دو شیر ایک جنگل میں نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اب

اُس کا منگو ٹھپ ہی دینا چاہیے۔ بس تُو آج ہی ایک ستھری سی کلہاڑی بنا دے۔ اب فیکے کی آ گئی ہے تو عاقل خاں کیا کر سکتا ہے؟

ایک شخص جو وہاں بزرگ قسم کا بیٹھا تھا، ہمت کر کے بولا، عاقل خاں ذرا ہوش کر، لڑائی بھڑائی ہوتی رہتی ہے۔ فیکا دل کا بُرا نہیں، اتنا غصہ نہ کھا، ٹھنڈے دل کے ساتھ فیصلہ کر، ویسے اُس نے کام اچھا نہیں کیا۔

چاچا نیاز دین، عاقل گرجا، اِس سے تیری صلاح لینے کا وقت نہیں۔ یہ مشورے تُو فیکے کی قبر کھودنے والوں کو دینا کہ پترا اتنے گز لمبی کروا اور اتنے ہاتھ چوڑی۔ اِس وقت میرے ہاتھ پر نہ بول، یہ جوان مردوں کے کام ہیں، بڈھوں کے نہیں۔

نیاز دین عاقل کی جھڑک کھا کر چپ ہو گیا۔ اس کے بعد کسی کو بات کرنے کا حوصلہ نہ رہا لیکن دل ہی دل میں سب خوش تھے کہ اب اِن کی ہنڈی پھنسی کہ پھنسی۔ آدھ گھنٹا سمجھانے اور دس روپے صادق کو پیشگی دینے کے بعد عاقل چلا گیا۔

رفیق جب صبح دوبارہ عاقل خاں کے باڑے پر گیا تو وہاں صرف نوکر تھا۔ اُس نے بتایا، عاقل صبح ہی چلا گیا ہے اور بہت غصے میں ہے۔ جاتے جاتے میرے بھی ایک دھول جما گیا ہے۔

کچھ دیر بعد لوگوں نے رفیق کو بتا دیا کہ شرط تو ایک طرف رہی، عاقل صادق لوہار کو کلہاڑی بنانے کی پیشگی دے آیا ہے۔ رفیق سن کے ہنس دیا اور گھر چلا آیا۔

کلہاڑی بن کر آئی تو عاقل کے ایک ہاتھ میں بختو کی زنجیر اور دوسرے میں یہ خونخوار قسم کی کلہاڑی رہنے لگی۔ ہر کوئی چمکتی ہوئی ننگی کلہاڑی دیکھ کر دُور سے ہی رستہ بدل لیتا لیکن اب عاقل کھلے بازار میں کسی نہ کسی کو پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور اُسے فیکے کے آئندہ ہونے والے قتل کے بارے میں تفصیل سے بتاتا۔ ایک ایک پہلو پر سیر حاصل گفتگو کرتا اور افسوس کرتا کہ ایک اچھا بھلا جوان خواہ مخواہ میں اِس دُنیا سے اُٹھ جائے گا۔ سامنے والا فرد بھی عاقل کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ دو تین روز اسی طرح گزر گئے۔

اسماعیل تیلی نماز کے لیے نکلا۔ عصر کی اذان ہوئی تھی اور اُس نے باجماعت نماز میں شریک

ہوتا تھا۔ عاقل کا گھر مسجد کی راہ میں تھا۔ اس نے گھر سے نکلتے ہی اسماعیل کو آتے دیکھا تو سڑک پر ہی روک کر کھڑا ہو گیا۔ بختو کی زنجیر کلہاڑی والے ہاتھ میں پکڑ لی اور زنجیر والا ہاتھ اسماعیل کی طرف بڑھا دیا۔ اسماعیل بے چارا نمازی اور پرہیزگار بندہ، کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ سلام لیتا ہے تو ہاتھ پلید ہوتا ہے، نہیں لیتا تو ایک نئی مصیبت۔ آخر دل ہی دل میں خُدا سے معافی مانگی اور ہاتھ ملا لیا۔ اُس کے بعد عاقل نے وہی فیکے والا قضیہ چھیڑ دیا۔

چاچا اسماعیل، اب تُو ہی بتا، کیا کیا جائے فیکے کے معاملے میں؟

اسماعیل: بھئی میری تو صلاح ہے اُسے معاف کر دے۔

عاقل: یہ تو نامردوں والا مشورہ ہے۔

اسماعیل: تو پھر صلاح کس چیز کی مانگتا ہے؟

عاقل: یہی کہ اُسے کس چیز سے قتل کروں؟ آخر تم سیانے آدمی ہو، بڑا زمانہ دیکھا ہے۔

اسماعیل: میاں، مَیں نے زمانہ تو دیکھا ہے پر قتل تو نہیں کیے۔

عاقل: قتل نہیں کیے لیکن اُجاڑے میں قتل ہوتے تو دیکھے ہیں کہ نہیں؟ بس یہ بتا دے، آسان موت کس ہتھیار سے ہوتی ہے؟

اسماعیل: دیکھ عاقل! ایک تو یہ کہ اُجاڑے میں نہیں دیکھا جاتا تھا، کافر کو کس شے سے مارا جائے کہ اُسے تکلیف کم ہو، دوسری بات یہ کہ تم نے یہ کلہاڑی کس لیے بنوائی ہے؟

عاقل: فیکے کو قتل کرنے کے لیے۔

اسماعیل: جب تم ایک ہتھیار بنوا چکے ہو تو پھر مشورہ کیا دوں؟

عاقل: او یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اچھا یہ بتا دو، کلہاڑی کس جگہ ماروں کہ اُسے درد بھی نہ ہو اور وہ فوراً مر بھی جائے۔ ذرا تجربے سے بتاؤ۔

اسماعیل: عاقل کس طرح کی باتیں کرتے ہو؟ تجربے سے تب بتاؤں، جب میں نے کسی کو مارا ہو۔ مَیں نے تو آج تک چوہا نہیں مارا۔ پھر جب تُو نے اُسے مارنا ہی ہے، تو اُس کی تکلیف سے کیا مطلب؟

عاقل: واہ چاچا اسماعیل واہ، فیکا آخر میرا یار ہے۔ اُسے تکلیف ہوگی تو کیا مجھے تکلیف نہ ہوگی؟ تم نے دلیروں والی بات نہیں کی۔

لشکے بھئی لشکے، اسماعیل نے حیران ہو کر کہا، تیرے جیسا قاتل مَیں نے پہلی بار دیکھا ہے، جو اونٹ پر بیٹھ کر کوہان سے ڈرتا ہے۔ بھئی اگر تم کو اُس کا اتنا ہی احساس ہے تو قتل ہی کیوں کرتا ہے؟ بس جانے دے، جو ہوا سو ہوا، اُس کا درد نہیں دیکھنا چاہتا تو اتنے کڑیل جوان کو مارتے ہوئے تجھے رنج نہیں ہوگا؟

افسوس تو مجھے بھی ہے اس بات کا چاچا، شیر جیسا جوان چھوٹی سی بات پر مرنے لگا ہے، پر کیا کروں؟ آخر زبان دے بیٹھا ہوں۔ ویسے بھی سب نے ایک دن چلے تو جانا ہے۔ کوئی دو دن آگے، کوئی دو دن پیچھے، یہ دُنیا فانی ہے۔

بھئی میری نماز چھوٹی جا رہی ہے کوئی فیصلہ کرو۔ اسماعیل نے تنگ آ کر کہا۔

جا چاچا نماز پڑھ، کہیں تیری جنّت نہ ہاتھ سے نکل جائے۔ حد ہو گئی، تم لوگوں کو بندے کی جان کی پروا نہیں، نمازوں کی ہے، جا چلا جا۔ غصّے سے، اگر فیکا مر گیا تو دیکھوں گا اللہ تیری نمازوں کو کس کھاتے میں ڈالتا ہے۔ اِن نمازوں کے ساتھ ہی دوزخ میں جائے گا۔ عاقل نے بختو کی زنجیر دوبارہ دائیں ہاتھ میں لی اور راستہ چھوڑ دیا۔

اُدھر فیکا اپنے کام میں لگا رہا۔ اُسے اُس کے بڑے بھائی بشیر احمد نے سختی سے منع کر دیا کہ فی الحال عاقل سے دُور رہو۔ خواہ مخواہ دنگا مچانے کی ضرورت نہیں۔ بھائی کے کہنے پر وہ عاقل کے سامنے آنے سے گریز کرتا رہا۔ عاقل نے جب دیکھا کہ فیکا میرے سامنے نہیں آتا تو مزید بڑھ چڑھ کر اُس کے قتل کے تذکرے کرنے لگا۔

ایک دن رفیق کا بھائی عاقل کو سامنے سے آتا دکھائی دیا، تو عاقل نے اُسے سلام کیا اور بولا، بائی، اپنا فیکا شیر کدھر ہے؟ کئی دن سے نظر نہیں آ رہا؟

اِدھر گاؤں میں ہی ہے، رفیق کا بھائی بولا، بس بھینسوں کے چارے وارے میں لگا رہتا ہے۔ کیوں، کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟

خیر ہی تو نہیں ہے بائی بشیر۔ بس قسم کھا بیٹھا ہوں اُسے قتل کرنے کی۔

ایں، خیر، بشیر نے حیرانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا، عاقل خاں تیرے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں؟ کل تک ایک دوسرے کا لقمہ بچاتے تھے۔ ٹھرا تو نہیں چڑھا رکھا؟

بائی ٹھرے میں نہیں ہوں، عاقل نے لجاوٹ سے کہا۔

یہ اچھی بات تو نہیں ہے۔ بشیر تحمل سے بولا، اگر وہ میرا بھائی ہے تو تیرا بھی یار ہے، اُسے قتل کرنے سے تیرا اور میرا نقصان تو برابر ہی ہوگا۔

بائی، بات تیری ٹھیک ہے، پر کیا کروں؟ اُسے قتل کرنے کی زبان دی ہوئی ہے۔ بس اُسی کے ہاتھ سے مجبور ہوں۔ مجھے غصہ آیا ہوا ہے، اب تو یہ کڑوا گھونٹ بھرنا ہی پڑے گا۔ بس اللہ سے اُس کی بخشش کی دعا مانگ۔

بشیر: مَیں تو اُس کی زندگی کی دعا مانگوں گا۔

عاقل اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا،، اِس کا ایک طریقہ ہے۔ اِدھر کان نزدیک کر، اُسے کہہ چار چھ دن گاؤں سے آگے پیچھے ہو جائے۔ میرا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو پھر آ جائے ورنہ نقصان بہت ہو جائے گا، دونوں گھروں کا۔

بشیر: بات تو تیری ٹھیک ہے عاقل خاں مگر تمھاری قسم کا کیا بنے گا؟

تُو اُس کی فکر نہ کر۔ خُدا سے مَیں خود بات کرلوں گا، یہ میرا اُس کا معاملہ ہے۔ بس کچھ دن کے لیے فیکا شیر یہاں سے چلا جائے تو کوئی حل نکل سکتا ہے۔

بشیر: یہ طریقہ ٹھیک ہے عاقل، مَیں آج ہی اُسے جھوک گھسن بھیج دیتا ہوں مگر اِن بھینسوں کا کیا کروں؟ اگر وہ یہاں سے چلا جائے گا تو اِن کو چارا کون ڈالے گا؟ میرے تو بس کا روگ نہیں۔

عاقل کچھ دیر سوچ کر دوبارہ بولا، اِس کا ایک حل ہے۔ اِنہیں میرے باڑے پر باندھ آؤ۔ میرا نوکر اِن کو چارا ڈال دیا کرے گا۔

بشیر، یہ بات تم نے بہت عمدہ کی۔ مَیں کل صبح ہی رفیق کو گاؤں سے نکال کر بھینسیں تمھارے

باڑے میں باندھ آتا ہوں۔

عاقل نے خوش ہو کر مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ بختو کی زنجیر دوسرے ہاتھ میں کی اور آگے چل دیا۔

....

اگلے دن عصر کا وقت تھا۔ رفیق کام سے فارغ ہو کر، آرام سے چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اچانک باہر سے عاقل کی آواز آئی، اوبئی فیکے شیرا، ذرا باہر آ، ضروری کام آ گیا، جلدی آ جا۔

آواز میں کرختگی اور اُکھڑپن ویسا ہی تھا، جس کے سبب رفیق کا بھائی تذبذب میں پڑ گیا۔ رفیق باہر کی طرف لپکا تو اُسے روکنے کے لیے بشیر بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا! رفیق باہر مت جاؤ، مَیں پوچھتا ہوں، کیا چاہتا ہے؟

بائی بیٹھ جا، کوئی بات نہیں، مَیں خود دیکھتا ہوں۔ یہ کہہ کر رفیق بلا جھجک دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اُس کے پیچھے بشیر بھی دوڑا کہ کہیں ظالم کلہاڑی نہ مار دے۔

عاقل کے ایک ہاتھ میں وہی صادق لوہار والی کلہاڑی اور دوسرے میں بختو کی زنجیر تھی۔ عاقل خاں رفیق کو دیکھتے ہی بولا، بھئی فیکے شیرا، بات یہ ہے کہ اپنی بختو 'کت' پر آ گئی ہے۔ سنا ہے چک بیدی والا میں رنگ علی شاہ کا کتا بڑا نسلی ہے۔ جلدی تیار ہو، چک بیدی میں رنگ شاہ کے کتے سے بختو پر پھیرا لگوا لائیں۔

رفیق نے پلٹ کر پاؤں میں جوتے اڑسے، صافا سر پر رکھا اور عاقل کے ساتھ چل پڑا۔

عاقل نے بختو کی زنجیر اپنے ہاتھ میں رکھی اور کلہاڑی رفیق کو پکڑاتے ہوئے بولا، فیکے شیرا، یہ کلہاڑی تم پکڑو، کمبخت صادق لوہار نے دس کلو لوہا اسی پر لگا دیا۔ اسے پکڑے میرے تو بازو آدھے رہ گئے۔ اتنی بھاری کلہاڑی میرے ہاتھ تھما دی، بھلا کوئی پوچھے، میں نے دلی فتح کرنی تھی؟

عصر کا سورج بائیں کاندھے پر تھا، دن کا اُجالا تھا، بادلوں کے گولے سروں پر اُڑ رہے تھے۔ اس عالم میں دونوں تنگوپے بختو کو لے کر گاؤں کے درمیان تیز قدموں سے نکل رہے تھے۔

اللہ یار پہلوان اور چاچا رفیق فرشتہ کا واقعہ

خیراب چاچے رفیق کا کام کھیتوں کھلیانوں میں ہی رہنے لگا۔ گاؤں کے لوگ اُسے فرشتہ کہتے تھے۔ گاؤں گاؤں اُس کی دھوم تھی مگر نہ تو اُس نے کبھی کبڈی کھیلی، نہ کُشتی لڑی۔ نہ کبوتر اُڑائے، نہ اِس طرح کے کھیل دیکھنے کا شوقین تھا۔ فقط مویشی پالنے کا رہین تھا لیکن ایک بار ایک مزے کا واقعہ ہوا۔ بات دراصل یہ تھی کہ ایک دفعہ ہمارے اردگرد کے گاؤں میں کُشتی کا مقابلہ ہوا۔ کُشتی کا کھاڑا ہمارے گاؤں میں جما۔ ایک پہلوان اللہ یار کھرل بہت مانا ہوا تھا بیس پہلوانوں کو شکست دے کر آخری مقابلے میں پہنچ گیا۔ ویسے تو یہ بات اُس کے لیے قابلِ تحسین تھی مگر جس قدر پہلوانی میں طاق تھا ویسا ظرف نہیں رکھتا تھا۔ اُس میں غرور ایسا تھا کہ ہر کُشتی جیتنے کے بعد میدان میں کھڑا للکارتا تھا کہ جس کا جی چاہے میدان میں آ جائے۔ جب اُس پہلوان نے اپنی آخری کُشتی جیت لی اور انعام اٹھا لیا تو عادت کے موافق وہی للکار پھر کرنے لگا۔ بڑھکیں مار کر مقابل میں کسی کو بلانے لگا۔ جتنے لوگ دائرے میں کھڑے تھے، کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اُس کی للکار کا جواب دے کر اپنی گردن تڑوائے۔ ادھر وہ مسلسل للکار رہا تھا کہ جس کا جی چاہے مقابلہ کر کے دیکھ لے، ابھی منہ کے بل زمین میں داب دوں گا۔ گاؤں والوں کو یہ بات اچھی نہ لگی مگر جی کڑا کر سب سنتے رہے۔

میاں شفیع محمد جو ہمارے گاؤں کا ایک قسم کا بڑا تھا، اُس نے کہا فرشتے کو بلاؤ بھئی۔ اس کی تھوڑی سی اکڑ تو ختم ہو۔ اِدھر چاچا رفیق اپنے کام تام میں جُتا ہوا۔ دو بندے اُسے ڈھونڈنے نکلے۔ عصر کا وقت تھا۔ یہ وقت اُس کے دودھ دوہنے کا تھا لیکن اُنھوں نے زور دیا کہ ابھی کھاڑے میں جانا ہے۔ اس نے بہت کہا، بھائی میری بھینسیں دودھ دوہنے کو کھڑی ہیں اور میں آپ کی پہلوانیوں میں پڑ جاؤں۔ اُنھوں نے اسے کہا بھائی معاملہ عزت بے عزتی کا آ پڑا ہے، چل کے آج علی کا نام لے کر میدان کی خبر لے۔ اب یہ مان کے نہیں دے رہا۔ کہنے لگا بھائی میں نے کبھی کُشتی کھیلی نہیں۔ کیوں میری جان مارتے ہو۔ یہ پہلوانوں کے کام ہیں اُنھیں سو داؤ پیچ آتے

ہیں۔ مَیں سیدھا سادا بھینسیں پالنے والا چت ہو جاؤں گا۔ میرا دادا یعنی میاں الہٰ دین بھی چار پائی پر بیٹھا منع کر رہا تھا۔ اس نے کہا دیکھو بھئی یہ تمھارے اور اُس پہلوان کے آپس کے معاملے ہیں۔ میرے بیٹے کو بیچ میں نہ ڈالو۔ آخری میاں شفیع خود پہنچ گیا اور کہا میاں الہٰ دین جیسا یہ تمھارا بیٹا ہے ویسے ہی میرا، مگر اس پہلوان کے لیے ہمارے پاس اور کوئی حل بھی نہیں ہے۔ بھینسیں آ کے دوہ لے گا۔ دو منٹ کا کام ہے۔ اور چاچے رفیق کو لے کر چل پڑے۔

کھاڑے میں پہنچے تو لوگ جو پہلے نہیں آئے تھے وہ بھی جمع ہو گئے۔ اب رفیق نے یہ کیا کہ پہلے میدان میں جا کر اُسے سمجھایا، اور کہا، بھائی الہٰ یار آپ پہلوان ہو، پہلوانوں کو تحمل اور بردباری زیب دیتی ہے تکبر اور ڈھیٹ پن اُنھیں عیب ہے۔ تُو نے کشتی جیت لی ہے اب اور کیا چاہتا ہے۔ اگر اس وقت مَیں ہار گیا تو مجھے کچھ فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ یہ میرا کام ہی نہیں ہے اور اگر تُو ہار گیا تو زمانہ تجھ پر ہنسے گا۔ ساری عمر کے لیے تیری پہلوانی ختم ہو جائے گی لیکن وہ پہلوان رفیق کی بات پر ہنس دیا اور کہا، باتیں نہ کر میدان میں آ۔ چنانچہ چاچے رفیق نے وہیں اپنی دھوتی کو جانگیے میں بدلا اور مقابلے کے لیے جم گیا۔ اب قصہ یہ تھا کہ پہلوان کی حرکتوں کی وجہ سے تمام تماشائی اُس کے خلاف ہو چکے تھے اور رفیق کے حق میں دعائیں مانگ رہے تھے اور معاملہ یہ تھا کہ رفیق کو پہلوانی کا کوئی گُر تو آتا نہیں تھا اور اس پہ یہ ڈر بھی تھا کہ پہلوان نے جو کہیں پہلو بدل کر دھوبی پٹڑا دے مارا تو سب کے سامنے بے عزتی خراب ہو جائے گی۔ لہٰذا کشتی کو ایک طرف رکھو اور کسی طرح پہلوان کو اس قابل ہی نہ چھوڑو کے وہ چت کرنے کے داؤ پیچ لگا سکے۔

آخر یہی ہوا کہ جیسے ہی دونوں سامنے ہوئے۔ رفیق نے یکدم اُس کے ہاتھ کی دستی پکڑ لی۔ پہلوان کے لیے یہ کوئی خرابی کی بات نہیں تھی لیکن اُس بے چارے کو کیا پتا تھا کہ یہ بندہ مجھے شکست دینے کی بجائے اپاہج کرنے آیا ہے۔ اسی اثنا میں رفیق نے اُس کی دستی ایسی زور سے دبائی کہ ایک دم کلائی کے چٹخنے کی آواز آئی۔ مطلب یہ کہ پہلوان کی کلائی ٹوٹ چکی تھی۔ اب وہ چیخ رہا تھا اور دستی چھڑانے کی کوشش میں تھا اور یہ چھوڑ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے سارے داؤ پیچ بھول کر درد سے بلبلانے لگا اور کلائی چھڑانے کی تگ و دو کرنے لگا مگر یہاں اُسے سامنا آدمی کی بجائے گویا فرشتے

سے تھا۔ چاچے رفیق کی انگلیاں گویا کلائی میں گھس گئی تھیں۔ پھر ایک ہی لمحے بعد رفیق نے اُس کی گردن کے پیچھے کاندھے پر ایسا مُکا مارا کہ وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ لیجیے مقابلہ ختم۔ میدان تالیوں سے گونج گیا۔ لوگوں نے چاچے رفیق کو کاندھے پر اُٹھا لیا مگر یہ جلد اُن کے کاندھوں سے اُتر کر اپنے گھر بھاگ آئے اور سلور کی بالٹی پکڑ کر بھینسوں کا دودھ دوہنے لگے لیکن جب اس ساری بات کا میاں جی کو پتا چلا تو وہ بہت غصے میں آ گئے۔ چاچے رفیق سمیت پورے گاؤں کو گالیاں دیتے جاتے تھے اور خُدا سے معافیاں مانگتے جاتے تھے۔ بعد میں سنا ہے پہلوان صاحب پہلوانی چھوڑ کر حکمت کرنے لگے کیونکہ حکیموں سے اپنی دستی اور گردن کے پٹھوں کا علاج کراتے کراتے خود حکیم بن گئے تھے۔

چھوڑ گئے دُنیا کے میلے

پھر یوں ہوا کہ ہمارے گھر میں ایک ایسا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا کہ سب کنبے کی ایک مرتبہ پھر کمر ٹوٹ گئی۔ ہوا یہ کہ ہمارے گاؤں میں ایک کمبخت آدمی تھا۔ مردود مر گیا۔ اب اُس کا نام لینا مجھے گوارا نہیں۔ وہ اپنے ساتھ چاچا رفیق کو لے گیا کہ شیشم کا ایک تنا اٹھا کر گڈھ پر رکھنا تھا۔ اُنھوں نے چاچے رفیق کو ایک طرف سے تنا اٹھانے پر لگا دیا اور خود تین چار آدمی دوسری طرف سے اٹھانے لگے۔ یہ شیشم کا تنا بہت موٹا اور بھاری تھا۔ جب چاچے رفیق نے اپنی طرف سے تنا اٹھا لیا تو ان کم ذاتوں نے ظلم کیا کہ اپنی طرف سے اُسے اچانک چھوڑ دیا۔ ایک دم اُس کا سارا وزن چاچے رفیق کے کاندھوں پر آ پڑا۔ اس بے پناہ وزن سے اُس کا سینہ پھٹ گیا اور منہ سے خون آنے لگا۔ جب گھر آیا تو حالت ٹھیک نہیں تھی لیکن اُس نے کسی کو نہیں بتایا۔ اماں دادی اُس سے پوچھتی رہ گئی، پتر رفیق میں تیری حالت ٹھیک نہیں دیکھ رہی۔ تجھے ہسپتال لے چلیں۔ تجھے آخر ہوا کیا ہے لیکن اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ بابا اللہ دین بھی چار پائی پر بیٹھا بیٹے کی حالت دیکھ رہا تھا۔ میرا والد کہتا ہے، رفیق کا صدمہ اتنا بڑا تھا کہ ہمارے پورے گھر کی عقلیں گویا سلب کر لی گئی تھیں۔ ہم اُسے دودھ اور دیسی گھی اور ہلدیاں دیتے رہے مگر اُس کے سینے کا درد کم نہ ہوا اور کچھ ہی دنوں بعد

ہسپتال لے جاتے ہوئے دم توڑ گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر صرف 29 سال تھی، سب سے بڑی حسرت ہماری یہ رہی کہ اُس نے زندگی بھر اپنے لیے کچھ نہیں مانگا، نہ اپنے لیے کوئی چیز خریدی۔ ہمیشہ دوسروں کی خاطر ہی زندگی بسر کی۔

اُس کے جانے کے بعد میری دادی کی حالت کیا ہوگی یہ مَیں نہیں جانتا۔ مَیں تو اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ مَیں نے یہ جو اُس کی باتیں آپ تک بیان کی ہیں، یہ سب اپنے والد، اپنی دادی اور گاؤں کے کچھ بوڑھوں سے سنی ہیں اور اُس عاقل خاں کی زبانی سنی ہیں جو اُس کا قریبی دوست تھا اور بہت بعد میں فوت ہوا جب مَیں بارہویں جماعت میں تھا۔

ترکھان تیرے صدقے

یہ 1958ء کا زمانہ تھا۔ ہمارے گاؤں میں ایک ترکھان ابراہیم تھا۔ یہ آدمی لکڑی اور راج گیری میں بہت ہُنر مند اور کاریگر تھا۔ والد صاحب کی اِس کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ اگرچہ وہ والد صاحب سے بیس پچیّس سال بڑا تھا مگر میرے والد کا قصہ یہ تھا کہ اُسے ہمیشہ سے پڑھے لکھے اور ہُنر مند لوگوں میں بیٹھنے اور ملنے جُلنے کا شوق رہا تھا۔ میرے دادا کو بھی چونکہ فارسی مثنویوں اور پنجابی کلام سے رغبت تھی، وہی رغبت والد صاحب کو بھی تھی۔ والد صاحب مستری ابراہیم کے پاس بیٹھنے اُٹھنے لگے اور اُس کا لکڑی کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ اِس سے یہ ہوا کہ اُس نے والد صاحب کے شوق کو دیکھتے ہوئے اپنے ساتھ راج گیری اور لکڑی کے کام میں لگا لیا۔ اگرچہ وہ والد صاحب کو محنت کا معاوضہ تو مزدُوروں کا دیتا تھا مگر کام راج گیری اور ترکھان گیری کا لیتا تھا لیکن یہ چیز والد صاحب کے لیے بھی فائدہ مند تھی۔ یوں گھر کا چولہا بھی برابر چلتا رہا اور والد صاحب کام بھی سیکھتے رہے۔ چاچا رفیق کے فوت ہو جانے کے بعد بھینسیں ایک دو کے علاوہ باقی جانور تو قریباً سب بِک گئے تھے۔ والد صاحب کو لکڑی اور راج گیری سیکھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ دو ہی سال میں سب کچھ نہایت عمدہ سیکھ لیا اور اُسے آزادانہ برتنے بھی لگے۔ اِسی اثنا میں مستری ابراہیم لاہور چلا گیا کیونکہ اُس کے باقی بھائی وہیں تھے۔ اِدھر اِس عرصہ میں والد صاحب

کا گاؤں میں ایک اور دوست بن چکا تھا۔ اُس کا نام شیر محمد لوہار تھا۔ شیر محمد بھی لکڑی کا بہترین کاریگر تھا۔ وہ اپنا کام کرنے کے بعد شیر محمد لوہار کے پاس ہی بیٹھنے اور اُٹھنے لگے۔ بقول والد صاحب یہ آدمی لکڑی کی اقسام اور اُس کی باریکیوں کا اتنا ماہر تھا کہ الاماں۔ اب والد صاحب نے راج گیری کے ساتھ لکڑی کے کام کے بھی تمام اوزار خرید لیے۔ اگرچہ اِس کام کو اُنھوں نے پیشے کے طور پر نہیں کیا مگر گھر میں استعمال ہونے والی لکڑی کی تمام چیزیں، دروازے اور چارپائیوں سمیت خود بنانے لگے۔ دوسری طرف اُن کا ادبی مطالعہ خودساختہ جاری رہا۔ جن میں خاص طور پر پنجابی کے تمام شاعروں کا کلام اُنھیں حفظ تھا۔ اُردو کے بھی اکثر شاعروں کے شعر، اقبال کی نظمیں زبانی یاد تھیں اور اہلِ بیتِ رسول ﷺ اور جناب امیر کے بھی عاشق تھے۔ تاریخ کا مطالعہ بھی بے پناہ تھا، مَیں حیران ہوں کہ اُن کے پاس یہ سب کچھ کرنے اور سیکھنے اور پڑھنے کا وقت کہاں سے نکلا۔

لڑکا موچی نکلا

ایک بات عرض کرتا چلوں کہ یہ گاؤں معمولی نہیں تھا بلکہ سرکاری طور پر ماڈل ولیج تھا، جس میں ڈسپنسری، جانوروں کا ہسپتال، ہیلتھ کیئر سنٹر، ڈاکخانہ، یونین کونسل اور لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ سکول تھے۔ سیدھی سڑکیں اور سڑکوں پر دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں۔

میاں شفیع، جس کا ذکر رفیق کے باب میں آ چکا ہے، کو گاؤں سنوارنے کا بڑا شوق تھا۔ اکثر خود کُھرپالے کر نالیوں سے کچرا نکالنا شروع کر دیتا تھا۔ اب گاؤں میں جس بھی سرکاری عمارت کو مرمت کرنا ہوتا یا وہ نئی بنانا ہوتی، وہ اُس کا کام میرے والد صاحب کی ایمانداری اور اپنے کام کے ساتھ لگن کے سبب اُنہی سے کراتا، جس کی وجہ سے والد صاحب کے ہاتھ کی صفائی بڑھتی چلی گئی اور معاشی طور پر بھی قدرے فاقوں سے بچت ہو گئی مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے یہ وہ رزق تھا، جو صرف فاقوں سے بچا پاتا تھا۔ کیونکہ پاکستان کی اشرافیہ نے مزدُوروں اور محنت کشوں کا معاوضہ اتنا کم رکھا ہے کہ وہ کبھی معاشی طور پر خوش حال نہیں ہو سکتے بلکہ دن رات محنت کرنے کے باوجود اگلے وقت کی روٹی کی فکر میں رہتے ہیں اور آئے روز یہ تیسری دُنیا کا نظام مزید استحصال یافتہ بنتا جاتا ہے۔ اُس کی

ایک مثال خود یہ میاں شفیع بھی تھے۔ اتنا اچھا آدمی ہونے کے باوجود نچلی قوموں (جنھیں خُدا جانے کس مردود نے نچلی کہا) سے اُس کا رویہ اشرافیہ والا ہی تھا۔ میرے والد صاحب بتاتے ہیں کہ ایک بار اِس کا رشتے دار ایک ڈی آئی جی پولیس آ گیا۔ وہ میاں شفیع کی بہت عزت کرتا تھا۔ اُس نے انھیں کہا، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔ میاں شفیع نے کہا ہمارے گاؤں کے کچھ لڑکوں کو پولیس میں رکھ لو۔ اُس نے کہا لڑکوں کے کاغذ مجھے دے دینا۔ اب میاں شفیع نے گاؤں میں تمام نوجوانوں کو جمع کیا اور کہا جس لڑکے نے بھی آٹھویں کلاس پاس کر لی ہے وہ اپنے کاغذ مجھے دے۔ دس پندرہ لڑکوں نے اپنے کاغذ یعنی آٹھویں جماعت پاس کے سرٹیفکیٹ میاں شفیع کے حوالے کر دیے۔ یہ لڑکے سب کھوکھروں اور بھٹی ذات کے تھے۔ اِن میں سے ایک لڑکے کے علاوہ باقی سب لڑکے پولیس میں کانسٹیبل ہو گئے۔ اُس لڑکے کے کاغذ میاں صاحب نے اُسے لا کر واپس کر دیے اور کہاں آپ کا نام آنے تک بھرتی پوری ہو گئی تھی۔ والد صاحب بتاتے ہیں دراصل اُن تمام لڑکوں میں یہی واحد لڑکا تھا جو دسویں جماعت پاس تھا لیکن بدقسمتی سے بے چارا موچی تھا۔ اب آپ خود ہی بتایئے جب اِس جیسے آدمی بھی یہ کرتے تھے تو اِس ملک کا کیسے خانہ برباد نہ ہو۔ مجھے تو لگتا ہے ہمارے ملک سے کبھی موچی پن ختم نہیں ہوگا۔

باب دوم

وے دن بھی آ گئے ہم آئے آب و گل میں

1971ء میں والد صاحب کی شادی ہو گئی۔ اُن کی بیوی، حمیدہ بی بی ہیں، جو خدا سلامت رکھے میری والدہ ہیں۔ 1972ء میں میری بڑی بہن خدیجہ بی بی پیدا ہوئی اور اُس کی پیدائش کے تین سال بعد یعنی 1975ء میں مَیں علی اکبر ناطق پیدا ہوا۔ میری بڑی بہن کا نام میرے دادا نے خدیجہ رکھا۔ جب مَیں پیدا ہوا تو میرا نام بھی دادا نے علی اکبر رکھا اور اُسی کے ساتھ فرما دیا اِس کے بعد جو بیٹا پیدا ہوگا، اُس کا نام علی اصغر ہوگا۔ لہٰذا مجھ سے تین سال بعد علی اصغر پیدا ہوا۔ جسے دادا جان نہ دیکھ سکے اور پہلے ہی فوت ہو گئے۔ مَیں نے پہلے بھی دادا جان کے باب میں لکھا ہے کہ جب فوت ہوئے مَیں ایک سال کا تھا۔ لہٰذا اُن کی شکل وصورت دیکھنے کا ہوش مجھے نہ تھا۔

ہمارا پہلا گھر

جس وقت کا مجھے ہوش ہے۔ وہ 80 کا زمانہ تھا۔ تب مَیں پانچ برس کا ہوں گا۔ ہمارا گھر کچا تھا لیکن بہت کھلا تھا۔ گھر کے چار کمرے تھے۔ تین ایک طرف اور ایک سامنے کی طرف تھا۔ ان

تین کمروں کے سامنے بڑا سا کچا صحن تھا۔ یہ صحن اور کمرے کچی مٹی اور بھوسے کو ملا کر لیپے گئے تھے۔ صحن میں دو ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ اِن تین کمروں میں سے دو میں میرے والدین رہتے تھے۔ ایک میں میری دادی اور میرے دو چچا رہتے تھے، دونوں کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جو اِن تین کمروں کے سامنے ایک کمرہ تھا وہاں بابا صدرالدین اور اُس کی بیوی اماں حلیمہ رہتے تھے۔ اِن کے صحن میں ایک بہت بڑی اور ہری بیری کا درخت تھا۔ اُس وقت گاؤں میں بجلی نہیں ہوتی تھی۔ سب گھروں میں لالٹینیں اور دیے جلاتے تھے۔ وہ بھی زیادہ تر کمروں کے اندر جلاتے تھے اور جب سونے لگتے تو اِن کی بتیاں بھی گُل کر دیتے۔ یوں چاروں طرف گھپ اندھیرا اور اُس اندھیرے میں خاموشی کے چراغ جلتے تھے۔ عشا کی نماز کے بعد جاگنے کا تصور نہیں ہوتا تھا۔ بس وہی لوگ جاگتے تھے جنھوں نے رات کے وقت اپنے کھیتوں کو پانی دینا ہوتا تھا اور نہر کے پانی کی باری ہوتی تھی باقی تمام خلقت سوتی تھی۔ پانی لگانے والوں کے علاوہ رات کے وقت نہ کوئی مسافر چلتا تھا اور نہ کام کرنے والا نظر آتا تھا۔ کھیتوں کو پانی لگانے والوں کے ہاتھ میں لالٹین ہوتی تھی یا پھر روشنی دینے والی بیٹریاں ہوتی تھیں جن میں سیل ڈالے جاتے تھے۔ البتہ ہمارے گھر میں ایک گیس بھی تھا۔ اِس گیس کی روشنی ایک بلب جتنی بلکہ اُس سے بھی زیادہ ہوتی تھی اور اِن میں ریشم کے دھاگے کا بلب لگا ہوتا تھا۔ مگر مَیں نے کبھی یہ گیس جلتے نہیں دیکھا۔ البتہ ہمارے گھر میں بھی ایک بیٹری اور لالٹین تھی۔ بعد میں موم بتیاں بھی نکل آئیں لیکن زیادہ تر غریب لوگوں کے گھر میں چھوٹے دیے ہوتے تھے جن میں مٹی کا تیل پڑتا تھا۔ اِس کی لَو سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھتا رہتا تھا جو کمرے کی دیوار اور چھت کو کالا سیاہ کر دیتا تھا۔ مَیں دیے کی لَو پر اکثر اپنی نظریں جما دیتا تھا اور دیر تک بغیر آنکھ جھپکے اُسے دیکھتا رہتا تھا۔ مَیں نے سنا تھا بغیر آنکھ جھپکے چراغ کی لَو کو دیکھنے سے لَو لمبی ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر میرے تجربے میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ چولھوں میں پاتھیوں اور لکڑیوں کی آگ جلتی تھی اور ہم بچے چولھے کے گرد بیٹھ کر گھی اور مکھن سے چوپڑی ہوئی روٹیاں کھاتے تھے۔ اُس کے ساتھ لسی کے چھنے پیتے تھے۔ اِسی دَوران صبح کے عالم میں چچا بھینسوں کا دودھ دوہ کر کر منڈل اماں دادی کے پاس رکھ دیتا تھا۔ ابا میاں تب کویت میں تھے۔ ہمارے اِس گھر میں

ہمارے پاس چار بھینسیں تھیں۔ یہ گھر کی جنوبی دیوار کے ساتھ دو کمروں میں بندھتی تھیں۔ ہمارے کوٹھوں کی چھتوں کے اوپر بیریوں کے بہت سے بیر گرتے تھے اور اکثر چھتوں پر بیریوں کا سایہ رہتا تھا۔

ہمارے گھر کے سامنے پانی کا کھالا تھا، اُس میں نہر کا پانی چلتا رہتا تھا۔ دروازے سے نکلتے ہی نالے پر ایک پُلی تھی۔ اِس پُلی سے گزر کر سڑک پر آتے تھے۔ یہ سڑک کچی تھی۔ گھر کے سامنے نالے کے کنارے پر ٹاہلیوں، بیریوں اور کیکروں کے بڑے درخت تھے اور گھر میں بھی تین چار درخت تھے۔ ایک بیری کا درخت مجھے ابھی تک بہت یاد آتا ہے۔ یہ ایک بڑے پتوں والی کم از کم پچاس فٹ اونچی بیری تھی۔ اِس کے گول گول لال سرخ بیر بہت زیادہ ہوتے تھے۔ ہرے پتے شیشوں کی طرح چمکتے تھے اور دن بھر گلہریوں اور پرندوں کی ڈاریں اِس کی شاخوں میں پروئی رہتی تھیں۔ اماں حلیمہ، یعنی بابا صدرالدین کی بیوی، میری دادی اماں فاطمہ اور میری والدہ اِسی بیری کی چھاؤں میں بیٹھتی تھیں۔ ہمارا گھر سڑک سے اونچا ٹیلا نما شکل میں تھا۔ مجھے یاد ہے میری والدہ اِسی بیری کے نیچے چرخا ڈال کر پونیاں کاتتی تھی۔ اماں حلیمہ اور میری والدہ کا آپس میں سلوک بہت اچھا تھا۔

دائیں جانب کے کیکر پر اکثر پھول لگے ہوتے تھے۔ نالے کی پُلی کو پار کرتے تو چوڑی اور کچی سڑک تھی۔ اِس سڑک کی دوسری جانب دائیں ہاتھ ماسی جیجاں کا گھر تھا۔ اِس گھر میں بہت سے کبوتر اور لسوڑے کا پیڑ ہوتا تھا۔ اِسی کے بائیں طرف ایک اور گھر تھا جو بابے محمد علی کا گھر تھا۔ یہ کہیں دُور سے ہمارا رشتے دار بھی تھا۔ مَیں نے بہت سی باتیں اور قصے اِس سے بھی سنے ہیں۔ جس کا بیان آگے آئے گا۔ اِس کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ اِس کے مکان بھی کچے تھے۔ مکان کے دونوں کونوں پر ایک ٹاہلی کا سوکھا تنا کاٹ کر بنیاد کے ساتھ پیوست کیا گیا تھا تاکہ کوئی گڈ یا دوسری بھاری شے مکان سے نہ ٹکرائے۔ یہ لکڑی کے تنے اکثر لوگ اپنے کچے مکانوں کے کونوں کے ساتھ رکھ لیتے تھے۔ مَیں اکثر اِس تنے پر بیٹھ جاتا تھا۔ یہ ایک اچھی چوکی بھی بن جاتی تھی۔ سڑک کے پار بائیں پہلو میں ایک موچی کی دُکان بھی تھی۔ اِس کا نام مھندہ موچی تھا۔ چمڑے کے جوتے

بناتا تھا۔ گاؤں کے اکثر لوگ اِس کی چھپری کے نیچے بیٹھے رہتے تھے۔ یہ موچی نماز وغیرہ نہیں پڑھتا تھا لیکن صبح سویرے نالے پر بیٹھ کر آدھ گھنٹا کُلیاں کرتا اور استغفار کرتا تھا۔ موچی کی دُکان کے عین سامنے یعنی ہمارے مکان کی پچھلی دیوار کے ساتھ ایک ماچھن کا بھٹ تھا جہاں وہ روٹیاں پکاتی تھی۔ ہمارے محلے کی کم و بیش تمام عورتیں شام کے وقت اپنی روٹیاں ماچھن کے اُسی بھٹ پر آ کر پکاتی تھیں۔ ماچھن اُس کے عوض ایک روٹی جتنا آٹا لیتی تھی۔ بھٹ سے اٹھتا ہوا دھواں بلکہ ہر گھر کے آنگن سے بلند ہوتا دھواں اِس بات کی علامت تھی کہ یہ گھر بھی آباد ہے اور اِنھیں کھانے کو روٹی بھی پکتی ہے کیسا زمانہ آ گیا ہے آج اگر کسی گھر سے دھواں اٹھتا دیکھیں تو یقین ہوتا ہے کہ یہاں آگ لگ گئی ہوگی۔ اِسی طرح پڑھے لکھے اور ان پڑھ گھروں میں فرق اتنا ہوتا تھا کہ جس گھر کا کوئی فرد ہیر وارث شاہ، بلھے شاہ یا میاں محمد بخش کی کتابیں پڑھ سکتا تھا وہ سارا گھر پڑھا لکھا کہلاتا تھا۔ اِس حساب سے ہمارا گھر بھی پڑھا لکھا تھا۔ جس گھر میں سائیکل ہوتی تھی وہ اچھا خاصا مڈل کلاسیا ہوتا تھا۔

لسوڑے کا درخت اور ربڑ کے جوتے

ماسی جیجاں کے گھر کی دیواریں بھی کچی تھیں اور دو کچے کوٹھے تھے۔ کوٹھے اور دیواریں بھوسے ملی مٹی سے لیپی ہوئی تھیں۔ دائیں ہاتھ ایک چھپر سا تھا جس کے نیچے چولھا تھا۔ صحن میں ایک بڑا لسوڑے کا پیڑ تھا۔ اگر کسی نے لسوڑے کا پیڑ دیکھا ہو تو اُسے معلوم ہے کہ یہ بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ اِس کی شاخیں نہایت ٹیڑھی میڑھی، گنجلک، لچک دار اور بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ پتے بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ یہ درخت بھی بہت گھنا اور بڑی موٹی شاخوں والا تھا۔ کم از کم سو سال پرانا تھا۔ مَیں اکثر اُس گھر میں کھیلنے کے لیے گھس جاتا تھا۔ ماسی جیجاں اور میری والدہ سہیلیاں تھیں۔ اکثر اوقات ایک دوسرے کے پاس بیٹھی دکھ سکھ کی باتیں کرتی تھیں۔ مَیں لسوڑے کے پیڑ پر گلہریوں کی طرح کبھی ایک ٹہنی پر اور کبھی دوسری ٹہنی پر پھدکتا رہتا تھا۔ اِس پر لسوڑوں کا پھل بہت زیادہ لگتا تھا۔ لسوڑے بہت موٹے اور میٹھے ہوتے تھے۔ اکثر تو اچار کے

لیے کچھ ہی توڑ لیے جاتے۔ پھر بھی اتنے بچ جاتے کہ ہم کھاتے کھاتے تھک جاتے مگر لسوڑے ختم نہ ہوتے۔ لسوڑے کے اس درخت پر چڑیاں اور کبوتر بھی بہت بیٹھتے تھے۔ کبوتروں کی ایک چھتری ماسی جیجاں کے گھر کے اوپر بھی ہوتی تھی، جہاں بے شمار کبوتر بیٹھتے۔

اصل میں مَیں یہ ساری باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ بعض مناظر میرے لیے مجسم کردار کی شکل اختیار کر چکے ہیں، جن سے میرے لاشعور نے کئی مناظر تخلیق کیے۔ یہ منظر بھی اُنھیں میں سے ایک ہے۔ میری ایک نظم اِسی منظر سے تخلیق ہوئی ہے، آپ بھی سن لیجیے....

لقے کبوتر پالنے والے

لقے کبوتر کس نے پالے، جس گھر گھگرے والی نار
جس گھر اُونچے بانس کی چھتری اور چھتری کے پھُمن چار
جس کی چھت پر چاند خدا کا اور بنیرے جالی دار
کھڑے بنیروں کے کنگروں پر سُرخ لہو کی پھیلی دھار
جس گھر دودھیا رنگ کے ہیرے اور ہیروں کی ناف اتار
جس گھر مال گلابی سارا، قصبہ جس کا پہرے دار
لقے کبوتر پالنے والے جگ بھیتر ہیں بس دو چار

لقے کبوتر جس نے پالے، اُس کے چونترے چھن چھن باجیں
ڈبلے گلے کی گانی والے گٹکوں گٹکوں بول کے بھاگیں
رات ستاروں والے دیوے لمبے دنوں کو سورج لاگیں
لمبے دنوں کی دُھوپ سنہری، دُھوپ میں مُندری والے جاگیں

لقے کبوتر پالنے والے باجرا چھڑ کے لاتے ہیں
لال کنالی آوی والی پانی سے بھرواتے ہیں
کاسنی باتھو کُوٹ کے پوچا آنگن میں پھرواتے ہیں
پھول لوَے کی توریوں والے کیوڑا بھر چھڑکاتے ہیں
گھاگھرے والی اور کبوتر رقص میں تیرتے جاتے ہیں
دیکھنے والے لوگ ندیدے آنکھوں کو سہلاتے ہیں
پتلے آب کے شیشے لے کر کوٹھوں پر آجاتے ہیں

ایک دفعہ میری والدہ نے مجھے شیخوں کی دُکان سے ربڑ کے جوتے خرید کر دیے۔ مَیں نے جب پہلی بار جوتے پہنے تو یوں لگا جیسے میرے پاؤں کے نیچے پَر باندھ دیے ہیں۔ محلے میں تب کوئی بچّہ ایسا نہیں تھا جس کے پاس جوتے ہوں۔ مَیں نے بھی اپنی ہوش میں جوتے پہلی بار پاؤں میں پہنے تھے لہٰذا جوتوں کا احساس مجھے اڑائے اڑائے پھر رہا تھا۔ مَیں ایک پاؤں اُٹھاتا تو دوسرا خود بخود اُٹھ جاتا۔ مَیں اپنے محلے میں پہلا بچّہ بن گیا جس کے پاؤں میں ربڑ کے بوٹ تھے۔ مَیں اِس لسوڑے کے پیڑ پر اب بوٹ ڈال کر چڑھنے لگا، مجھے بہت لُطف آتا تھا۔ ماسی جیجاں کا ایک بیٹا ارشد تھا۔ یہ کم و بیش میرا ہی ہم عمر تھا۔ جب اُس نے میرے پاؤں میں جوتے دیکھے تو اُس نے رونا شروع کر دیا کہ مجھے بھی جوتے چاہئیں۔ مَیں نے بھی جوتے پہن کر لسوڑے پر چڑھنا ہے۔ اُس نے بے انتہا سیاپا ڈال دیا۔ اُس کی ماں پریشان ہوگئی کہ اب کیا کرے؟ لیکن اُن کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ جوتے خرید لیتے۔ آخر اُس نے میری ماں سے شکایت کی کہ جب تمھارا بیٹا بوٹ پہن کر ہمارے لسوڑے پر چڑھتا ہے تو میرا بیٹا رو رو کر ندیاں بہا دیتا ہے اور جوتے مانگتا ہے۔ اُس کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن میری ماں نے میرے جوتے بھی اُتروا لیے۔ کہنے لگی یہ جوتے تمھارے پاؤں کو لگتے ہیں، تم لنگڑے ہو جاؤ گے لہٰذا یہ جوتے نہیں پہننے۔ مَیں تمھیں نئے جوتے لا کر دوں گی، یہ واپس کرنے ہیں۔ مَیں بہت رویا اور چیخا چلّایا، لیٹنیاں لیں اور وضاحتیں

کہیں کہ یہ میرے پاؤں کو نہیں لگتے۔ وہ نہیں مانی اور جوتے زبردستی پاؤں سے کھینچ لیے۔ پھر اللہ جانتا ہے اُس نے وہ جوتے کہاں پھینکے۔ اصل میں میری ماں کے پاس بھی اتنے پیسے نہیں تھے کہ اپنی سہیلی کے بیٹے کو جوتے لے دیتی، اُس نے میرے بھی اُتروا لیے۔ پھر اِس واقعے کے غالباً چھ ماہ بعد مجھے پہننے کو جوتے ملے لیکن اب جوتے پہننے کا احساس پہلے والا نہیں تھا۔

دھاگے کا اژدھا

والد صاحب کے اکثر دوست اُن کی اپنی عمر سے کافی بڑے تھے۔ اُنھی میں ایک بابا رمضان تھا۔ بابا رمضان گاؤں میں ارائیں خاندان میں سے تھا۔ بوڑھا آدمی تھا۔ اِس کے منہ میں کوئی دانت نہیں تھا۔ بات کرتا تو منہ ایک بڑے کوزے کی طرح کھل جاتا، جس کے اندر زبان کے چلنے کی باقاعدہ آواز آتی تھی۔ زمینداری کرتا تھا۔ والد صاحب کے ساتھ اِس کی کافی سلام دعا تھی۔ مَیں اِس کے چہرے کی ہیئت اور منہ کی ساخت سے ڈرتا تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے ٹاہلی کے درخت کے نیچے چارپائی پر آ کر اکثر بیٹھ جاتا تھا۔ والد صاحب سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ حیرت کی بات ہے جتنا مَیں اِن کو دیکھ کر دور رہتا تھا اتنا ہی والد صاحب اپنے تمام دوستوں میں اِس کی تعریف زیادہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ عید کا دن تھا۔ عید کی نماز ہمیشہ سکول کے کھلے میدان میں پڑھی جاتی تھی اور یہ سکول ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔ چنانچہ عید کی نماز پڑھنے جتنے لوگ بھی آتے تھے وہ ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتے تھے۔ گاؤں میں چونکہ ہمارے علاوہ نہ کوئی شیعہ کا گھر تھا اور نہ شیعہ مولوی تھا۔ لہذا ہم بھی گاؤں کے ساتھ اتفاق پیدا کرنے کے لیے اُسی سکول میں عید کی نماز پڑھتے تھے۔ اُس دن بھی والد صاحب میری اُنگلی پکڑے عید کی نماز پڑھنے سکول کی طرف چل پڑے۔ نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میرا رنگ روپ کافی گورا چٹا تھا۔ نئے کپڑوں کی وجہ سے مزید نکھر گیا، سکول کے میدان میں پہنچے تو وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ اُن سے والد صاحب گلے ملنے لگے۔ اتنے میں وہی بابا رمضان بھی آ گیا۔ مجھے والد صاحب نے حکم دیا کہ بابے رمضان کو سلام کرو۔ مَیں ڈرتا ہوا تھوڑا سا آگے بڑھا اور اُنھیں سلام کیا، بابے رمضان

نے خوش ہو کر مجھے کمر میں ہاتھ ڈال کر اوپر اٹھا لیا اور ایک دم بڑا سا قہقہہ لگایا اور ماتھا چوما۔ اس حالت میں اُس کا منہ بالکل میری آنکھوں پر ایسے کھلا جیسے ایک بڑے سے سانپ کا منہ کھل گیا ہو اور وہ مجھے ہڑپ کرنے لگا ہو۔ مَیں ایک دم ڈر گیا اور چیخیں مار کر رونے لگا۔ اُس نے گھبرا کر مجھے چھوڑ دیا۔ مَیں سہم کر اپنے والد کی گود میں سمٹ گیا اور بہت زیادہ خوفزدہ ہو گیا۔ والد صاحب مجھے جلدی سے گھر لے آئے۔ گھر آتے ہی مجھے شدید بخار ہو گیا۔ اب یہ ہوا کہ بابے رمضان کا چہرہ میری آنکھوں پر چپک کر رہ گیا۔ مَیں جیسے ہی آنکھیں بند کرتا تو عجیب سا منظر بن جاتا۔

اُسی رات جب میں سویا تو مجھے خواب آیا کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک نہایت باریک سا دھاگا لرز رہا تھا۔ مَیں اُس دھاگے کو غور سے دیکھنے لگتا ہوں تو وہ آہستہ آہستہ موٹا ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ موٹا ہونے کے ساتھ ساتھ ہیبت ناک ہوتا چلا جاتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں وہ سانپ بن جاتا ہے۔ اُس سانپ کا چہرہ بالکل میرے سامنے ہوتا ہے۔ پھر وہ سانپ تیزی سے نہایت طاقتور اور موٹا ہوتا چلا جاتا اور میرے خوف میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ سانپ اژدھے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اُس کا منہ ایک پہاڑ کی چٹان کی طرح بڑا ہو جاتا ہے اور وہ اپنا منہ کھول کر ایک دم مجھ پر جھپٹتا ہے۔ اُسی وقت میری چیخ بلند ہوتی ہے۔ میری چیخ خواب سے نکل کر حقیقت کا روپ دھار جاتی ہے۔ اِس چیخ سے میری والدہ اور والد اور دادی پریشان ہو کر بھاگ کر میری چارپائی کے پاس آئے۔ مَیں چونکہ دادی اماں ہی کے ساتھ سوتا تھا۔ وہ سب سے زیادہ گھبرائی۔ سب نے مجھے دلاسا دیا لیکن مَیں اب بہت ڈر چکا تھا۔ میرا بخار مزید تیز ہو گیا۔ صبح اُٹھے تو ڈاکٹر کے پاس دوائی لینے گئے۔ ڈاکٹر نے بخار کی دوائی دے دی۔ گھر میں سب نے تصور کر لیا کہ مَیں بخار کی وجہ سے ڈر گیا ہوں۔ لیکن اب یہ خواب معمول بن گیا۔ جیسے ہی مَیں سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا، وہی کچھ عمل دوبارہ شروع ہو جاتا۔ دھاگے سے سانپ، سانپ سے اژدھا اور پھر اژدھے کا منہ کھول کر ہڑپ کرنے کی کوشش۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ روز بہ روز میری چیخوں نے پورے گھر کو پریشان کر دیا۔ اب تعویذ گنڈے کروائے جانے لگے۔ دادی اماں پانی دم کر کے مجھے پر چھڑکنے لگی لیکن خواب بند ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ چنانچہ مَیں پندرہ بیس دن بخار میں جکڑا گیا۔

آہستہ آہستہ یہی خواب تصور کی شکل اختیار کر گیا اور بیداری کی حالت میں بھی اِسی طرح محسوس ہونے لگا۔ بیس دن کے بعد میرا بخار ختم ہوا۔ خواب کی تصویریں اور دھندلکے بھی کم ہوتے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ تمام چیزیں میرے لاشعور میں چلی گئیں اور کبھی کبھار اُبھر کر سامنے آتیں لیکن اب میری اُن سے ڈرنے کی کیفیت بالکل نہ رہی تھی بالکل ایک قسم کا کھیل بن گیا تھا۔ البتہ مَیں نے اُس وقت کے بعد بابے رمضان کا سامنا نہیں کیا حتیٰ کہ وہ فوت ہو گیا مگر یہ حقیقت ہے کہ میری زندگی کی خوفناک شے، جس کا سامنا کرنے سے مجھے اذیت ہوتی ہے، وہ سانپ ہی ہے۔ مجھے اِس جانور سے نہایت درجے کی کراہت اور دشمنی ہے۔ مَیں سانپ کو کسی بھی طرح سے زندہ چھوڑ دینے کے حق میں نہیں ہوں لیکن کیا کیجیے کہ زندگی کی رفتار میں ہر دوسرا آدمی سانپ کی شکل میں موجود ہے، جن سے گریز ممکن نہیں۔

خراس اور چینے پروں کی تیتریاں

اِس دَور میں ہماری والدہ اکثر ہمیں لے کر اپنے والد میاں عزیزالدین کے ہاں رینالہ چلی آتی۔ رینالہ ایک خوب صورت شہر تھا۔ بہت چھوٹا سا، نہ ہجوم اور نہ کسی قسم کی گندگی تھی۔ یہاں دو نہریں بہتی تھیں۔ انگریزوں کی بنائی ہوئی نہری کوٹھیاں تھیں اور جامنوں کے اَن گنت باغات تھے۔

رینالہ شہر کے پاس ہی ایک گاؤں تھا۔ یہ بہت زیادہ ہرا بھرا علاقہ تھا۔ نانا کے گھر کے ہمسائے میں ایک ترکھانوں کا گھر تھا۔ اُن کے دروازے کے عین باہر نہایت کُھلی جگہ تھی جہاں گندم، چنے اور دیگر اجناس پیسنے کا ایک بڑا سا خراس تھا۔ اِس میں ایک اونٹ جُتا ہوتا جو خراس کو چلاتا تھا۔ اُسی ترکھان کے گھر میں بہت ساری چینے پروں کی تیتریاں بھی تھیں۔ کم از کم 30 کے قریب ہوں گی۔ یہ نہایت خوب صورت اور کالے سفید پروں والی تیتریاں بہت موٹی تازی ہوتی تھیں اور اکثر خراس والے صحن یا گھر کے باہر کھلی سڑک پر پھرتی رہتیں۔ انڈے بھی دیتی تھیں۔ جب بولتیں تو کانوں میں سُروں کے رس گھول دیتیں۔ بعض دفعہ مَیں ان کو پکڑ بھی لیتا۔ موٹی تازی ہونے کی وجہ سے مُرغی جیسی ہو گئی تھیں اور زیادہ اُڑ نہیں سکتی تھیں۔ جب بھی خراس چلنا شروع ہوتا

میرے کانوں میں اُس کے گھوں گھوں کی آواز آتی تو میں گھر سے فوراً بھاگ کر باہر آجاتا۔ میاں اللہ رکھا ترکھان مجھے پکڑ کر اونٹ ہانکنے کے لیے خراس کی گادھی پر بٹھا دیتا۔ پھر تو دائرے میں چلتے اونٹ اور خراس کی گادھی کی لچک سے ایسے جھولے آتے، کچھ نہ پوچھیے۔ اُن دنوں موٹر گاڑیوں اور رکشوں اور مولویوں کے سپیکروں کا شور تو ہوتا نہیں تھا اِس لیے خراس کے چلنے کی مدھم لَے مجھے موسیقی معلوم ہوتی تھی اور میں اُس آواز اور گادھی کے جھولے کی سرشاری میں کہیں ایسا ڈوبتا کہ کسی دُور پریوں کے دیس میں چلا جاتا۔ عین اُسی لمحے دو چار وہی تیتریاں خراس کے دائرے میں داخل ہو جاتیں اور پیچھے پیچھے بھاگنے لگتیں۔ کبھی ایک آدھ اُڑ کر میری جھولی میں بھی بیٹھ جاتی اور کوئی اُڑ کر اونٹ کے کوہان پر چڑھ جاتی۔ ترکھان کو اونٹ ہانکنے کی ذرا فکر نہ رہتی کہ یہ کام اُس کا مَیں اور وہ تیتریاں بخوبی انجام دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ تیتریاں مجھ سے ایسی واقف ہوئیں کہ ذرا جھجکتی اور ہچکچاتی نہ تھیں۔ میرے آگے پیچھے پھرتی رہتیں۔ بھائی میاں کیا بتاؤں وہ زمانہ کیسے سادہ سادہ اور بلیک اینڈ وائٹ تصویروں کی طرح معصوم تھا۔ اکثر ترکھان کی بیوی باہر آتی اور اُس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی شے مٹھائی یا حلوے کی شکل میں ہوتی اور مجھے دے کر اندر چلی جاتی۔ اُس وقت مَیں تو نہیں جانتا تھا کہ مَیں اِن بوڑھے بوڑھی کو مفت کا ہانکیہ ملا ہوں۔ بہت پیار کرتی۔ آج وہ زمانہ خواب ہو گیا۔ ہمارے نانا نہ رہے ماموؤں سے کبھی بن نہ سکی بلکہ وہ بھی اُس جگہ سے کہیں چلے گئے اور گھر بیچ گئے۔ پچھلے دنوں وہاں جانا ہوا تو دیکھا! نہ وہاں خراس تھا، نہ چینے پروں کی تیتریاں تھیں، نہ کُھلی اور صاف ستھری سڑک تھی۔ گاؤں کو شہر نے کھا لیا تھا۔ سب کچھ کوئی دیوزاد زمانہ بہا کر لے گیا اور وہاں چھوڑ گیا لوہے کے شٹروں والی دُکانیں، رکشوں اور سپیکروں کا شور اور گاہکوں کی جیبوں پر رال ٹپکاتے دُکاندار۔ خدایا کیوں شہروں کی ہوس میں گاؤں کی سادگی لٹی جاتی ہے۔ میاں اب وہاں ساتھ احساس تو کیا ساتھ زمانہ بھی نہیں ہے۔

خیر یہی چند سال اُس گاؤں کی سیر کے تھے جو بہت خوب رہے۔ ایک دن نانا فوت ہو گئے اور ہمارا وہاں جانا موقوف ہو گیا۔ اِن کے یوں تو چار بھائی تھے مگر وہ سب کے سب نہایت احمق، ضدی، ہٹ دھرم اور بدلحاظ تھے۔ اکثر لڑائی فساد پر تُلے رہتے تھے۔ چنانچہ والدہ اُن کے پاس

کبھی نہیں گئی۔ اُن میں سے ایک ماموں فوج میں تھے۔ بنگال میں قیدی بھی ہوئے۔ بنگال سے چھوٹ کر آئے تو پورے خاندان پر فوجی دھاک بٹھانا شروع کر دی۔ نماز اور روزے کے پابند تھے۔ بچوں کو صبح کی نماز پڑھانے کے لیے اٹھانے کا طریقہ یہ تھا کہ سرہانے پر کھڑے ہو کر سوئے ہوئے لڑکے کے سر میں جوتے مارنے شروع کر دیتے۔ بیگم کو ذری ذری سی بات میں باکسنگ پہ رکھ لیتے۔ اُنھیں ہر روز نیا دانت لگوانا پڑتا۔ چھوٹے بچوں سے محبت کا عجیب طریقہ یہ تھا کہ جس پر پیار آتا اُس کے منہ کے قریب سے مُکّا لہرا کر ڈراتے۔ اسی پیار میں ایک بار ایک بچہ شدید ڈر گیا اور اپنے منہ کو بدقسمتی سے اُسی طرف پھیر بیٹھا جس طرف یہ حضرت اپنا مُکّا خالی لے جانا چاہتے تھے۔ نتیجتاً مکا سیدھا اُس کے جبڑے پر لگا۔ اُس کا ایک دانت پھٹاک سے باہر نکل آیا اور خون جاری ہو گیا۔ بچہ دس دن ہسپتال میں رہا۔

جہاز سے چھلانگ لگاتے ہوئے ایک دفعہ پیراشوٹ سمیت درخت پہ اٹک گئے اور ٹانگ میں گولی بھی کھائی۔ اس سبب ٹانگ میں لنگ پیدا ہو گیا تھا۔ بہاولپور چھاؤنی میں پوسٹ تھے۔ ایک دفعہ جب میرے والد کویت میں تھے اور میری عمر بمشکل چھ سال تھی۔ میری والدہ ہم بہن بھائیوں کو بہاولپور چھاؤنی میں اُن کے پاس لے گئی۔ وہاں عجب تماشے دیکھنے کو ملے۔ صاحب نے پورا فوجی نظام گھر میں قائم کیا ہوا تھا۔ ایک دن وہاں ایک عجیب قضیہ ہوا۔ جس کے سبب دوبارہ اُن کے ہاں جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ چلتے چلتے وہ مزیدار قضیہ بھی سنتے جایئے۔

میرا کورٹ مارشل

فوجی ماموں بچوں کو فوجی پریڈ سے لے کر فرضی توپ اور گولہ بارود چلانے کی مشق اور الٹری کے گُر سکھاتے تھے۔ ہر کردار جو وہ رنگروٹوں یا سپاہیوں پر آزماتے تھے گھر میں اُس کی مشق ہوبہو کراتے تھے۔ غلطی پر پٹھو لگاتے اور یہ سزا ضروری نہیں کہ گھر کے مردوں پر ہی جاری ہوتی، عورتیں بھی اس کی زد میں آتی تھیں۔

روز کسی نہ کسی وجہ سے سب گھر والے 'ہولڈ' کرا دیے جاتے۔ ہولڈ کا مطلب سارے گھر کا

لائن باندھ کر ہاتھ اوپر کر کے کھڑے ہونا تھا۔ اُس کے بعد اپنی بید لے کر تفتیش شروع کر دیتے اور مجرم کو شناخت کر کے کورٹ مارشل کرتے۔ کورٹ مارشل کی سزا سارا دن بھوک اور چھ میل پیدل چلنے کی تھی اور اِس میں کسی مرد، عورت، بوڑھے، بچّے کی تخصیص نہیں تھی۔ جب تک مجرم ثابت نہ ہوتا سارا گھر ہولڈنگ پہ رہتا۔ یہ کورٹ مارشل قریباً روز ہوتا تھا یعنی دروازے کی چٹخنی ٹوٹی تو کورٹ مارشل، سالن ٹھیک نہیں پکا تو کورٹ مارشل۔ واش روم صاف نہیں تو کورٹ مارشل۔ کسی پہ زیادہ پیار آیا تو کورٹ مارشل۔ نوکر چونکہ روز روز کورٹ مارشل کی تاب نہ لا سکتے تھے لہٰذا بھاگ جاتے مگر گھر والے کہاں جاتے۔ مجھے اپنے کورٹ مارشل کی فکر رہتی اور روز امی سے ضد کرتا کہ یہاں سے نکلیں۔

ایک دن صاحب ڈیوٹی پر نکلے تھے، مجھ سے اچار کا مرتبان گر کر ٹوٹ گیا۔ پورے گھر میں سناٹا چھا گیا۔ میری آنکھوں میں کورٹ مارشل تیرنے لگا۔ والدہ نے میرے ماموں زاد سے کہا، 'بھئی ہمیں ابھی بس اڈے پر چھوڑ کر آؤ۔

ماموں زاد نے امی سے کہا، ''پھوپھی جان! آپ اپنے بیٹے کو لے جائیں گی تو اس کے بدلے میرا کورٹ مارشل ہو جائے گا کیونکہ کورٹ مارشل تو ہر حالت میں ہونا ہے۔''

والدہ نے کہا، ''کچھ بھی ہو جائے مَیں تو اپنے معصوم بچّے کا کورٹ مارشل نہ ہونے دوں گی۔ جلد ہمیں بس اڈے چھوڑ کر آ۔''

ماموں زاد نے کہا، ''پھوپھی! اِس شرط پر چھوڑ کر آتا ہوں کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ اور چھ مہینے واپس نہ آنے دو۔''

امی نے اُسے بھی اپنے ساتھ لیا۔ پھر ہم ماموں صاحب کے گھر آنے سے پہلے ریل گاڑی پر بیٹھ کے اوکاڑہ کے لیے نکل پڑے اور میں کورٹ مارشل سے بچ گیا۔

سنا ہے ایک عرصہ تک ماموں تلملاتے رہے کہ کورٹ مارشل کیسے کروں؟ ہم جو دو مہینے کے لیے رہنے گئے تھے، کورٹ مارشل کے ڈر سے دو ہفتوں میں واپس آ گئے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ آج سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے، ہماری پوری قوم ستر سال سے ہولڈنگ اور کورٹ مارشلوں میں جی رہی ہے اور ہماری طرح اس کے پاس یہ سہولت نہیں کہ کہیں بھاگ کر جان چھڑا لے۔

بھٹو کی سات مرلہ سکیم

بابا صدرالدین اور اماں حلیمہ اپنی موت تک ہمارے ہی گھر میں رہے۔ ہم اس گھر میں 1985ء تک رہے۔ پھر اسے چھوڑ دیا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اس گھر کے پچھلی طرف ایک کنال کا بڑا گھر تھا۔ یہ گھر ریکوال ذات کے کسی آدمی کا تھا۔ اُس گھر کے صحن میں بھی ایک بہت بڑی بیری تھی جس پر منوں کے حساب سے گول اور سُرخ بیر لگتے تھے اور آدھا گاؤں کھاتا تھا۔ ریکوال ذات کا یہی ایک واحد گھر تھا جو اکیلا ہی ہمارے گاؤں میں تھا۔ گاؤں کی زیادہ آبادی بھٹی خاندان کے لوگوں کی تھی۔ یہ لوگ چور پیشہ اور بدمعاش قسم کے تھے۔ بھٹیوں نے ریکوالوں کے گھر پر قبضہ کر لیا اور اب اُن کی نظر ہمارے گھر پر لگ گئی۔ گاؤں میں ہمارا بھی ایک ہی گھر تھا۔ اُنھوں نے زور زبردستی تقاضا شروع کر دیا کہ اسے خالی کریں یہ بھی ہماری جگہ ہے۔ والد صاحب اُن کے کسی دھکے میں نہیں آئے۔ اُنہی دِنوں یہ ہوا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے مُلک میں غریبوں اور بے گھر مہاجرین کے لیے فی خاندان پانچ اور سات مرلہ کے پلاٹ دینے شروع کیے۔ ہمارے گاؤں کے لیے بھی گاؤں کے مضاف کی زمین میں سو پلاٹ مختص ہوئے۔ والد صاحب گاؤں کی سیاست میں دخیل ہو چکے تھے اور بھٹو کے کارکن بن گئے تھے بلکہ گاؤں میں سب سے پہلے میرے والد اور اُستاد فضل حسین اور صادق بھٹی ہی واحد تین لوگ بھٹو کی پارٹی میں تھے۔ مگر جب بھٹو حکومت میں آ گیا تو حسبِ معمول اشرافیہ نے پارٹی پر قبضہ کر لیا۔ لہٰذا ہمارے گاؤں کے طاقتوروں نے بھی پیپلز پارٹی پر قبضہ جمایا مگر پُرانا رُکن ہونے کے ناطے پلاٹ الاٹ کرنے والی کمیٹی میں میرے والد کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اُس وقت میاں شفیع فوت ہو چکا تھا اور اُس کا بڑا بیٹا میاں سرور گاؤں کا نمایندہ تھا۔ مگر اُن سو پلاٹوں میں سے پچھتر پلاٹس پر بھٹیوں نے قبضہ جما لیا حالانکہ اُن کے پاس پہلے ہی رہنے کو وافر جگہ تھی۔ اِن پر اُن کا کوئی حق نہیں تھا۔ بعد میں وہی پلاٹ اُنھوں نے غریبوں کو بیچ کر پیسے کھرے کیے۔ باقی کے پچیس پلاٹس بھی اُن لوگوں نے قبضے میں لے لیے جو ذرا قلم دوات اور کاغذ سے تھوڑا بہت واقف تھے اور کچھ احتجاج کے جلسے بھی منہ سے نکال سکتے تھے۔ باقی جیسا کہ کسی زبان کی کہاوت ہے، زمین اللہ کی، قبضہ طاقتور کا اور روتے دھوتے رہی کمزور کی۔

سفر در پیش ہے ہم سفراں

اُنھی دِنوں بھٹو نے مڈل ایسٹ اور سعودی عرب کے ساتھ پاکستانی لیبر کا معاہدہ کیا۔ معاملہ یہ ہوا کہ اِن ملکوں میں تیل نکلنے کے سبب جب پیسوں کی ریل پیل شروع ہوئی تو اُن کا ارادہ بنا کہ بدوانہ زندگی ترک کر کے شہر بسائے جائیں۔ چنانچہ اُس کے لیے صنعت وحرفت کا پیشہ رکھنے والے تمام محنت کشوں کی ضرورت تھی۔ بھٹو نے کہا وہ ضرورت مَیں پوری کرتا ہوں۔ چنانچہ پاکستان بھر میں سے راج گیر، مزدور اور دیگر ورکرز کی ایک بڑی کھیپ قریب چھ لاکھ افراد کو سعودی عرب پہنچانے کا معاہدہ کیا گیا۔ اِن سب کے ویزے اور ٹکٹ فری تھے۔ اُن میں میرے والد کا ویزا بھی لگ گیا لیکن پاکستان اور اُس کی عوام کی بدقسمتی کہ بھٹو کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور ایک ملعون جنرل ضیا نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے ہر شعبے میں فوجی ڈفر بھر دیے۔ رشوت اور 'لیگ پلنگ' عام کر دی۔ بندوق کو ہوا دی اور شرافت کو دغا دی۔ اوورسیز منسٹری میں بھی جرنیل بٹھا دیے۔ اُنھوں نے مغربی کنسٹرکشن کمپنیوں سے پیسے مانگنے شروع کر دیے۔ کمپنیز کے سینیٹر نے سعودی گورنمنٹ کو شکایت کر دی۔ اُنھوں نے زچ ہو کر پاکستان کے تمام ویزے کینسل کر دیے اور پوری لیبر انڈیا سے منگوالی۔ یہ اتنا بڑا نقصان تھا جس کا ازالہ آج تک نہیں ہو سکا اور آج بھی یہی کچھ چل رہا ہے۔

اِدھر والد صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ پاکستان سے نکلے بغیر حالات ٹھیک ہونے والے نہیں ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے باہر جانے کی کوشش جاری رکھی اور بالآخر 1980ء میں 9 ہزار روپیا دے کر کویت کا ویزا لگوایا۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی جسے اکٹھا کرنا آسان نہ تھا۔ مگر پندرہ بیس لوگوں سے یہ پیسے ادھار لیے اور نکل گئے۔

مَیں اُن دِنوں بہت چھوٹا تھا جب وہ کویت میں تھے۔ وہ اپنے خطوں میں کویت کے بہت سے حالات بیان کرتے رہے ہیں۔ یہ خط ہمارے گھر میں دس پندرہ سال تک پڑے رہے، پھر اللہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ مَیں نے جب پڑھے، آٹھویں کلاس میں تھا۔ اِن خطوں میں ایک بات والد صاحب نے بہت دفعہ لکھی تھی، وہ تھا صحرا کا ذکر۔ وہ جس کمپنی کے ساتھ کام کر رہے تھے

اُس نے شہری کالونیاں بنانا تھیں اور یہ سارا کام کویت کے صحراؤں میں تھا۔ والد صاحب کہتے ہیں۔کویت کے بدو بیابانوں میں خیمے لگا کر رہتے تھے۔ایک دو مہینے بعد وہ خیمہ وہیں چھوڑ کر ایک نئی جگہ پر نیا خیمہ لگا لیتے تھے اور پُرانے خیمے میں جتنا سامان وغیرہ پڑا ہوتا تھا۔ اُنھیں کویتی گورنمنٹ اکٹھا کرتی پھرتی تھی تا کہ صحرا میں گند نہ پھیلے۔ یہ سیکنڈ ہینڈ خیمے اور سامان وہ افریقہ کے مسلمان ملکوں کو ہدیہ کر دیتے تھے۔ چونکہ اُس وقت کویت گورنمنٹ اور کویتی عوام کے پاس بہت پیسا آ رہا تھا۔ اس لیے اُنھیں اِس ضیاع کی ذرا پروا نہیں تھی۔کویت کے بدوؤں کی مرغوب غذا اونٹ کا گوشت اور اونٹ ہی کا دودھ تھا۔ دنبے بھی کھاتے تھے مگر اونٹ کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ باز اُڑاتے تھے۔ ثابت دنبوں اور اونٹوں میں چاول بھر کر اُنھیں آگ کے سُرخ کوئلوں میں داب دیتے تھے۔ پھر شام کے وقت صحرا میں ایک بہت لمبا چوڑا دسترخوان بچھا کر جانوروں کی طرح اُس کو کھاتے تھے۔غیر کویتیوں کو بہت حقیر سمجھتے تھے۔ اگر چہ ان کے پاس بڑی بڑی امریکی گاڑیاں آ گئی تھیں مگر اونٹ پر بیٹھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ اِن کے امیر ترین کویتی بھی اونٹ چرانے کو فخر سمجھتے تھے۔ صحرا میں جب شام کا وقت ہوتا تھا تو یہ وقت اِن کے لیے جنّت کے موسم سے کم نہیں تھا۔ گورنمنٹ اِنھیں خیموں اور بیابانوں سے پکڑ کر شہری کالونیوں میں آباد کرتی تھی لیکن یہ موقع پا کر پھر صحرا میں بھاگ جاتے تھے۔کویت کی کرنسی اُس وقت بھی دُنیا کی سب سے بڑی کرنسی تھی اور یہ بات کویتی اچھی طرح جانتے تھے اس لیے محنت کا معاوضہ طے کرتے وقت اپنی اور مزدُور کے ملک کی مشترکہ قیمت نکال کر اتنی ہی مزدُوری دیتے تھے جو مزدُور کو زیادہ امیر ہونے سے بچا لے۔

والد صاحب یہاں ڈھائی سال رہے۔ اُن کے کویت جانے کے چھ مہینے بعد ہم پر قدرے معاشی کشادگی شروع ہو گئی۔

باب سوم

مکتب جانے کا دلچسپ قصہ

یہ سردیوں کی میٹھی دھوپ تھی۔ سکول کا میدان بہت وسیع تھا۔ میدان کی گھاس سوکھی ہوئی مگر اُس کی جڑیں ٹھنڈی اور لمبی تھیں۔ اُن کو چھونے سے سردی کا احساس بڑھ جاتا تھا۔ سکول گاؤں کے مغرب میں تھا۔ اُس کے تین طرف کھیت تھے۔ سکول میں ٹاہلی، نیم اور پیپل کے اونچے درخت تھے اور سب میدان کے چاروں کناروں پر تھے۔ شمال کی طرف کی دیوار کے پار ایک کچی سڑک گزرتی تھی۔ چونکہ سکول کی چاردیواری بھی کچی تھی اور مشکل سے تین فٹ اونچی تھی اِس لیے سڑک پر سے گزرتی ہوئی گائیں بھینسیں اور اُن کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں صاف نظر آتی تھیں۔ چرواہے بھی اِسی سڑک سے اپنی بھیڑیں گزار کر لے جاتے تھے۔ بھیڑیں آہستہ آہستہ گزرتی ہوئی ایسے جاتی تھیں جیسے وقت مجسم ہو کر ہلکے قدموں سے چل رہا ہو۔ بھیڑوں کے چلنے سے اٹھتی ہوئی گرد جلد ہی بیٹھ جاتی تھی۔ درختوں کی بے برگ شاخوں پر کوئل اور کوّے بیٹھے تھے۔ سکول کے مغرب کی طرف کی دیوار سے پرے مونجی کے کھیت کٹ چکے تھے۔ اُن سے مونجی نکال کر پرالی کی بڑی پہاڑیاں سی جگہ جگہ بنادی گئی تھیں۔ اُن پرالی کی پہاڑیوں پر پرندے چونچیں مار

کر اپنا رزق ڈھونڈ رہے تھے۔ اُن کے اردگرد ساگ سرسوں اور برسن کے کھیت تھے۔ جن میں سے اکثر میں پانی تیر رہا تھا۔ برسن اور سرسوں کے پھولوں میں شہد کی مکھیاں پھولوں کی پتیوں کی مثل اُڑ رہی تھیں۔ سردیوں کی وجہ سے تمام کلاسیں اِسی میدان میں بیٹھی تھیں۔ اُستاد غنودگی کی حالت میں دھوپ کے مزے لے رہے تھے۔ کلاسیں جگہ جگہ ایسے جمی تھیں جیسے کسانوں نے وسیع میدان میں گوبھی کے پھول جمع کیے ہوئے تھے یا چرواہے اپنی بھیڑوں کو ستا رہے ہوں۔ سکول میں یہ میرا پہلا قدم تھا۔ میرے پاس اُردو کا ایک نیا قاعدہ تھا۔ پاؤں میں ٹائر کے جوتے تھے۔ کُرتا پیچھے سے سلامت تھا، آگے سے تھوڑا سا پھٹا تھا، کُرتے کے اوپر ایک میلی سی سویٹر تھی۔ یہ سویٹر ہاتھ سے بُنی ہوئی تھی اور جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ شلوار کا ایک پہنچا بھی پھٹ کر گھگھرا سا بن گیا تھا۔ مجھے خبر نہیں تھی کس اُستاد کی کلاس میں بیٹھنا ہے اور کیسے پڑھنا شروع کرنا ہے۔ مَیں میدان میں سب کلاسوں سے الگ تنہا ایک خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا اور گھاس کی جڑیں ناخنوں سے اکھیڑنے لگا۔ مَیں اکیلا اِس لیے سکول گیا تھا کہ میرا والد رزق روٹی کے سلسلے میں کویت میں تھا، والدہ نے مجھے ایک قاعدہ تھما کر سکول بھیج دیا کہ چلو بیٹا پڑھنا شروع کرو۔ اِس سے پہلے مجھے کوئی خبر نہیں تھی پڑھنا کسے کہتے ہیں۔ ہاں رات کو دادی اماں کی گود میں مسلسل سونے کی وجہ سے قرآن کی چند آیتیں اور جنوں پریوں اور شہزادوں کی کہانیاں ضرور سن چکا تھا۔ مجھے یہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی، کہ ایک لڑکا میرے پاس آیا، کہنے لگا اٹھو تمھیں اُستاد صاحب بلاتے ہیں۔ مَیں ڈرتے ڈرتے اُس کے ساتھ ہولیا۔ یہ اُستاد فضل حسین تھا۔ مَیں اِسے اس لیے جانتا تھا کہ ہمارے گھر کے سامنے ہی اِس کا گھر تھا۔ ہمارے گھر سکول سے مشکل سو قدم پر ہوں گے۔ اُستاد ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ اُس نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا، ہاں بیٹا وہاں کیوں بیٹھے ہو؟ مَیں نے کہا اُستاد جی پڑھنے آیا ہوں۔ اُس نے کہا، اچھا یہ بتاؤ داخلہ فیس لائے ہو، مَیں نے کہا وہ کیا ہوتی ہے؟ وہ دوبارہ بولا پیسے لائے ہو؟ مَیں نے کہا نہیں۔ اُستاد فضل حسین نے اپنی جیب سے دو روپے نکالے اور مجھے تھما کر کہا یہ لو ماسٹر خالق کے پاس چلے جاؤ۔ اُسے یہ فیس دے دو اور کہو مجھے داخل کر لو۔ اپنی امی سے کہنا دو روپے مجھے واپس کر دے۔ پھر وہ ایک لڑکے کی طرف مخاطب ہوا، عزیز احمد،

اِسے پرائمری حصے میں خالق صاحب کے پاس چھوڑ آ۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر لے چلا اور ایک چھوٹے گراونڈ میں آ گیا جہاں شام کے وقت مَیں اکثر بڑے لڑکوں کو وانجی کھیلتے دیکھتا تھا۔

وہاں اُستاد چند لڑکوں کو لے کر میدان میں خاموشی سے بیٹھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں اُستاد عبدالخالق کے پاس پہنچ گئے۔ اُستاد بچوں کو وہی قاعدہ پڑھا رہا تھا جو میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ کچی جماعت تھی۔ عزیز نے اُستاد سے کہا، اُستاد جی فضل صاحب کہتے ہیں اِسے داخل کر لیں۔ یہ کہہ کر وہ اُنہی اُلٹے قدموں واپس بھاگ گیا۔ یہ اُستاد بھی میرا پڑوسی تھا اور ہمارے گھر کے حالات سے واقف تھا۔ بولا، ہاں بھئی بگو گوشے (ولایتی سیب، یہ نام میرے محلے والوں نے میرے گورے رنگ کی وجہ سے دیا تھا) داخلہ فیس لائے ہو؟ مَیں نے مٹھی میں دبائے ہوئے دو روپے اُستاد کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ خالق صاحب نے ایک لڑکے سے کہا داخلہ رجسٹر لاؤ۔ وہ بھاگ کر کمرے سے داخلہ رجسٹر لے آیا۔ اُستاد نے نہ مجھ سے میری عمر پوچھی، نہ سن و سال۔ نام وہ پہلے ہی جانتا تھا، باپ کا نام بھی جانتا تھا۔ اپنی مرضی سے حساب کر کے میری عمر کے ساڑھے سات سال پورے کیے اور رجسٹر پر تاریخ پیدائش کے خانے میں 15 جون 1973ء لکھ دیا۔ اُس کے بعد رجسٹر واپس رکھوا کر مجھے پاس بٹھایا اور بولا، قاعدہ کھولو، مَیں نے قاعدے کا پہلا صفحہ کھولا، اُستاد نے کہا پڑھو۔ الف سے اللہ، ب سے بسم اللہ، پ سے پیاز، ت سے تختی۔ یہ تھا میرا اسکول میں داخلے کا واقعہ لیکن آج تک یہ سمجھ نہیں آئی اللہ سے پیاز اور پیاز سے تختی تک کا سفر اُلٹا ہے یا سیدھا؟

مجھے معلوم نہیں سکول میں کتنے دن میرے اِسی طرح نکلے۔ پرائمری حصے میں کل پانچ اُستاد تھے۔ اِنھیں پی ٹی سی ٹیچر کہتے تھے۔ اِن کی تعلیم میٹرک ہوتی تھی۔ اُس کے بعد ایک سال کا ٹیچر کورس کر کے اُستاد لگتے تھے۔ ایک اُستاد اپنی کلاس پہلی جماعت سے شروع کرتا تھا اور اُسے پانچویں تک لے کر جاتا۔ اِس دَوران اُردو، ریاضی، اسلامیات، معاشرتی علوم کے مضامین وہی اکیلا پڑھاتا۔ پانچویں تک انگریزی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ یہ آج تک ہمیں نہ آئی۔ اِن میں سے ہر اُستاد کم و بیش ایک جیسی قابلیت اور رویے کا حامل تھا۔ سب لسی شوق سے پیتے تھے۔ گیارہ بجے

کے قریب چائے پیتے تھے۔ ایک ہی جیسی چھڑی استعمال کرتے تھے۔ کلاس کو کوئی سبق رٹنے کے لیے دے کر ایک ہی طرح سے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتے تھے۔ ادھر بچّے اُستاد کو سوتا دیکھ کر ایک دوسرے کے کان کھینچنے لگتے تھے۔ ہلڑ بازی کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی پشتوں میں قلم اور کچی پنسل کی نوکیں چبھوتے تھے یا کسی کی پشت کے پیچھے سے لمبی سی لائن کھینچ کر ایسے سے ہوا بھرتے تھے۔ جیسے سائکل میں ہوا بھرتے ہیں۔ بھڑ پکڑ کر شلوار میں ڈال دیتے تھے۔ یہ عمل تب تک جاری رہتا تھا جب تک اُستاد کی آنکھ نہیں کھل جاتی تھی۔ اُستاد کی آنکھ کھلتے ہی دوبارہ رٹا شروع ہو جاتا تھا۔ میرے خیال میں تعلیم وہی تھی جو ہم اُستاد کی نیند کے دَوران حاصل کرتے تھے۔ باقی سب رٹا تھا۔

پرائمری حصے میں تین چار کیکر اور چھ آٹھ ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ یہ میدان مرکزی میدان سے قدرے چھوٹا تھا اور آدھے سے زیادہ سرکنڈوں کی دبھ (جھاڑ) سے بھرا ہوا تھا۔ دبھ کے اردگرد ایک نالا پانی کا تھا اور اُس میں گیندے کے پھول اُگتے تھے۔ نالے میں پانی ہر وقت چلتا تھا اور اچھی خاصی ٹھنڈک رہتی تھی۔ سردی کی دھوپ میں خاص کر اُستاد کو نیند اچھی آتی تھی۔ میرا خیال ہے جو شاگرد اُستاد کی تربیت سے بچ جائے وہی علم حاصل کر پاتا ہے۔ اُستاد عبدالخالق دوسرے اُستادوں کی نسبت قدرے بہتر تھا۔ ڈنڈے بہت برساتا تھا اور وقت بھی صرف کرتا تھا، یوں سمجھ لیں اپنی روٹی حلال کر کے کھاتا تھا۔ باقی کے اُستاد اللہ لوک تھے۔ چلیے تھوڑا سا نقشہ اِن اُستادوں کا بندھ جائے۔

ماسٹر عبدالخالق

انھوں نے ہمیں پہلی کلاس سے پانچویں تک تعلیم دی اور ڈنڈے کے ساتھ دی، آپ کی شہادت کی انگلی آدھی کٹی ہوئی تھی، ڈنڈا مارتے وقت اُسی کا دباؤ زیادہ چھڑی پر ہوتا تھا، طلبا کو یقین تھا اگر اُستاد جی کی انگلی کٹی ہوئی نہ ہوتی تو اُن کی چھڑی کا درد آدھا ہوتا۔ اُستاد جی کا گھر سکول سے دس قدم پر تھا اور یہی بات تشویشناک تھی، صبح 8 بجے سے شام 5 بجے تک سکول ہی میں نیم کے

بڑے درخت کی گھنی چھاؤں میں بٹھائے رکھتے، خود بھی وہیں بیٹھے رہتے۔ ڈنڈا چلائے جاتے اور سبق دہرائے جاتے۔ دن میں ایک بار گھر جا کر روٹی کھانے کی اجازت دیتے تھے، ٹیوشن نہیں لیتے تھے، فالتو وقت میں تعلیم مفت دیتے تھے، خود بھی ایک ہی بار گھر جاتے تھے، پتا نہیں روٹی بھی کھاتے تھے کہ نہیں البتہ مَیں اپنے گھر سے جو لسی لے کر آتا تھا، وہ پی لیتے تھے اور وہیں کُرسی پہ بیٹھے سو لیتے تھے۔ اُن کی آنکھ بند دیکھ کر ہم بھی خوابوں میں ہو لیتے تھے۔ گھر میں کم کم جانے کی وجہ اُستاد جی کی بیگم صاحبہ تھیں کہ اُن کا ڈنڈا آپ پر چلتا تھا اور زبان اُستاد جی کے بھائیوں بھتیجوں پر چلتی تھی اور ایسی تیز چلتی تھی کہ اُس کے مقابلے میں تلوار کا وار ہلکا تھا۔ بہت دفعہ ہم نے بقلم خود اُستاد جی کو پٹتے دیکھا۔ اُستاد جی کے بیٹے بیٹیاں بھی تھیں، جنھیں کھیلانا، بہلانا اور ہگانا ہمارے ذمّے تھا۔ اگرچہ اُس وقت ہماری عمر بھی اِن معاملات میں کسی کی محتاج تھی مگر اُستاد جی کے بچّوں کے لیے ہماری حیثیت ہگانے موتانے میں سرپرست کی سی ہو گئی تھی۔ اُستاد جی چونکہ سب مضمون پڑھاتے تھے اِس لیے ہم ہر حالت میں اُن کے باادب رہنے پر مجبور تھے۔ اُستاد جی کا گھر کسی طرح بھی ہمارا اپنا گھر تھا۔ اُن کے مکان کی لپائی، ستھرائی، صفائی اور رکھائی، سب ہمارے ذمّے تھی۔ کھانا اُن کی بیگم بہت اچھا بناتی تھی اور ہم دو تین لڑکے، جن کا اُستاد کے گھر میں بے اجازت گھس جانا ضروری ہوتا تھا، ہم اُن کا کھانا اکثر چٹ کر جاتے تھے، پھر اُن کی بیوی سے گالیاں کھاتے تھے مگر اُستاد جی نے کبھی کھانا کھانے کے سبب ڈنڈے کے سائے میں نہیں لیا۔ رٹا ایسا لگواتے کہ الامان۔ آئے دن کلاس کا مانیٹر بدلتے تھے۔ سرکنڈے کا قلم خود تیار کر کے طلبا کو دیتے اور خوش خطی کا ڈھنگ بھی سکھاتے۔ خود بھی بلا کے خوش نویس تھے، لفظوں کی اِملا تختیوں پر لکھوا لکھوا کر صیقل کر دیا۔ اُردو عبارت کی قرات کراتے تھے۔ سکردو سے لے کر کراچی تک جتنے شہروں کے نام تھے سب حفظ کروائے۔ تب وہ نام عجیب سے لگتے تھے۔ اب اُن بستیوں میں گھومتے ہیں تو ناموں کا عجب پن محسوس نہیں ہوتا۔ قرآن کی ابتدائی سورتیں یاد کروائیں، ریاضی کے سوال سلیٹوں پر حل کرواتے تھے اور پہاڑے 20 کی گنتی تک سب رٹوائے۔ جب ہم پانچویں سے پاس ہوئے تو اُستاد جی کے گلے میں گیندے کے پھولوں کے ہار ڈالے اور فی بچّہ 5 روپے نذرانے کے بھی گزرانے۔

پرائمری جماعت کے امتحان مارچ کے شروع میں ہوتے تھے۔ بہار کے دِنوں کی آمد ہوتی تھی۔ درختوں کے پتے پھوٹ رہے ہوتے تھے۔ نرم و گداز اور صاف ستھری ہوا ہوتی تھی۔ اُن دِنوں گاڑیوں کا دھواں بھی نہیں تھا، آسمان بہت صاف اور نیلا نظر آتا تھا۔ ہر شے نکھری نکھری اور واضح تھی۔ بہار کی آمد کا صاف پتا چلتا تھا۔ پورے سکول کی کیاریاں گیندے کے زرد پھولوں سے بھر جاتی تھیں۔ گیندے کے یہ پھول اُن دِنوں اتنے خوب صورت اور پیارے لگتے تھے جیسے یہ بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہوں جو کیاریوں میں قطاریں بنا کر کھڑے رہتے ہیں۔ نیم اور بیلیوں کے درختوں پر عجیب بھینی بھینی خوشبو کا بُور لگتا تھا۔ رزلٹ والے دن ہم نئے کپڑے پہن کر سکول جاتے۔ ہزاروں خدشے دماغ میں ہوتے، اللہ جانے فیل ہوں گے یا پاس؟ مگر جب پاس کا سنتے ایک دم دل بلیوں اُچھل جاتا۔ تمام چیزیں خوب صورت نظر آنے لگتیں جو بچہ بھی پاس ہوتا وہ اُستاد کو پیسے ضرور دیتا۔

ایک دفعہ ایک بچّے نے پاس ہونے پر دو روپے اُستاد کو پیش کیے۔ یہ غریب سا بچّہ تھا۔ اُستاد کو غصہ آ گیا۔ اُس نے کہا، مَیں دو روپے نہیں لوں گا۔ مَیں کوئی گداگر تھوڑی ہوں۔ پانچ روپے سے کم پیسے میری توہین ہے۔ یہ اپنے پاس رکھیں۔ وہ بچّہ بہت پریشان ہوا لیکن بے چارے کے پاس اِس سے زیادہ نہیں تھے۔ وہ رونے لگ گیا مگر اُستاد نے پیسے نہیں لیے۔ اُن دِنوں میٹرک پاس ہی اُستاد ہوتے تھے۔ آج کل تو وہ بھی نہیں رہے۔ ٹیوشن کے نام پر عجیب لوٹ مار شروع کر رکھی ہے۔

اُستاد عبدالخالق سراسر غریب آدمی تھے اور ابھی تک غریب ہیں۔ اِس کے ساتھ ریٹائر اور بوڑھے بھی ہو چکے ہیں اولاد کچھ زیادہ کمانے والی نہیں۔ اللہ اُن کی عمر دراز کرے۔ اوپن یونیورسٹی کے ٹیوٹر کا سرٹیفکیٹ بھی لے رکھا ہے مگر اوپن والے اُنھیں کام نہیں دے رہے۔ ہم نے بہت دفعہ یہاں کے وائس چانسلر سے اور کارمداروں سے گزارش کی کہ ہمارے اُستاد جی کو ساہیوال کے علاقے میں اوپن یونیورسٹی کے طلبا کا ٹیوٹر مقرر کر دیں مگر وہ میری کب سننے والے ہیں۔ آج کل اُستاد جی مجھے خواہ مخواہ وزیرِ اعظم سمجھے بیٹھے ہیں اور ناراض ہیں کہ مَیں نے اُن کا کام نہیں کیا۔ اُستاد جی مَیں شرمندہ ہوں، اگر مَیں ادیب اور شاعر کی جگہ سرکاری افسر ہوتا تو آپ کب کے ٹیوٹر بن چکے ہوتے۔

اُستاد فضل حسین

یہ وہی اُستاد فضل حسین ہیں جن پر مَیں نے اپنا ایک افسانہ ''سفید موتی'' لکھا ہے۔ بہت نحیف اور کمزور جسم کے مالک تھے۔ فارسی کا منشی فاضل کیا تھا۔ بے پناہ ذہین تھے۔ اپنے مضمون پر اُنھیں دسترس تھی۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہتے اور شرر تخلص کرتے تھے، غصّے کی آگ تھے۔ ذرا کسی کی بات ناگوار گزرتی، یہ پھٹاک سے گالی دیتے اور چھڑی مارنے کو دوڑتے لیکن اُن کی گالی کا خاص لفظ ''بھوتنی کے'' ہوتا تھا۔ اِس سے آگے نہیں جاتے تھے۔ غالب سے بے پناہ عشق تھا۔ کم وبیش اُن کا تمام دیوان حفظ تھا۔ سکول کی اُسی گلی میں رہتے تھے جہاں ہم نے 1984ء میں اپنا نیا مکان بنایا اور پھر اِن کے بالکل پڑوسی ہو گئے۔ اِن کے گھر کے بالکل سامنے ہمارا گھر تھا۔ اِن کا ایک خالی پلاٹ ہمارے داہنے طرف تھا اور ہماری دیوار سے دیوار لگی تھی۔ دوسرا پلاٹ سامنے اِنہی کے گھر کے ساتھ تھا۔ وہاں کیکروں کے بے شمار درخت تھے۔ جب اُن پر زرد پھول لگتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے سونے کا باغ لہلہا رہا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ہمارے ایک کوٹھے کے ساتھ اُستاد فضل حسین نے ایک پرچون کی دُکان کھول لی تھی جس کا گاؤں کے بھٹی قوم کے ایک فرد نے چوری کر کے تمام سامان اُٹھا لیا۔ سامان کیا تھا، چائے، چینی اور ٹافیوں کی ڈبیاں تھیں۔ اِنھوں نے روپیٹ کے اور تنخواہ میں سے آنہ آنہ جوڑ کے جب چھ ماہ بعد دوبارہ اُس میں سامان رکھا تو کچھ ہی دِنوں بعد وہ دُکان دوبارہ چوری کر لی گئی۔ اب فضل حسین صاحب نے دُکان بند کر دی۔

اُن دِنوں ان کا ایک بیٹا افتخار حسین ایم اے اکنامکس کر گیا تھا اور ہمارے ہی سکول میں کلرک ہو گیا۔ بعد میں یہی افتخار حسین اوکاڑہ ڈگری کالج میں اکنامکس کا پروفیسر ہو گیا تھا۔ جب مَیں کالج میں گیا اُسی سے اکنامکس پڑھی۔ اُن کا دوسرا بیٹا ظہیر الدین بابر کنگ ایڈورڈ کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کر رہا تھا۔ یہ درخت لگانے کا شوقین تھا۔ تیسرا انتظار حسین بھی کالج جاتا تھا اور چوتھا سرفراز سکول میں تھا۔ جب یہ بڑا ہوا تو ظہیر الدین کے لگائے ہوئے درخت اِس نے کٹوا دیے۔ یہ تھوڑا حاسد اور بے مروت آدمی نکلا۔ اِن کا جو پلاٹ ہمارے ساتھ تھا، اُس میں ایک نیم

اور تین چار کیکر کے درخت تھے۔ اُن کی چھاؤں ہمارے مکانوں کی چھتوں پر رہتی تھی اور کیکروں کے پھول چھتوں پر گرتے تو قیامت لگتے تھے۔ سرفراز نے یہ درخت اِسی لیے کٹوا دیے کہ اُن کا سایہ ہمارے گھروں میں کیوں جاتا ہے اور اُسی پلاٹ میں کسی جاننے والے کی بھینسیں بندھوا دیں۔ اُنھوں نے وہ تمام درخت تباہ کر دیے۔ اخراجات پورے کرنے بہت مشکل تھے۔ آخر کیکروں والا سامنے کا پلاٹ بیچ دیا۔

ہُدہُد کی یاد آئی

یہی دن تھے، جب کا یہ واقعہ ہے۔ ہمارے علاقے میں ایک پرندہ بہت خوب صورت ہوتا تھا۔ چونچ اُس کی تیز کٹاری تھی اور کلغی انتہائی پیاری تھی۔ ہم تو اِسے ٹُوکہ کہتے تھے، سنا ہے یہ ہُدہُد ہے۔ یہی سلیمان ابنِ داؤد علیہ السلام کا مخبر تھا۔ عموماً سوکھے درختوں کے تنوں میں سوراخ مار کر گھونسلا بناتا ہے اور اُس میں قیام فرماتا ہے۔ مجھے اِس سے محبت شدید تھی اور پکڑنے کی خواہش دشت دشت پھراتی تھی۔ روز رات خواب کی آنکھوں میں دیکھتا تھا کہ آگے آگے چلا جاتا ہوں اور ہُدہُد کچھ میرے کاندھوں پر چڑھے بیٹھے ہیں، کچھ پیچھے پیچھے چلے آتے ہیں۔ اُڑ کر کبھی دائیں نکل جاتے ہیں، کبھی بائیں پھرُ اتے ہیں۔ جب بھی ہُدہُد دیکھتا، اُس کے پیچھے دُور نکل جاتا، چاہے جاڑے کی برف جماتی ہو، چاہے جیٹھ ہاڑھ کی دھوپ جلاتی ہو۔

ایک دن خُدا کی نصرت یوں آئی کہ مَیں اپنے گھر تھا۔ کچے صحن کی انگنائی میں چوکڑی مارے ریاضی کی کاپی کھولے سوال حل کر رہا تھا۔ میری بڑی بہن خدیجہ، جو مجھ سے تین کلاس آگے تھی، اپنی ایک سہیلی کے ساتھ چھٹی جماعت کی سائنس کھولے کچھ یاد کر رہی تھیں اور رٹا ایسا دبا کے لگا رہی تھیں کہ اُنھیں کچھ ہوش نہ تھا۔ اِسی عالم میں مَیں نے دیکھا، ایک ہُدہُد قریب آ کر انگنائی کی دیوار پر بیٹھ گیا۔ مَیں نے اپنی کاپی اُٹھائی اور بے تکی سی اُس کی طرف اُچھال دی، حالانکہ ایسے پرندے کو مارنا پڑے تو بڑے نشانہ بازوں سے چُوک جائے مگر حیرانی کا چہرہ دیکھیے کہ میری کاپی اُسے جا لگی اور پرندہ نیچے گر گیا۔ مَیں خوشی سے چیختا ہوا اُٹھا اور اُسے پکڑ لیا۔ میری بہن اور اُس کی

سہیلی، جو ہماری پڑوسن ہی تھی، وہ بھی ایسے خوب صورت پرندے کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوگئیں۔ مَیں غور سے پرندے کے خوش نما پَروں کو دیکھنے لگا اور اُن پر ہاتھ پھیرنے لگا اور چومنے لگا۔ میری حیرت کی انتہا نہ تھی کہ جسے دُور سے کتنے عرصے سے دیکھنے کی کوشش میں تھا، وہ یوں آسان جھولی میں آ پڑے۔ ابھی مجھے اُس کو پکڑے کچھ ساعتیں ہوئی تھیں کہ اُس لڑکی نے پرندہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور کہنے لگی، لاؤ ہم اِسے ایک دھاگے سے باندھتے ہیں۔ میری بہن جلدی سے ایک دھاگا لے آئی۔ لڑکی پرندے کو آرام سے زمین پر رکھ کر دھاگے کو دوہرا تہرا کرنے لگی۔ جب مَیں اُسے دوبارہ ہاتھ لگانے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ ہُد ہُد غور سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا اور حیران تھا کہ مجھے کُھلا چھوڑ کر یہ کیا کر رہے ہیں؟ پھر ایک ہی دم اُس نے اُڑان بھری اور یہ جا وہ جا، ہَوا ہو گیا۔ مَیں چیخیں مار کر رونے لگا، اور لوٹنیاں مارنے لگا۔ وہی کاپی اُٹھا کر لڑکی کے سر پر ماری، اور خوب لڑائی پساری۔ اُس کے بعد یہ ہوا، نہ کبھی ہُد ہُد ہمارے گھر آیا، نہ وہ لڑکی آئی بلکہ اُس کے بعد دیکھی بھی نہیں۔

حتیٰ کہ تیس سال نکل گئے۔ ایک سال پہلے کی بات ہے، لاہور میں اپنی عینک کا شیشہ ڈلوانے ایک عینک ساز کی دُکان میں گھُسا تو ایک خاتون دو بچّوں کے ساتھ وہاں کھڑی عینک کا فریم پسند کر رہی تھی، مجھے غور سے دیکھتی رہی، پھر بولی آپ علی اکبر ہیں؟ سوچا کوئی ناول یا شاعری کی قاری ہوگی، مَیں نے کہا، جی وہی ہوں، اور آپ؟ کہنے لگی! وہی ہُد ہُد والی جس کے سر پر آپ نے کاپی ماری تھی۔ اُس کے بعد کچھ نہ پوچھیے کیا کیا زمانے یاد آئے، ہائے گزرے ہوئے وقت تجھے کہاں سے لاؤں۔ پھر مَیں اُنھیں ایک ریستوراں میں لے گیا اور تین گھنٹے بچپن کی یادوں کو مناتے رہے، روتے رہے، آنسو بہاتے رہے۔

اُستاد فضل حسین کا ایک دلچسپ واقعہ

مَیں نے پانچ چھ سال یعنی دوسری جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک اِن سے یعنی فضل حسین سے ٹیوشن پڑھی۔ غالب، میر، انیس اور اسی طرح کے بے شمار شاعروں سے اِنھی کے

ذریعے واقفیت ہوئی۔ اہلِ سنت تھے۔ مذہبی اعتقاد اِن کا پختہ تھا مگر نماز روزہ کے پابند نہ تھے۔ حیرت کی بات ہے اقبال کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ کہتے تھے تاریخ اور ثقافت سے کورا تھا۔ اُنھیں برِصغیر کے جن دو لوگوں سے نفرت تھی، اُن میں سے ایک اورنگ زیب عالمگیر اور دوسرا اقبال تھا۔ اور جن دو لوگوں سے عشق تھا، وہ اکبر بادشاہ اور شاعر غالب تھا۔ فارسی میں عرفی کے بہت شعر اُنھیں یاد تھے۔ شعر سنانے کے معاملے میں بہت معصوم تھے۔ ہم بچّوں کو اُس وقت شعر کی نزاکتوں کا خاک پتا نہیں تھا مگر مجھے وہ اُن شاعروں کے شعر پڑھ کے اُن کی نزاکتوں کو ایسے بیان کرتے جیسے مَیں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ سکول میں ہمارے ایک اُستاد عبدالغنی صاحب ہوتے تھے۔ دینیات پڑھاتے تھے۔ مذہب کے دیوبندی تھی۔ یہ لمبی داڑھی رکھتے اور شاگرد بھی کسی دَور میں اُستاد فضل حسین کے رہ چکے تھے۔ ایک دفعہ ہماری کلاس میں اُنھوں نے کہیں مذہب و ملتِ اسلامیہ کے جوش میں آکر کہہ دیا، غالب ایک گمراہ شاعر تھا۔ اخلاقیات میں گرا ہوا تھا۔ اُس کا پورا دیوان اقبال کے ایک مصرعے کے برابر بھی نہیں۔ مَیں نے یہ بات آکر اُستاد فضل حسین کو بتا دی۔ اُستاد فضل حسین نے جب یہ سنا تو اُن کے تلووں میں جا لگی۔ دوسرے دن غصّے سے لال پیلا ہوتے، اپنا عصا ٹیکتے ٹیکتے سکول میں چلے آئے اور سیدھا ماسٹر عبدالغنی کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ وہ بے چارے نویں کلاس کو دینیات پڑھا رہے تھے۔ ادب کے ساتھ جلدی اپنی کُرسی خالی کی لیکن یہ بہت تپے ہوئے تھے۔ اپنی کھونڈی کا خم غنی صاحب کی گردن میں ڈال دیا اور وہیں کلاس کے سامنے کہنے لگے، اوئے بھوتنی کے جب تجھے شعر کا پتا نہیں تو اُس پر بات کیوں کرتا ہے۔ وہ بے چارے حیران اور ہکا بکا منہ دیکھنے لگے کہ آخر مجھ سے کیا غلطی ہوگئی؟ اِدھر اِنھوں نے اُس کی گردن سے کھونڈی نکالی اور کھینچ کے ٹانگوں پر جما دی اور کہا چل ذرا مجھے سمجھا کہ اقبال کا کون سا مصرع غالب کے پورے دیوان پر بھاری ہے؟ جلدی بتا۔

اب وہ سمجھے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ فوراً گھور کر میری طرف دیکھا، کیونکہ اُنھیں یقین تھا کہ یہ آگ مَیں نے ہی لگائی ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ بے چارے نمازی آدمی، شعر کی جمالیات سے محض کورے۔ اِدھر اُدھر بغلیں جھانکنے لگے۔ اُنھیں مسلسل خموش پا کر اور میری طرف گھورتا دیکھ

کر فضل صاحب پھر پھنکارے، بچّے کو کیوں ڈراتا ہے؟ بھوتنی کے مجھے جواب دے۔ اس کے بعد کُرسی پر بیٹھ گئے اور بولے، لے مَیں یہاں بیٹھا ہوں، جب تک تُو وہ مصرع یاد کر لے جو غالب کے پورے دیوان سے بھاری ہے۔ اب اُن کی بلا جانے شاعری کیا ہوتی ہے۔ وہ تو بے چارے پاکستان کی اشرافیہ کا دیا ہوا بیانیہ کلاس میں کہہ گئے تھے۔ یہاں اُس اونٹ کا سامنا تھا جس کا چارا بننے سے اونچے درختوں کی شاخیں نہیں بچ سکتی تھیں۔ کلاس میں بیٹھے بچّے زندگی میں پہلی بار اپنے سامنے ایک اُستاد کو دوسرے اُستاد سے پٹتا دیکھ رہے تھے۔ آخر پاؤں چھو کر بولے، اُستاد جی آئندہ غلطی نہیں ہوگی۔ معاف کر دیں۔ مَیں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

جونہی اُنھوں نے یہ بات کی اُستاد فضل حسین اپنی جگہ سے اٹھے اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے، میاں عبدالغنی کان کھول کر سن لے غالب کا کلام تیرے حیض و نفاس اور استنجا و تیمم کی شرحیں نہیں ہیں کہ جو منہ میں آیا بول دیا۔ اب یہ دینیات وینیات پڑھالیا کر، شاعری پیغمبری پیشہ ہے، یہاں زبان کی طہارت اور دل کی طہارت ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یہ مسیلمہ کذابی نہیں ہے۔ اِس میں دخل مت دیا کر اور بچّوں کو گمراہ نہ کیا کر۔ اِس کے بعد عصا کی ٹھک ٹھک کرتے گھر چلے گئے۔ بچّے سب سہمے بیٹھے تھے اور میرا خون جم کر رہ گیا تھا کہ اب شامت آئے گی۔ اُن کے جانے کے بعد غنی صاحب نے میری طرف دیکھا اور فقط اتنا کہا، او سبائی فتنے، مجھے معلوم ہے یہ بصرہ پر چڑھائی تُو نے کروائی ہے۔

دوسرا واقعہ

جب ضیا کا ریفرنڈم ہوا، خبر نہیں، اُس وقت میری عمر کیا تھی، مگر ہوش ضرور تھے۔ ہمارے گاؤں میں دو آدمیوں نے تب ضیا کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ ایک میرے والد صاحب اور دوسرے اُستاد فضل حسین صاحب، اُستاد فضل حسین ضیا کے سخت مخالف تھے۔ اُنھوں نے ذوالفقار علی بھٹو پر ایک مرثیہ بھی لکھا تھا۔ یہ ایسا ریفرنڈم کہ کچھ نہ پوچھیے۔ گاؤں کے اِسی سکول میں ووٹنگ ہو رہی تھی۔ مَیں بھی شغل دیکھنے وہیں تھا۔ ووٹ ڈالنے والا بندہ اوّل تو کوئی آتا نہیں تھا۔ اِس کے باوجود

جو آتا تھا اُس کے بھی اور جو نہیں آتا تھا اُس کے ووٹ بھی غیبی طریقے سے کاسٹ ہو رہے تھے۔ معاملہ یہ تھا ہمارے گاؤں میں ایک مولوی عبدالستار ہوا کرتے تھے، کم عمری میں فوت ہو گئے۔ حلوہ بہت کھاتے تھے، وہی اُنھیں لے ڈوبا اور معدے کی بیماری میں چلے گئے۔ وہ ضیا کے دلدادہ تھے۔ مولوی عبدالستار پولنگ پر کھڑے ووٹ بھگتا رہے تھے۔ بہت دیندار آدمی تھے اِس لیے بھول کر بھی کسی پر اعتماد نہیں کر رہے تھے اور خود 'ہاں' پر مہریں ثبت کیے جاتے تھے۔ الیکشن میں صدر کو چونکہ ووٹ دینے کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی تھی، یعنی اگر آپ کو اسلام چاہیے تو ووٹ ہاں میں دو، نہیں چاہیے تو ووٹ ناں میں دو۔ اب کس کی جرأت تھی کہ کوئی ناں میں ووٹ دیتا۔ اِس سب کے باوجود بھی مولوی عبدالستار ووٹ ڈالنے والے کے ہاتھ سے بیلٹ پیپر لے کر اُس کے نام کی مُہر ''ہاں'' پر لگا دیتے مبادا بھول کر بھی کفر کی مداخلت ہو جائے۔

اب ہوا یہ کہ میرے والد صاحب اور اُستاد فضل حسین بھی ووٹ دینے چلے گئے۔ یہ تو سب کو پتا تھا کہ اِن کا معاملہ خراب ہے لیکن مولوی صاحب بھی ہار ماننے والے کب تھے۔ اِن کا ووٹ بھی ''ہاں'' میں کاسٹ کرنے پر تُل گئے۔ جیسے ہی اُستاد فضل حسین نے کہا لاؤ بھئی میری پرچی، مَیں بھی ووٹ دوں، مولوی عبدالستار صاحب نے کہا، اُستاد جی آپ کا ووٹ ہو گیا، آپ کیوں زحمت کرتے ہیں۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ اُستاد جی کو جلال آ گیا، کہنے لگے، بھوتنی کے، مَیں ابھی گھر سے آیا ہوں، میرا ووٹ تیری ماں کا بھوت ڈال گیا ہے؟ اِدھر کر پرچی۔ تیرے صدر کی ایسی کی تیسی۔ چونکہ مولوی صاحب خود بھی اُستاد جی کے شاگرد رہے تھے۔ بول نہیں سکتے تھے، دُبک کے ایک طرف ہو گئے۔ تب اُستاد فضل حسین نے اپنا ووٹ ضیا کے خلاف یعنی اسلام کے مخالف دیا اور اُس کے بعد میرے والد صاحب نے بھی یہی کیا۔ پھر دونوں گھر چلے آئے۔ میں شُغل کے لیے وہیں رُک گیا۔ چونکہ یہ سب ووٹنگ کُھلی جگہ پر اور کھلے عام اسلام کی حمایت میں ہو رہی تھی لہٰذا کسی سے کچھ پردہ رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اِس لیے مَیں وہیں کھڑا تماشا دیکھتا تھا۔ جب یہ دونوں لوگ اپنا ووٹ اسلام کے خلاف ڈال کر چلے گئے تو مولوی عبدالستار صاحب نے فوراً صندوقچی کھول کر اُلٹ دی اور دونوں کا ووٹ تلاش کر کے باہر پھینکا اور فوری اُس صندوقچی کی تطہیر کر کے

پولنگ کی کثافت دُور کی۔

مَیں نے واپس آتے ہی اُستاد فضل حسین اور اپنے والد کو بتا دیا کہ مولوی صاحب نے آپ کے ووٹوں کے ساتھ یہ کیا ہے، والد صاحب تو اِس بات پر ہنس کر خموش ہو گئے مگر اُستاد فضل حسین کو آگ لگ گئی۔ کُرسی اُٹھا کر گھر کے سامنے باہر سڑک پر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی شام کو مولوی عبدالستار اسلام نافذ کر کے وہاں سے گزرے، اِنھوں نے رستہ روک لیا۔ اپنی کھونڈی کی نوک اُس کے سینے میں چبھو کر کہنے لگے۔ اوئے بھوتنی کے، تیری فلاں کو یہ، تیری ٹنگھاں کو وہ۔ غرض گالیوں کا سیلاب بہا دیا۔ مولوی صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی اور بھاگ نکلے۔

ازراہِ مماثلت ایک واقعہ اِسی سے ملتا جلتا ایک دفعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ ایک بار کیری لوگر بل کے تحت پاکستان کو امریکہ سے کچھ فنڈ ملا تھا۔ اِس فنڈ سے پاک فوج کو پرے رکھنے کے لیے ایک امریکی سینیٹر نے کچھ شرائط نتھی کر دیں کہ یہ صرف اور صرف عوام کی فلاح میں خرچ ہوگا۔ فوج نے اِس پر بہت رولا ڈالا۔ اُس نے جماعتِ اسلامی کی زیرِ قیادت ایک خودساختہ ریفرنڈم کرایا۔ یعنی کیری لوگر بل منظور یا نامنظور۔ مَیں ایک دن شہر میں صدر بازار سے گزر رہا تھا کہ جماعتیے اپنے ریفرنڈم کی صندوقچی لے کر بیٹھے تھے۔ ایک لڑکے نے مجھے بھی گھسیٹا کہ اپنا ووٹ کاسٹ کریں اور تفصیل سے بتایا کہ اس فنڈ کے تحت پاکستان کی فوج کو کمزور کرنے کی سازش ہے۔ لہٰذا آپ نے مہر نامنظور پر لگانی ہے۔ مَیں نے پرچی لے کر ''کیری لوگر بل منظور'' پر مہر لگا کر پرچی صندوقچی میں ڈال دی۔ پہلے تو سٹپٹا کر مجھے گھورا پھر صندوقچی کھول کر میرے سامنے ہی وہ پرچی باہر نکالا کر پھاڑی اور پھینک دی۔

اُستاد فضل حسین سے پانچ روپے میں ٹیوشن

تب مَیں تیسری جماعت میں تھا جب ٹیوشن شروع کی۔ فضل حسین صاحب کی پرچون کی دُکان کے سامنے ہی سبے کی بوریاں بچھا کر ہم دولڑکے بیٹھ جاتے تھے۔ فضل حسین صاحب کی ایک کُرسی قینچی نما ہوتی تھی۔ یہ بہترین کُرسی پتا نہیں اُنھوں نے کہاں سے بنوائی تھی۔ اُس پر بیٹھ جاتے

تھے اور ہمیں املا، ریاضی کے سوالات، اُردو کی گرائمر اور دیگر غیر نصابی باتیں پڑھاتے تھے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اکبر بادشاہ اور غالب کے عاشق تھے اور اُن کے بہت سے واقعات سناتے تھے۔ یہ واقعات مَیں نے دوبارہ کسی کتاب میں نہیں پڑھے۔

اکبر کی ذہانت کا قصہ

اکبر بادشاہ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ جب اپنا دیوان لگاتے تھے تو مسلمان اُمرا کو دائیں جانب بٹھاتے تھے اور ہندو اُمرا کو بائیں جانب۔ ایک بار ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ بادشاہ سلامت ہم سے امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ جب یہ خبر اکبر کے کان تک پہنچی تو اکبر نے ہندو اُمرا کو تنہائی میں بلایا اور اُنھیں کہا، دیکھو بھائی یہ بتاؤ۔ انسان کا دِل کس جانب ہوتا ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ وہ بائیں جانب ہوتا ہے۔ تب اکبر نے کہا، مَیں تمھیں اپنے دل کی جانب بٹھاتا ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو اپنے دل کی جانب مسلمانوں کو جگہ دوں تو ٹھیک ہے یہ نعمت تمھاری بجائے مسلمانوں کو بخش دیتا ہوں۔ اکبر کی بات سن کر راجہ بیربل نے کہا، بادشاہ سلامت ہم آپ سے خوش اور ہمارا رام بھی خوش۔ آپ ہمیں دیوان میں بائیں جانب ہی بٹھایا کریں۔

الغرض ہم دو لڑکے اُن سے پڑھتے تھے۔ ایک لڑکا ہمارے قریب کے گاؤں کا تھا۔ ہمارے گاؤں کے ایک چوہدری میاں سرور کا بھانجا تھا۔ اُس کا والد بھی اچھا پیسے والا تھا۔ یہ لڑکا اپنے آپ کو راجہ کہتا تھا اور مجھے رعایا سمجھتا تھا۔ اُس کی املا کا خط نہایت بُرا تھا۔ عجیب ٹیڑھے میڑے لفظ لکھتا تھا۔ مَیں اُستاد فضل حسین کو ماہانہ پانچ روپے ٹیوشن دیتا تھا اور وہ لڑکا دس روپے دیتا تھا۔ مَیں دیکھتا تھا کہ اُستاد جی اُسے بالکل ڈانٹتے نہیں تھے اور مجھے چھوٹی چھوٹی غلطی پر ٹوکتے تھے۔ ایک دن مَیں نے تختی لکھتے وقت جان بوجھ کر اُسی کی طرح حروف لکھ دیے تاکہ جلدی جلدی کام نپٹ جائے۔ جیسے ہی فضل حسین نے میری تختی دیکھی، ایک دم گویا آگ سے بھڑک اُٹھے اور اتنا غصّہ کیا کہ پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ ہاتھ اُلٹا کر انگلیوں پر پنسلیں ماریں۔ یہ اُن کی سب سے بڑی سزا

کا طریقہ تھا اور آئندہ کے لیے خبردار کیا کہ ایسی املا نہیں لکھنا۔ مَیں حیران تھا، اُستاد جی ایسی ہی خط نویسی پر اُس لڑکے کو کچھ نہیں کہتے اور مجھے شدید غصہ ہوئے ہیں۔ خیر جب وہ لڑکا اپنے گھر چلا گیا تو مجھے پیار سے پاس بٹھا کر بولے، بیٹا علی اکبر میری ایک بات سنو۔ تم نے دیکھا، کبھی مَیں نے اِس لڑکے کو ڈانٹا نہیں کیونکہ یہ پتھر ہے۔ اِس میں سے سبزہ نہیں اُگ سکتا۔ اِس کے باپ کے پاس بہت پیسے ہیں۔ اُس کے علاوہ کچھ نہیں۔ تم کچی مٹّی ہو جس سے سبزہ پھوٹ سکتا ہے۔ چنانچہ اُس کی نقل میں پتھر مت بنو۔

ماسٹر محمد لطیف

لطیف صاحب ہمارے پرائمری کے اُستاد تھے لیکن ہمیں نہیں پڑھا پائے۔ تب پہلی سے پانچویں تک کا معاملہ یہ ہوتا تھا کہ سب مضمون ایک ہی اُستاد پڑھاتا تھا اور جو اُستاد ایک کلاس پہلی سے پکڑتا تھا پھر اُسی کو پانچویں تک پہنچاتا تھا۔ چنانچہ اُستاد محمد لطیف صاحب کی قسمت میں ہم نہ لکھے گئے مگر یہ ضرور تھا کہ میرے حال پر نظر رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی چیکنگ کرنے والا ڈی ای او سکول میں آتا اور بچوں سے سوال پوچھنے کی کوشش کرتا تو اُستاد محمد لطیف اُس ڈی ای او کا رُخ کسی طرح میری طرف پھیر دیتے۔ اب ایک تو مَیں رنگ کا کافی گورا تھا، منہ متھے کا ٹھیک تھا، دوم پڑھتا بھی اچھا تھا۔ انسانی نفسیات سے واقف تھے۔ ڈی ای او بھی خوش خوش ہلکے پھلکے سوال پوچھتا تھا۔ چنانچہ جواب صحیح دے کر اُستادوں کے سر سے بار ہلکا کر دیتا تھا۔

ماسٹر لطیف صاحب بہت ہنس مکھ تھے، چھوٹا موٹا بے ضرر مذاق کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اللہ جانے کیوں ہمارے گاؤں سے چلے گئے۔ دراصل اُن کی ایک بیٹی نے خودکشی کر لی تھی۔ شاید اُسی کا صدمہ اُنھیں لے ڈوبا اور جلد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تیسرے ماسٹر عبدالستار تھے۔ یہ صاحب خشک مزاج تھے۔ لمبے تڑنگے قد کے مالک اور کسی قسم کی نرمی اِن کے چہرے پر نہیں تھی۔

ماسٹر عبدالغفار

یہ ہمارے اُستاد عبدالخالق صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور پچھلے دنوں فوت ہو گئے۔ اِن کے بڑے بھائی عبدالخالق صاحب میرے پانچویں جماعت تک کے استاد رہے ہیں۔ غفار صاحب سب سے چھوٹے تھے مگر اللہ نے سب سے پہلے اِنہی کو اپنے ہاں دعوت دی۔ نہایت تحمل مزاج، ہنس مکھ اور شریف آدمی تھے۔ میرے پڑوسی بھی تھے۔ میرا بچپن اور جوانی اُسی محلے میں گزرا ہے جس میں اُستاد جی نے ساری عمر گزار دی۔ وہ گاؤں سے باہر نہیں گئے، اُن کے پاس ایک سائیکل ہوتی تھی۔ بس اُسی پر ڈاک لینے شہر تک جاتے تھے اور عصر سے پہلے لوٹ آتے تھے۔ بچوں کو پڑھانے کا شوق کم تھا، خدمتِ خلق کا زیادہ تھا۔ کسی نے شناختی کارڈ بنوانا ہوتا، بجلی کا بل دینا ہوتا، یا دُنیا جہان کی کوئی بھی کاغذی کارروائی کی ضرورت ہوتی، محلے والے غفار صاحب کے حوالے کر کے نچنت ہو جاتے۔ یہ اُن سے اپنی چائے کا خرچہ نکال کر ساری ذمّے داری اپنے پہ لے لیتے اور کام بھی کرا دیتے تھے۔ اُن کا اکثر وقت شمیم کی چائے کے ہوٹل میں گزرتا تھا۔ مینہ برسے، آندھی آئے، یہ وہیں پائے جاتے۔ سکول میں ہمارے ساتھ اڈّی کھڈی کھیلتے اور ہارنے والے سے شکنجبین پیتے۔ زندگی بھر اپنے کسی طالبِ علم کو ایک چانٹا رسید نہیں کیا۔ کافی عرصہ پہلے ایک ظالم رانگڑ اِنھیں اپنے موٹر سائیکل پر بٹھا کر کہیں لے جا رہا تھا۔ اُس نے موٹر سائیکل کسی گڈے میں مار دیا اور غفار صاحب کو ایک ٹانگ سے لنگڑا کر دیا۔ بڑی مشکل سے علاج ہوا۔ پورے گاؤں سے اِن کا یارانہ تھا۔ ہمارے گاؤں کی ڈاک اِنہی کے سپرد تھی۔ تب ڈاک کے محکمے سے کوئی یافت نہ تھی۔ سب کام رضا کارانہ ہوتا تھا اور مفت کی پھٹیک تھی۔ مگر اِنھیں یہ کام خُدا جانے کیا مزا دیتا تھا کہ گھر گھر خط اور ڈاک بانٹتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ پورے گاؤں کے حالات کی پوٹلی اِنہی کے پاس تھی۔ ہمیشہ گاؤں میں ایسا کوئی فرد ضرور ہوتا ہے کہ سب کا ہلکا پھلکا کام مفت میں سرانجام دیے جاتا ہے اور بدلے میں کچھ نہیں پاتا ہے۔ یہی اُن کی بھی حالت تھی۔ لطیفے بہت سناتے تھے۔ سکول اِن کے گھر کے عین ساتھ تھا، چنانچہ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ یعنی پل میں گھر پل میں سکول۔

غفار صاحب کے گھر کے ساتھ ایک آٹے کی چکی تھی، وہیں بیٹھے پائے جاتے تھے۔ ایک وقت آیا دُنیا کی تمام بیماریاں اُنھیں جا لگیں اور جلد مر گئے۔ غالباً کثرت سے شکنجبین اور روزانہ کی بیس پچیس پیالیاں چائے اُنھیں لے ڈوبیں۔

پانچواں اُستاد اور مھانے کا جِن

اِس اُستاد کا نام بھول گیا ہوں۔ یہ اُن دِنوں ایک لونڈا سا نیا بھرتی ہوا تھا اور کہیں شہر سے آتا تھا۔ بچّوں کی جان کا دُشمن تھا۔ ایک دفعہ ایک بچّے کو سزا کے طور پر کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے تالا لگا کر چابی اپنے ساتھ لے گیا۔ چھٹی ہوئی تو سکول ویران ہو گیا لیکن وہ بچّہ اندر اکیلا کمرے میں ڈر گیا۔ چیخیں مارنے لگا، کافی دیر تو کسی نے اُس کے رونے کی آواز ہی نہ سنی۔ جب اُس کے والد کو خبر ہوئی تو اُس نے آ کر دروازہ توڑا اور بچّے کو باہر نکالا مگر دوسرے دن اُستاد کو پھر بھی کچھ نہیں کہا یعنی تب اساتذہ کی قصابیت کو معمول کی بات لیا جاتا تھا۔

ایک دفعہ اِس کے ساتھ ایک لطیفہ بہت مزے کا ہوا۔ واقعہ یہ ہوا کہ اِس نے مھانا پڈی کو بہت چھڑیاں ماریں۔ مھانا پڈی میرا سب سے قریبی دوست بن گیا تھا اور بہت ذہین تھا۔ خوب صورت بھی انتہا کا تھا۔ میرے ایک افسانے ''اچھو بازی گر'' میں اس کا ذکر ہے۔ اِس کی والدہ اِسی گاؤں میں لڑکیوں کے سکول میں ٹیچر تھی۔ ایک دن موقع پا کر اِس نے یوں ڈرامہ کیا کہ چیخیں مار کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگا اور بھاگ کر سکول کے ایک کونے میں کھڑے بہت پُرانے پیپل کے درخت کی طرف جانے لگا۔ اُس درخت کے متعلّق مشہور تھا کہ وہاں جن پریاں رہتے ہیں۔ لڑکے سب ڈر گئے کہ مھانے کو جن لگ گئے ہیں۔ دو لڑکے بھاگ کر مھانے کی والدہ کو بتانے گئے۔ سب اُستاد اُسے پکڑتے تھے مگر وہ قابو سے باہر ہو کر اُسی درخت کی طرف جاتا تھا۔ اُس کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ چیخیں الگ مار رہا تھا۔ اتنے میں وہی ٹیچر اُس کے قریب ہوا اور پکڑنے کی کوشش کی۔ اِس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، کھینچ کر دو تھپڑ اُستاد کے منہ پہ جڑ دیے۔ اُستاد باولا سا ہو گیا مگر بے بس تھا۔ جِن لگے لڑکے کو کچھ کہوں تو کہیں سرے سے ہی نہ مارا جاؤں۔ ایک دم دُور ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔

شرمندگی بہت تھی۔ اتنے میں مہانے کی والدہ بھی روتی پیٹتی وہاں پہنچ گئی۔ اُس بے چاری نے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو اپنا برقع اٹھا کر وہ دُور پھینکا اور بیٹے کو گود میں پکڑ لیا اور قرآنی آیتیں پڑھنے لگی۔ والدہ کو دیکھتے ہی مہانا رُک سا گیا۔ پہلے تیز تیز پھر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا اور اُس کے بعد اعتدال پر آ گیا۔

اُنھی دِنوں اُستادوں نے ہمیں ٹاسک دیا کہ بیٹا کیکر اور ٹاہلیوں کے پودے لے کر آؤ تا کہ اِس میدان کے اردگرد لگائیں۔ ہم سب لڑکے ایک ایک پودا کھیتوں سے کھود کر لے آئے۔ وہ اِس گراونڈ میں لگا دیے، اب وہ سب بڑے ہو چکے ہیں اور بہت سایہ دیتے ہیں۔

مولوی محمد عارف

یہ صاحب ہمارے گاؤں کی مسجد کے مولوی تھے۔ بوڑھے اور شریف آدمی تھے۔ ہمارے گاؤں میں دو ہی مذہبی فرقے تھے۔ ایک حنفی بریلوی اور دوسرے وہابی۔ وہابی فرقہ کے لوگ بہت کم تھے۔ اُنھوں نے اپنی الگ مسجد بنائی تھی جہاں ایک وہابی مولوی رکھ لیا تھا۔ مولوی عارف صاحب بھی اصل میں دیوبند مسلک کے تھے مگر تمام عمر پتا نہیں چلنے دیا۔ فرقہ وارانہ بات کبھی نہیں کی۔ انھوں نے پینتالیس سال تک امامت کرائی اور بچّوں کو ناظرہ قرآن پڑھایا۔ گاؤں کے تمام چھوٹے بڑے اِن کے شاگرد تھے۔ مَیں نے بھی ناظرہ قرآن اِنھی سے پڑھا۔ اگرچہ ہمارے مذہب کو جانتے تھے مگر کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ایک دن جب مَیں نے قرآن ختم کر لیا تو کہنے لگے، اکبر بیٹا تم سے اکیلے میں بات کرنی ہے گھر میں آنا۔ مَیں شام کو گھر میں گیا۔ پچاس روپیا ہدیہ اور کچھ کپڑے لے گیا۔ انھوں نے وہ چیزیں رکھ لیں اور بولے دیکھ بیٹا، قرآن تم نے پڑھ لیا ہے۔ اب مَیں بوڑھا ہو گیا ہوں، مسجد میں سیڑھیاں چڑھنا اور اُترنا مجھ سے نہیں ہو پاتا۔ آئندہ بچّوں کو قاعدہ سیپارہ تم پڑھا دیا کرنا۔ مَیں ہفتے میں ایک دن آیا کروں گا۔ مَیں بہت خوش ہوا۔ پھر تین سال تک یہ کام مَیں نے کیا۔ یہ پڑھائی صبح نمازِ فجر کی جماعت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتی اور سورج نکلنے تک جاری رہتی تھی۔ کم و بیش ڈیڑھ سو بچّے ہوتے تھے۔ اُس کے بعد مولوی عارف صاحب کا ایک بھتیجا، جو

پہلے فوج میں تھا، وہ ریٹائر ہو کر واپس آ گیا اور یہ کام اُس نے سنبھال لیا۔ یہ شخص بہت کینہ پرور، ناصبی اور بدتمیز تھا۔ اِس کی انہی عادتوں کے باعث گاؤں والوں نے اِسے پیش امامت سے اور بچوں سے دُور کر دیا۔ ایک دفعہ میری اِس سے سخت تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ اہلِ بیتِ رسول ﷺ کے خلاف تھا اور یزید کا پیروکار تھا۔ شکر ہے پچھلے تیس سال سے مَیں نے اِس کی شکل نہیں دیکھی۔

مولوی عبدالستار

یہ بھی خود بچوں کو قرآن ناظرہ پڑھاتا تھا۔ کچھ عرصہ مَیں نے اِس سے بھی قرآن پڑھا مگر دوبارہ مولوی عارف صاحب سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اِس نے ایک کپڑے کی دُکان بنائی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی۔ نوائے وقت کا اخبار روز شہر سے منگواتا تھا۔ آدھا گاؤں اِسی کے پاس آ کر اخبار پڑھتا تھا۔ جب مَیں میٹرک میں ہوا تب متواتر اِس کے پاس بیٹھنے لگا تھا۔ اُس کی خاص وجہ، ایک تو اخبار تھی دوم وہ لائبریری تھی۔ اگرچہ اُس میں بریلوی مذہب کے متعلق بہت سی کتابیں تھیں مگر تب مَیں پڑھنے کے معاملے میں کسی مذہب کا قائل نہیں تھا۔ اُسی لائبریری سے انجیل اور تورات بھی پڑھی۔ وہیں نوراللغات اور فرہنگ آصفیہ میرے ہاتھ لگی میرے کتاب پڑھنے کا شوق دیکھ کر مولوی عبدالستار نے لائبریری کی چابی مجھے ہی دے دی تھی کہ جب چاہوں یہاں کھول کر بیٹھ جایا کروں۔ مولوی عبدالستار وارثی میلادی مولوی تھا، پیروں فقیروں پر بہت اعتقاد تھا، بریلوی فرقے کو نجاتی فرقہ قرار دیتا تھا، باقی تمام اسلامی فرقوں کو گمراہ کہتا تھا۔ ضیاالحق کا عاشق تھا۔ صدام کو اپنا اسلامی ہیرو سمجھتا تھا۔ اپنے اُستاد مولوی محمد عارف کے خلاف تھا۔ البتہ لوگوں کو چھوٹے موٹے قرض اکثر دیتا تھا، اگر اپنے پاس نہ ہوتے تو کسی اور سے اُدھار مانگ کر دے دیتا۔ شادی نہیں کی تھی۔ مَیں نے ایک دفعہ پوچھا، آپ دوسرے کی پریشانی خوامخواہ اپنے سر لے لیتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس نہیں ہوتے تو معذرت کر لیا کریں۔ کہنے لگے، مرنے سے پہلے جو بندہ پریشان نہیں ہے، وہ اصل میں مُردوں کی زندگی بسر کرتا ہے۔ کیونکہ مُردوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

مولوی عبدالستار کی ڈیڑھ اینٹ کی وضاحت

لوگ اُن کی دو باتوں کی بہت شکایت کرتے تھے۔ ایک اُنھوں نے شادی کیوں نہیں کی، دوم مولوی عارف کے کیوں خلاف تھے۔ ایک مرتبہ جب مَیں کافی بڑا ہو گیا اور مولوی عبدالستار سے برابری کی سطح پر میل جول ہو گیا تو مَیں نے شادی والے معاملے پر تو بات نہیں کی لیکن مولوی عارف صاحب سے اُن کی بیزاری کا قصہ پوچھا۔ اُنھوں نے جو واقعہ مجھے سنایا وہ کافی دلچسپ ہے، آپ بھی سنیے۔ کہنے لگے قصہ یہ ہے کہ مولوی عارف صاحب کی بیوی نماز روزہ نہیں کرتی تھی اور دن کے آٹھ بجے تک سوئی رہتی تھی۔ مَیں فجر کی اذان سے ایک گھنٹہ پہلے اُٹھ جاتا تھا۔ اپنے گھر سے نکل کر سیدھا مولوی عارف صاحب کے گھر جاتا۔ اُن کے چولہے پر مولوی صاحب کے وضو کے لیے پانی گرم کرتا اور اُسے مولوی عارف کے حجرے میں رکھ دیتا۔ وہ اُس پانی سے وضو کرتے اور تہجد پڑھنے میں مصروف ہو جاتے، اُس کے بعد مَیں خود وضو وغیرہ کر کے مسجد میں آتا۔ تہجد پڑھتا، قرآن کی تلاوت کرتا۔ اتنے میں فجر کی اذان کا وقت ہو جاتا۔ اذان دیتا اور صفیں وغیرہ بچھاتا۔ تب مولوی عارف صاحب مسجد میں آتے اور پیش امامت کرتے۔ ایک دن معمول کے مطابق مَیں گیا۔ لیکن ابھی باہر دروازے پر ہی تھا کہ مولوی عارف صاحب کی بیوی اُنھیں گندی گالیاں دے رہی تھی اور کہہ رہی تھی، اے کنجر انسان تجھے کئی بار کہا تھا یہ ختم درود، نیاز اور گیارھویں کے ختم کی کھیر بکریوں کے آگے نہ ڈالا کر۔ کُتوں کے آگے ڈال دیا کر مگر تم نہیں مانے۔ اب اُسی حرام اور ناپاک کھانے کی وجہ سے ساری بکریاں مر گئیں۔ مَیں حیران کہ ہائیں اِن کی بکریوں کو کیا ہوا؟ اور یہ ختم درود اور گیارھویں کی کھیر پر کیوں عتاب ہے؟ خیر مَیں بھی گھر میں داخل ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں تمام بکریاں مری پڑی ہیں اور سب کی سب زخمی بھی تھیں۔ پتا چلا کہ رات کہیں سے ایک بگھیاڑ گھر میں داخل ہوا تھا، وہ بکریوں پر حملہ آور ہوا۔ تمام بکریوں کو مار دیا اور ایک کو اٹھا کر لے گیا۔ مولوی صاحب کی بیوی کا خیال تھا کہ خُدا نے اُس پلید کھانے کی وجہ سے بکریاں ہلاک کروا دیں۔ مولوی صاحب کی بیوی نے مجھے شاگرد سمجھ کر اور گھر کا آدمی سمجھ کر غصّے میں سب کچھ کھول کر بتا دیا۔ یعنی گاؤں کے لوگ اُن کے

ہاں جو کھیر، یا دیگر نیاز کی چیزیں بھجواتے تھے وہ اُنھیں حرام سمجھ کر خود نہیں کھاتے تھے اپنی بکریوں کے آگے ڈال دیتے تھے۔ مجھ سے یہ منافقت اور گاؤں کے لوگوں کی عقیدت کے ساتھ کھلی تذلیل دیکھی نہ گئی۔ لہٰذا مَیں نے کسی اور کو تو یہ بات نہیں بتائی البتہ خود اُن سے دُور ہو گیا اور آئندہ کے لیے توبہ کی۔

بچپن کے دوست

امان اللہ شاہ عرف مھانا: یہ پہلی جماعت سے میرا دوست بنا۔ نہایت نازک، خوب صورت، بالکل ایک پھول کی طرح تھا۔ اِس کا رنگ تو میرے جیسا سفید نہیں تھا البتہ نین نقش مجھ سے زیادہ تیکھے تھے۔ بے حد ذہین تھا۔ زبان میں تیزی اور لفظوں میں روانی تھی۔ گھر سے روز آٹھ آنے خرچ کے لے کر آتا تھا۔ جو کچھ کھانے کو خریدتا تھا، مجھ سے ضرور شیئر کرتا تھا۔ مَیں بھی اس سے بانٹ کر کھاتا تھا۔ سوال سب سے پہلے حل کرتا تھا۔ جماعت میں سب لڑکے زمین پر بیٹھتے تھے۔ زمین چونکہ کچی ہوتی تھی اس لیے گھر سے بوریاں ساتھ لاتے تھے، اُنھیں بچھا کر اوپر بیٹھتے تھے۔ ہم دونوں نے دو بوریوں کو آپس میں سلوا کر ایک بڑی بوری بنا لی تھی جس پر دونوں آسانی سے بیٹھ جاتے تھے۔ اُستاد کُرسی پر بیٹھتا تھا۔ کلاسیں کسی درخت کے سائے میں لگتی تھیں۔ اگر سردی ہوتی تو گراؤنڈ میں دھوپ میں لگتیں۔ لہٰذا ہم دونوں بالکل قریب قریب بیٹھتے تھے اور ایک دوسرے کے سر میں انگلیاں پھیرتے رہتے تھے۔ اُستاد بعض اوقات بہت غصّہ کرتے کہ تم نے یہ کیا باری باری کنگھی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے لیکن وہ مارتے اس لیے نہیں تھے کہ جو بھی پڑھاتے تھے سب سے پہلے ہم ہی دونوں یاد کر لیتے تھے۔ پھر بھی اُستاد تو جیسے تیسے گزارا کر لیتا تھا لیکن لڑکے بہت حسد کرتے تھے۔ فوراً اُستاد کو شکایت لگا دیتے کہ اُستاد جی دیکھیے پھر بالوں میں کنگھی کر رہے ہیں۔ اُستاد ہمیں اُٹھا کر ایک کو کلاس کے ایک کونے پر اور دوسرے کو دوسرے کونے میں بٹھا دیتا لیکن تھوڑی دیر میں دونوں گھسٹتے گھسٹتے پھر اکٹھے ہو جاتے۔ میرا گھر چونکہ سکول کے قریب تھا

اور مھانے کا گھر گاؤں کے درمیان تھا۔لہٰذا تفریح کے وقت وہ میرے گھر میں چلا آتا اور ہم دونوں وہیں سے کھانا کھا کر واپس سکول جاتے تھے۔ میری دیکھا دیکھی اُسے بھی کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا۔کویلوں اور پرندوں کے پیچھے بھی اکثر اکٹھے ہی بھاگتے لیکن وہ ہمارے کبھی ہاتھ نہ آتے۔ اِس کا والد اوکاڑہ کی اتفاق شوگر مل میں ملازم تھا اور والدہ اِسی گاؤں میں گرلز سکول میں پڑھاتی تھی۔ ہماری دوستی کا یہ سلسلہ پانچویں جماعت تک چلا۔ پھر یہ ہوا کہ اِس کے والد کی نوکری عبداللہ شوگر مل میں ہو گئی۔ یہ علاقہ دیپالپور میں تھا۔اُن کی وجہ سے اُس کی ماں نے بھی اپنا تبادلہ دیپالپور کروالیا اور یہ وہیں منتقل ہو گئے۔ مجھے تب مھانے کا یہاں سے چلے جانے کا بہت دُکھ ہوا تھا۔ کچھ عرصہ تک اکثر خواب میں ہم اکٹھے کلاس میں بیٹھے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے ہوتے تھے۔ جب ہماری بیس سال بعد دوبارہ ملاقات ہوئی تو وہ بی ایڈ کر چکا تھا اور ٹیچر بھی ہو گیا تھا۔ دیپالپور کے ہائی سکول میں پڑھا رہا تھا۔ مجھے مل کر بہت جذباتی ہوا۔ جوش میں منہ چومنے لگا۔ مَیں دو دن اُس کے ہاں ٹھہرا رہا اور بچپن کو بہت یاد کیا۔ مجھے کہنے لگا علی، دیکھو اگر مَیں تمھارے ساتھ ہی رہتا تو بہت کتابیں پڑھتا اور شاید شاعر بھی بن جاتا لیکن تم سے جُدا ہونے کے بعد مَیں کوئی کتاب نہیں پڑھ سکا۔ مَیں نے شروع میں بہت ضد کی تھی کہ مجھے واپس اُسی گاؤں میں چھوڑ آئیں مگر امی نہیں مانی۔ مَیں نے تم سے بچھڑنے کے بعد دو سال تک کوئی نیا دوست نہیں بنایا۔ کوئی اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔اُس کے بعد میری اُس سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔

محمد ندیم: یہ بھی میرے بچپنے کا دوست ہے۔پہلی جماعت میں اِس کا بھی وہی سال تھا جو میرا تھا اور ایک ہی اُستاد تھا لیکن اِس کے ساتھ میری دوستی چھٹی جماعت سے شروع ہوئی تھی جب امان اللہ شاہ عرف مھانا ہمارے گاؤں سے چلا گیا تھا۔ یہ بھی ایک خوب صورت لڑکا تھا۔ سکول میں تمام اساتذہ سے اکٹھے ڈنڈے کھائے۔اِس کی انگریزی ذرا سی مجھ سے بہتر تھی کیونکہ اِس کا والد بھی سکول ٹیچر تھا۔ وہ دھیان دیتا تھا مگر اِسے ریاضی بالکل نہیں آتی تھی۔ چنانچہ کم و بیش ہماری تعلیمی حالت ایک جیسی ہی تھی۔ شام کو اکٹھے سکول میں کھیلتے تھے۔گاؤں سے ایک کلومیٹر دُور

جنوب کی طرف ریت کے بڑے بڑے ٹیلے تھے۔ وہیں ندیم کی کاشت کاری زمین تھی۔ اکثر ہم اُن ٹیلوں پر کھیلنے نکل جاتے۔ سکول میں ہماری شرارتوں اور اُس کے نتیجے میں پٹائی کے بہت سے واقعات ہیں۔ ہمیں جن اساتذہ نے پڑھایا، دو ایک کو چھوڑ کر اُن کی حالت خود ہم سے بُری تھی۔ چنانچہ سیکھنے اور پڑھنے کا عمل کچھوے کی اُلٹی چال تھا۔ آٹھویں تک ہمیں انگریزی جس نے پڑھائی اُسے ڈنڈے مارنے کا شوق زیادہ تھا۔ لہٰذا نویں کلاس میں ہیڈ ماسٹر سے التجا کی کہ ٹیچر بدل دیجیے لہٰذا دینیات والا ٹیچر انگریزی پڑھانے لگا۔ جب رزلٹ آیا تو چار یا پانچ لڑکوں کے علاوہ سب فیل ہو گئے۔ اُن چار پانچ لڑکوں میں یہ ندیم بھی شامل تھا اور مَیں بھی تھا۔

ایک دفعہ ایک اُستاد توقیر صاحب ہمیں مطالعہ پاکستان پڑھا رہا تھا۔ اُس کا حکم تھا کوئی بچّہ کلاس میں شور نہ کرے۔ اُستاد کی کُرسی درمیان میں تھی۔ ہم اردگرد بیٹھے تھے۔ پتا نہیں کس بچّے نے سیٹی ماری، اُستاد نے سمجھا ندیم نے سیٹی ماری ہے، اُس نے ایک ڈنڈا کھینچ کر ندیم کے چوتڑوں پر دے مارا۔ یہ بلبلایا اور بولنے لگا کہ اُستاد جی سیٹی مَیں نے نہیں ماری مگر اِس کی بات ابھی آدھی ہی نکلی تھی کہ اُس نے دو ڈنڈے اور مار دیے۔ یہ پھر بولنے لگا، اُس نے ایک ڈنڈا مزید جڑ دیا کہ خموش کیوں نہیں ہوتا۔ اب اِسے بہت غصّہ تھا کہ سیٹی دوسرے نے ماری ہے اور ڈنڈے مسلسل مجھے پڑ رہے ہیں مگر بے چارا کسمسا کر رہ گیا۔ وضاحت کرنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ جب اُستاد کلاس سے چلا گیا تو کہنے لگا مَیں نے اُستاد کو دل میں بہت گالیاں دی تھیں۔ ظاہر ہے زبان سے گالی دینا مزید ڈنڈوں کی دُنیا کی سیر کرنا تھی۔

کالج میں ندیم نے سائنس کے مضامین رکھ لیے اور مَیں نے اکنامکس اور شماریات رکھ لی۔ کالج میں ہمارے دوست بدل گئے۔ میرا دوست ایک شہر کا لڑکا بن گیا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ پھر رفتہ رفتہ دونوں ایم اے بھی کر گئے۔ سچ تو یہ ہے گاؤں میں جس وقت ہم پڑھنے کی کوشش میں تھے، وہ پڑھائی صرف اپنے بل بوتے اور اپنی ہی خود ساختہ تربیت کے زیرِ اثر تھی۔ ورنہ نہ تو کسی اُستاد اور نہ والدین کی طرف سے رہنمائی کا عنصر موجود تھا۔ اُس پر ستم یہ کہ مجھے حالات کی گردش نے کسی ادارے میں ریگولر پڑھنے نہیں دیا۔ ندیم کے پاس وقت بھی تھا، حالات بھی سازگار تھے مگر

وہ بھی ایم اے اُردو کر کے بیٹھ گیا۔ کچھ عرصہ فیصل آباد کی ایک مل میں کام کیا، مگر کچھ عرصہ بعد چھوڑ کر آ گیا۔ اب ندیم گاؤں میں ہوتا ہے۔ اپنی زمین پر کاشتکاری کرتا ہے۔ بھینسیں رکھی ہوئی ہیں، ایک نوکر بھی رکھا ہوا ہے۔ دو شادیاں کر رکھی ہیں، اللہ جانے کیسے نباہ کرتا آ رہا ہے۔ میری کتابیں بھی پڑھتا ہے۔ میرے اچھے بُرے حالات سے بھی واقف ہے اور ابھی تک ایک اچھا دوست ہے، اکثر جب گاؤں جاتا ہوں تو مل بیٹھتے ہیں اور دکھ سکھ سانجھے کرتے ہیں۔

آصف علی

آصف نہایت کیوٹ بچّہ تھا۔ اُستاد عبدالخالق صاحب کا بھانجا تھا لیکن دوسرے ماموں یعنی اُستاد عبدالغفار کے گھر رہتا تھا۔ یہ بھی بہت ذہین تھا۔ اُردو کی املا اور ریاضی میں طاق تھا۔ سانولا رنگ تھا مگر نین نقش بلا کے خوب صورت تھے۔ میری ہی کلاس میں تھا۔

ہمیشہ فرسٹ آتا، میرے ساتھ کھیلتا کودتا تھا۔ چونکہ ہم دونوں کے گھر سکول کے بالکل ساتھ تھے اس لیے اکثر شام تک سکول کے گراونڈ ہی میں پائے جاتے۔ ٹارزن اور عمران سیریز بھی پڑھنے لگے تھے۔ میری ریاضی اور اُردو املا بہت کمزور تھی۔ یہ مجھے اُن کی مسلسل مشق کراتا تھا۔ سکول میں اگر میرا کلاس میں تمام وقت امان اللہ شاہ عرف مھانا کے ساتھ گزرتا تھا تو سکول کے بعد کا وقت شام کا اندھیرا ہونے تک آصف کے ساتھ نبھتا تھا۔ اِس کا باپ چیچہ وطنی کے کسی گاؤں میں تھا۔ جہاں وہ معمولی کسان تھا۔ پانچویں کلاس پاس کرنے کے بعد یہ بھی اپنے والدین کے پاس چیچہ وطنی کے ایک گاؤں میں واپس چلا گیا۔ پھر میری اُس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ البتہ بعد میں ایک دو بار اُس کے بارے میں سنا کہ اُس کی تعلیمی حالت اچھی نہیں رہی۔ دراصل اُس کے والدین نے اِسے واپس بلا کر بہت بُرا کیا تھا۔ اُس کے والدین کا گاؤں بہت پسماندہ تھا۔ نہ وہاں ڈھنگ کا کوئی سکول تھا اور نہ تعلیم کی طرف کسی کا دھیان تھا۔ والد اور والدہ بھی اَن پڑھ تھے۔ مجھے اکثر یاد آتا ہے۔ سکول میں دراصل شام کا وقت نہایت رومانوی اور سانولا سا ہو جاتا تھا۔ پرندے اپنے گھروں کی طرف اُڑتے ہوئے جاتے تھے۔ اِس کیفت میں آصف کچھ نہ کچھ گاتا تھا۔ اُس وقت

اُس کی پتلی سی آواز بہت بھلی لگتی تھی۔ اِس سب کیفیت میں آصف کا چہرہ اُس پوری فضا میں بہت جچتا تھا۔ اُس عمر میں بھی اس کے اندر مجھ سے زیادہ عقلی قوت موجود تھی۔

پھر یوں ہوا کہ زمانہ بدل گیا۔ کاسۂ سر سے وقت کا دریا نکل گیا۔ 2015ء میں جب ایک دن مَیں یونیورسٹی آف لاہور میں Creative Writing کی کلاس پڑھا رہا تھا، اچانک اُس کا فون آ گیا۔ فون نمبر اُس نے ہمارے گھر یعنی والد صاحب سے لیا۔ اس نے کہا، میں آپ کا دوست آصف بول رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ پانچویں کلاس تک پڑھا تھا۔ لاہور آیا ہوا ہوں۔ آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُس کی آواز سن کر میں 30 سال پیچھے چلا گیا اور دل میں اُسے ملنے کا شدید جذبہ پیدا ہوا۔ 9 بجے وہ میری یونیورسٹی پہنچ گیا۔ میں اُسے پہچان نہ سکا۔ دیکھ کر شدید دھچکا لگا۔ یہ تو وہ والا آصف بالکل نہ لگتا تھا۔ داڑھی اور سر کے بال صاف سفید ہو چکے تھے، رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ بے ڈھنگی اور لمبی سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں ایک شاپر تھا، جس میں عینک اور ڈراپس کی شیشی تھی۔ اصل میں ہمارے گاؤں سے جانے کے بعد اُس کی تعلیمی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ میٹرک تھرڈ ڈویژن سے پاس ہوئی۔ آگے غربت اور افلاس کی وجہ سے پڑھ نہ سکا، اُس نے کسی کارخانے میں نوکری کر لی تھی۔ پھر کارخانوں کی نوکریاں کرتے اُس کی زندگی طے ہونے لگی۔ وہ میرے پاس دو گھنٹے بیٹھا رہا۔ مَیں اُسے کینٹین میں لے گیا۔ بچپن کی یادیں آنسو رلاتی رہیں۔ جو کچھ اُس نے اپنی تنخواہ بتائی وہ بیس ہزار بنتی تھی اور سر پر پورے خاندان کا بوجھ تھا۔ لیکن اس سے بھی تشویش ناک بات یہ ہوئی کہ اُس کا سیاسی ہیرو اور مذہبی رہبر خادم رضوی تھا۔ الیاس قادری کو ولی کامل سمجھتا تھا۔ وہ جب تک بیٹھا رہا مجھے صحیح دین کی تبلیغ کرتا رہا۔ میری شاعری اور ادب کو غیر شرعی خیال کرتا رہا۔ یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس کے جدید لباس اور لڑکوں، لڑکیوں کو آپس میں گھل مل کے بیٹھے دیکھ کر حیران، پریشان اور پشیمان ہونے کے بعد عذاب کی نوید سناتا رہا۔ کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے اپنے بچپن کے نہایت نفیس اور پیارے دوست کی یہ طبعی اور ذہنی حالت دیکھ کر مجھے کتنا صدمہ پہنچا۔ بخدا میرے اندر ایک زلزلہ اور بھونچال تھا۔ اُس کی معاشی اور ذہنی کیفیت دیکھ کر میرا دل ڈوب چکا تھا۔ مَیں اُن اشرافیہ کے منحوس چہروں پر کس طرح لعنت

کروں جنھوں نے ہماری نسلوں کو اِس پسماندگی تک پہنچا دیا۔ ہماری فکر کو قعرِ مذلت تک لے گئے۔ خود اندازہ لگائیے جب آصف جیسا ذہین لڑکا اِس تعلیمی اور معاشی نظام کی بدحالی کا شکار ہو کر اِس حالت کو پہنچ سکتا ہے تو ایک عام نوجوان کہاں تک نہ چلا گیا ہوگا۔ میرے دل پر کیا کچھ گزر رہی تھی۔ میں جب اُس کی کھانے اور چائے پانی سے تواضع کر رہا تھا تو اُس کا فضول خرچی پر لیکچر بھی سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلا گیا اور مجھے ایسا اُداس کر گیا کہ جی ویران ہو کر رہ گیا۔ اے زمانے تجھے کیا کہوں۔ اے پاکستان کے سیاسی اور معاشی نظام تجھ پر کیسے نفرین کروں؟

گھر کی تبدیلی

یہ 1983ء کے آخری دن تھے۔ دادا جان اور چچا رفیق فوت ہو چکے تھے۔ والد صاحب کویت میں تھے۔ ہم دو بہن بھائی، والدہ اور دادی گھر میں رہ گئے۔ جنھیں بھٹی فیملی ہراس کرنے لگی کہ ہماری زمین چھوڑو۔ آخر ہم نے گاؤں کے بالکل ساتھ ہی ایک کنال جگہ لی۔ ایک کنال کے گھر کی فردیں ہمارے نام پر چڑھ گئیں بلکہ میرے یعنی علی اکبر ناطق کے نام پر۔ اِس گھر میں بجلی نہیں تھی۔ گھر کیا بلکہ پورے گاؤں میں نہیں تھی۔ شام ہی سے لالٹینیں جل اُٹھتیں۔ باہر گلیوں میں اندھیر گھپ ہوتا تھا مگر ایسا سکون تھا کہ کیا کہیں۔ ایک دن ہزار دن کے برابر اور ایک رات ہزار رات کی مثل تھی۔ جیسے زمانہ ٹھہرا ہوا ہو۔ نہ گلیوں میں شور تھا نہ گھروں میں۔ رات کے عالم میں ٹاہلیوں اور پیپلوں کے درخت بھوتوں کے مسکن لگتے تھے۔ جب اُن کی شاخیں ہلتیں تو محسوس ہوتا پریاں پروں کو پھڑ پھڑا رہی ہیں۔ گرمیاں اور سردیاں اپنے وقت پر آتی تھیں اور وقت پر جاتی تھیں۔ ضرورتیں محدود تھیں اور اخراجات بھی محدود تھے۔

خیر اب ہم اِس نئے گھر میں تھے۔ ابا کویت میں تھا۔ یہ گھر بھی کچا تھا۔ اِس کے چار کمرے تھے۔ صحن میں چار پانچ ہی ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ گھر کی پچھلی دیوار کے ساتھ کھیت کھلیان تھے۔ سنبل اور ٹاہلیاں بہت زیادہ تھیں۔ کھیت برسن اور سرسوں کے علاوہ گندم اور مکئی کے بھی ہوتے تھے۔ سامنے یونین کونسل کا آفس تھا۔ درمیان کی سڑک بھی درختوں سے بھری رہتی تھی۔

یونین کونسل میں بھی بے شمار درخت تھے۔ ہمارے گھر سے بچاس قدم دُور سامنے ہی ہائی سکول تھا۔ روبرو اُستاد فضل حسین اور اُس کی فیملی تھی۔ اِسی دَور میں اُستاد فضل حسین سے مَیں نے ٹیوشن شروع کی تھی۔ مَیں تب تیسری جماعت میں تھا۔

جِنّ لڑکا اور مَیں

اِسی دَور کا ایک واقعہ ہے۔ مَیری عمر نو سال تھی، بھولا بھالا بچّہ تھا۔ اُن وقتوں میں گاؤں کے غریب لوگ چولہا جلانے کے لیے لکڑیاں استعمال کرتے تھے۔ تب آگ سوکھے درختوں کی لکڑیوں، بھینسوں کے گوبر کی سوکھی پاتھیوں یا سوکھی ہوئی جڑی بوٹیوں سے جلائی جاتی تھی۔ لکڑیاں مول لینے کی طاقت عام گھروں میں نہیں ہوتی تھی اِس لیے گاؤں کے بچّے اور لڑکے بالوں کے ذمہ یہ کام ہوتا تھا کہ لکڑیاں چُن کر لاؤ ورنہ شام کو روٹی نہ ملے گی۔ ایک دن مَیں اور ہمارے ہمسایوں کا ایک لڑکا لکڑیاں چُننے کھیتوں میں گئے۔ ایک جگہ مَیں اپنی لکڑیاں چُن چُن کے ڈھیر لگائے جاتا تھا اور دوسری جگہ میرا ہمسایہ، جو میری ہی عمر کا تھا، وہ اپنی لکڑیاں ڈھیر لگا کر رکھے جاتا تھا۔ کچھ دیر میں میری کافی ساری لکڑیاں جمع ہو گئیں۔ اِتنے میں مجھے پیاس لگ گئی۔ دُور پانی کا ایک نالہ بہتا تھا۔ مَیں نالے پر پانی پینے چلا گیا۔ وہاں ایک سنہری رنگوں والی چڑیا ایک چھوٹے سے درخت کی ٹہنی پر بیٹھی تھی مَیں اُسے پکڑنے کی کوشش میں لگ گیا، وہ جہاں جہاں اُڑ کر نکل جاتی مَیں اُسی کے پیچھے پیچھے بھاگتا جاتا مگر چڑیا نہ پکڑ سکا اور اس میں کافی دیر ہو گئی۔ واپس آیا تو میری اور اُس لڑکے کی لکڑیوں کے ڈھیر غائب تھے اور وہ لڑکا وہیں بیٹھا رو رہا تھا، مَیں نے اُسے پوچھا تُو کیوں رو رہا ہے اور لکڑیاں کہاں ہیں۔ اُس نے کہا ایک جِن آیا تھا، وہ میری اور آپ کی لکڑیاں اُٹھا کر چلا گیا ہے، جِن کہتا تھا، ہم نے بھی روٹیاں پکانی ہیں۔ اُس کے بعد اُس نے جِنّ کی شکل اور ہیئت کے بارے میں بتایا کہ کیسی تھی۔ مَیں اُس کی زبانی جِنّ کی شکل سن کر ہی ڈر گیا۔ ہم دونوں واپس آ گئے۔ میری ماں نے پوچھا لکڑیاں کہاں ہیں؟ مَیں نے اُسے جِن والا تمام واقعہ سنایا۔ میری امی نے کہا چل میرے ساتھ اور مجھے لے کر اُس لڑکے کے گھر میں آ گئی۔ دیکھا تو اُن کے چولہے کے

پاس تمام لکڑیاں پڑی ہوئی تھیں جنھیں مَیں نے پہچان لیا۔ مَیں حیران ہوا کہ یہ لکڑیاں جن یہاں کیسے پھینک گیا۔ وہ لڑکا اور اُس کی والدہ بھی اِس بات پر حیران تھے۔ میری والدہ نے مجھے کہا، اِن میں سے اپنی لکڑیاں اُٹھا۔ مَیں نے اپنی لکڑیاں اُٹھائیں اور گھر آ گئے۔ میری امی نے مجھے بتایا کہ وہ جِن جو لکڑیاں اُٹھا کر لے گیا تھا وہ یہی لڑکا تیرا دوست ہے اور آئندہ تُو نے اس کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رکھنا۔ مَیں اپنی والدہ کی یہ بات سن کر ڈر گیا اور پھر جہاں بھی اُس جِن کو دیکھتا، دُور بھاگ جاتا اور آج تک اُس جنِ سے سلام دُعا نہیں رکھی۔ تب سے مَیں نے اُصول بنا رکھا ہے کہ ہر اُس انسان سے دُور رہوں گا اور اُسے اپنا دوست نہیں بناؤں گا جس کے بارے میں ذرا بھی شبہ ہوا کہ یہ دراصل ایک جن ہے۔ ادبی دُنیا میں بھی مجھے بہت سے جِن ملے ہیں جنھیں ہر ممکن اپنے سے دُور رکھتا ہوں۔

والد صاحب کی کویت سے واپسی اور ہمارے ٹھاٹھ

والد صاحب ڈھائی سال بعد کویت سے واپس آ گئے۔ تب میں چوتھی جماعت میں تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہم اچانک امیر گنے جانے لگے۔ کپڑے بھی اچھے پہنتے تھے، جوتے بھی۔ سکول میں بھی بہت عزت ہونے لگی۔ سکول میں اُستادوں کی چائے دو دو دفعہ بنا کر لے جاتا۔ دو تین اُستادوں کو اُدھار پیسے بھی دے دیتا تاکہ مار سے بچ جاؤں۔ کھیلنے کے لیے ہاکیاں اور کرکٹ کا سامان بھی خرید لیا۔ ہاکی میں کلیم اللہ، سمیع اللہ اور اختر رسول میرے ہیرو تھے اور کرکٹ میں رمیز راجہ، ظہیر عباس اور جاوید میانداد پر جان چھڑکتا تھا۔ اُنھی کی نقل کر کے کھیلنے کوشش کرتا۔

تب تک میرا چھوٹا بھائی علی اصغر تیسری جماعت میں ہو چکا تھا لیکن اب ہماری صحت پر افلاس و امارت کا کوئی اثر نہیں تھا کیونکہ تب گاؤں میں تمام چیزیں امیروں اور غریبوں کی سادگی سے ہی چلتی تھیں۔ فرق صرف فاقہ کشی کا تھا۔ یعنی جس گھر میں دو وقت کی ہانڈی پکتی وہ امیر اور جس کی ایک وقت پکتی وہ غریب تھا۔ چونکہ ہمارے گھر میں پچھلے ساڑھے تین سال سے دو وقت کی ہانڈی پک رہی تھی لہٰذا ہمیں امیر سمجھا جانے لگا۔ اِسی عرصہ میں صدرالدین اور اُس کی بیوی اماں

حلیمہ جو پہلا گھر چھوٹ جانے کے بعد لاہور چلے گئے تھے، واپس لوٹ آئے اور ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ اِن دِنوں مَیں بھی کافی شرارتی ہو گیا تھا۔ آئے دن نئی شرارت سوجھتی تھی۔

بابا صدرالدین اور مَیں

بابا صدرالدین کے غصّے کا پارہ ہمیشہ 190 ڈگری پر رہتا تھا۔ ان کے شعلوں کی تاب صغیر وکبیر نہ لا سکتے تھے۔ حلیمہ بی بی ان کی ضد تھیں یعنی نہایت رحم دل خاتون تھیں۔ اُن کا ایک قانون تھا کہ گالیاں جھولی بھر بھر کر دیتے مگر ہتھ چھٹ نہیں تھے۔ ان کی حرکات سے یوں لگتا ابھی توپ چلا دیں گے مگر انجام میں غلیل بھی نہ تھے۔ قائداعظم کے بہت خلاف تھے۔ ان کو گاہے گاہے صلواتوں سے نوازا کرتے تھے۔ کہتے، 'ایک بار وہ فیروز پور میں آیا۔ نواب ممدوٹ اُس کے ساتھ تھا، نواب ہم سے باتیں کرتا رہا اور وہ گُنگ بیٹھا رہا۔ مَیں نے نواب سے کہا تو چپ کر، جس نے پاکستان بنانا ہے اُسے بولنے دے۔ پھر میں نے قائداعظم سے کہا، ہاں بھائی محمدے (یعنی محمد علی جناح) تو گل کر، جدوں پاکستان بنے گا، فِر ساڈا فیروز پور کتھے جائے گا؟ لیکن جواب دینا تو ایک طرف اُس نے میری بات ہی نہ سمجھی، آنکھیں پھاڑ کر پاگلوں کی طرح دیکھتا رہا۔ بعد میں پتا چلا، اسے تو پنجابی نہیں آتی۔ پھر میں نے لوگوں کو بہت کہا، اس کے پیچھے نہ لگو، تمھیں اُجاڑ کے رکھ دے گا مگر میری کسی نے نہ سنی۔ ووٹ پڑے تو میں نے یونینسٹ کو ووٹ دیا۔ میں نے کہا۔ نہ کانگرس چاہیے نہ مسلم لیگ، یہ انگریز پارٹی مجھے ٹھیک ہے۔ پر وہ کالوں کے مقابلے میں ہار گئی۔ بس اسی دن سے ہماری قسمت ہار گئی۔ اُس نے سب کچھ تباہ کروا دیا۔ یہاں اوکاڑے میں لا کے مروا دیا۔'

یہ مزے کی باتیں سب اُن کی خیال آفرینی تھی ورنہ وہ کبھی نہ ممدوٹ کو ملے نہ قائداعظم کو۔ ہاں البتہ ووٹ ضرور یونینسٹ کو دیے تھے۔ میرے بارے میں ان کا فیصلہ تھا کہ یہ لڑکا ہر عمل میں دُنیا کے اُلٹ چلے گا اور ایک دن اپنی گردن میں ریشم ڈلوائے گا۔

اس کے باوجود بابا صدرالدین تہجد گزار تھے۔ پانچوں نمازیں وقت پر پڑھتے۔ روزہ

رکھتے۔ چاہے جون جولائی میں کیوں نہ آئیں۔ بہت تحمل سے افطار کرتے۔ یعنی اذان کے آدھ گھنٹا بعد مغرب وعشا سے فارغ ہو کر۔

صدرالدین پر تیروں کی بارش

یہ بھی رمضان کا مہینا تھا عصر کا وقت تھا۔ مَیں بتا چکا ہوں ہمارا گھر کچا تھا اور بہت بڑا تھا۔ ایک بڑے احاطے میں اِدھر اُدھر کچے مکان تھے اور بیچ میں کھلا صحن تھا۔ انھی میں ایک کمرہ بابا صدرالدین اور اماں حلیمہ کے پاس تھا۔

ایک دن میرے ہاتھ میں ایک تیر کمان تھی۔ آپ سمجھیں یہ بچّوں کے کھیل کی تیر کمان ہوتی تھی۔ اسے بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شہتوت کی چھڑی لی۔ اس میں لچک زیادہ ہوتی ہے اور ٹوٹتی کم ہے۔ اسے دونوں سروں سے موڑ کر کمان کی شکل دی اور ایک مضبوط دھاگے سے باندھ دیا۔ اس کے بعد سرکنڈے کا ایک کانا لے لیتے۔ اس کے اگلے سرے پر چنگا مضبوط کانٹا یا سوئی ٹھونس لیتے اور اس کے بعد پرندوں کا شکار کرتے پھرتے۔ یہ سرکنڈے کا تیر کبھی سیدھا میسّر نہ آتا تھا۔ اس میں ٹیڑھ ضرور ہوتی تھی اور ہلکا بھی ہوتا تھا۔ اِس لیے اس کا نشانہ کبھی سیدھا نہ لگتا۔ اگر آپ مشرق کی طرف نشانہ لے کر پھینکتے تو وہ شمال مشرق کی طرف مڑ جاتا۔ کبھی تو یہ ہوتا کہ آپ نے اسے پھینکا سامنے ہے لیکن اپنی ٹیڑھ اور ہوا کی بدولت گرا آپ کی پچھلی طرف۔

اس قسم کے تیر کمان سے نشانہ لیتے وقت صرف آپ کا نشانہ ٹھیک ہونا ضروری نہیں بلکہ بادبان اور کمپاس کے ساتھ آپ پر وحی اترنا بھی ضروری ہے اور یہ سب چیزیں ایک آٹھ دس سال کے بچّے کے پاس کہاں؟

اب ہوا یہ کہ دادا جی کو افطاری کی دیگ پکواتے ہوئے نماز کا وقت ہو گیا۔ روزہ اُنھوں نے رکھا ہوا تھا۔ وہیں جائے نماز بچھالی اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اِدھر میرے ہاتھ میں تیر کمان تھی۔ تیر کے آگے ڈھائی تین انچ کی سوئی جڑی ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں ایک چمبیلی کا ایک بوٹا تھا۔ اس پر ایک لالی آ کر بیٹھ گئی۔ لیجیے صاحب ہم نے اس لالی کا شکار کرنے کے لیے شست باندھ

لی۔کمان کی رسی پر تیر رکھ کر اس کو ایسا کھینچا کہ تیر گولی کی رفتار سے جائے۔وہی ہوا، تیر ایک دم ایسی تیزی سے نکلا کہ ہم خود دنگ رہ گئے۔مگر شامتِ اعمال، تیر نے اپنی سمت تبدیل کر لی۔لالی تو وہیں بیٹھی رہی اور تیر سیدھا بابا صدرالدین کی کمر میں ترازو ہو گیا۔وہ اُس وقت سجدے میں تھے۔جیسے ہی تیر اُن کے پہلو میں لگا، ایک دم ٹیڑھے سے ہو گئے اور اونچی آواز میں 'ہائے سبحان ربی الاعلیٰ' کہا۔مَیں نے دیکھا اُن کے سجدے کی حالت میں تیر اُن کی کمر میں ایسے پیوست تھا جیسے زمین پر نیزہ گڑا ہو۔اس کا مطلب تھا سوئی پوری کی پوری ان کے گوشت میں اتر گئی تھی۔یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔بابا جی کی اگرچہ تسبیح میں 'ہائے' کا اضافہ ہو گیا تھا مگر فی الحال وہ نماز توڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ نادر شاہ بن جائیں گے۔اب میں نے کہا، جو بھی ہو اِس لالی کا نشانہ لے کر رہوں گا۔فوراً دوسرا تیر کمان میں رکھا اور پہلے تیر کی ٹیڑھ کا اندازہ کر کے دوسرا تیر تھوڑا سا لالی کی طرف ترچھا کر کے چھوڑ دیا۔مگر ہوا یہ کہ وہ بھی ترچھا ہی گیا اور پھر بابے کی کمر میں پیوست ہو گیا۔میرا غصّہ دو چند ہو گیا۔تیسرا تیر چڑھانے ہی لگا تھا کہ میری والدہ آ گئیں۔اُنھوں نے میرے کان پر ایک جمائی، بولیں، 'شمر کی اولاد یہ کیا کر رہا ہے؟ دادا نماز میں بیٹھے ہیں اور تو تیر پر تیر چھوڑے جا تا ہے؟'

والدہ نے تیر کمان میرے ہاتھ سے لے لیا۔پھر اس سے پہلے کہ دادا جی نماز سے فارغ ہوتے، میں گھر میں موجود ٹاہلی کے درخت کی چوٹی پر چڑھ گیا۔پورا گھر سہما ہوا تھا۔تھوڑی ہی دیر میں وہ نماز سے فارغ ہو گئے، پھر دعا مانگی۔اس کے بعد دیگ پر بیٹھے نائی سے کہا، 'لا بھئی اپنا نشتر لے کر میری کمر سے شمر کے نیزے نکال۔' نائی بھی سہما سہما تھا اور میں درخت پر بیٹھا سب دیکھ رہا تھا۔نائی نے دیگ کو چولھے پر چھوڑا اور اپنی گتھلی سے نشتر لے کر سوئیاں نکالنے لگا۔جب سوئیاں نکل چکیں تو دادا جی آرام سے اُٹھے اور میری طرف منہ کر کے آواز دی، پُتر نیچے آ جاؤ۔تیرا کوئی گناہ نہیں جدی پُشتی تمھارا یہ کام ہے۔

میں تھوڑی دیر اُوپر ہی رہا کہ میٹھی آواز سے بلاتے ہیں مگر اُترتے ہی آگ ہو جائیں گے لیکن وہ یہ جملہ کہہ کر دیگ کی طرف متوجّہ ہو گئے۔میں رفتہ رفتہ ٹاہلی سے اُترنے لگا۔کچھ ہی دیر

میں ڈر جاتا رہا اور میں نیچے آ گیا مگر حیرت کی بات کہ انھوں نے مجھے کچھ نہ کہا بلکہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے، 'پُتر یاد رکھ، جن کے اجداد ایک دفعہ ہاتھ سے کمان رکھ دیں، دوبارہ اُن کے نشانے ٹھیک نہیں لگتے، آج سوچتا ہوں دادا جی کی یہ بات کتنی سچ تھی۔

میاں میر میں گم شدگی

اماں حلیمہ اور بابا صدرالدین اکثر لاہور میں چلے جاتے تھے۔ لاہور صدر کا مین بازار سب رشتے داروں سے بھرا ہوا تھا۔ میری بھی اکثر ضد ہوتی تھی کہ لاہور جانا ہے لیکن میرے والد اِس بات کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ اِن لاہور والوں سے کوئی ربط رابطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اگرچہ یہ لاہوری رشتے دار اکثر پورا پورا کنبہ اٹھا کر ہمارے گاؤں چلے آتے تھے اور مہینا بھر ہمارے گھر میں میلا لگائے رکھتے تھے۔

اُس وقت لاہور جانا بھی ایک باقاعدہ سفر تھا۔ یہ نہیں کہ صبح چھ بجے خیال آیا لاہور جانا اور ساڑھے سات بجے لاہور میں داخل ہو گئے۔ اُن وقتوں میں ہفتوں تیاری ہوتی تھی۔ نئے کپڑے سلوائے جاتے تھے۔ نئے جوتے خریدے جاتے تھے۔ پھر یہ کہ گاؤں سے شہر کا سفر تانگوں پر ہوتا تھا۔ اومنی بسیں تھی، اگرچہ اُن کے ٹائم ٹیبل ہوتے تھے مگر اتنی زیادہ نہ چلتی تھیں۔ پورے دن میں ایک یا دو بسیں لاہور کی طرف نکلتی تھیں اور زیادہ سے زیادہ 70 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی تھیں۔ روڈ سنگل ہوتی تھی لیکن ٹریفک نہیں ہوتی تھی۔ اکثر تو ریل پر جاتے تھے۔ یہ ریل بھی ایک آدھ ہی جاتی تھی۔ اوکاڑہ سے ایک بس نکلتی تو شام کے قریب بادامی باغ میں جا کر رُکتی، وہاں سے تانگے پر بیٹھ کر پھر صدر کینٹ میں جاتے۔ گویا یہ ایک کام تھا جو آسان نہ تھا۔ پھر ایک بات اور بھی تھی کہ اِس سب سفر کے لیے اچھی بھلی رقم چاہیے ہوتی تھی۔ جو مہینوں تک میسّر نہ ہوتی تھی۔

اس سب کے باجود ایک دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں امی نے مجھے اور میری بڑی بہن خدیجہ کو بابا صدرالدین اور اماں حلیمہ کے ساتھ لاہور جانے کی اجازت دے ہی دی۔ صدر اور مغل پورہ میں بہت سے رشتے دار تھے۔ اُس وقت یہ لاہور کی مضافاتی بستیاں ہوا کرتی تھیں۔

ریلوے اسٹیشن کے پہلو میں جی ٹی ایس کا اڈا تھا۔ اِسی جگہ سے تانگے اور ویگنیں چلتی تھیں اور سڑکیں زیادہ تر ویران تھیں۔ اِکا دُکا سواری تھی۔ بس سے اُترتے ہی تانگے پر بیٹھے اور صدر کو کوچ پکڑا۔ صدر میں ہمارے رشتے داروں کے مکان سڑک کے بالکل اُوپر غلام محمد پارک کے سامنے پڑتے تھے۔

اُس وقت کا لاہور آپ سمجھیں درختوں اور ٹھنڈی نہروں کے صاف پانی کا لاہور تھا۔ اب لاہور میں آ کر یہ ہوا کہ ایک قسم کا گھر ہی میں قید کر دیا۔ میری اماں مجھے اکیلا گھر سے باہر نکلنے نہ دیتی تھی اور میری بڑی بہن میرے ساتھ چپکی رہتی۔ جونہی باہر قدم رکھتا خطرے کا نقارہ بج جاتا اور مجھے کان سے پکڑ کر اندر لے جایا جاتا۔ گھر سے باہر صرف ہمارے رشتے داروں کے لڑکوں کے ساتھ صبح اور شام ایک دو گھنٹے کو نکلنے کی اجازت تھی۔ اِدھر میرا جی آوارگی کو تڑپتا تھا۔ اُن دنوں ابنِ صفی کو پڑھنا بہت سے زیادہ متبرک سمجھا جاتا تھا اور یہاں میرے پاس اُس کی کوئی کتاب نہ تھی۔ گاؤں میں تھا تو سو طرح کی کتابیں اور سو طرح کے کھیت کھلیان تھے۔ یہاں مسلسل قید خانے سے گھبرا گیا۔ مجھے پچھتاوا ہونے لگا کہ کیوں لاہور آ گیا۔

ایک دن سہ پہر کا عالم تھا، بادل گھرے ہوئے تھے، ہوا نرم رو تھی۔ میرے سر کے کالے سیاہ اور چمکیلے بال اڑتے اور بیٹھتے تھے۔ اُسی وقت کوئی بات جی میں آئی، سب کی آنکھ بچائی اور گھر سے نکل لیا۔ پچھلی گلی سے ایک کتابوں کی دُکان پر پہنچا۔ آٹھ آنے کا ایک عمران سیریز لیا اور ایک دوسری گلی سے نکلتے ہوئے واپس غلام محمد پارک کی طرف آ گیا۔ اُسی کے ساتھ ایک بڑی پانی کی ٹینکی تھی۔ وہاں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں بیٹھ کر اُٹھا اور پیچھے کی طرف کے پُرانے قبرستان سے ہوتے ہوئے میاں میر کی طرف نکل گیا۔ رستے میں عمران سیریز پڑھتا جاتا تھا۔ یہ تمام رستہ تب ویران اور سبز گراونڈوں اور اونچے پُرانے درختوں سے بھرا ہوتا تھا۔ قبرستان ہزاروں سال پُرانا لگتا تھا لیکن پھر بھی ذرا ڈر نہ لگا۔ چلتے چلتے میاں میر کے مزار پر پہنچ گیا۔ یہاں بہت لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میدانوں کی گھاس بہت ہری ہری تھی اور سامنے مزار پر کبوتر بہت تھے۔ کبھی ہوا میں اِس طرف کو اُڑتے، کبھی اُس طرف کو۔ کبوتر سفید اور جانگلی، دونوں طرز کے تھے اور گٹکوں

گنگوں سے مزار کا احاطہ صدائے درود و صلات تھا۔ مَیں کبھی مزار کی قبر کی سہارلے کر بیٹھ جاتا، کبھی روشوں پر ٹہلنے لگتا۔ گھر بار سب کچھ یوں بھول بیٹھا کہ دماغ سے سب کچھ نکل گیا، لاہور میں ہوں یا اپنے گاؤں میں ہوں۔ آپ سمجھ لیں تب ہمارے گاؤں کی آبادی اور میاں میر یا لاہور صدر کی آبادی میں کچھ نفوس کا فرق ہوگا، نہ گاڑیاں تھیں، نہ موٹروں کی گھوں گھوں، نہ انسانوں کا ناپاک سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ فقط تازہ ہواؤں کے جھونکے تھے۔ پرندوں کی اُڑانیں تھیں اور درختوں کی لہلہاوٹیں تھیں۔ یہاں تک کہ عالم مغرب کا ہوگیا۔ اچانک جی میں خیال آیا، میاں علی اکبر تو یہ کہاں پھرتا ہے۔ اُدھر دادی اماں اور بڑی بہن کا صدمے سے جنازہ اُٹھ گیا ہوگا۔

لو میاں سوچتے ہی یہ بات مَیں نے گھر کی جانب یوں دوڑ لگائی کہ پرندہ سمجھو بن گیا تھا۔ عجب تازگی کا عالم تھا کہ سانس ذرا نہ پھولی، نہ قدموں میں تھکاوٹ آئی، اب تو یاد نہیں، کے وقت میں پہنچا مگر یہ ضرور ہے کہ گھوڑے کو پچھاڑ آیا تھا۔ لیجیے گھر کیا پہنچا کہ یہاں عالم سوگ کا اور دہائی کا تھا۔ میرے گم ہونے کے چرچے گلی گلی پھیل چکے تھے۔ یہ بات عین برحق سمجھ لی گئی تھی کہ کوئی پٹھان اُٹھا کر لے گیا ہے اور بیچ دے گا۔ اب علی اکبر ہاتھ نہیں آئے گا۔ سب سے بڑا صدمہ تو یہ تھا کہ مجھ چٹے گورے کو پٹھان کے ساتھ دیکھ کر پولیس مجھے بھی پٹھان سمجھے گی اور راستے میں کچھ پرسش اُٹھانے والے کی نہ ہوگی۔ پورے صدر میں ادھر اُدھر اعلان ہو چکے تھے کہ اِس رنگ شکل کا لڑکا ملے تو خبر کی جائے۔ رشتے داروں کے سب لڑکے ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے۔ اب جونہی مجھے گھر میں داخل ہوتے دیکھا، میری بہن اور دادی اماں چیخیں مارتی ہوئی مجھ سے چپک گئیں۔ سب کی سانس میں سانس آئی اور اگلے ہی دن جی ٹی ایس بس پہ لادا اور اوکاڑہ نزول فرمایا۔ پچھلے دنوں صدر سے گزرا تو کیا کیا یاد آ کے رہ گیا۔ ہائے میرے اگلے لاہور تجھے کہاں سے لاؤں۔

کتابیں اپنے آبا کی

اب مجھے کتابیں پڑھنے کی لپک ہوئی کہ الاماں۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ سامنے یونین کونسل کا

دفتر تھا جس کا ذکر دادی اماں کے باب میں آ چکا ہے۔ اِس میں اونچی اونچی بہت سی چھاؤں بھری ٹاہلیاں تھیں۔ یونین کونس میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔ ویسے تو اِس میں زیادہ تر تفسیر اور پاکستانی علوم کے متعلّق کتابیں تھیں جو اُس وقت میرے کام کی نہیں تھیں مگر بچّوں کی بے شمار کتابیں بھی موجود تھیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں تھیں۔ اِن میں الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، ٹارزن کی واپسی، چچا چھکن وغیرہ کو مختصر اور سادہ کر کے چھوٹی کتابیں بنا دی گئیں تھیں۔ جو بچّوں کے پڑھنے کے واسطے پڑی تھیں۔ منشی فضل حسین کے کہنے پر مَیں وہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ یہ بہت مزے کی تھیں اور گاؤں میں میرے علاوہ اِنھیں کوئی نہیں پڑھ رہا تھا۔ گھر کے سامنے کچی سڑک گزرتی تھی۔ سڑک کے ساتھ پانی کا نالہ چلتا تھا اور کنارے پر دونوں جانب ٹاہلیوں کے بلند پیڑ تھے۔ یہاں اکثر ٹاہلیوں کی چھاؤں میں چار پائی رکھ کر ہم آرام کرتے تھے۔ مَیں کوئی نہ کوئی کتاب اُٹھا کر یہیں چار پائی پر لیٹ جاتا اور کتاب پڑھنے لگتا۔ بعض اوقات سڑک پر پھیری لگانے والے اکثر آواز لگاتے ہوئے گزرتے تھے۔ کھوئے کی قُلفی لے لو، گڑ اور برف کا ٹھنڈا گولا لے لو۔ لال د لال متیرہ لے لو۔ خاص کر جب قُلفی اور گولے کی آواز آتی تو میرے کان کھڑے ہو جاتے، بھاگ کر گھر میں جاتا اور پیسے یا آٹا، گندم جو بھی ملتا، لے کر سڑک پر آ جاتا۔ برف کا گولا بنوا لیتا اور سُرخ کے لگا لگا کر چوستا اور شیشم کے درختوں کی چھاؤں تلے بچھی چار پائی پر بیٹھ کر یا پانی کے نالے میں پاؤں ڈال کر کتاب پڑھتا جاتا اور گولا کھاتا جاتا۔

بعض اوقات ٹارزن کی کتاب لے کر ٹاہلیوں پر چڑھ کر گلہریوں کی طرح شاخوں پر پھدکتا رہتا اور کتاب پڑھتا۔ جب پیسے پاس نہ ہوتے تو قُلفی یا گولے والے کو دُور جاتے ہوئے فقط دیکھتا رہتا۔ جب تک آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتا نظر کتاب پر نہ کرتا۔ یونین کونسل کا دفتر اور اُس میں لائبریری مصطفیٰ زیدی نے بنوائی تھی۔ اُس وقت وہ ساہیوال کے ڈی سی تھے لیکن یہ کام میرے پیدا ہونے سے کہیں پہلے کا تھا۔ مَیں نے ابنِ صفی کی عمران سیریز، ٹارزن کی جنگلی مہمیں اور کمانڈوز کی کہانیاں بھی مفت یہیں سے پڑھیں۔ بعض اوقات مَیں وہ کتابیں گھر لے آتا اور اُس کے عوض چوکیدار کو دوپہر کے وقت گھر سے عمدہ دودھ پتی بنوا کر لا پلاتا۔ یہاں سے مَیں نے سارا وہ ادب

پڑھا جو بچوں کو پڑھنا چاہیے تھا۔ اے کاش آج کے بچّے پیدا ہوتے ہی جوان نہ ہوتے اور نیٹ کی بجائے کم از کم بیس سال کی عمر تک کتاب ہی سے واسطہ رکھتے تو یقین مانیے وہ آہستہ آہستہ بڑے ہوتے اور یہ بہت فطری ہوتا۔ کیونکہ جلد بڑا ہونے والا جلد رسوا ہوتا ہے۔

مگر یہ ٹھاٹھ دو سال ہی قائم رہ سکے۔ کیونکہ والد صاحب جتنے پیسے لائے تھے اُن میں سے کچھ پیسوں کی چار پانچ بھینسیں خرید لیں، اُن کو چارا ڈالنے کے لیے نوکر رکھ لیا۔ کچھ پیسے رشتے داروں کو اُدھار دے دیے۔ کچھ اِدھر اُدھر کے جاننے والے لے گئے اور آج تک واپس نہ کیے۔ لہٰذا چھٹی جماعت تک جاتے جاتے تمام سرمایہ ڈوب گیا۔

روزانہ کے معمولات

چھٹی جماعت میں میری عمر گیارہ سال تھی۔ اُن وقتوں میں گاؤں میں کسی بچے کا اِس عمر میں پہنچنا، یہ اعلان ہوتا تھا کہ بچہ لڑکا ہو گیا ہے۔ اب اِس پر ذمے داریوں کا لاد دینا واجب ہے۔ چنانچہ صبح کی اذان کے وقت میری ماں زبردستی سوئے ہوئے کو اٹھاتی اور مسجد میں بھیجا کرتی۔ جہاں نماز کے بعد مولوی عارف صاحب سے قُرآن ناظرہ پڑھتا۔ سورج نکل آتا، تب گھر آتا، اُس کے بعد درانتی پکڑتا اور گھر کے پچھواڑے میں موجود کھیتوں سے بھینسوں کا چارا کاٹ کے لاتا، وہیں پر اگر جامنوں کا موسم ہوتا تو صبح صبح پکے ہوئے جامن کھاتا جو رات بھر رِس رِس کر پیڑوں کے اُوپر سے گر جاتے تھے اور زمین پر بکھرے پڑے ہوتے تھے۔ اگر امرودوں کا موسم ہوتا تو وہی کچے پکے کھا لیتا، شہتوت بھی بہت مل جاتے تھے۔ اگر مالٹوں کی بہار ہوتی تو بھی خالی نہ جاتی۔ کچھ بھی نہ ملتا تو کھیتوں میں چیرا تو ضرور ہی مل جاتے۔ پاؤں میں جوتے اُن دِنوں ٹائر کے ہوتے تھے۔ اِن کی خوبی یہ تھی کہ ٹوٹتے نہیں تھے۔ تریل اور گھاس پر پھیلی صبح کی تراوت میں پاؤں دن بھر ٹھنڈے رہتے تھے۔ چارا لانے کے بعد رات کے بچ گئے ہوئے سالن سے یا ٹماٹروں اور مرچوں کی چٹنی سے دیسی گھی میں پکی روٹی کھاتا اور چھنا بھر لسی پیتا، پھر بستہ اُٹھاتا اور بیس قدم کی راہ میں پڑے سکول میں جا پڑتا۔ قومی ترانہ مَیں خود کہتا تھا، میرے دو دوست، ندیم بھٹی اور امتیاز

اِس میں ہم نوائی کرتے تھے۔ قومی ترانہ نماز کی طرح یاد تھا یعنی دونوں کا مطلب کبھی نہ آیا۔ اُس کے بعد کلاسیں شروع ہوتیں۔

اُستادوں سے واسطہ اُن دنوں جگرے دار ہی رکھ سکتا تھا کہ سکول کے آدھے درخت تو اُن کے ڈنڈوں کی نذر ہوتے تھے۔ دو بجے تک یہیں پُرسہ داری ہوتی۔ اُس کے بعد گھر آتے، صبح کی پکی روٹی، پسی ہوئی مرچیں لسی میں گھول کر اُن کے ساتھ کھاتے اور بھینسوں کو نہروں پر نہلانے نکل جاتے۔ پھر اُنھیں گھر لاتے، چارا کُتر کر ڈالتے۔ تب شام کے پانچ بج جاتے، پھر سکول میں حاضر ہو جاتے، کھیلتے جاتے، کھیلتے جاتے اور شام ڈھلے لوٹ آتے۔ عین اُسی وقت دن بھر کے تھکے ماندے پرندے بھی بستی بستی سے دانہ دانہ چُگ کر پپلی پہاڑ کے جنگلوں میں لوٹ رہے ہوتے تھے اور بھیڑیں چرانے والے اپنے ریوڑوں کو چرواکر گاؤں میں لوٹ رہے ہوتے۔ بھیڑوں کے گزرنے سے کچی سڑک پر بیٹھی گرد ہلکی ہلکی اڑتی تو بہت اچھی لگتی۔ رات آٹھ بجے ہی اپنے بستروں پر لیٹ جاتے۔ تارے اُن دِنوں بہت چمکتے تھے، لیٹے ہی لیٹے اُنھیں گنتے رہتے۔ چاند میں چرخہ کاتنے والی بوڑھی عورت کو آوازیں دیتے اور وہ سنتی نہ تھی۔ آخر تھک کر سو جاتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رات خوابوں میں چاند والی عورت کے گھر میں تاروں کے ساتھ بیٹھے کھیل رہے ہوتے۔ اِن دِنوں میری ہم نشینی میرے دو چچا زاد علی اختر اور علی ارشد اور ایک میرا مرحوم بھائی علی اصغر کرتا تھا۔ گاؤں میں اکثر کوئی نہ کوئی ایسا مزے کا واقعہ پیش آتا کہ کئی دن تک اُس کا لُطف نہ جاتا۔

پھاجے بھٹی اور سؤر کی لڑائی

اُنھیں میں سے ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ہمارے گاؤں میں ایک موٹا تازہ آدمی پھاجا بھٹی ہوتا تھا۔ اُس کے پاس ایک دونالی رائفل ہوتی تھی۔ وہ اکثر اپنی رائفل اور کارتوسوں کا پٹا گلے میں ڈال کر نمائش کرتا ہوا کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر گاؤں میں آتا جاتا تھا۔ ہمارے گھر کے ساتھ ہی اُس کا ایک ڈیرہ تھا، وہاں دو چار مونڈھے بچھا کر خود چارپائی پر بیٹھ جاتا اور آٹھ دس لوگ مونڈھوں پر ٹِک جاتے۔ وہاں سب اپنی اپنی دلیری کی کہانیاں لمبی لمبی چھوڑتے تھے۔ پھاجا بھٹی اپنی رائفل

چار پائی کے ایک پائے سے لگا کر رکھ دیتا اور سب سے زیادہ گپیں مارتا کہ فلاں جگہ مَیں نے یہ کیا اور فلاں جگہ یہ تیر مارا۔

ہمارے ہاں تب سؤر کو نہایت نجس اور خطرناک جانور تصوّر کیا جاتا تھا۔ اکثر لوگ اپنے کتوں کے ذریعے اِس کا شکار کھیلتے تھے اور اِسے مار کر ثواب کماتے تھے۔ یہ گنے کے کھیت میں پایا جاتا تھا اور وہ کھیت گاؤں میں بہت ہوتے تھے۔ سؤر کے دو دانت تلواروں کی طرح تیز ہوتے ہیں۔ سؤر جنگلی ہو تو واقعی خطرناک ہوتا ہے۔ ایک دفعہ اللہ جانے کیسے ایک سؤر کا بچّہ ہمارے گاؤں میں آ نکلا مگر اِس کے ابھی دانت نہیں نکلے تھے لیکن دہشت بہت تھی۔ ہم لڑکے بالے عجیب حیرت اور سرشاری میں اِلا اللہ کر کے اُس کے پیچھے لگ گئے۔ رفتہ رفتہ تمام گاؤں کو پتا چل گیا کہ ایک سؤر گاؤں میں آ گھسا ہے۔ اب سؤر آگے تھا اور ہم اُس کے پیچھے۔ وہ گاؤں کی کبھی اِس گلی میں کبھی اُس گلی میں بھاگ رہا تھا اور ہم پیچھا نہ چھوڑ رہے تھے۔ وہ بہت گھبرایا۔ اُسے جب رستہ نہ ملا تو لوگوں کے گھروں میں داخل ہونے لگا۔ کبھی ایک گھر کی دیوار پھلانگتا اور کبھی دوسرے گھر کی۔ گھر کی عورتیں سؤر کو دیکھ کر چیخیں مار کر بھاگ اٹھتیں۔

پھاجے بھٹی کو پتا چلا تو اُس نے اپنی بہادری کی دھاک بٹھانے کا سوچا اور رائفل لے کر سؤر کے پیچھے ہولیا۔ مگر جب سؤر کی پھرتیاں دیکھیں تو گھبرا گیا اور ہم لڑکے بالوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

سؤر ایک گھر میں جا گھسا، بے چارا حواس باختہ ہو چکا تھا۔ گھر کے ایک کمرے میں ایک عورت بیٹھی مدھانی سے دودھ بلو رہی تھی۔ سؤر نے جاتے ہی اُسے ٹکر دے ماری، وہ ایک طرف لڑھکتی چلی گئی اور اُس کے دودھ کی چاٹی ٹوٹ کر دودھ دہی لسی اور مکھن پورے کمرے میں بہہ گیا۔ وہ عورت اوندھے منہ گری اور ڈر کے مارے اٹھی تو پھر گر گئی۔ سؤر دیواروں کو ٹکریں مارنے لگا مگر اُسے اب بھاگنے کو جگہ نہ تھی۔ اتنے میں پھاجے بھٹی کو لوگوں نے کہا سردار صاحب آپ کی رائفل کس کام آئے گی۔ اب اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ دروازے کے پاس ہو کر سؤر کو فائر کرے۔ وہ کسی بھی وقت حملہ کر دیتا۔ آخر لوگوں کے شرم دلانے پر پھاجے بھٹی نے دروازے کے قریب ہو کر

سؤر کا نشانہ لیا مگر سؤر کی دہشت سے اُس کی ٹانگیں اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جیسے ہی فائر کیا، خود زمین پر گر گیا اور فائر بجائے اِس کے کہ سؤر کو لگتا خود ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ ہم اللہ اللہ کر کے بچے۔ اِدھر سؤر نے فائر کی آواز سنی تو سیدھا پھاجے کی طرف آیا۔ یہ موٹا تازہ بہت تھا جلدی اُٹھا نہ گیا، سؤر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گرے پڑے پھاجے بھٹی کے ایک زوردار ٹکر ماری۔ وہ تو خُدا کا شکر تھا کہ سؤر ابھی بچہ تھا، اُس کی قتلیاں (لمبے تیز دانت) نہ نکلی تھیں ورنہ وہیں پیٹ چاک ہو جاتا۔ ہم ڈر کے مارے دُور ہٹ گئے۔ سؤر پھاجے بھٹی کے سینے کے اوپر سے چڑھتا ہوا باہر نکل گیا۔ اُسی اثنا میں ہماری اینٹیں اور پچاس ساٹھ لوگوں کے ڈنڈے سؤر پر پڑنے لگے۔ پھر چند ہی لمحوں میں اُس کا کچومر نکل گیا۔ اتنے میں پھاجا بھٹی بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی رائفل دوبارہ کاندھوں پر رکھ لی اور کارتوسوں کی بیلٹ بھی دوسرے کاندھے پر چڑھا لی، پھر سؤر کے پاس آیا اور اُسے کچلا ہوا دیکھ کر بولا، یار تم نے اِسے خواہ مخواہ ڈنڈوں سے مار دیا، مَیں نے تو لیٹ کر شست باندھی تھی اور دوسرا کارتوس بھی چڑھا لیا تھا۔

بارش کا پانی اور چھمی کی لڑائی

اِن دِنوں ساون بھادوں عروج پر رہتا تھا۔ سردی آتی تو تالابوں اور نالوں پر برف کی پیپڑیاں جم جاتیں۔ گرمی کے مہینے آتے تو پرندوں تک کی چیں بول جاتی۔ برفوں کے پسینے بہہ جاتے۔ ساون بھادوں آتے تو برساتوں کے میلے لگ جاتے۔ دو دو ماہ مسلسل بارش ہوتی۔ گاؤں کی گلیاں نہریں اور ندی نالوں میں بدل جاتیں۔ گھر کے صحن اور چوک چوراہے تالاب بن جاتے۔ گاؤں کے ستر اسّی فیصد مکان کچے ہوتے تھے۔ دیواریں کچی ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ سے کبھی ایک مکان دھڑام سے گرا کبھی دوسری طرف گر گیا۔ محلوں کے محلے یوں گرتے تھے جیسے غزنی کا لشکر نکل گیا۔ چھتیں ٹپک پڑتی تھیں۔ اِدھر ساون کے بادل ایسے آتے جیسے کالی چادریں چڑھی آتی ہوں۔ ابھی ایک گھٹا برس کے جاتی تھی اگلے لمحے دوسری چلی آتی تھی۔ لوگ اذانیں دے دے کے توبہ تلافیاں کرنے کی کوشش کرتے مگر ساون بھادوں تو ساون بھادوں تھے، نہ دعا کی سنتے تھے نہ خُدا کی۔

اِنہی ساون بھادوں کے دنوں کا قصہ ہے۔ ہماری گلی سے اوپر والی گلی کی بات ہے۔ ہم لڑکے بالے کچھے پہنے بارشوں کے پانیوں میں غوطے لگاتے گھوم رہے تھے جھوم رہے تھے۔ اِسی اثنا میں چھمی اور شیدو میں لڑائی شروع ہوگئی۔ چھمی گاؤں کی ایسی خوب صورت لڑکی تھی کہ واللہ کوئی دوسری اِس جیسی نہیں تھی۔ معاملہ یہ ہوا کہ چھمی کا گھر اور شیدو کا گھر ساتھ ساتھ تھے۔ دونوں کے گھروں کے آگے سے پانی کی نالی بہتی تھی لیکن یہ نالی تو گھر کا ضائع شدہ پانی بہانے کے لیے ہوتی تھی، ساون کے بارشی ہاتھیوں کو کہاں سہار سکتی تھیں۔ چھمی کے گھر کا دالان اترائی کی طرف تھا۔ چنانچہ اُس نے مٹّی کے چار پانچ ٹوکرے ڈال کے اوپر سے آنے والے پانی کو پیچھے ہی روک دیا تاکہ پانی گھر میں مزید داخل نہ ہو۔ مٹّی کی یہ رکاوٹ پا کر نالی اور سڑک کا پانی شیدو کے گھر میں داخل ہونے لگا۔ اب اُس نے چھمی کی مٹّی ہٹانا شروع کر دی۔ سڑک نہر بنی ہوئی تھی۔ بارش مسلسل برس رہی تھی۔ چھمی نے اُسے روکنا شروع کر دیا۔ دونوں لڑ پڑیں۔ ہم اُنھیں دیکھنے لگے۔ پہلے گندی گالیاں دینے لگیں، ایک دوسری کو کوسنے دینے لگیں۔ پھر اور تیز ہوئیں اور ایک دوسری کے عاشقوں کے نام اور کام دہرانے لگیں۔ یہ مزے کی لڑائی دیکھ کر اور بھی لوگ وہاں جمع ہوگئے۔ اِس کے بعد ایک دوسرے کے بال اور گُتیں پکڑ لیں اور کھینچنے لگیں۔ سب تماشا دیکھ رہے تھے اور کوئی چھڑا نہیں رہا تھا۔ تب مزید آگ بھڑکی اور ایک دوسری کے کپڑے پھاڑنے لگیں۔ اتنے میں پانی اُن کے گھروں میں گھس کر تالاب بن رہا تھا۔ پھر بات یہاں تک پہنچی کہ دونوں الف ننگی ہوگئیں۔ لڑائی زوروں پر تھی۔ ایک ایک عضو نظر آ رہا تھا۔ ہم چھوٹے بچّے چاہتے تھے کہ یہ تماشا کبھی ختم نہ ہو۔ اتنے متوازن جسم اور ایسے دودھیا رنگ پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اتنے میں شیدو کا کوٹھا دھڑام سے نیچے آ رہا۔ کوٹھے کے گرتے ہی تماشا ختم ہوگیا۔ دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ کر اندر بھاگیں اور ہم وہاں سے اپنے اپنے محلوں کو بھاگے۔ مجھے آج بھی یہ منظر اتنا یاد ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔ اِس چھمی پر مَیں نے ایک افسانہ بھی لکھا ہے۔

ایک دفعہ جب میں پندرہ برس کا تھا، مَیں نے چھمی سے کہا، اے چھمی ہم بھی کھڑے ہیں راہوں میں، کہنے لگی ابھی تو تمھارے اپنے لڑکی والے دن ہیں۔ اُس کے بعد ہم نے کبھی اُسے آنکھ

اُٹھا کر نہ دیکھا۔ کچھ عرصے بعد اُس کی شادی ہوگئی اور جس سے شادی ہوئی وہ حرامی عورت کو پلاسٹک سمجھتا تھا۔ کافی عرصہ بعد ایک دفعہ گاؤں میں آئی، اُسے دیکھ کر میرا دل دہل گیا، بخُدا ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ مَیں حیران ہوگیا کہ یہ وہی چھمی ہے جسے حُسن کی دیوی کہتے تھے۔ چند سال اور گزرے، ایک دن خبر آئی کہ چھمی مرگئی ہے۔

آہ، اے دُنیا تُو کتنی ظالم ہے، تیرے بسنے والے اکثر درندے ہیں جو انسانوں کو زندہ رہنے سے روکتے ہیں۔

جامن کے درخت اور ایک ہولناک واقعہ

مَیں بعض اوقات اپنے گھر کے پچھلی طرف کے نالے کو پار کر کے بابے شریف کے کھوہ سے ہوتا ہوا عدالت خاں کے جامنوں کی طرف نکل جاتا تھا۔ اِن اونچے اور گھنے جامنوں کے اوپر کئی سوکھی شاخیں ہوتی تھیں جو ایندھن جلانے کے کام آتی تھیں۔ ایک دن اِسی طرح مَیں ایک جامن کی چوٹی پر چڑھ کے بیٹھا لکڑیاں توڑ رہا تھا۔ یہ پیڑ دیگر جامن کے پیڑوں کی قطار کے درمیان تھا، بہت گھنا تھا لہٰذا مَیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اِن جامنوں کے نیچے پانی کا نالہ بہتا تھا اور دائیں بائیں گنے کے کھیت تھے لیکن اِس وقت نالے میں پانی نہیں تھا۔ دن کے گیارہ بارہ بجے کا وقت تھا۔ اِسی اثنا میں مَیں نے دیکھا کہ ایک عورت نالے کے درمیان بھاگی چلی آتی ہے اور اُس کے پیچھے ایک آدمی لگا ہوا ہے۔ آدمی کے ہاتھ میں کسّی تھی (کسّی مٹّی کھودنے والا لوہے کا تیز اوزار ہوتا ہے جس کے پیچھے تین فٹ لکڑی کا دستہ ہوتا ہے)۔ عورت ہانپتی اور بھاگی چلی آتی تھی لیکن محسوس ہو رہا تھا کہ زیادہ بھاگ نہیں سکے گی۔ وہ آدمی جو اُس کے پیچھے لگا تھا، وہ عین اُس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ یہاں تک کہ میرے والے جامن کے درخت کے عین نیچے پہنچ کر وہ عورت گر گئی اور دونوں ہاتھ معافی کی طرح بند کر کے اُس آدمی سے معافیاں مانگنے لگی مگر اُس بد بخت اور ظالم نے وہ تیز لوہے والی کسّی اُس کے سر پر دے ماری۔ مَیں درخت کی چوٹی پر بیٹھا بالکل سہم گیا۔ میری ٹانگیں اور جسم اتنی تیزی سے کانپنے لگا جیسے ابھی گر جاؤں گا۔ مَیں اگرچہ ابھی بچّہ تھا مگر جان کو بچانے کے عجیب

لاشعوری احساس نے مجھے بالکل ساکت کر دیا۔ اتنے میں اُس آدمی نے تین چار وار مزید کیے اور عورت کو قتل کر دیا۔ مَیں نے گاؤں میں بھالو قصائی کے ہاتھوں اکثر بچھڑے کو ذبح ہوتے دیکھا تھا۔ اُس عورت کے ڈکرانے کی آواز اور خون بہنے کا نِگال (گردن میں حلق کی نالی) عین بچھڑے کی طرح تھا۔ اُس کے سر اور چہرے پر کسّی کے وار ایسے بھیانک تھے کہ مَیں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں کھولیں تو وہ بدبخت لاش کو کھینچ کر گنے کے کھیت میں پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے لاش کو کھیت کے اندر پھینک دیا تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ لاش پھینکنے کے بعد اُس نے نالے میں جمع ہوئے خون پر اُسی کسّی سے مٹّی ڈال دی اور قریب ہی ایک نالے میں کھڑے پانی سے کسّی کو دھو لیا اور آہستہ سے اِدھر اُدھر دیکھ کر آگے بڑھنے لگا۔ اُس کے وہاں سے جاتے ہی مَیں جلدی سے پیڑ سے نیچے اُترا اور بھاگ کر بابے شریف کے کھوہ پر آ گیا۔ وہ آدمی سامنے جا رہا تھا۔ مَیں نے ایک دم شور ڈال دیا کہ یہ بندہ ایک عورت کو قتل کر کے جا رہا ہے۔ کھوہ پر دو تین لوگ بیٹھے تھے۔ وہ میری بات پر حیران رہ گئے۔ مَیں نے انتہائی غلغلہ مچایا، اِس بندے کو پکڑو، اس نے ایک عورت کو قتل کر کے گنے کے کھیت میں پھینک دیا ہے۔ میرے اِس شور مچانے پر وہ لوگ اُس کے پیچھے بھاگے۔ پھر تھوڑی دیر میں پندرہ بیس لوگ اُس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ وہ گاؤں میں داخل ہو کر ایک شخص امین بھٹی کی بیٹھک میں گھس گیا اور جلدی سے اندر سے کُنڈی لگا لی۔ اتنے میں ایک بڑا مجمع اُس بیٹھک کے اردگرد جمع ہو گیا۔ تب لوگوں نے مجھ سے لاش کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ مَیں نے اُنھیں نشان دہی کی۔ پھر لوگ لاش پر پہنچ گئے۔

مقتول عورت مسلم شیخوں کی تھی اور قاتل بھی اُنہی میں سے تھا بلکہ عورت کا خاوند تھا۔ تھوڑی دیر میں عورت کے بھائی کلہاڑیاں لے کر وہاں چلے آئے اور دروازہ توڑنے لگے تاکہ بندے کو خود قتل کر دیں لیکن اُنھیں لوگوں نے پکڑ لیا۔ پھر پولیس کو اطلاع کر دی گئی۔ تھوڑی دیر میں پولیس آئی اور قاتل کو لے کر چلی گئی۔ عورت کے بھائی روتے اور پیٹتے رہ گئے۔ حیرت کی بات ہے مجھے نہ کسی نے گواہی کے لیے بلایا اور نہ کسی نے پوچھا کہ کیسے قتل کیا۔ ایک مدّت بعد مَیں نے سنا کہ عدالت نے اُس قاتل کو باعزت بری کر دیا ہے۔ قاتل نے یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ اُس نے قتل کیا ہے لیکن

عذر یہ پیش کیا کہ وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ سوتی تھی۔ حیرت ہے کہ عدالت نے اُس کا یہ عذر قبول کر لیا اور اُسے چھوڑ دیا۔ اے کاش پاکستانی عدالتیں قاتلوں کو باعزت بری نہ کیا کرتیں تو اس ملک کی یہ حالت نہ ہوتی۔ آج سارا ملک قاتلوں سے بھر چکا ہے۔

درختوں پر مرغیاں

گھر کے صحن میں تین چار ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ سامنے کی سڑک پر بھی دونوں جانب درخت تھے۔ یہ ٹاہلیاں بہت اونچی اور لمبی تھیں۔ سامنے یونین کونسل کے صحن میں تو ایک قسم کا جنگل تھا۔ میری والدہ نے مرغیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اب ہوا یہ کہ عصر کا وقت ہوتے ہی مرغیاں اُڈاریاں بھر کر ٹاہلیوں کی شاخوں پر بیٹھ جاتیں۔ یعنی رات کا بسیرا وہ ٹاہلیوں پر رکھنے لگیں لیکن کچھ ہی دن بعد بلے بلیوں کو خبر ہو گئی کہ اُن کی ضیافت کا سامان ٹاہلیوں پر سویا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ روز مرغیوں کی گردنیں ناپنے لگیں۔ اب میری والدہ کو فکر ہوئی کہ مرغیوں اور بلیوں کی آپس کی لڑائی یونہی چلتی رہی تو کچھ ہی دن میں ایک ویرانی کا بیاباں ہوگا۔ مرغیاں اِس جہان سے اُٹھ جائیں گی۔ چنانچہ والدہ نے ہمیں حکم دیا کہ مرغیوں کو ٹاہلیوں سے نیچے اُتاریں۔ لیجیے اب ہماری روز کی ذمے داری بن گئی کہ درختوں پر چڑھی ہوئی مرغیاں اُتار کر انھیں ڈربوں میں بند کریں۔ پہلے پہل تو ہم شاخوں پر چڑھ کر انھیں پکڑنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر ہو جاتیں۔ معمول یہ ہو گیا کہ ہم شاخ شاخ تو وہ پات پات۔ عشا ہونے تک یہی کھیل چلتا۔ سب مرغیوں کو درختوں سے اُتار کر ڈربوں میں لاتے۔ اُس کے بعد ایک اور طریقہ نکالا کہ نیچے ہی سے اینٹ روڑے مار کر انھیں اُتارنے لگے۔ یہ کام پہلے سے آسان تھا اور مزے کا بھی تھا۔ روزانہ شام سے لے کر ایک گھنٹا تک یہی سلسلہ چلتا۔ اِس میں یہ ہوا کہ چند دنوں میں ہمارا نشانہ اتنا درست ہو گیا کہ گھنٹوں کا کام منٹوں میں نمٹانے لگے۔ یہ سلسلہ کئی مہینے چلتا رہا۔ مرغیوں نے درختوں پر چڑھنا نہ چھوڑا اور ہم نے نشانہ بازی نہ چھوڑی۔ یہ گویا ایک شغل ہو گیا تھا۔ سہ پہر کے ہوتے ہی مٹی کے ڈھیلے جمع کر لیے جاتے اور جیسے ہی شام پڑتی، مرغیاں اُڈاریاں بھر کر پیڑوں پر

چڑھتیں، تب ہماری کارروائی شروع ہو جاتی۔ یہ کبھی خیال نہ آیا کہ ہم اُن ہی درختوں پر چڑھنے سے پہلے ہی پکڑ کر ڈربوں میں کیوں بند نہیں کر لیتے لیکن خیال تب آتا جب ہم اِسے کوئی مصیبت سمجھتے، ہمارے لیے تو اب یہ ایک کھیل ہو گیا تھا۔

بچپن کے کھیل

بچپن کے زمانے میں کئی طرح کے کھیل ہوتے تھے۔ جو سردی، گرمی، برسات اور بہار کے دنوں کی مناسبت کو دیکھ کر کھیلے جاتے تھے۔ دیہاتی لوگ زیادہ تر مقامی کھیلوں میں دلچسپی لیتے تھے اور شہری لڑکے بین الاقوامی کھیلوں کے علاوہ کوئی کھیل نہیں کھیلتے۔ دیہات میں اُن دِنوں جس طرح کے کھیل کھیلے جاتے تھے اُن میں باندر ِکلہ، گلی ڈنڈا، وانجی، لکڑ چٹالا، چور سپاہی، پتنگ بازی اور گھوڑی گھرمس زیادہ معروف تھے۔ انھیں میں ایک کھیل لاٹو گھمانا بھی تھا۔ اِن کھیلوں کے علاوہ ہم کرکٹ اور ہاکی بھی کھیلتے تھے لیکن اِن میں سامان زیادہ تر خود ساختہ ہوتا تھا۔ مَیں نے بچپن میں کسی ایک خاص کھیل پر کبھی توجہ نہیں دی تھی لیکن مَیں جو چند کھیل کھیلتا رہا اُن کا سرسری تذکرہ کیے دیتا ہوں۔

باندر ِکلہ

یہ سراسر دیہاتی کھیل تھا، آج بھی کہیں کہیں دیہاتوں میں کھیلا جاتا ہے اور کافی سخت جان لڑکوں کا کھیل ہے۔ اِس میں ایک کھلی جگہ پر ایک چوب زمین میں گاڑ دی جاتی تھی۔ اُس کے ساتھ پانچ فٹ کی رسی باندھ دی جاتی۔ چوب کے اردگرد اُنھی لڑکوں کے جوتوں کا ڈھیر لگا دیا جاتا جو کھیل میں شریک ہوتے تھے۔ یا اِدھر اُدھر سے ٹوٹے پھوٹے جوتے اٹھا کر چوب کے پاس رکھ دیے جاتے۔ جس لڑکے کے سر پر باری کا بوجھ آتا، وہ رسی پکڑ کر جوتوں کی رکھوالی میں مسلسل چوب کے اردگرد چکر لگاتا رہتا تاکہ کوئی لڑکا جوتا نہ اُٹھا سکے۔ دوسرے لڑکے چوب کے پاس پڑے ہوئے جوتوں کو اُٹھانے کی کوشش کرتے۔ اگر جوتا اٹھاتے ہوئے کسی لڑکے کو رسی والا لڑکا چھو لیتا تو

اسی لڑکے کی باری آجاتی۔ اگر تمام جوتے بغیر چھوئے اٹھا لیے جاتے تو وہی اٹھائے ہوئے جوتے رسی والے لڑکے کو مارنے شروع کر دیتے۔

چوب سے دور ایک نشان رکھ لیا جاتا تھا۔ جس کو ہاتھ لگانا ہوتا تھا۔ تمام جوتوں کے اُٹھتے ہی وہ مقررہ نشان کی طرف بھاگ اُٹھتا اور لڑکے اُس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اُس کی سمت جوتے پھینکتے جاتے۔ اگر چوب والا لڑکا جلدی نہ بھاگ پاتا تو اُس کی بڑی زبردست پٹائی ہوتی۔ یہ بڑی ذلت کی بات سمجھی جاتی تھی۔ مَیں نے باندر کلہ کھیلنے میں بہت وقت کاٹا ہے۔ مگر ایک آدھ بار جوتا کھانے کے علاوہ صاف بچ نکلتا تھا کیونکہ مَیں کافی تیز دوڑ لیتا تھا۔ یہ کھیل کافی دلچسپ ہوتا تھا۔

لکڑ چٹالا

یہ کھیل بھی ہم نے بہت کھیلا۔ کھیل کیا تھا؟ ایک طرح سے درختوں پر پُھرتی سے چڑھنے اور ایک شاخ سے دوسری شاخ پر گلہریوں کی طرح پھدکنے کی مشق تھی۔ ہمارے گھر کے ارد گرد اور سڑکوں پر بے شمار درخت تھے۔ ٹاہلیوں کے ان درختوں پر بلند شاخوں تک پہنچنے میں تب ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ اس کھیل میں یہ ہوتا تھا کہ آٹھ دس لڑکے ہوتے تھے۔ ایک ڈیڑھ فٹ کا لکڑی کا ڈنڈا ہوتا تھا۔ ایک لڑکا اِس ڈنڈے کو اپنی ٹانگ کے نیچے سے نکال کر دور پھینکتا تھا۔ جس لڑکے کی ڈنڈا اُٹھانے کی باری ہوتی تھی، وہ بھاگ کر ڈنڈا اٹھانے جاتا تھا۔ اتنے میں نیچے کھڑے ہوئے تمام لڑکے جلدی سے درختوں پر چڑھنا شروع کر دیتے۔ جب تک وہ ڈنڈا اُٹھا کر آتا، لڑکے درختوں کی شاخوں پر چڑھ چکے ہوتے۔ اب اُس نے درخت پر چڑھے ہوئے لڑکوں میں سے کسی نہ کسی لڑکے کے پیچھے جا کر اُسے ہاتھ سے چھونا ہوتا تھا۔ جیسے ہی وہ کسی کے پیچھے درخت پر چڑھتا، درخت والا لڑکا ایک شاخ سے دوسری کسی شاخ پر جا بیٹھتا۔ یہ کھیل مزے کا بھی تھا اور مشکل بھی تھا۔ سست اور ڈرپوک لڑکا اِس کھیل میں حصہ نہیں لے سکتا تھا کیونکہ درخت سے گرنے اور اپنی ہڈیاں تڑوانے کا خطرہ ہر وقت رہتا تھا۔ یہ کھیل ہم نے بہت کھیلا اور بہت عرصہ تک کھیلا۔

اس میں جسمانی ورزش کے ساتھ ایک طرح کی تیزی اور ہشیاری بھی پیدا ہوتی تھی اور بہت مزہ آتا تھا۔ یہ کھیل آٹھویں جماعت یعنی بارہ تیرہ سال کی عمر کے بچوں تک مقبول تھا۔

وانجی

یہ کھیل بھی ایک قسم سے بھاگ دوڑ کا ہی تھا۔ ہم سکول کے میدان میں ایک وانجی کی لکیریں بنا لیتے تھے۔ وانجی دراصل بڑے بڑے خانوں کا ایک پلاٹ ہوتا تھا۔ اُس میں چھوٹی چھوٹی لکیریں مار کر سڑکیں بنائی جاتی تھیں۔ یہ سڑکیں اُن خانوں کے اردگرد ہوتی تھیں جن میں مخالف ٹیم کے اراکین کھڑے ہوتے تھے۔ ہر خانے کی سڑک میں ایک لڑکا کھڑا ہوتا تھا۔ اُس لڑکے کا پاؤں سڑک سے باہر نہیں نکلتا ہوتا تھا۔ دو ٹیمیں ہوتی تھیں۔ ایک ٹیم کے لڑکے کھینچے گئے خانوں کی سڑکوں پر ایک خاص ترتیب سے کھڑے ہوتے تھے۔ اور دوسری ٹیم کے تمام ارکان کو ایک خانے سے دوسرے خانے میں جانے کے لیے سڑک کو عبور کرنا ہوتا تھا۔ اگر عبور کرتے ہوئے اُن کو باری والی ٹیم کا کوئی رُکن چھو لیتا تو دوسری ٹیم کی باری خانوں میں کھڑے ہونے کی آجاتی۔ اس کھیل میں نہایت عیاری اور بھاگنے میں تیزی اور تیز رفتاری کا عمل دخل تھا۔ ایک ٹیم کے اگر ایک بھی رُکن کو دوسری ٹیم کا کوئی رُکن چھو لیتا تو پوری ٹیم کو باری دینا پڑتی۔ اگر سب ارکان صحیح سلامت بغیر چھوئے تمام خانوں کو واپسی پر بھی عبور کر جاتے تو گویا باری والی ٹیم کو ایک انڈہ ہو جاتا۔ "انڈا" ایک شکست کو کہا جاتا تھا۔ عصر کے بعد یہ کھیل شروع کرتے تھے اور شام کی اذان تک جاری رہتا تھا۔ اس کھیل میں چھوٹے بچے چھوٹوں کے ساتھ کھیلتے تھے اور بڑے لڑکے بڑوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔

گلی ڈنڈا

اس کھیل میں قتلی کی طرح کی ایک چھ انچ کے سائز کی چھوٹی لکڑی ہوتی تھی اور ایک ڈیڑھ فٹ کا ڈنڈا ہوتا تھا۔ اکثر دو دو لڑکوں کی ٹیم ہوتی تھی۔ گلی کو ایک طریقے سے زمین سے ڈنڈے کے

ذریعے ابھارا جاتا یا دائرے سے باہر اُچھالا جاتا۔ اُس کے بعد دوبارہ اُسی ڈنڈے سے ضرب لگا کر دور پھینکتے تھے۔ جن لڑکوں کے سر باری ہوتی تھی۔ اُن کا کام یہ تھا کہ گلی کو اٹھا کر واپس اُسی طرف دوبارہ پھینکتے تھے۔ اگر ضرب کے دوران گلی کیچ کر لی جاتی تو دوسرے لڑکے کی باری آ جاتی یا اگر وہ لڑکا گلی پھینک کر اُسی کے ڈنڈے کا نشانہ لگا لیتا جس سے گلی کو ضرب لگائی گئی تھی تو بھی باری آؤٹ ہو جاتی۔ یہ کھیل کافی دلچسپی کے علاوہ اچھا خاصا کھپا دینے والا بھی ہوتا تھا۔ گلی کو پھینکنے والا لڑکا مسلسل سختی میں ہوتا تھا۔ باز و شل ہو جاتے تھے۔

ایک دفعہ مَیں اور میرا ایک دوست ایک دوسرے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہ لڑکا ہم سے عمر میں بھی دو سال چھوٹا تھا لیکن ظالم کا نشانہ ایسا درست تھا کہ خدا کی پناہ۔ گلی کو ایسی تاک کے ہٹ لگاتا تھا کہ گلی واپس پھینکنا ہمارے بس سے باہر ہو جاتی تھی۔ اُس نے شام تک ہمیں گاؤں سے ایک دوسرے گاؤں تک پہنچا دیا۔ یعنی چار میل باہر چھوڑ کے واپس ہوا۔ اُس کے بعد اُس لڑکے سے گلی ڈنڈا کھیلنے سے توبہ کر لی۔

مقامی ہاکی کھیلنا

ہم اِسی عمر میں ہاکی کھیلتے تھے لیکن یہ ہاکی گویا ایک خمدار لکڑی کی کھونڈی ہوتی تھی، جو کسی درخت سے کاٹ لیتے تھے۔ گیند کے لیے ہمارے پاس ایک اور ترکیب تھی۔ اُس کو ایک ترکیب سے پیدا کرتے تھے۔ وہ ایسے کہ مومی کاغذ کو پگھلا کر اُس کی گیند بناتے تھے۔ اُن دنوں سودا سلف لانے کے لیے پلاسٹک کے شاپر نہیں ہوتے تھے۔ لوگ کپڑے کا ایک تھیلا سی لیتے تھے، اُسی میں سودا وغیرہ خرید کر لاتے تھے۔ پلاسٹک کی شیٹیں محض مکانوں کی چھتوں پر ڈال کر اوپر مٹی ڈالنے کے لیے استعمال کرتے تھے یا پھر کھاد کی بوریوں کے اندر بھی ایک پلاسٹک کی شیٹ ہوتی تھی۔ اِس کے علاوہ پلاسٹک کا کوئی مصرف نہیں تھا۔ چنانچہ تب مومی کاغذ کا ملنا ایک مشکل کام تھا۔ سڑک پر کہیں کوئی پلاسٹک کی شیٹ کا ٹکڑا پڑا مل جاتا تھا۔ ہم سب لڑکے بچے پورے گاؤں میں گلیوں سے مومی کاغذ کے ٹکڑے چُن کر ایک جگہ جمع کر لیتے۔ پھر زمین میں ایک گیند کی طرح کا گول سا

سوراخ کرتے اور موم کا غذ کو آگ لگا کر اُس سوراخ میں اُس کا مائع انڈیلتے رہتے۔ جب گیند جتنی اُس کی ساخت تیار ہو جاتی تو اُسے کسی طرح گولائی کی شکل میں دبا کر گیند بنا لیتے تھے۔ یہ گیند پتھر کی طرح سخت اور نہایت بھاری قسم کی بنتی تھی۔ تب کھونڈیوں اور اِس گیند کے ذریعے ہاکی کھیلنے کی کوشش کرتے۔ اِس گیند میں ایک خرابی یہ ہوتی تھی کہ ایک قسم کا پتھر ہی ہوتا تھا۔ اکثر پاؤں اور ٹخنوں پر ایسی زور کی لگتی کہ جان ہی تو نکال دیتی تھی۔ اِس کی ضربوں سے کم وبیش تمام بچوں کے ٹخنے سوجے ہوتے تھے لیکن ہم کھیلنے سے باز نہ آتے تھے۔ اِس طرح کی ہاکی کھیلنا ہم دیہاتی بچوں کا ہی کام تھا، شہر کے بچوں کے بس کا روگ نہیں تھا۔ کھیل کے میدان کے لیے گھر کے سامنے والی یونین کونسل کا چھوٹا سا صحن ہوتا تھا یا پھر پہلو میں ایک ڈسپنسری کا لمبوترا سا میدان تھا۔ ہمارے لیے ہاکی سب سے خطرناک کھیل تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہاکی کھیلنے لگے اور کوئی ایک دو بچے زخمی نہ ہوئے ہوں۔

بھڑ کی پتنگ

بعض کھیل ہم نہایت شرارتی قسم کے کھیلتے تھے۔ یہ کھیل نہ ہوتے تھے بس شرارتیں ہوتی تھیں۔ اِنھی میں ایک شرارت بھڑ کے ساتھ زور آزمائی ہوتی تھی۔ معاملہ یہ تھا کہ گرمیوں کے دِنوں میں بھڑ کے اندر اچھا خاصا زہر پیدا ہو جاتا تھا۔ اِن کی بڑی بڑی کھکھریں دیواروں کے سوراخوں اور درختوں کی شاخوں میں لگی ہوتی تھیں۔ کسی نہ کسی جگہ سے ہمیں کاٹ لیتے تھے۔ اکثر منہ یا ناک پر ڈنک مارتے تھے۔ اِس کے ڈنک سے اچھی خاصی تکلیف ہوتی تھی۔ چیخیں نکلوا دیتا تھا۔ کئی کئی دن منہ سوج کر کُپا ہو جاتا۔ بخار بھی ہو جاتا تھا۔ بھڑ کی دو قسمیں ہوتی تھیں۔ ایک زرد قسم کا بھڑ ہوتا تھا۔ یہ عام بھڑ ہوتا تھا اور ایک کلیجی اور زردی رنگت میں بڑا سا بھڑ ہوتا تھا۔ اِسے کابلی بھڑ کہتے تھے۔ یہ نہایت زہریلا ہوتا۔ اُس کے ڈنک سے شدید تکلف ہوتی تھی۔ عام بھڑ سے کئی گنا زیادہ زہر کا ٹیکا لگاتا۔ ایک دو دفعہ مجھے اِس بھڑ نے بھی کاٹا تھا اور بہت مصیبت برپا ہو گئی تھی۔ اِس کے اندر طاقت بھی عام بھڑ سے زیادہ ہوتی تھی۔

چونکہ ہم بچوں کو ہر وقت کسی درخت کی شاخ پر چڑھنا ہوتا تھا، کسی دیوار کے سوراخ میں انگلی دینا ہوتی تھی چنانچہ اِن سے ڈنک مروا بیٹھتے تھے اور خوب روتے تھے۔ اُن دِنوں اینٹی الرجک گولیوں کا کچھ پتا نہ تھا، نہ ہم انجیکشن لگواتے تھے، تین تین دن منہ اور آنکھیں پھلائے پھرتے رہتے لہٰذا بھِڑ سے ہماری دشمنی فطری ہو گئی تھی۔ ہم یہ کرتے کہ لمبے لمبے دھاگوں سے ان بھِڑوں کی دُمیں باندھ کر اُنھیں پتنگ کی طرح اُڑاتے۔ ہم صرف دُم کے ساتھ دھاگا باندھ دیتے تھے اور اُس دھاگے کا ایک سرا اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ بھِڑ اُڑتا اپنے زور سے تھا۔ چنانچہ ہمارا مفت کا پتنگ بن جاتا۔ اِس کام کے لیے زیادہ تر کابلی بھِڑ اچھا رہتا تھا۔ اُس کے انجن کی پاور زیادہ ہوتی چنانچہ اُنچائی تک اڑتا تھا۔ اِس طریقے سے ہماری دو طرح تشفی ہو جاتی۔ ایک تو ہمیں اُن سے بدلا لینے کا موقع ملتا دوم اچھی خاصی پتنگ بازی بھی ہو جاتی۔ یہ کھیل بھی آٹھ دس سال کی عمر تک جاری رکھا، پھر چھوڑ دیا۔

باب چہارم

والد صاحب کا کاروبار کرنا

اِنہی دِنوں والد صاحب نے ایک اور کام کیا۔ جو کچھ کویت کی بچی کھچی پونجی تھی اُن سے کاروبار کرنے کی دلیل ذہن میں بنائی۔ میری والدہ نے بہت روکا، کاروبار ہم نہیں کر سکتے۔ لاہور میں کوئی مکان یا پلاٹ خرید لیں۔ بچّوں کے کام آئے گا مگر والد صاحب نے والدہ کی ایک نہ مانی اور کاروبار کی ٹھانی۔ گندم کا بیوپار کرنے کی طرف متوجّہ ہوئے۔ جب تمام پیسوں کی کافی ساری گندم خرید لی تو گاؤں کے غریب گھروں سے عورتیں آنا شروع ہو گئیں جن کی مفلسانہ سماجتوں کی تاب نہ لا کر والد صاحب نے اُنھیں وہی گندم چند روپے منافع کے ساتھ اُدھار دینا شروع کر دی اور منڈی کی طرف نہ لے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مہینے میں ساری گندم گاؤں میں اُدھار اُٹھ گئی۔ اُس کے بعد جو نقد پیسے کچھ تھے، وہ بھی رشتے دار اور اِدھر اُدھر کے یار دوست مانگ تانگ کر لے گئے۔ اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں سب کویتی سرمایہ ٹھکانے لگ گیا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے اِس گندم اور نقد دیے گئے اُدھار سے دو تین سال بعد ایک جگہ سے 1400 روپے واپس ہوئے۔ مجھے اُس سادہ لوح آدمی پر پیار آتا ہے جس نے یہ رقم واپس کی۔ یہ تھا میرے والد صاحب کا بیوپار۔

میرے گاؤں کا سرسری نقشہ

اِس کا نام 32 ٹو ایل ہے۔ اوکاڑہ کے مضاف میں ہے۔ اِس کی گلیاں چوڑی اور کھلی ہیں۔ کبھی اِس کے دائیں پہلو میں بیاس بہتی تھی۔ اب وہاں قبرستان ہے اور کافی گنجان ہے۔ یہاں وہابی، بریلوی اور دو چار شیعہ دفن ہیں۔ باہم صلح سے رہتے ہیں، قبروں کے اندر سے کبھی لڑائی جھگڑے کی آواز نہیں آئی۔ بیاس کا دریا سمٹ کر ایک چھوٹی نہر بلکہ نالہ ہو گیا ہے۔ اِس نالے میں بھی وسطی پنجاب کی تمام فیکٹریوں اور بارش کا پانی چلتا ہے۔

کبھی یہ گاؤں ماڈل ویلج تھا۔ اب کھنڈر ہو رہا ہے، درخت یہاں کے باسیوں نے اکثر کاٹ کھائے ہیں اور نئے نہیں لگائے ہیں۔ پہلے یہ گاؤں سکھوں کا تھا۔ درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ سڑکیں اگرچہ کچی تھیں مگر صاف تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پلاسٹ اور چھپر وغیرہ کی بیماری ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ گاؤں کے درمیان میں ایک بڑا چوک تھا۔ اِس میں پیپل، نیم، شرینہہ اور ٹاہلیوں کے بے شمار درخت تھے۔ بعد از تقسیم پنجابی مہاجروں کا ہوا۔ یہ مہاجر آدھے فیروز پوری ہیں، آدھے جالندھری ہیں۔ باقی جو بچتے ہیں وہ روہتکی ہیں۔ ابھی بھی روہتکی ہیں۔ گاؤں میں ندی نالے بہتے تھے، درخت چھاؤں رکھتے تھے۔ اب خاک اُڑتی ہے۔ یہاں دو ہائی سکول ہیں۔ ایک لڑکیوں کا ہے۔ جو گاؤں کے دائیں سرے پر قبرستان کے ساتھ ہے۔ مُردوں سے اُنھیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ایک گاؤں کے بائیں سرے پر ہے۔ دونوں کا فاصلہ بُعد المشرقین ہے اور متوازی ہے۔ یہ بہتر ہی ہے۔ اِس گاؤں میں ایک ڈسپنسری تھی۔ ایک یہاں بچّوں کی خوراک کا مرکزِ صحت تھا۔ مریضوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اب کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ ایک نیا ہسپتال بنایا ہے۔ ڈاکٹر ایک بجے دن کے ہسپتال کو تالا لگا کر چلا جاتا ہے۔ مریضوں کو ہدایت ہے کہ وہ ایک بجے سے پہلے بیمار ہو کر آیا کریں۔ اگر لیٹ ہو جائیں تو اگلے دن بیمار ہو جایا کریں، جلدی نہ کیا کریں۔ ایک بجے کے بعد اُس نے شہر میں کلینک کھولنا ہوتا ہے۔

ایک جانوروں کا ہسپتال بھی تھا، دونوں پاس پاس ہیں۔ وہ ایک بجے کے بعد کھلتا ہے اور

شام تک چلتا ہے۔ اگر جانور صبح بیمار ہو جائے تو وہ انسانی ہسپتال میں آ جاتا ہے۔

میرے بچپن میں گاؤں کے اندر ایک ہی مسجد تھی، پھر دو بن گئیں۔ اب گاؤں میں تین مسجدیں ہیں۔ ایک وہابیوں کی۔ ایک دیوبندیوں کی، ایک بریلویوں کی۔ یہ تینوں مسجدیں ہم نے بنائی ہیں اور ہم خود شیعہ ہیں۔

گاؤں کے لوگ کروڑ پتی نہیں تھے، لاکھ پتی بھی نہیں تھے، صرف پتی پتی تھے۔ بھینسیں یہاں بہت تھیں۔ اُنہی کا دودھ پیتے تھے۔ یہاں لڑائی وغیرہ نہیں ہوتی تھی، جھگڑا ہو جاتا تھا۔ اُس میں ڈانگ سوٹا، تلوار یا گولی نہیں چلتی، گالی چلتی تھی۔ البتہ دو لڑائیوں میں ڈانگیں چلتی مَیں نے خود دیکھی ہیں۔ تب میں تیرہ سال کا تھا۔ یہ لڑائی بھٹیوں اور تین آرائیں بھائیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ہمارے گاؤں میں بڑے کملے لوگ پیدا ہوئے۔ گاؤں میں پہلے ایک دو نائی ہوتے تھے۔ جو صرف ٹنڈ کرنا جانتے تھے اور چاول پکاتے تھے۔

کھیلوں میں کبوتر بازی، مرغے بازی، ڈرامے بازی، سب کچھ ہے۔ ایک یونین کونسل بھی ہے، جس کا قیام مصطفیٰ زیدی کے ہاتھ سے ہوا۔ لڑکوں کے سکول کا قیام مولوی کریم الدین اور محمد حسین آزاد کے ہاتھوں ہوا تھا، انگریزوں کے دَور میں۔ ہسپتالوں کا قیام پیپلز پارٹی کے دَور میں ہوا تھا اور اُن سب کو کھنڈر بنانے کا کام ن لیگ کے دَور میں ہوا۔

22 رجب کے کونڈے اور ہمارا گاؤں

دادی اماں اِس دن کا اہتمام بہت شوق سے کرتی تھیں۔ دادی اماں کو ایک بات کی بے حد فکر رہتی تھی۔ وہ یہ کہ ائمۂ طاہرین کے نام کی نیازیں دلوانے مین ناغہ نہ آئے چاہے دُنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ اِنہی میں ایک 22 رجب کی نیاز آتی تھی۔ رات بھر نہ سوتے تھے۔ تاروں کی چھاؤں میں پوریاں تلتے تھے، حلوہ پکاتے تھے۔ دادی اماں، میری والدہ، اور بہن پوریاں بنا بنا کر رکھتی تھیں۔ ہم لکڑیاں کاٹتے تھے، آگ جلاتے تھے اور میدے کے گول پیڑے بنا بنا کر دیتے تھے۔ رات بھر ٹھنڈی ہوا چلتی رہتی تھی، چراغ جلتے رہتے تھے۔ پوریوں کا ڈھیر لگ جاتا

تھا، تب فجر کا سویرا چڑھتا تھا۔ سب کو پتا ہوتا تھا آج اِس گھر میں کونڈوں کی نیاز ہے۔ آفتاب اُبھرنے سے پہلے لوگ چلے آتے تھے، بچّے چلے آتے تھے، عورتیں چلی آتی تھیں، کھاتی جاتی تھیں اور دُعائیں دے کر رخصت ہوئے جاتے تھے۔ ہم اِدھر بھاگ، اُدھر بھاگ، کسی کو حلوہ ڈال کر دے، کسی کو پانی دے، کسی کو پوریوں کی چنگیر دے، سب وقت مصروف رہتے تھے اور تھکتے نہ تھے۔ یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جاتا تھا اور نیاز کا وقت ختم ہو جاتا تھا۔

ہم پکاتے تھے، گاؤں والے آ کر کھاتے تھے، گاؤں کا اور ہمارا جی خوش ہوتا تھا۔ ابھی میرا چھوٹا بھائی علی اشرف اِس کا بہت اہتمام کرتا ہے۔ آٹھ دیگیں حلوے کی پکتی ہیں اور تین چار من میدہ لگتا ہے۔ تمام گاؤں کا صغیر و کبیر کھاتا ہے۔

بابا شریف کا کھوہ اور بابا شریف خود

ہمارے موجودہ گھر کے پیچھے کھیت کھلیان اور ندی نالے تھے اور قریب ہی بابے شریف کا کھوہ تھا۔ کھوہ اُسے کہتے تھے جہاں گاؤں سے باہر مال ڈنگر باندھنے کی جگہ ہوتی تھی۔ ایک ٹیوب ویل یا رہٹ بھی ہوتا تھا۔ گویا زمینداروں کا گاؤں سے باہر ایک دوسرا مکان سمجھ لیں جہاں کھیتی باڑی کی ضروریات اور مال مویشی رکھے جاتے ہیں۔ یہ کھوہ ہمارے گھر کے عقب میں فقط سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ اِس میں ایک بہت بڑا پیپل کا درخت تھا اور ایک دو جامن اور آم کے درخت تھے جن کے نیچے مویشی بھی بندھے رہتے تھے اور ہر وقت دو چار لوگ بیٹھے گپیں بھی ہانکتے رہتے تھے۔ یہیں پر ایک طرف گُڑ بنانے کا بیلنا لگا تھا اور ساتھ چونبا تھا جس میں راب پکتی تھی اور گُڑ بنتا تھا۔ میرا والد بھی اکثر اِسی کھوہ پر بیٹھتا تھا۔ بابا شریف، اُس کے دونوں بیٹے اور پوری برادری سخت وہابی تھے۔ نیاز کی کسی بھی شے کو حرام سمجھتے تھے لیکن بابا شریف ایک سیدھا سادھا بندہ تھا علم اور کتاب سے مکمل بے تعلّق۔ یوں سمجھ لیں کہ سنا سنایا وہابی تھا، اِدھر والد صاحب کا مزاج کچھ ظریفانہ تھا۔ گفتگو میں مذاق اور ظرافت کا پہلو رکھتے۔ بابے شریف کے ساتھ بے تکلف دوستی تھی۔ اُنہی دِنوں کا ایک واقعہ مزے کا ہوا۔

باباشریف اکثر ہمارے گھر بھی تشریف لاتے۔ شروع شروع میں ہمارے گھر کی کوئی شے نہیں کھاتے تھے۔ اُنھیں شک تھا کہ ہماری ہر کھانے والی شے پر نیاز حسینؑ کے لیے قرآنی آیات دم کی ہوتی ہیں جو شرک ہے۔ مگر کب تک۔ اکثر چاول، کھیر، کونڈوں کی نیاز اور اسی طرح کی چیزیں دیکھ کر اُن کے منہ میں پانی بھر آتا۔ اِدھر میری اماں دادی کا معمول تھا کہ کوئی دن نیاز سے خالی نہیں جاتا تھا۔ ایک دن بابا شریف قدرتاً ہمارے گھر میں بیٹھے والد صاحب سے گپ لگا رہے تھے۔ اُدھر دادی اماں نے مولا عباس غازی اور مولا حسین کے ظہور کی خوشی کی نیاز پکا دی اور اِن کے آگے بھی پیش کر دی اور بتا دیا کہ یہ نیاز ہے اگر کھانا چاہیں۔ اِنھوں نے تھوڑی بہت حیل حجت کی۔ مگر اتنے اچھے کھانے کو دیکھ کر رہا نہ گیا اور پلاؤ کے چاول اور میٹھی کھیر کھا گئے۔ اِس کے بعد اُن کی جھجک جاتی رہی اور ہمارے گھر کی تمام نیازیں کھانے لگے۔

اُدھر اُس کے بیٹوں اور بیوی کو علم ہو گیا کہ ہمارا بوڑھا دین سے بہک گیا ہے اور شیعوں کی نیازیں کھاتا پھرتا ہے۔ فوراً اُس کے کھانے کے برتن الگ کر دیے۔ بستر الگ کر دیا۔ بیوی اُن سے پردہ کرنے لگی کہ نکاح ٹوٹ گیا ہے۔ اپنی مسجد کے مولوی سے فتویٰ لے لیا۔ مولوی نے کہا محمد شریف جب تک اپنے دین کی تجدید نہ کرے اور دوبارہ کلمہ طیب نہ پڑھے اُس کی بیوی اُس پر حرام ہے۔ چنانچہ ہر طرف غُل ہو گیا۔ القصہ اور بہت کچھ سرزنش کی مگر اب بابا شریف کے منہ کو نیازیں لگ چکی تھیں۔ میرے والد صاحب سے پوچھتے رہتے کہ اب کس امام کے نام کی اور کب نیاز پکانا ہے۔ اس نسبت سے اُسے تمام ائمۂ شیعہ کے نام بھی یاد ہو گئے اور اولادِ رسول کے نام بھی۔ کئی بار اُس کے بیٹوں نے میرے والد صاحب سے شکایت بھی کی کہ آپ نے ہمارے باپ کا آخری عمر میں دین برباد کر دیا ہے۔ قیامت کے دن ہم آپ کا گریبان پکڑیں گے۔ والد صاحب یہ کہہ کر ٹال جاتے کہ میاں قیامت کے دن ہم اور آپ ایک جگہ نہیں ہوں گے۔ گریبان تو دُور کی بات ہے آپ میرا کچھ بھی نہیں پکڑ سکیں گے اور بات ہنسی مذاق میں نکل جاتی۔ آخر ایک دن بابا شریف فوت ہو گیا۔ گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ ہوا کہ اب جنازہ کیسے کرائیں مگر مصلحت کے تحت جنازہ کرا دیا گیا۔ پھر بھی والد صاحب کا اُن کے برگد کے نیچے بیٹھنا جاری رہا۔ ہمارا گھر چونکہ

بالکل نزدیک تھا۔ والد صاحب جب لوگوں میں بیٹھے ہوتے ہیں تو ایسے باتیں کرتے ہیں کہ لوگ گھنٹوں اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ اکثر اُنھیں وہیں روٹی پہنچانی پڑتی۔ پھر نہ جانے کب ہماری نیاز کا کھانا بابا شریف کے اُنہی بیٹوں کے منہ لگ گیا۔ دو چار دفعہ تو بہت جھجکے مگر آہستہ آہستہ نیاز اپنا کام کرنے لگی۔ شرک، کفر، بدعت جیسے الفاظ گویا اُنھیں یاد ہی نہ رہے۔ اب کافی عرصہ گزر چکا ہے بابے شریف کے دونوں بیٹے نہ صرف خود کونڈوں کی نیاز کھاتے ہیں بلکہ جب نیاز ہوتی ہے تو اپنے گھر والوں کو بھی لے آتے ہیں کہ باپ کی طرح اُن کے برتن اور بسترے بھی الگ نہ ہو جائیں۔

والد صاحب کہتے ہیں بھئی یہ نیاز کیسی بھی ہو، چھٹتی نہیں ہے منہ سے لگی ہوئی، چاہے شیعہ کافروں ہی کی کیوں نہ ہو۔ میری تمام شیعوں کو ہدایت ہے دیو بندی اور وہابی بھائیوں کو نیاز پر لگا دو۔

صوفی دین محمد اور اللہ میاں

ہمارے گاؤں کی مسجد کے گنبد کی تیاری ہو رہی تھی۔ یہ پوری مسجد والد صاحب نے بنائی تھی۔ اِس کا گنبد ساٹھ فٹ اونچا تھا۔ یعنی والد صاحب ایک دن ساٹھ فٹ کی بلندی پر بیٹھے گنبد کی اندرونی طرف چھت پر کام کر رہے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک بوڑھا آدمی ہوتا تھا۔ اِس کا نام صوفی محمد دین تھا۔ آنکھوں سے نابینا تھا۔ اِس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مسجد میں بیٹھا نماز کے بعد پندرہ بیس منٹ سر جھکائے اونچی آواز میں ''میرے اللہ میاں، میرے اللہ میاں'' کا ورد کرتا تھا۔ ایک دن معمول کے مطابق وہ یہی ورد ''میرے اللہ، میرے اللہ'' پکار رہا تھا کہ اُوپر گنبد کی بلندی سے والد صاحب نے آواز لگائی، ''جی میرے بندے، جی میرے بندے'' وہیں مولوی عبدالستار کھڑا تھا۔ اُس نے والد صاحب سے کہا، توبہ توبہ آپ کیسے اِس کے اللہ میاں ہو گئے؟ والد صاحب نے مولوی ستار سے کہا، بھئی خود اِسی سے پوچھ لو۔ اب مولوی ستار صوفی محمد دین سے مخاطب ہوا، جی صوفی صاحب آپ کا اللہ کہاں ہے جسے پکار رہے ہو؟ اُس نے فوراً اپنی اُنگلی آسمان کی طرف بلند کی اور کہا وہ رب میرا اللہ ہے۔ قدرت سے اُس نے اپنی انگلی اوپر جس طرف بلند کی وہاں عین سیدھ میں والد صاحب بیٹھے تھے جس سے اشارہ سیدھا والد صاحب کی طرف ہو گیا۔ اب والد

صاحب نے کہا، مولوی ستار دیکھ لو، اِس کا رب کون ہے؟ تم لوگ پتا نہیں کتنے عرصے سے اللہ کو بلا رہے ہو، اُس نے کوئی جواب نے دیا۔ مجھے اِس نے جونہی پکارا، مَیں نے نہ صرف اِس کی آواز سنی بلکہ جواب بھی دیا۔ مولوی عبدالستار نے کہا، ہاں بھئی اب تو ماننا ہی پڑے گا۔

ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں

ایک واقعہ اور سنتے جایئے۔ گاؤں میں ایک مولوی صاحب جعفر ہوا کرتے تھے۔ ذات کے رانگڑ تھے اور دیوبند مسلک سے وابستہ تھے۔ گاؤں کی مسجد کافی خوب صورت اور بڑے بڑے ستونوں پر قائم ہوگئی تھی۔ کھلی اور ہوادار بھی تھی۔ گرم دنوں میں گرمی ذرا نہ اثر کرتی اور سردیوں میں صحن اُس کا نہایت وسیع ہونے کے سبب دھوپ پورے طور روشن رکھتی اور بوڑھے اور ٹھٹھرتے جسموں کو تپش سے گرماتی۔ مولوی جعفر صاحب اکثر گھر کی بجائے یہیں رہتے اور کسی نہ کسی ستون کے سہارے بیٹھ کے تبلیغ کرتے رہتے۔ اُن کی تبلیغ کا شکار خاص کر نوجوان لڑکے ہوتے تھے۔ تمام لڑکوں کو ایک دائرے میں بٹھا کر اُنھیں ہدایات اور نصیحتیں ازبر کراتے، وضو کیسے کرنا ہے، غسل کرتے وقت کس کس جگہ ہاتھ سے اعضائے مخصوصہ کو رگڑنا ہے طہارت کیسے کی جاتی ہے، آیات و دعائیں کون کون سی پڑھنی ہیں۔ شادی کیسی عورت سے کرنی چاہیے۔ یعنی جو زیادہ بچے پیدا کرے اور حضور ﷺ کی اُمت میں اضافہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ مجھے بھی ایک دو بار اُن سے تبلیغ کا شرف حاصل ہوا مگر میرے بعض سوالوں سے اُن کی طبیعت کافی مکدر ہو جاتی تھی۔ اُن کے دل و دماغ پر شکوک و شبہات اور بدگمانیوں کا غلبہ ہو جاتا جسے رفع کرنے کے لیے اُنھیں تعوذ اور وظائف کا ورد دس گنا بڑھانا پڑتا۔ اگرچہ لونڈا مَیں بھی کافی چکنا تھا مگر اُنھوں نے دل کڑا کر کے مجھے اپنی محفل میں بیٹھ کر نصیحت حاصل کرنے سے مستقل منع کر دیا اور باقی نوجوانوں پر تبلیغ جاری رکھی۔ سنا ہے کامیابی بھی حاصل کر لی۔ اُن کی تبلیغ میں بیٹھنے والے بعض افراد کے کاروبار کو ابھی میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ ماشاء اللہ اُن پر اُوپر کی کمائی سے اللہ کا بڑا کرم ہے۔ عادات بھی مولانا کی دعا کے مطابق ہیں۔ مولوی جعفر صاحب ایک دعا مستقل مانگا کرتے تھے، الٰہی خوار ہیں، بدکار ہیں،

ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں لیکن ترے محبوب ﷺ کی اُمت سے ہیں۔

ایک دن میرے والد صاحب کہنے لگے، مولوی صاحب آپ روز پانچ وقت خُدا کے ہاں اقبالِ جُرم بھی کرتے ہیں اور خاص طور پر یہ بتا کر کہ ترے محبوب ﷺ کی اُمت سے ہیں، اپنے نبی ﷺ کی رُسوائی کا ذریعہ بھی بنتے ہیں پھر بخشش کی اُمید بھی رکھتے ہیں۔ یہ جرائم ہی کیوں نہیں چھوڑ دیتے یا اُمت ہی سے نکل جائیں۔

کہنے لگے توبہ توبہ میاں بشیر کیسی باتیں کرتے ہو؟ ہم گناہ کرنے والے ہیں، اللہ بخشنے والا ہے۔ دیکھیے جو آدمی گناہ نہیں کرتا، وہ سمجھتا ہے کہ اللہ بخشے گا نہیں۔ یہ بات اللہ کی رحمت سے انکار کے مترادف ہے اور شرک ہے۔ ویسے بھی اللہ اتنا بے نیاز ہے چاہے تو نیک اور پرہیز گار کو دوزخ میں ڈال دے اور گناہ گار کو جنّت میں ڈال دے۔ اُس کی ذات کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہاں تک کہ تمام پیغمبروں، ولیوں اور اوصیا کو ایک رسی سے باندھ کر (نعوذ باللہ) دوزخ میں پھینک دے اور تاابد وہیں رکھے۔

والد صاحب نے کہا، میاں جعفر ایسے نہیں، ''یوں کہو اگر اللہ چاہے تو مولوی جعفر اور اُس کے والد اور اُس کے دادا اور اُس کے تمام کنبہ کی شکلیں سوّروں اور باندروں کی بنا کر اُنھیں دوزخ میں پھینک دے تو وہ یہ کر سکتا ہے کیونکہ اُس کی ذات بے نیاز ہے۔ مولوی صاحب، اس طرح اللہ کی ذات کی بے نیازی بیان کرو۔ پیغمبروں اور ولیوں سے ہاتھ اٹھا لو۔ اُن پر تو وہ درود پڑھتا ہے اور یہ روز مسجد کے ستون پر اپنی گناہ گاری کا وزن کیوں ڈالتے ہو۔ یہاں سے بستر اُٹھایئے اور اپنے گھر کی دیوار میں بچھایئے۔ دو دن میں گر جائے گی۔ اِس بات پر وہ والد صاحب سے سخت خفا ہو گئے لیکن دعا کی نثر پر غور نہیں فرمایا چنانچہ مولوی جعفر صاحب بدکاری اور ذلت اور خواری کا اقرار کرتے ہوئے ایک دن اللہ کو پیارے ہو گئے۔

آج سوچتا ہوں، کیا ہم بطور اُمت قیامت تک ذلت، خواری اور بدکاری کے جرائم کریں گے پھر اُن کا اقبالِ جرم کریں گے اور فنا ہو جائیں گے؟ مجھے تو یہی لگتا ہے کیونکہ یہ پوری قوم مولوی جعفر ہے۔

باباچوغطہ کا مقبرہ

چیچہ وطنی کے ایک گاؤں 48 بارہ ایل میں ایک بابا چوغطہ تھے۔ قادری سلسلے سے بیعت تھے۔ پھر خود بیعت لینا شروع کی اور اُن کے ہزاروں مرید ہو گئے۔ اُن کے بعد اُن کا پوتا محمد علی قادری نوشاہی اُن کا گدی نشین ہوا۔ بابا چوغطہ کا مقبرہ والد صاحب نے بنایا لیکن اِس معاملے میں بابا محمد علی قادری نوشاہی خود بھی مغل شاہی تعمیرات میں بہت درک رکھتے تھے۔ چنانچہ جب والد صاحب نے مقبرے کی تعمیر شروع کی تو محمد علی صاحب نے اُن کی اِس معاملے میں بہت مدد کی اور کچھ ایسے گُر بتائے جو گنبد اور دارا شاہی آرٹ تعمیر کرنے میں بہت اہم تھے۔ تب مَیں بالکل چھوٹا ہوتا تھا۔ مجھے اِن باتوں کا ہوش نہیں لیکن بعد میں ہمارا بابا چوغطہ کے خاندان سے اتنا زیادہ میل ملاپ ہو گیا کہ ایک قسم کی ایک ہی فیملی بن گئی۔ مقبرے کی تیاری کے دَوران بابا محمد علی اور میرے والد بیسیوں مقبروں پر شہر شہر میں گئے تا کہ سب کے طرزِ تعمیر کو دیکھ کر جائزہ لے لیں۔ مَیں بھی اکثر اُن کے ساتھ ہوتا تھا کیونکہ ضد میں پڑ جاتا تھا کہ مجھے لے کر چلیے۔ اِسی دَوران ایک سفر اللہ جانے کیوں میرے دماغ میں چپک کر رہ گیا حالانکہ اُس میں کوئی خاص بات نہیں، خیر آپ کو سنائے دیتا ہوں۔

آنکھ میں نقشے رہ جاتے ہیں

مجھے کچھ ہوش زیادہ نہیں، اللہ جانے کتنے برس کا تھا اس لیے بس دھندلا سا عکس آنکھوں میں رہ گیا ہے۔ میرے والد صاحب اور بابا محمد علی کسی شہر کے کسی قصبے یا دیہات میں گئے تھے۔ موسم کی کیفیت نہ سردی والی تھی نہ گرمی والی۔ یوں سمجھیں معتدل سی فضا تھی۔ ہم ایک گھر میں گئے۔ یہ گھر بابا محمد علی کے مریدوں کا تھا۔ گھر کے سامنے ٹھنڈے اور شفّاف پانی کا نالا بہتا تھا۔ یہ بہت چوڑا اور رواں تھا۔ پانی کی تہ میں نالے کا فرش صاف دِکھتا تھا۔ نالے کے دونوں کناروں پر شہتوت، نیم، شریںہہ اور پاپلر کے درخت بہت کھڑے تھے۔ توت لگے ہوئے تھے اور بہت میٹھے

تھے، جو ئیں نے وہاں کھڑے ہوتے ہی کھانے شروع کر دیے۔ اُن درختوں کا سایہ پانی میں صاف لہریں مارتا تھا۔ ہوا خوشگوار ٹھنڈی پھیل رہی تھی۔ نالے کے اُوپر دو موٹے اور چوڑے ڈنڈے ساتھ ساتھ جوڑ کر رکھے تھے۔ یہ دونوں پُل کا کام دیتے تھے اور ایک بندہ اِن پر سے آسانی سے گزر سکتا تھا۔ اِن ڈنڈوں یا درخت کے سوکھے تنوں کے بیچ سے ہرے پتے پھوٹ رہے تھے۔ ہم ایک ایک کر کے تینوں اُس پُل سے گزرے اور سامنے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ پورے گھر پر درختوں کا ہرا سایہ ایسے گھیر ڈالے کھڑا تھا کہ مجھے سائے میں سے بھی ہرا رنگ نظر آتا تھا۔ میرے والد نے دروازے کی زنجیر کھنکھٹائی۔ کچھ ہی لمحوں بعد ایک خاتون نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی بہت خوش ہوئی۔ اپنے بیٹے کو آواز دی اور خوشی خوشی میرے والد اور بابا محمد علی اور مجھے گھر میں لے گئی۔ اُس کا بیٹا کمرے سے نکل کر ہمیں گلے سے ملا۔ اُن کا گھر کچا تھا۔ تین کچے مکان ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ اُن مکانوں کے سامنے ٹاہلیوں کے درخت بڑے اور گھنے تھے۔ اُن پر پرندے چہک رہے تھے اور اُڑ رہے تھے۔ خاتون نے پل کی پل میں رنگین پایوں والی منجیاں نکالیں، اُن پر دوہریں اور کاڑھے ہوئے سرہانے بچھائے اور ہمیں بٹھا دیا۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ خاتون ہماری بلائیں لے رہی تھی۔ اُس نے دہی والی چاٹی میں مدھانی ڈالی ہوئی تھی اور دودھ بلو رہی تھی جب ہم وارد ہوئے۔ فوراً اُسی ادھ بلوئے دہی سے ادرڑ ھکے کے چھنے نکال کر ہمیں پلانے لگی۔ بیٹا اُس کا بھاگ کر باہر گیا اور پل کی پل میں ایک دیسی مُرغ اُٹھا لایا۔ پھر حلال کر دیا۔ قریباً ایک گھنٹے کے اندر روٹی تیار ہو گئی۔ اتنے میں دو چار لوگ مزید وہاں آ گئے اور باتیں ہونے لگیں۔ مجھے آج نہ وہ باتیں یاد رہیں نہ وہ جگہ اور شہر یاد رہا مگر منظر سب ایک ایک جزو کے ساتھ یاد ہے اور یہ منظر سمجھیں کہ چالیس سال پہلے کا ہے۔ ایسا اچھا مزے کا کھانا، مزے کی دہی اور لسی اور مانوس گھر آج تک نہ دیکھا۔ اُس کے بعد ہم نہ کبھی وہاں گئے، نہ کبھی وہ جگہ دیکھی۔ نہ وہ لوگ کبھی ملے۔ مَیں نے کئی بار والد صاحب سے پوچھا کہ وہ کون سی جگہ تھی اور وہ کون لوگ تھے مگر والد صاحب کو سب بھول گیا بلکہ وہ کہتے ہیں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا یا اُنھیں کچھ یاد نہیں کہ ہم کہاں گئے تھے۔ بابا محمد علی سے بھی کئی بار پوچھا، وہ بھی صاف مکر گئے اور کہتے تھے تجھے

خواب آیا ہو گا مگر مجھے کامل یقین ہے کہ ہم گئے تھے اور حقیقی طور پر گئے تھے۔ میری یادداشت سے یہ منظر کبھی نہ نکلا۔ اللہ جانے اِس میں کیا حکمت ہے۔

کُشتے کی تیاری

بابا محمد علی حکمت اور طب میں بھی درک رکھتے تھے۔ اُن کے ہاں مریدوں کے بیچ بہت سے مریض بھی جمع ہو جاتے تھے جن کے علاج معالجے کے لیے بابا محمد علی مفت تگ و دو کرتے تھے۔ اُن کی نبضیں دیکھ کر اُنھیں پڑیاں باندھ دیتے تھے۔ اِسی حکمت میں ایک دن ایک مزے کا واقعہ ہوا۔

بابا جی کے ہاں دوائیوں کے کُشتے بنائے جاتے تھے۔ ایک دفعہ مَیں وہیں تھا، ایک کونڈے میں مسلسل سُچے موتیوں کا کشتہ تیار کیا جا رہا تھا۔ اِس کا طریقہ یہ تھا کہ چھٹانک یا آدھ پاؤ موتی کونڈے میں ڈال کر اُنھیں مسلسل پیسنا شروع کر دیا جاتا۔ پھر تھوڑا تھوڑا عرقِ گلاب ڈالتے جاتے اور پیستے جاتے۔ اتنا پیستے کہ آدھ پاؤ سُچے موتیوں کی مقدار تین کلو عرق پی جائیں اور یہ کام آٹھ، دس دن چلتا۔ میلے کے دنوں میں جلد ہو جاتا تھا کہ مریدوں کو پیسنے پر لگا دیا جاتا۔ اِس کُشتے میں اتنی طاقت آ جاتی ہے کہ الامان۔ بندہ ایک ذرہ بھر خوراک گرم دودھ کے ساتھ لیتا تو اُڑا اُڑا پھرتا۔ آدھ پاؤ کشتہ دوسو آدمیوں کے لیے کافی ہوتا تھا۔

یہ کشتہ ایک مرید کونڈے میں پیسے جاتا تھا کہ ایک بکرا اِدھر اُدھر منڈلانے لگا۔ یہ بکرا بہت پلا ہوا تھا اور بابا جی کا بہت لاڈلا تھا۔ مختلف برتنوں میں منہ مارنا، تازہ لگے پودوں کی کونپلیں کھانا، ٹکریں مارنا اور گھر کی دیواریں اور چھتیں پھلانگنا اِس کا شیوہ تھا۔ کشتہ قریباً تیار ہو چکا تھا۔ جو آدمی کشتہ پیس رہا تھا وہ اپنے دھیان میں پیسے جاتا تھا کہ یہ بکرا آ موجود ہوا۔ اُس بے چارے کو ایک لگا کے ٹکر ماری۔ مرید تین چار پلٹنیاں کھا گیا، ادھر بکرے نے کونڈے میں منہ ڈال دیا۔ یہاں وہاں سے دیگر مرید بکرے کو پکڑنے کے لیے دوڑے مگر اُس کا منہ کونڈے میں داخل ہو چکا تھا، وہ جتنا اِسے کھینچتے تھے یہ اُسی قدر زور سے کونڈے کی طرف کھنچتا تھا اور جلدی سے موتیوں کے کشتے کو

چاٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ پَل کی پَل میں کونڈا صاف کر دیا۔

بابا جی کہیں مراقبے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جلدی خبر نہ ہو سکی۔ بکرا کُشتہ کھا کر یہ جا وہ جا، دیواروں اور کوٹھوں پر چڑھ گیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد بابا جی مراقبے سے اُٹھے تو اُنھیں کُشتے اور بکرے کی حرکت کی خبر ہوئی۔ بابا جی نے کہا 'او تہاڈا بیڑا غرق، جلدی سے بکرا پکڑو، یہ کُشتہ اُسے مار دے گا۔ اِس سے پہلے کہ بکرے کا دل پھٹ جائے، اُسے حلال کر دیا جائے۔'

لیجیے اب مرید بکرے کے پیچھے دوڑے مگر وہاں کشتہ اپنا کام کر چکا تھا۔ بکرا ایک مکان کی چھت پہ لیٹا بانگیں مار رہا تھا اور درد کی آواز آسمان تک جاتی تھی۔ مریدوں کے پکڑنے سے پہلے ہی بکرے کا دل واقعی پھٹ چکا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک مرید نے عین آخری لمحوں میں اُس کے گلے پر چھری پھیر دی اور اُسی شام کے لنگر میں وہ بکرا اپنے کُشتے سمیت مریدوں کے پیٹ میں چلا گیا۔

میرے بھائیو، ہر شے اتنی ہی کھانی چاہیے جتنی ہضم ہو جائے ورنہ بابا جی کو اُس سے جتنا بھی پیار ہوگا، چھری پھیرنا پڑے گی۔

گھر میں شیعت آ گئی

بابا محمد علی کا بڑا بیٹا رحمت اور اُن کے بھائی کے پوتے وحید اور آصف میرے بہت قریبی دوست بن گئے۔ ایسے دوست جن سے بے لوث محبّت پروان چڑھی جو آج تک باقی ہے۔ مَیں اکثر وہاں جاتا تھا اور ایک ایک مہینا رہتا تھا۔ بابا محمد علی مجھے اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔ رحمت علی سے میری اکثر مذہب پر گفتگو ہوتی تھی۔ اُس کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ مَیں اتنا لائق ہونے کے باوجود شیعہ کیوں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ شیعہ مذہب ایک بے وقوف مذہب ہے اور مجھے اِس حماقت سے باہر ہونا چاہیے۔ البتہ آصف اور وحید مجھ سے بحث نہیں کرتے تھے۔ وحید بہت خوب صورت لڑکا تھا۔ سب سے زیادہ میرا دوست بھی یہی تھا لیکن زیادہ عقل مند نہیں تھا۔ رحمت کے ساتھ میری مناظرانہ بحث چلتی رہتی تھی۔ اُسے تاریخ میں دلچسپی تھی مگر ابھی راہ سیدھی نہ پکڑی تھی۔ مَیں وہاں مسلسل اور متواتر جاتا رہا۔ اُن کے ہاں ایک سال میں تین عرس لگتے تھے۔ اِن عرسوں

میں چاروں طرف سے مریدوں کے گروہ جمع ہوتے اور تین دن تک بہت رونق رہتی۔ میری چونکہ وہاں دوستی بھی تھی اور عرس بھی ہوتے تھے چنانچہ مَیں ہر عُرس پہ جاتا۔ میرے جانے سے پہلے رحمت اور وحید مجھے لاجواب کرنے کے لیے، بہت مشکل مسئلے سوچ رکھتے تھے کہ جب مَیں جاؤں گا تو وہ مجھے جھوٹا ثابت کریں گے لیکن اُن کی یہ حسرت کبھی پوری نہ ہو سکی۔ میری شیعت اور ہماری آپس کی بحثوں سے بابا محمد علی بالکل بے خبر تھے کہ اندر ہی اندر کیا کچھ قادری سلسلے میں ایک دیمک لگ چکی ہے۔ پھر ایک دن آیا کہ رحمت شیعہ ہو گیا۔ یہ ایسی بات تھی جس کی تلافی نہ تھی۔ پورے گھر میں کہرام مچ گیا۔ فی الفور میرا داخلہ بند کر دیا گیا۔ والد صاحب نے بھی وہاں آنا جانا بند کر دیا لیکن اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ رحمت کی شیعت روز بہ روز پختہ ہوتی گئی لیکن جب تک بابا محمد علی زندہ رہے رحمت کی شیعت کو گوارا سمجھا جاتا رہا، کیونکہ وہ معاملات کو قدرے سمجھتے تھے، جیسے ہی وہ فوت ہوئے، پورے خاندان اور پوری خانقاہ، بھائی بہنوں اور رشتے داروں نے رحمت علی سے تعلّقات ختم کر دیے۔ آج کل وہ میرے ساتھ تعمیرات کے کام میں مصروف ہے۔ خُدا اُس کی شیعت کو اُس کے لیے باعثِ برکت کرے۔

والد صاحب سوئے کوفہ و نجف

یہ 1986ء کے دن تھے۔ مَیں نے پانچویں جماعت پاس کر لی تھی اور چھٹی میں داخل ہو گیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا کہ والد صاحب نے جب کویت کی جمع پونجی ٹھکانے لگا لی تو اُنھوں نے عراق کا ویزا لگوا لیا۔ عراق میں تب صدام کا زمانہ تھا۔ عراق ڈویلپ ہو رہا تھا۔ وہاں مغربی کنسٹرکشن کمپنیوں نے کام شروع کر دیے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب مجھے ہر چیز کا ہوش تھا۔ والد صاحب کا ایک نہایت قریبی دوست رفیق مکیریا اور مَیں خود اُنھیں لاہور ایئر پورٹ سے چڑھانے آئے تھے۔ رفیق مکیریا نہایت کریم النفس آدمی تھا۔ ہر لحاظ سے جسے ایک شریف انسان کہہ سکتے ہیں، یہ وہی تھا۔ والد صاحب کو جہاز پر روانہ کرنے کے بعد رفیق مکیریا لاہور میں اپنی ایک چچا زاد بہن کے ہاں ٹھہر گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ بچّے کو اگلے دو دن لاہور کے چند مقامات کی سیر کرا کر تیسرے

دن چلیں گے۔ اصل میں اُس کا ارادہ اپنے تمام رشتے داروں کو ملنے کا بھی تھا۔ جبکہ مَیں گھر سے کوئی دوسرا شلوار کُرتا نہیں لے گیا تھا۔ ایک بڑا سا رومال البتہ میرے پاس تھا۔

یہاں ایک واقعہ ایسا ہوا جو مجھے کبھی نہیں بھولا۔ وہ جس گھر میں ٹھہرا وہ کافی امیر تھے۔ اُن کے ہاں ایک بیٹا تھا جو میرے ہی سِن و سال کا تھا اور دو بیٹیاں تھیں جو مجھ سے بڑی تھیں۔ گھر کافی بڑا تھا۔ چھ سات کمرے، اٹیچ واش روم، سامنے باغیچہ اور چاروں طرف دیوار تھی۔ یہ ایک کوٹھی نما گھر تھا۔ اُن کے بچّوں کے کھیلنے کے لیے کئی گیندیں تھیں، بلّا تھا، اور بھی کئی چیزیں تھیں۔ اُنھوں نے ایک کمرے میں میرا بستر بچھا دیا، ایک کمرے میں رفیق مکیریا کا بچھا دیا۔ باقی بھی ہر ایک کے لیے الگ کمرہ تھا۔ میاں بیوی ایک ہی کمرے میں ہوتے تھے۔

مَیں چاچا رفیق مکیریا کے ساتھ دن بھر لاہور کے مختلف مقامات دیکھتا اور اُس کے بعد عصر کے وقت اُسی گھر میں لوٹ آتے۔ پھر شام تک اُن کے بچّوں کے ساتھ گیند بلا کھیلتا۔ اُنھوں نے ہمارے کھانے پینے کا بھی بہت خیال رکھا۔ یوں دو تین دن میں اُن کے بچّے میرے ساتھ بالکل گھل مل گئے لیکن اِن تین دِنوں میں میرے کپڑے بہت زیادہ گندے ہو گئے اور مجھے اِن کپڑوں میں شرم آنے لگی۔ جبکہ اُن کے بچّے روز دھوئے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور بالکل صاف ستھرے لگتے تھے۔ چوتھے دن جب ہم وہاں سے گھر کے لیے رُخصت ہونے لگے تو کپڑے بہت ہی زیادہ گندے ہو چکے تھے۔ مَیں نے گندے کُرتے کو چھپانے کے لیے اپنا وہی رومال اپنے کُرتے کے سامنے باندھ لیا تاکہ کُرتا گندا نظر نہ آئے۔ اب جیسے ہی رفیق مکیریا اور مَیں اُنھیں آخری ملاقات کے لیے مل کر جُدا ہونے لگے تو اُنھوں نے ایک عجیب رویّہ اختیار کیا۔ جلدی سے میرا رومال پکڑ کر کھول دیا اور کُرتہ اٹھا کر شلوار کی جیب دیکھنے لگی۔ رفیق مکیریا اور مَیں خود اُن کے اِس عمل کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہم دونوں نے بھانپ لیا کہ وہ میری تلاشی لے رہے ہیں کہ شاید مَیں اُن کی کوئی شے چرا کر لے جا رہا ہوں۔ اُن کا بیٹا اور بیٹیاں پاس ہی کھڑے یہ دیکھ رہے تھے۔

جب وہ خاتون یہ عمل کر چکی اور میرے پاس سے کچھ برآمد نہ ہوا تو اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوئی، ولید وہیں باغیچے میں دیکھو۔ وہ گیند اِس کے پاس نہیں ہے۔ اُس کی اِس بات سے

ہیں خود اور رفیق بکیریا شرمندگی سے پانی پانی ہو گئے۔ یعنی اُن کے خیال میں مَیں اُن کی کئی گیندوں میں سے ایک گیند چرا کر لے جا رہا تھا جبکہ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ کام بھی کیا جا سکتا ہے۔ خیر ہم وہاں سے نکل آئے۔ وہ دن اور آج کا دن مَیں نے اِس بات سے ایک سبق لیا ہے کہ کوئی کھربوں پتی ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ کمینے ہیں تو اُن کی بھوک اور کمینگی ایک گیند کی قیمت سے بھی نیچے گر سکتی ہے۔ اُس کے بعد مَیں دوسروں کے رشتے داروں کے ہاں تو کجا کبھی اپنے رشتے دار کے گھر بھی نہیں رہا نہ اُن سے سلام دعا رکھی اور نہ خُدا وہ دن دوبارہ لائے۔

باغِ جہاں کے گل

والد صاحب کے عراق جانے کے بعد ہم گاؤں میں اپنے نئے گھر میں رہنے لگے جو سکول سے چند قدم پر تھا۔ چونکہ اُن دِنوں گھر میں موجود بھینسوں کی ساری ذمے داری مجھ پر اور میرے چھوٹے بھائی علی اصغر پر آ پڑی تھا لہٰذا کھیتوں سے چارا کاٹ کر لانا، اُسے ٹوکہ مشین میں کُترنا پھر بھینسوں کے آگے ڈالنا، اُس کے بعد بھینسوں کو نہلانا، اُنھیں پانی پلانا، پھر سکول جانا، کھیلنا، کتابیں پڑھنا، یہ تمام کام اور اُن کی ترتیب کس طرح کرتے تھے، یہ حیران کُن قصہ تھا مگر آج مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اِن سب کاموں کو انجام دے کر بھی بہت سا وقت بچ جاتا تھا اور دن گزرنے کا نام نہ لیتا تھا، شام دُور کھڑی مسکراتی رہتی تھی۔ جب کہ آج کل یوں بستر سے اُٹھتے ہیں اور اگلے ہی لمحے شام کے سورج کا منہ دیکھتے ہیں۔ گویا وقت کو پر لگ گئے ہیں۔ اِس دَور کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ اُنہی دِنوں میرا تیسرا بھائی علی افضل پیدا ہوا تھا۔ میرے دو چچا زاد علی اختر اور علی ارشد بھی ہمارے ساتھ والے گھر میں رہنے لگے تھے۔ اُن کے والد یعنی چچا رشید نے میاں سرور کھوکھر کا باغ ٹھیکا پر لے لیا۔

یہ دو مربع کا باغ تھا۔ جس میں امرود، مالٹے، کینو، فالسہ اور جامن شامل تھے۔ یہ باغ گاؤں سے ڈیڑھ کلومیٹر دُور جنوب مغرب کی طرف تھا۔ اب ہمارا معمول یہ ہو گیا کہ سکول سے فارغ ہونے کے بعد چارا لاتے، اُنھیں بھینسوں کے آگے ڈالتے۔ باقی تمام چارا کُتر دیتے تا کہ

والدہ اُسے وقفے وقفے سے بھینسوں کے آگے پھینک دیا کرے۔ خود باغ کی طرف چلے جاتے۔ یہ باغ بہت خوب صورت تھا، پرندے بے تحاشا تھے۔ اِن پرندوں کی نسلیں اتنی زیادہ اور اتنی خوب صورت ہوتی تھیں کہ اب اُن میں سے کوئی پرندہ نظر نہیں آتا۔ اللہ جانے زمیں کھا گئی یا آسماں نگل گیا۔ ہم تمام دن پرندوں کے پیچھے دوڑتے، خاص کر نیلا مُرغ، طوطے اور کویل ہمارے پسندیدہ پرندے تھے۔ ایک اور بھی پرندہ بہت زیادہ ہوتا تھا، اُسے صوم چڑی کہتے تھے۔ کالے اور سنہرے پروں والی ہوتی تھی۔ بہت چھوٹی ہوتی تھی، بہت تیز چونچ والی اور بہت ہوشیار۔ شام کا اندھیرا پھیلنے تک اِن باغوں میں اور اِن پرندوں میں گزرتی۔ چچا کے دونوں بیٹے اور میرا بھائی علی اصغر اور مَیں خود جتنا اِس باغ میں خوش تھے شاید کبھی اتنے خوش نہ ہوئے ہوں۔ موسم اتنے صاف اور ہوائیں اتنی تازہ تھیں کہ جھوم جھوم جاتے تھے۔ بیماری یا تھکن کا کوئی احساس بدن میں نہ تھا۔ اِنہی باغوں کی ہواؤں میں شام گئے تک اتنا بھاگتے تھے کہ ایک دن میں سمجھ لیں سو کلومیٹر کر گئے ہوں۔

گیدڑ اکڑ گیا

اِنہی دِنوں کا ایک واقعہ ہے سن لیجیے، ہم چاروں ایک نالے پر جا رہے تھے، ایک طرف باغ تھا اور دوسری طرف گنے کا کھیت تھا۔ ہم نے دیکھا اچانک سامنے سے ایک گیدڑ گنے کے کھیت سے نکل آیا اور کچھ فاصلے پر ہمارے آگے اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم چاروں نے مٹی کے ڈھیلے اُٹھا لیے اور اُسے بھگانے کے لیے اُس کی طرف پھینکے مگر وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکا اور آنکھیں گھور کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ اب ہم بھی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے کہ اتنے میں ایک اور گیدڑ نکلا اور اُس کے پیچھے آ کر جم گیا۔ پھر ایک لمحہ بعد ایک اور نکل آیا۔ اب یہ تین گیدڑ ہو گئے اور ایسے دیوار بن گئے جیسے اپنی حدود میں داخل ہونے سے روکنے آئے ہوں۔ تھوڑی دیر ہم اور وہ گیدڑ ایک دوسرے کے آمنے سامنے جمے رہے۔ پھر اُن کی کچھ دیر بعد غرغراہٹ شروع ہو گئی۔ اِس غرغراہٹ نے ہمیں نہایت خوفزدہ کر دیا۔ اُس کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ گیدڑوں کو اُن کا حق

ملکیت بخش دینا چاہیے اور ہم چاروں چُپ کر کے پیچھے سِرک آئے۔ حقیقت میں اُس دن گیدڑ ہمارے سامنے شیر ہو گئے تھے۔

لیکن جب بعد میں ہم نے یہ واقعہ اپنے چچا کو سنایا تو وہ بہت خوفزدہ ہو گیا اور اُس نے ہم سے تفصیل کے ساتھ اُن کا حلیہ پوچھا، جیسے ہی ہم نے اُن کا حلیہ بیان کیا تو اُس نے انکشاف کیا کہ یہ گیدڑ نہیں بھیڑیے تھے۔ اچھا کیا وہاں سے خیریت ہوئی اور تم سلامت نکل آئے۔

ایک بدکار آدمی سے بچاؤ

ایک دن مَیں چچا کے باغ سے اکیلا گاؤں میں آ رہا تھا۔ شدید سردی کے دن تھے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میرے کاندھے پر ایک گٹھڑی تھی جس میں دو کلو کے قریب امرود تھے۔ مَیں گاؤں اور باغ کے درمیان میں تھا اور ابھی گاؤں ایک کلومیٹر دُور تھا۔ اِسی اثنا میں ایک آدمی مجھے اپنے قریب آتے محسوس ہوا۔ مَیں نے اپنے قدم تیز کر لیے۔ اُس آدمی نے بھی اپنے قدم تیز کر لیے۔ مَیں نے غور سے دیکھا وہ ہمارے گاؤں کا نہیں تھا اور اُس کی عمر بھی ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی یعنی بڑی عمر کا آدمی تھا۔ مَیں نے اپنے قدم مزید تیز کر لیے۔ دُور تک مجھے کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگرچہ یہ علاقہ ہمارے گاؤں کی حدود کا ہی تھا مگر اِس وقت میں اکیلا تھا۔ لہٰذا بہت ڈرا ہوا تھا۔ اُن دِنوں ہماری مائیں اکثر ڈراتی تھیں کہ کسی انجان آدمی کو جب دیکھو کہ وہ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے کوئی شے دے رہا ہے تو یقین کر لو وہ بچے اغوا کرنے والا ہے۔ اُس سے فوراً دُور بھاگ جاؤ۔ کیونکہ یہ لوگ بچوں کو اغوا کر کے اُنھیں پٹھانوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ تب مَیں نے دیکھا کہ وہ آدمی میرے بالکل قریب آ گیا۔ اُسی وقت مجھے مخاطب کیا، کا کا تمھارا نام کیا ہے؟ مَیں نے کہا میرا نام علی اکبر ہے، وہ پھر بولا تمھارا والد کیا کرتا ہے؟ مَیں نے کہا وہ عراق میں ہوتا ہے۔ اِس جواب کے ساتھ ہی مَیں نے اُس سے تین چار قدم کا فاصلہ پیدا کر لیا لیکن وہ اب مزید قریب ہونے لگا اور اُس نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور میری طرف بڑھا کر کہا، یہ پیسے رکھ لو۔ جیسے ہی اُس نے نوٹ بڑھایا مَیں نے امرود کی گٹھڑی وہیں پھینکی اور چیخیں مار کر بھاگ

اُٹھا۔ وہ چند قدم میرے پیچھے بھاگا مگر مَیں ریل گاڑی بن چکا تھا۔ اتنی زور زور سے چیخیں ماریں کہ آواز چاروں طرف گونج گئی۔ اُسی اثنا میں مَیں نے دیکھا کہ ہمارے گاؤں کے مختلف کاشت کار جو اپنی فصلوں میں کام کاج میں مصروف تھے بھاگ کر ہماری طرف آنے لگے اور چند ہی منٹ میں اکٹھے ہو گئے۔ دو تین نے بھاگ کر اُس آدمی کو پکڑ لیا۔ مَیں حیران ہوا کہ جو لوگ مجھے ارد گرد کہیں نظر نہیں آ رہے تھے میری آواز پر کیسے لمحوں میں اِدھر اُدھر سے نکل آئے ہیں۔ مَیں نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے مجھے بچا لیا۔ اب اُس آدمی کی وہیں لتریشن شروع ہو گئی۔ کوئی اُسے ٹھڈا مار رہا تھا کوئی مکے مار رہا تھا۔ ایک اُن میں ہمارا پڑوسی تھا، اُس نے کہا لاؤ ذرا دکھاؤ حرامی تمھاری جیب میں کتنے پیسے ہیں؟ جس بچے کو تم پیسے دکھا رہے ہو اِس کے دادا پردادا نواب رہے ہیں اور اِس کے باپ کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ تمھاری سات پشتوں نے نہیں دیکھے۔ اُس کے ساتھ ہی اُس کی جیب سے پیسے نکال لیے۔ شاید سو یا پچاس روپے ہوں گے۔ یہ بھی اُن دِنوں بہت رقم تھی۔ پھر اُسے پکڑ کر گاؤں لے آئے۔ میری والدہ نے مجھے جلدی سے اپنے سینے سے لگا لیا اور دبوچ کر گھر میں لے گئی۔ اب اُس آدمی کی تفتیش ہونے لگی۔ پتا چلا کہ وہ ہمارے گاؤں سے تین چار گاؤں چھوڑ کر ایک گاؤں میں رہتا تھا اور اِس کا سابقہ کردار بھی بچّے باز کا سا تھا۔ تب اُسے پکڑ کر تھانے دے دیا گیا لیکن جب ہم نے دوسرے دن اُس کا پتا چلایا تو تھانے والے اُس سے پیسے لے کر چھوڑ چکے تھے لیکن اِس کے بعد یہ ہوا کہ اگلے دو سال تک میری والدہ نے مجھے اکیلے گاؤں سے باہر نہیں نکلنے دیا۔

دو بدمعاشوں کا انجام

ہمارے ساتھ والے گاؤں میں دو بدمعاش تھے۔ ایک کا نام شفقت وٹو تھا اور دوسرے کا شوکت گجر تھا۔ یہ دونوں ہمیشہ اکٹھے رہتے تھے۔ ارد گرد کے علاقوں میں ڈکیتی اور چوری کی وارداتیں اِن کا معمول تھا۔ قریب ہی اک قصبہ تھا وہاں جس دُکاندار سے چاہتے کھانے پینے کی چیزیں اُٹھا کر لے آتے۔ جس غریب کو چاہتے ذلیل کرتے، مار پیٹ کرتے۔ کئی جگہ سے جگا

وصول کرتے لیکن اپنے سے طاقت ور کے قریب بھی نہ پھٹکتے تھے۔ بلکہ اُن کے چرن چھوتے تھے۔ اِن دونوں نے اپنے ساتھ ایک ایک گن مین بھی رکھا ہوا تھا۔ شفقت کا گن مین اُس کے ہمسائے کا ایک لڑکا تھا اور شوکت گجر کا گن مین اُس کا اپنا سالا تھا۔ ایک دن شفقت بدمعاش نے اپنے گن مین کے سگے چچا کو تھپڑ مار دیے۔ گن مَین نے اُسے کہا، میاں شفقت آپ نے اچھا نہیں کیا۔ کم از کم میرے چچا کا تو خیال کرتے۔ شفقت وٹو نے اُسے بھی دو چار گالیاں دیں اور کہا، مَیں نے تمھارے ہاتھ میں گن پکڑا دی ہے تو کیا تُو نے سمجھ لیا ہے کہ تُو شفقت وٹو بن گیا ہے؟ آئندہ میرے کام میں دخل نہیں دینا۔ اِس واقعے کو تین چار ماہ گزر گئے۔

ایک دفعہ مَیں اپنے چچا کے باغ میں موجود تھا۔ وہاں چچی نے اپنی دس پندرہ مرغیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دن یہ دونوں بدمعاش وہاں آ گئے اور تین چار مُرغیاں پکڑ کر لے گئے۔ چچی کو جب پتا چلا تو اُس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر دعا مانگی یا اللہ یہ میری مرغیاں اِن کے نصیب میں نہ ہوں۔ جس طرح اِنھوں نے دُنیا کو غریبوں کے لیے جہنّم بنایا ہوا ہے، تُو بھی اِنھیں جہنّم میں ڈال۔

پھر اُسی دِن کا واقعہ ہے۔ اِس باغ سے اِن کا گاؤں ڈیڑھ کلومیٹر ہی دُور تھا۔ شفقت وٹو نے وہ مرغیاں اپنے ایک ملازم کو دیں اور کہا اِنھیں جلدی سے ذبح کرو۔ اتنے میں مَیں نہا لوں۔ شوکت گجر وہیں ڈیرے میں بیٹھ گیا اور شفقت نہانے کے لیے اپنے گھر کے سامنے والی مسجد کے غسل خانے کی طرف چل پڑا۔ اُس کا وہی گن مین اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جیسے ہی مسجد کے سامنے والے نیم کے درخت کے نیچے پہنچے گن مین نے رائفل میں گولی چڑھا دی اور شفقت وٹو کو آواز دی، ''اوئے شفقو! چھڈ نہاون نوں، ہُن تیرے گھر آلے آپے تینوں نہوا دین گے۔'' یعنی اب تیرے خود نہانے کی ضرورت نہیں ہے، تیرے گھر والے خود ہی تجھے نہلا دیں گے۔ جونہی شفقت نے مُڑ کر اُسے دیکھا، گن مین نے رائفل کی پوری میگزین اُس کے سینے میں خالی کر دی۔ پھر فوراً دوسری میگزین چڑھا کر ہوائی فائرنگ کرتا ہوا پیدل گاؤں سے باہر نکل گیا مگر کسی گاؤں کے فرد نے اسے پکڑنے یا مارنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی شفقت وٹو کا بدمعاش دوست شوکت گجر

آگے بڑھ کر اُس کے پیچھے گیا۔ حیرت کی بات ہے اگلے دن شفقت وٹو کی ماں وہ چاروں مرغیاں اسی طرح سے واپس کر گئی۔ پھر اُس کے تھوڑے دن بعد ہی شوکت گجر غائب ہو گیا۔ چار سال تک اُس کی کوئی خبر نہ ملی۔ چار سال بعد پتا چلا کہ وہ پاکپتن میں اپنے سسرال میں گیا تھا، وہاں اُس کے سالوں نے ہی اُسے قتل کر دیا اور اُس کے آٹھ لاکھ روپے پر قبضہ کر لیا جو اُس وقت کم از کم آج کے آٹھ کروڑ کے برابر تھے۔

دریا کا پاٹ اور عالو والا ٹویا

یہ زمانہ وہ تھا جب مَیں آٹھویں جماعت میں تھا اور عمر تیرہ سال تھی۔ گاؤں کے پہلو میں دریائے بیاس کا بقیہ جات بہتا تھا۔ اِس کا پانی ایک عرصہ سے دریائے ستلج میں غرق باد ہو چکا تھا اور یہاں ایک نہر سی بہتی تھی لیکن یہ نہر بھی یورپین دریاؤں کو منہ چڑاتی تھی۔ ہمارا شیوہ ہو گیا تھا کہ اپنی بھینسیں اِس دریا میں ڈال دیتے اور پھر خود بھی دریا میں غوطہ زنی کرتے۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے شرطیں لگا کر کبھی اُلٹا کبھی سیدھا تیراکیاں بھرتے۔ کئی کئی لمحے دریا کی تہ میں چھپے ایک جگہ سے دوسری جگہ مچھلی کی طرح تیرتے تھے ایک ڈیڑھ گھنٹہ روز اِسی طرح کا معاملہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں پانی میں تیرنے کی بہت مشق ہو گئی تھی اور پانی کی گہرائی یا گیرائی ہم پر کوئی اثر انداز نہ ہوتی تھی لیکن عجیب بات تھی کہ اِسی دریا میں ہر سال ایک دو بندے ضرور ڈوب کے مر جاتے تھے اور عین اُنہی جگہوں پر جہاں ہم روز ڈبکیاں لگاتے تھے۔ ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ وہ اِن معمولی جگہوں پر کیسے ڈوب جاتے ہیں۔ برساتوں میں دریا مزید چڑھ جاتا تھا تو ہم پہلے سے بھی زیادہ مزے لیتے تھے۔

گاؤں کی تمام عورتیں یہاں کپڑے دھوتی تھیں۔ دریا کے کنارے دُور تک ہری گھاس اُگتی تھی۔ کپڑے دھو کر وہ اس گھاس پر بچھا دیتی تھیں۔ ایک دن یوں ہوا کہ ہم معمول کے مطابق دریا میں اپنی بھینسیں چھوڑ کر خود بھی نہانے لگے۔ ہمارے گاؤں کی ایک عورت عالو تھی۔ وہ ایک کنارے پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ترتیب میں آٹھ دس عورتیں مزید بیٹھی تھیں اور

دھپادھپ کپڑے دھونے میں لگی ہوئی تھیں۔ برسات کا موسم تھا اور دریا میں معمول سے ذرا زیادہ پانی تھا۔ اچانک اُس عورت کی صابن کی ٹکیہ پانی میں گر گئی۔ اُسے پکڑنے کے لیے عالو نے بھی اپنے قدم پانی میں رکھ دیے۔ ستم یہ ہوا کہ پانی کے اندر جہاں اُس کا پاؤں لگا وہ جگہ پھسلن والی تھی۔ لہٰذا وہ نیچے پھسلتی چلی گئی۔ اب تیرنا اُس بے چاری کو نہیں آتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے پانی میں غائب ہوگئی۔ عورتوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ہم سب لڑکے بالے جو پانی میں نہا رہے تھے جلدی سے اُس جگہ پہنچے اور اُسے ڈھونڈنا شروع کر دیا مگر لاکھ کوشش کے باوجود اُسے ڈھونڈ نہیں پائے۔ ہمیں حیرت تھی کہ اتنے سے وقت میں وہ کہاں غائب ہوگئی۔ اُس کے بعد گاؤں کے کئی مزید آدمی جمع ہو گئے اور سب نے وہاں چھلانگیں ماردیں۔ مگر شام تک ڈھنڈیا کے باوجود اُس کی لاش نہیں ملی اور آج تک نہیں ملی۔ تب سے اُس جگہ کو سب عالو والا ٹویا کہنے لگے۔ اُس کے بعد کوئی بھی لڑکا عالو والا ٹویا کے قریب نہیں جاتا تھا۔ آج جب کہ دریا سوکھ چکا ہے اور وہاں پانی کی بوند نہیں ہے، اُس جگہ کو عالو والا ٹویا ہی کہتے ہیں۔

اِس دریا کی ایک خصوصیت اور بھی تھی کہ یہ ہمارے علاقے کو دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا۔ یعنی دریا سے مغرب کی جانب کا علاقہ اوکاڑہ تحصیل میں پڑتا تھا اور جونہی پار کرتے تھے تو مشرقی کنارہ دیپالپور تحصیل کے تحت آتا تھا۔ اِس کے علاوہ اِس میں ایک اور بھی خصوصیت تھی کہ ہماری طرف کے علاقے میں تمام مہاجرین آباد تھے اور کنارے کے مشرقی طرف کے علاقے میں تمام آبادی لوکل تھی۔ دونوں کے رہن سہن، زبان، روایات، معاشرت بالکل ایک دوسرے سے جُدا تھیں۔ ہم لوگ اُنھیں ڈخنے کہتے تھے۔ یہ لفظ حقارت سے بولتے تھے۔ یعنی اُجڈ لوگ۔ کیونکہ یہ تمام علاقہ مقامی آبادی کا تھا جو زیادہ تر بلوچوں کی تھی۔ عورتیں دھوتیاں باندھتی تھیں۔ سالن نہیں پکاتے تھے۔ اونٹنیوں کا دودھ استعمال کرتے تھے۔ کھلے کھلے احاطوں میں رہتے تھے۔ ان کے گھروں کے اردگرد دیواریں نہیں ہوتی تھیں، باڑیں ہوتی تھیں۔ درخت بالکل نہیں لگاتے تھے۔ دُور تک سائے کا نام و نشان نہیں ہوتا تھا۔ تعلیم بالکل نہیں تھی۔ میلے ٹھیلے بہت کرواتے تھے۔ اکثر ہماری بھینسیں دریا پار کر کے اِن کی فصلوں میں جا گھستیں جنھیں ہم گھیر کر دوبارہ دریا میں لے آتے۔

ننگے باراتی

اِسی زمانے کا ایک قصہ ہے۔ معمول کے مطابق دو پہر ڈھلے ہم سات آٹھ چچازاد اور کچھ ہم عمر محلے کے لونڈے اپنی بھینسیں لے کر دریا پر آ پڑے۔ قمیصیں گھر پر رکھ گئے تھے، یہ ہماری روٹین تھی۔ شلواریں دریا کنارے اُتار پھینکتے کہ کون اِن دَھجیوں کا بار لیے پھرے۔ اُن دِنوں پانی میں ننگا نہانے میں جو لطف تھا وہ کچھوں اور نیکروں میں نہیں تھا۔ یوں لچکتے ہوئے موجوں میں اُترتے جیسے مچھلیاں تِلکتی جائیں۔ بھینسیں ایک طرف مست ہو کے پانی میں اِدھر اُدھر پھیل گئیں اور ہم لڑکے بالے پورے دریا میں ننگ دھڑنگ غوطہ زنی کرنے لگے۔ ننگے پن کا احساس ذرا نہ تھا، نہ شعورِ گناہ و ثواب تھا۔ کم از کم دو گھنٹے پانی کی موجوں میں لہرانے اور تیرنے کے بعد عصر کے قریب بھینسیں باہر نکال کر خود بھی نکلنے کا سوچا مگر ہوا یہ کہ ہمارے گاؤں کے دو شیطان لڑکے اُسی لمحے بھاگے آئے، سب کی شلواریں اُٹھائیں اور یہ جا وہ جا، منٹوں میں رفو چکّر ہو گئے۔ ہم آوازیں لگاتے اور منتیں ہی کرتے رہ گئے مگر اُنھوں نے ایک نہ سنی۔ شلواریں دُور کہیں چھپا کر چلے گئے۔ ہم انتظار میں ہیں کہ اب آتے ہیں، اب آتے ہیں مگر اُنھیں نہ آنا تھا نہ آئے حتیٰ کہ پانی میں دو گھنٹے سے اوپر ہو لیے۔ بھینسیں نہا نہو کر خود ہی گھروں کو روانہ ہو گئیں۔ اگر اُن کی شلواریں ہوتی تو شاید ہمارے ساتھ رہتیں۔ اِدھر ہم وہیں کے وہیں۔ اب سب کو پریشانی اور بے چینی کہ کب تک پانی میں بیٹھے رہیں۔ گھر ہمارے پورا گاؤں عبور کرنے کے بعد آتے تھے۔ نزدیک ہوتے تو دوڑیں لگا کر چلے جاتے۔ عمریں سب کی دس سے بارہ سال کے درمیان۔ اُدھر وہ شیطان کے مامے گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہوئے کہ پھر اُن کا کان بھی دکھائی نہ دیا جو ہماری آواز سنتا۔ اُس وقت کاغذی پیرہن کا رواج نہیں تھا۔

آخر پانی میں بیٹھے بیٹھے ہمتیں جواب دے گئیں تو سب ننگوں نے سر جوڑے، مختلف صلاحیں ہوئیں، دریا کے بیچ پارلیمنٹ اور سینٹ کا اجلاس ہوا۔ ارکانِ برہنہ نے قرار دادیں پیش کیں۔ پھر جیسا کہ اکثر دانشور کرتے ہیں، سوچ بے چار کے بعد ایک قانون پاس ہوا، جس پر فوری

عمل کا فیصلہ ہوا کہ اِسی طرح ننگی پلٹن باہر نکلے اور پریڈ کرتی ہوئی کپڑے اُٹھانے والوں کے گھر تک مارچ کرے۔ گھر میں داخل ہوکر زنجیرِ عدل ہلائے اور دادِ عدل کے ساتھ شلواریں پائے۔

لیجیے جناب دس بارہ ننگے لونڈوں کا جلوس ہر طرح کی آلودگی اور پردے سے مبرا، چھوٹے بڑے الف نکالے پانی سے نکلے اور قطار اندر قطار چلے گاؤں کی طرف۔ اب جو کوئی رستے میں ملا، بساط بھر دادِ ننگ دیتا۔ کسی کے لیے ہم غلمانِ بہشت تھے اور کسی کی نگاہ میں سبزہ رُخ تُرک امرد۔ ایک بزرگِ باریش توبہ توبہ کرتے، کانوں پہ ہاتھ رکھے، ہمیں شیطان کے چیلے کہہ کے جلدی سے بھاگ نکلے۔ کوئی ناری آنکھوں کو ڈھانک رہی تھی تو کوئی دیدۂ حیرت اور نگاہِ عبرت سے تاک رہی تھی۔ ایک جگہ گاؤں کی چھوکریاں ایک نَل سے پانی بھرنے کھڑی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر ایسے اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں جیسے ہم نہیں، وہ برہنہ ہوں۔ بعض گالیاں دینے لگیں مگر ہم تھے کہ ہر طرف سے کان بند کیے الف لٹکائے مسلسل چلتے گئے۔ ایک دو آدمی پاس سے گزرے اور شرارتاً ایک ایک چپت ہمارے چوتڑوں پر جما کر آگے نکل گئے۔ گھر اُن لڑکوں کا، جہاں ہماری منزل تھی، گاؤں کے عین بیچ تھا، وقت عصر اور مغرب کا تھا۔ گاؤں کے اکثر نے اندازہ لگایا کہ اتنے لڑکوں کا ایک دم پاگل ہو جانا سمجھ نہیں آتا۔ ضرور کسی نے سب کو بھنگ پلا دی ہے یا جادو اور پریوں کا سایہ ہو گیا ہے۔ اتنے میں ہمارا ایک بازی گر دوست جیدا سامنے سے آتا دکھائی دیا، حیران ہوکر پاس آیا اور پوچھا معاملہ کیا ہے؟ ہم نے مختصر قصہ کہا تو وہ فوراً دوڑ کر اپنے گھر سے ڈھول لے آیا اور دھما دھم بجانا شروع کر دیا۔ لیجیے اب تو ننگوں کی بارات بن گئی۔ اب ڈھول بجتا جاتا ہے اور ہم چلتے جاتے تھے۔ آخر اُن رانگڑ لڑکوں کے گھر کے سامنے پہنچ گئے اور دروازے پر دستک دی۔ لوگوں کا مجمع گرد ہونے لگا۔ اتنے میں دیکھا تو وہ دونوں فتنے ہماری شلواروں سمیت دوڑے آ رہے تھے۔ تب لوگ سمجھے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ پاس آ کر اُنھوں نے شلواریں ہمارے سامنے پھینکیں اور کہا، خُدا کا واسطہ ہے یہ پہن لو اور جاؤ۔ مگر اب ہم کہاں رُکنے والے تھے، سیدھا اُن کے گھر گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ اتنے میں یہ شور شرابا اور دستک سن کر گھر والوں نے دروازہ کھول دیا اور ہم درانہ گھس گئے۔ وہ ایک کو پکڑ کر پیچھے کرتے تھے تو دوسرا آگے بڑھ جاتا تھا۔ عجب تماشا ہو گیا، بے چاری

عورتیں گالیاں دیتی ہوئی شرم کے مارے کمروں میں داخل ہو گئیں اور اندر سے کنڈیاں چڑھا لیں۔ اُدھر اُن کے گھر کا صحن جلوہ گاہِ پری وش بن گیا۔

ہم ناچتے پھرتے تھے اور صحن میں گھومتے پھرتے تھے۔ جیدا ڈھول بجائے جاتا تھا۔ وہ منتیں کیے جاتے تھے، بھائی خُدا رسول کے واسطے کپڑے پہن لو مگر ہم سنتے نہ تھے۔ آخر کچھ اور لوگ اندر آئے۔ ایک آدمی نے جیدے کے کان پر یہ ایک جما کر دی کہ وہ دو قلابازیاں کھا گیا۔ ایک شخص نے آگے ہو کر ڈھول کو فٹ بال کی طرح یوں ٹھوکر ماری کے وہ دوسری طرف لڑھکتا چلا گیا۔ اب ڈھول موقوف ہوا اور لوگوں نے ہمیں پکڑا اور زبردستی ہماری شلواریں چڑھا کر باہر نکالا۔ جیدے کو اپنا ڈھول پکڑنے کی نوبت نہ ملی۔ اُسے گردن سے پکڑ کر باہر نکال دیا اور گھر کو کنڈی چڑھا دی، پھر وہ نہ کھلی، ڈھول وہیں رہ گیا اور آج تک نہیں ملا۔ پچھلے دِنوں مَیں گاؤں میں گیا تو جیدا ملا، اِس واقعے کو یاد کیا، کہنے لگا دیکھ لو بھئی تمھاری شلواریں مل گئیں مگر وہ میرا ڈھول پی گئے۔ مَیں نے کہا بھئی اب تو اُسے بھول اور یہ دس ہزار عیدی رکھ لے۔ بھئی کیسا زمانہ تھا، میر صاحب بھی کیا فرما گئے ہیں...

مشکل ہے مٹ گئے ہوئے نقشوں کی پھر نمود
جو صورتیں بگڑ گئیں اُن کا نہ کر خیال

اَچھو کی پدم ناگ سے جنگ

یہ بھی اُنہی دِنوں کا واقعہ ہے۔ اب ہم نے چارا ڈھونے کے لیے گدھی اور واہنا لے لیا تھا۔ جون جولائی کے دن تھے۔ سکول سے گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ اُن دِنوں ہمارے پاس دو بھینسیں تھیں جن کا چارا مجھے اور میرے بھائی کو پورا کرنا ہوتا تھا۔ گاؤں سے دو کلومیٹر باہر شمال مغرب میں سولہ نمبر مربع تھا۔ یہیں ہمارے چارے کے کھیت تھے۔ یہ مکئی کے کھیت تھے۔ ہم دونوں بھائی واہنے کے دائیں بائیں بیٹھ جاتے اور سولہ مربع پہنچ جاتے۔ واپسی پر اسی واہنے پر چارا لاد لیتے اور خود پیدل گدھے کے پیچھے پیچھے گاؤں پہنچ جاتے۔

ہمارے گھر کے ساتھ ہی چراغ دین کا گھر تھا۔ اُس کے سات بیٹے تھے، اِن کے متعلق میں نے ایک افسانہ بھی لکھا ہے جو میرے افسانوں کے پہلے مجموعے 'قائم دین' میں شامل ہے۔ اَچھو اُن بھائیوں میں نہایت جی دار آدمی تھا۔ فُٹ بال کا بہترین کھلاڑی اور گالیاں دینے کا ماسٹر ایسا تھا کہ اکثر گالیوں کے مقابلے اُس نے جیتے۔ اُس جیسی منتخب گالی میں نے آج تک کسی کی زبان سے نہیں سنی۔ ہمارے چارے کے کھیت کے ساتھ ہی اچھو کے چارے کا کھیت تھا۔ چنانچہ ہم نے معمول بنالیا کہ سورج کے سوا نیزے پر آتے ہی چارا لینے چل نکلتے۔ سورج کی اَنی پر اس لیے نکلتے کہ اُس سے پہلے اچھو کو ایک جگہ دوپہر تک مزدُوری کرنا ہوتی تھی۔ وہ وہاں سے ساڑھے گیارہ بجے فارغ ہوتا تھا۔

اب ہوتا یہ کہ مَیں اور میرا بھائی علی اصغر ایک گدھے پر واہنے کے آر پار بیٹھ جاتے اور اچھو اپنے گدھے پر بیٹھ جاتا۔ پھر جیسے ہی گدھے ڈھچکو ڈھچکو چلنا شروع ہوتے، اچھو کسی پنجابی فلم کی سٹوری سنانا شروع کر دیتا یا پھر اپنی زندگی میں بہادری کا کوئی کارنامہ سناتا چلا جاتا۔ اُس کے قصے اتنے دلچسپ ہوتے کہ ہم دونوں بھائی باوجود دوزخ جیسی دھوپ اور گرمی کے، اُس کی ہمراہی کے بغیر چارا لینے نہ جاتے۔ گدھے آگے پیچھے چلے جاتے اور ہم اُن پر بیٹھے جھولتے جاتے اور کہانی سنتے جاتے۔ خُدا قسم جیسا لطف اُن زمانوں میں کہانی سننے کا تھا، آج تک نہیں ملا۔ اچھو کبھی کسی جنگل میں اپنے ساتھ شیر کے مقابلے کا قصہ سناتا، کبھی کسی ڈاکو کا افسانہ سناتا اور کبھی اژدہے کے ساتھ ہونے والے معرکے کی داستاں بیان کرتا۔ نقشہ ایسا کھینچتا کہ ہم وہ تمام معرکہ گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ ایک گھنٹے میں کھیت تک پہنچتے، جو کہانی سننے کے دَوران لمحوں میں نکل جاتا۔ پھر جلدی سے چارا کاٹتے، گدھوں پر لادتے اور واپس ہو لیتے۔ واپسی ہماری گدھوں کے پیچھے پیچھے پیدل ہوتی تھی اور اچھو کی کہانی چلتی جاتی تھی۔

ایک دن اُس نے پدم ناگ کی کہانی شروع کی، جس میں ایک صحرا میں اچھو کا لگا تار تین دن ناگ سے مقابلہ چلا تھا۔ ناگ دس گز لمبا تھا اور پھنکلی اُس کی ایک پنکھے کے برابر تھی۔ اچھو سنا رہا تھا کہ پدم ناگ کیسے گولی کی رفتار سے اُس کی طرف اُڑتا ہوا حملہ آور ہوا اور کس طرح اس نے ناگ

کے وار بچا کر اُسے پلٹنیاں دیں۔ ناگ کی شوک اتنی تیز تھی کہ صحرا میں ایک گونج اُٹھ جاتی تھی اور ہوا کے بگولے چکّر کاٹنے لگتے تھے۔ ادھر اچھو بتا رہا تھا کہ اُس کی اپنی قلابازیوں نے ریت کے ٹیلے اُلٹ پلٹ دیے تھے۔ اِس لڑائی میں ریت اور گرد ایسی اُڑ رہی تھی کہ صحرا میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ 'سانپ کو مار تو مَیں پہلے دن ہی دیتا مگر مَیں نے اُسے زندہ پکڑنے کی ضد باندھ لی تھی۔'

بھوک، پیاس اور گرمی کی شدّت سے دونوں ہلکان ہو چکے تھے مگر اپنی جان کی خاطر ایسے ہشیار تھے کہ ذرا دوسرے کو راہ نہ دیتے تھے۔ کہنے لگا 'بھائی جان پر بنی ہو تو بندہ دیو سے بھی لڑ جاتا ہے اور یہی حالت میری تھی۔ مجھے پتا تھا کہ بس ایک دن کی بات اور ہے اب پدم ناگ کی طاقت آف ہونے ہی والی ہے۔ تم خود ہی بتاؤ، تین دن تک اوّل تو جاگنا، پھر ہُشیار بھی رہنا چھوٹی موٹی بات نہیں کہ ہر آدمی ایرا غیرا کر گزرے۔ بندہ ایک دن نہ سوئے تو باؤلا ہو جاتا ہے اور یہاں تین دن تک ایک پدم ناگ سے لڑنا سمجھو دیو ہی کا کام ہے اور مَیں یہ کر رہا تھا۔'

کہانی اپنے کلائمکس کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور ہم دونوں بھائی اُس میں ایسے مگن تھے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ تصوّر کے کیمرے صدا کی لہروں سے بندھے ہوئے تھے اور ہم اُن کے دم سے اچھو اور ناگ کے میدان جنگ میں پہنچے ہوئے تھے۔ اچھو کہانی سنانے کے درمیان ہاتھوں اور جسم کی حرکات وسکنات سے ایسے ایکشن کرتا تھا کہ وہیں میدان سج جاتا تھا۔ ہمیں یہ اُمید تو تھی کہ اچھو نے پدم ناگ کو آخر مار دینا ہے لیکن کیسے مارنا ہے؟ یہی کچھ جاننے کی جستجو بڑھ رہی تھی۔

خُدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اُسی لمحے ایک ڈیڑھ فٹ کا کالا سیاہ سانپ گنّے کی فصل سے نکلا اور ہمارے سامنے سڑک پر آ گیا، عین اچھو کے قریب۔ اتنی بڑی کالی بلا کو دیکھ کر ہمارے گدھے بِدک گئے اور ایک طرف بھاگے۔ ہم نے اُسی لمحے گدھوں سے نیچے چھلانگیں لگا دیں کہ کہیں پٹخ ہی نہ دیں۔ اب کیا ہوا کہ سانپ کو دیکھتے ہی اچھو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، کہانی بھول گئی اور لب خشک ہو گئے۔ نہ آگے چلا جاتا ہے، نہ پیچھے ہٹا جاتا ہے، بولتی بند ہو گئی۔

ہم دونوں بھائی حیران کہ اچھو، جس نے پدم ناگ سے تین دن مقابلہ کیا وہ اِس رسی جیسے سانپ کو مارنے کے بجائے ساکت کیوں کھڑا ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر ہم نے انتظار کیا لیکن جب

محسوس ہوا کہ اچھو کی روح تو یہیں کھڑے کھڑے خشک ہو جائے گی تو مَیں نے اور میرے بھائی نے جلدی سے کھیت سے روڑے اُٹھائے اور سانپ کی طرف پھینکے، سانپ ڈر کے بھاگا، اِدھر اچھو موقع پا کر دوسری طرف بھاگا مگر قسمت سے سانپ اور وہ ایک خشک اور ویران کھیت میں برابر دوڑنے لگے۔

اِسی اثنا میں اچھو کا پاؤں رپٹا اور دھم سے منہ کے بل جا گرا، پھر اُٹھا، پھر گرا۔ سانپ اُس کے پاؤں کے بیچ سے نکل گیا۔ اس پر اُس نے ایسی چیخیں ماریں کہ پہلے ہمارے فرشتوں نے بھی نہ سنی ہوں گی۔

اِدھر ہم سانپ کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اُسے برابر ڈھیلے مارے چلے جاتے تھے، جن سے بالآخر وہ زخمی ہو کر لوٹنیاں لینے لگا۔ اچھو بھاگ کر بیس قدم دُور جا کھڑا ہوا۔ مگر ہم دونوں بھائیوں نے سانپ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اُسے ڈھیلے مار مار کر آخر مار دیا۔ جب تک ہم سانپ کے پیچھے بھاگتے رہے، اچھو اپنی جگہ سے بال برابر نہ ہلا۔ جب وہ مر گیا تب اُس کی جان میں جان آئی۔

اُس کے بعد ہم دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے اور اچھو نے وہیں سے اپنی داستان شروع کر دی جہاں سے چھوڑی تھی۔ ہم نے اُسے ہرگز نہیں پوچھا کہ جناب آپ تو پدم ناگ کا مقابلہ کر چکے ہیں، اِس چار فٹے سانپ سے کیوں ڈر گئے؟ کچھ تو اینٹ پتھر اُٹھا کر مارا ہوتا۔ پتا نہیں اُس وقت ہم داستانوں میں ہی رہنا چاہتے تھے یا تب معصومیت ہی ایسی تھی۔ آج بھی اِس واقعے کو یاد کرتا ہوں تو دل میں بہت ہنستا ہوں اور اچھو پر بے پناہ پیار آتا ہے۔

ایک طوفانی بارش کا واقعہ

اب ہمارا تیسرا بھائی افضل بھی کچھ آٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ ہمارے گھر میں تین عدد بڑے بڑے کوٹھے تھے۔ گرمی کے دن صحن میں گزرتے تھے جس میں ٹاہلیوں کی چھاؤں ہوتی تھی۔ رات کو سب کی چارپائیاں اِسی میں بچھ جاتیں۔ صحن ذرا بڑا تھا۔ ایک کونے پر بھینسیں بندھی ہوتی تھیں اور دوسرے کونے پر ہم ہوتے تھے۔ سردیاں آتیں تو ایک کوٹھے میں ہم سوتے تھے، ایک

میں بھینسیں ہوتی تھیں۔ تیسرا کمرہ آگ جلانے کے کام آتا تھا۔ ہم تینوں بھائی سکول جانے سے پہلے اور سکول سے آنے کے بعد بھینسوں کی دیکھ بھال میں پھنسے رہتے۔

مویشیوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ خود تو بھوکا رہ سکتا ہے انھیں نہیں رکھ سکتا۔ ایک دن یہ ہوا کہ سردیاں کڑاکے کی تھیں بلکہ آج سے تیس سال پہلے ہر سردیاں کڑاکے کی ہوتی تھیں۔ یوں زمین پر سفید برف جم جاتی تھی۔ تالابوں اور نالوں پر برف کی پپڑیاں پڑی ہوتی تھیں۔ بعض تالابوں کی سطحوں پر تو ایسی برف کی تہ چڑھ جاتی کہ اُن کے اوپر سے بلیاں اور کتے بھاگ کر نکل جاتے اور اُن کے پاؤں کو پانی نہ چھو پاتا تھا۔ ہاتھ باہر نکالتے ہی ٹھٹھرتے اور گلے کو لگنے کی کرتے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ ہم تینوں بھائی سکول سے پڑھ کر آئے۔ بادل ہر طرف گھرے چھائے تھے یوں جیسے رات کالی نکل آئی ہو۔ اِدھر ہم تینوں بھائیوں نے بستے گھر میں رکھے اور گدھی پر واہنا رکھا۔ اماں ہماری کہتی رہ گئیں، ابھی کچھ دیر سانس لے لو، بادلوں کا بہت زور ہے، یوں نہ ہو کہ باہر نکلو تو برس پڑیں۔ مگر ہم تب بالکے ہٹ دھرمی اور ضد کے پتھر ہوتے تھے۔ اپنی جگہ جو پکڑتے تھے تو نہ چھوڑتے تھے۔ ہمیں یہ تھا کہ جلد جلد چارا کاٹ لائیں اور فارغ ہو کر کھیلنے کو جائیں۔ سکول سے آنے کے بعد کتابوں کو دوبارہ ہاتھ سکول ہی میں لگتا تھا۔ چنانچہ چارا لانے اور کھیلنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا اور تعلیم ثانوی چیز ہوتی تھی۔

سردیوں کے دن یوں بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ ذرا دیر کرتے تو شام ہو جاتی۔ ہم نکل پڑے۔ ایک گدھی ہمارے ساتھ تھی۔ گاؤں سے ڈیڑھ کلومیٹر دُور ہمارا چارے کا کھیت تھا۔ وہاں پہنچ گئے۔ اِدھر گھٹا ایک سے اُوپر ایک چڑھی آتی تھی۔ ایسے لگتا تھا ابھی رات پڑ گئی ہے۔ ہم نے اِسی عالم میں جلدی جلدی چارا کاٹنا شروع کر دیا۔ ہلکی ہلکی رم جھم اور سخت سرد ہوا ہمارے ہاتھ جمانے لگی۔ ٹھٹھراوا بہت ہونے لگا مگر ہم اپنے کام میں جتے رہے۔ کھیت برسن کا تھا اور برسن پہلے ہی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ چنانچہ چارے کا لمس بھی ٹھنڈا تھا مگر یہ ضرور تھا کہ ہمارے چارا کاٹنے کے دوران جسم کی ورزش سے سردی کا زور ذرا ہلکا ہو گیا تھا۔ ہمارے جسم پر پتلی سی اون کی جرسیاں

تھیں۔ وہ بوسیدہ اور پھٹی ہوئی تھیں اور کسی طرح بھی سرد ہوا روکنے کے کام نہیں آتی تھیں۔ اپنے آپ کو گرم رکھنے کے واسطے صرف ایک صورت تھی کہ چارا کاٹنے میں تیزی برتی جائے تا کہ جسم گرم رہے۔ ابھی آدھا چارا کاٹا تھا عین اُسی وقت بادلوں نے ببر شیر کی طرح گرجنا شروع کر دیا۔ اُن کی دھڑک ایسی تھی کہ جان دہلاتی تھی اور ہم یا کلے دہلتے تھے۔ ارد گرد آدمی نہ آدم زات۔ سردی کا مقام الگ۔

تب گاؤں کے ارد گرد اور خود گاؤں کی سڑکیں بھی کچی ہوتی تھیں۔ ایک ذرا بارشوں کا زمانہ آیا نہیں کہ ہر طرف کیچڑ کے گھمسان ہو گئے، پھر تو کوئی یہاں پھنسا کوئی وہاں پھنسا۔ ہم جلدی جلدی اپنے کھیت سے چارا کاٹنے لگے لیکن ابھی تھوڑا ہی کاٹا تھا کہ بارش کے تریڑے برسنے لگے۔ لیجیے ایک تو سردی، دوسری ٹھنڈی بارش اور تیسرا ہم گھر سے باہر، یہ کہ عمریں چھوٹی چھوٹی اور نہایت نازک لڑکے، جان کے لالے پڑ گئے۔ ارد گرد سر چھپانے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ کان لال ہو گئے، گال لال ہو گئے، ناکیں لال ہو گئیں اور اُن سے پانی بہنے لگا۔ ہاتھ زیادہ ٹھٹھرنے لگے۔ دانت بجنے لگے اور خون جمنے لگا اور صورت اِس سردی سے بچنے کی نظر نہ آتی تھی۔ جان حلق میں آ گئی۔ مجھے زیادہ فکر اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کی تھی، جن کے چہرے سُرخ سے نیلے ہونے لگے تھے۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ایک خیال جی میں آیا۔ ہم نے جلدی سے گدھی کے اُوپر سے واہنا اُتار کر اُس واہنے کے اوپر یعنی کوہان کی جگہ پر وہ گدیاں رکھ دیں جنھیں گدھی پر رکھا جاتا ہے۔ پنجابی زبان میں اُن گدیوں کو جُھل کہا جاتا ہے۔ یوں واہنے کا درمیانہ حصہ ایک چھوٹا سا خیمہ بن گیا۔ اِس خیمے میں ہمارے بس سر ہی آ سکتے تھے۔ ہم اپنے سر اُن میں ڈال کر تینوں اُلٹے لیٹ گئے۔ اب یہ تھا کہ سر واہنے کے نیچے تھے اور پشتیں ہماری باہر کھلے آسمان کے بیچ تھیں۔ کھیت پانی سے بھر گیا تھا۔ شاید قدرت کو ہمارے سر بچانے مقصود تھے اور اُسی انتظار میں تھی کہ ہم واہنے کے نیچے ہو لیں۔ اچانک بارش کی بجائے یہ بڑے بڑے اولے پڑنے شروع ہو گئے۔ اولے کوئی پاؤ پاؤ بھر کے ایسے تھے جیسے آسمان سے سفید انڈے مگر پتھروں کی طرح سخت برس رہے ہوں۔ ایک

بار تو مجھے لگا ہم کوئی مسخرے ہیں جن کا کھیل اللہ کو پسند نہیں آیا اور اُس نے ہم پر پتھر کے سفید انڈے مارنا شروع کر دیے ہیں۔ اب کیا تھا، سر تو خیر ہمارے بچے ہوئے تھے کہ اُن کے اوپر واہنا اور جُھل تھا مگر پُشتیں اور کمریں اور ٹانگیں کھلے آسمان میں تھیں اور ہم نازک لڑکے۔ اولے ہماری پُشتوں اور ٹانگوں پر برسنا شروع ہو گئے۔ بادل تھے کہ مست ہاتھیوں کی طرح چڑھے چلے آ رہے تھے اور لگتا تھا کہ بس آج نوح کا طوفان اور دُنیا کی ساری برف یہیں برسے گی۔ اولے پُشتوں پر گولوں کی طرح لگتے تھے اور درد سے ہماری چیخیں آسمانوں کو بلند ہوتی تھیں۔ ہمیں تب تو ہوش نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے مگر اُس وقت جو واحد پکار کسی کو کی جا سکتی تھی وہ اللہ میاں ہی تھا لیکن وہ بارش اور اولوں کے شور میں سن نہیں رہا تھا۔ ہماری گدھی پورے کھیت میں اڑنگے مارتی پھرتی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس پر یہ پتھروں کی بارش کون کر رہا ہے۔ اولوں کے بم اُس پر تو کھلے عام برس رہے تھے۔ بھئی کچھ نہ پوچھو، اُن دنوں جنرل ضیا کے مجرموں کو بھی کوڑے لگتے تھے مگر اُن کی حیثیت اِن اولوں کے سامنے خاک نہیں تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک ضرب کولہوں پر لگتی تھی اور ہم چیختے تھے۔ اُس وقت واحد نصیحت جو ہمیں یاد آ رہی تھی وہ ہماری اماں کی تھی۔ کاش سن لیتے اور بچ جاتے۔ دس پندرہ منٹ تک تو یہی سامان رہا گویا ہمیں نافرمانی کے مسلسل کوڑے مارے گئے ہوں۔ پھر یہ اولے تھم گئے اور منٹوں میں پوری دُنیا برف زار ہو گئی۔ درد سے ہمارے جسم بے جان ہو چکے تھے اور گویا موت کا سا سامان بن گیا تھا۔ کچھ دیر تو ہم اُٹھ ہی نہیں سکے۔ گدھی ہماری اللہ جانے کہاں بھاگ گئی تھی۔ ہمارے اردگرد برف کی ایک فٹ کی تہیں جم گئی تھیں اور ہم اُن میں دفن ہوئے پڑے تھے۔ سردی ایسی تھی کہ اللہ بچائے، مجھے سب سے زیادہ فکر چھوٹے بھائی کی تھی۔ اُس کی تو آخر میں چیخیں بھی نکلنا بند ہو گئی تھیں اور مَیں ایک تو خود روتا تھا دوسرا اُس کے لیے روتا تھا۔ ہمارے جسم نیلے پڑے جاتے تھے اور زبانیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ قدم اٹھ نہیں سکتا تھا۔ مَیں سب سے پہلے اُٹھا پھر اپنے دونوں بھائیوں کو اُٹھایا۔ وہ ادھ موئے ہو چکے تھے اور اکڑ سے گئے تھے۔ ہم تینوں ایک درخت کے پاس جیسے تیسے آئے اور ایک ہی دم بیٹھ گئے۔ ٹانگیں چلنے سے جواب دے چکی تھیں۔ مَیں نے اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھ پاؤں کی مالش شروع کر دی۔ اتنے میں دُور

ے کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری ماں دوڑی چلی آتی ہے۔ ہمیں اُس کو دیکھ کر کچھ حوصلہ ہوا۔ سڑک کچی تھی، کیچڑ اور برف کے سبب اُس کے پاؤں ٹھیک طرح سے نہیں پڑ رہے تھے مگر وہ ایسے دوڑتی آتی تھی جیسے اونٹنی اپنے بچّوں کے لیے بے چین ہو کر بھاگتی ہے۔ گاؤں سے ہمارے کھیت کا فاصلہ کم از کم آدھے گھنٹے کا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اُسی وقت گھر سے نکل پڑی ہوگی جب اولے پڑنا شروع ہوئے ہوں گے تبھی تو اتنی جلدی پہنچ گئی اور سب اولے راستے میں اُس کے اوپر برسے تھے۔ اُس کے اوسان خطا لگ رہے تھے۔ دوپٹا اللہ جانے کہاں گر گیا تھا۔ پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے۔ قریب آ کر اُس نے ہم تینوں کو ایک دم اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہہ رہے تھے۔ اُس کی آواز نہیں نکل رہی تھی مگر یوں لگا جیسے کہہ رہی تھی، 'ماں صدقے جائے، ماں مرجائے، میرے بیٹوں کے سر پر سارے اولے برسے ہیں۔'

میری ماں نے وہیں سے میرے سب سے چھوٹے بھائی کو پہلو میں دبایا اور اُس سے بڑے کو کاندھے پر سوار کیا اور میری انگلی پکڑ کر گویا گھر کی طرف بھاگ ہی اٹھی۔ ہماری گدھی اور چارا وہیں پڑا رہ گیا۔ کچھ نہ پوچھو ہم کتنی مشکلوں سے گھر پہنچے۔ ایک دم آگ جلائی اور ہمیں اُس کے سامنے بٹھا دیا۔ جب تپش پہنچنے لگی تو جان میں دم آیا۔ تب اُس نے دودھ گرم کیا، اُس میں انڈے ڈالے اور ہمیں پلایا۔ اِس سے ہمارے ہوش بحال ہوئے۔ کچے مکان کے اندر آگ جلے تو گویا ہیٹر جل جاتے ہیں۔ ہم بھی سردی سے نکل آئے لیکن رات کو ہم تینوں کو پھر بخار نے پکڑ لیا۔ یوں ایک ہفتہ تک ہمارا نزلہ، بخار اور کھانسی جاری رہا مگر اِس میں ہم بہت خوش تھے کہ سکول سے پورا ایک ہفتہ جان چھٹی رہی تھی۔ اِس واقعے کے بعد بھینسوں کے چارے کے لیے ہم نے ایک ملازم رکھ لیا۔ مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ملازم ہم سے بھی زیادہ نواب نکلا۔ ذرا اُس کا ذکر سن لیجیے۔

ایک سیّد ملازم ہوا

وہ ملازم نہایت غریب آدمی ہونے کے ساتھ قوم کا سیّد بھی تھا۔ نام اُس کا سیّد مشتاق حسین شاہ تھا۔ ملازم رکھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ کام کرنا اُس کے لیے نہ صرف ننگ و عار تھا بلکہ ایک

طرح کی موت کا سامان بھی تھا اور اپنی سیادت کو عذر بناتا کوئی اُس سے سیکھے۔ اُس نے روز کا یہ طریق بنالیا کہ صبح کی اذان ہوتے ہی آجاتا اور ہم دونوں بھائیوں کو گُدی سے پکڑ کر بستر سے نکالتا اور کہتا لڑکو اٹھو تم چارا کاٹ کے لاؤ اور مَیں بھینسوں کو نہر سے پانی پلا کر لاتا ہوں۔ ہم نہ اُٹھتے تو ہماری گردن سے گھسیٹتے ہوئے زبردستی اٹھا دیتا۔ جیسے ہی ہم چارا لے کر آتے، دیکھتے تو بھینسیں وہیں کی وہیں کھڑی ہوتیں خود آرام سے بیٹھا حقے کے کش چڑھا رہا ہوتا چنانچہ بھینسیں نہر پر بھی ہمیں ہی لے کر جانا پڑتیں اور پھر واپس آ کر جلدی جلدی سکول کا بستہ اُٹھاتے اور سکول کی گھنٹی کے ساتھ اسمبلی میں پہنچتے۔ جبکہ سیّد صاحب خود ہلکے پھلکے کام میں لگا رہتا، یعنی بھوسے کے اندر کھل اور بنولے مکس کرتا۔ چارا کُترنے والی بجلی کی موٹر ہم نے لگوالی تھی۔ موٹر والی مشین پر چارے کو کُتر کر باریک کرنا اور بھینسوں کا دودھ دوہنا اور دودھ دوہتے وقت ڈیڑھ کلو دودھ خود بھی پینا اور اتنا ہی اپنے گھر لے جانا وغیرہ۔ اگر والدہ کہتی کہ تم سارا کام میرے ہی بچوں سے لیتے ہو، دودھ بھی خود ہی لے جاتے ہو تو ہم تمھیں پیسے کس بات کے دیتے ہیں؟ تو وہ کہتا، دیکھو بہن مَیں تمھارے بیٹوں کو کام کی عادت ڈال رہا ہوں۔ یہ زندگی میں کبھی مار نہیں کھائیں گے، دوسری بات یہ کہ مَیں سیّد ہوں، آپ میری تنخواہ کو خُمس سمجھ لیں اور دودھ کو نیاز تصوّر کر لیں۔ میری والدہ فوراً قائل ہو جاتی کہ چلو اللہ راضی ہو گا۔ الغرض چار سال تک ہم نے سیّد صاحب کو خُمس دیا اور خود اُس کے عوض کام کیا اور اللہ کو راضی کیا۔ آخر ایک دن ہم نے وہ چاروں بھینسیں بیچ دیں جن میں سے ایک بھینس اپنے مقدّس سیّد صاحب کو دے کر بقیہ خُمس سے پیچھا چھڑایا۔ اب ہمیں پتا نہیں کہ ہمارے اِس عمل سے اللہ ناراض ہوا یا راضی۔ البتہ ہم بہت راضی ہوئے۔

اللہ کرے کوئی اِن فطرانہ اور زکوٰۃ لینے والوں کو بھی اسی طرح کا سیّد مل جائے جو اِنھیں کام کی عادت ڈال دے۔ پھر کبھی کبھی سوچتا ہوں، اِنھیں سیّد تو خیر نہیں پچھلے ستر سال سے سفیانی قسم کے چوکیدار ضرور مِلے ہوئے ہیں بلکہ ہم سب کو ملے ہیں۔ وہ ہم سے کام بھی لیتے ہیں اور گھر کا سارا دودھ بھی پیتے ہیں اور الزام بھی گھر والوں کے سر رکھتے ہیں۔

بابا مھندا اور جوگیوں کا گروہ

بابے مھندے کا پہلے سرسری ذکر ہو چکا ہے۔ اِس کا اصل نام محمد علی تھا۔ 2010ء میں فوت ہوا۔ اُس وقت اِس کی عمر 125 برس تھی۔ ہمارے گھر کے پاس ہی اُس کا مکان تھا۔ ہم اُسے بابا مھندہ کہتے تھے۔ بابے مھندے میں اور بہت سی نیک عادتوں کے علاوہ ایک خصلت یہ تھی کہ اپنی دشمنی کبھی دوستی میں نہ بدلتا۔ کسی کے ساتھ ایک بار پھڈا ہو گیا تو ساری عمر اُسی میں کاٹ دیتا تھا۔ اُس کا سب صاف تھا، یعنی سانپوں سے اُس کا یارانہ تھا۔ دُور دُور سے سانپ کے ڈسے آتے تھے اور اُس سے شفا پاتے تھے۔ ہمارے گاؤں والوں میں تو اُس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی کہ بنیادی طور پر وہ ایک غریب آدمی تھا مگر مَیں دیکھتا تھا کہ ہر سال اُس کے پاس ایک جوگیوں کا گروہ آتا تھا۔ یہ گروہ دس بارہ لوگوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ جب آتا تو گاؤں میں داخل ہوتے ہی اپنے جوتے اُتار لیتا اور سروں پر صافے باندھ لیتا۔ ہمارا گھر بابے مھندے کے گھر کے بالکل قریب تھا اِس لیے مَیں نے اُن کو کئی بار ایسے ہی آتے دیکھا۔ یہ لوگ بابے مھندے کے سامنے زمین پر بیٹھتے تھے اور دوزانو مؤدّب بھی ہوتے تھے۔ اُنھیں نذریں پیش کرتے جیسے بادشاہ کو پیش کی جاتی ہیں۔ بابا مھندہ اِن کی دو دن مہمان داری کرتا۔ اِس عرصے میں اُن میں طرح طرح کی باتیں ہوتیں۔ بابے مھندے کے گھر کے سامنے ایک کھلا احاطہ تھا جس میں بہت بڑی بیری کا درخت ہوتا تھا۔ اِس کے نیچے اُن کی چارپائیاں بچھا دی جاتیں۔ دو دن بعد وہ رخصت ہو جاتے۔ مَیں بہت چھوٹا تھا لیکن مجھے اُن کی باتیں نہایت دلچسپ لگتیں کہ اُن میں بہت کہانیاں ہوتی تھیں۔ سانپوں کے قصے ہوتے تھے۔ وہ سب بابے مھندے کی سانپوں کے متعلق بہت کرامتیں بیان کرتے تھے۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ہمارے گاؤں والے تو بابے مھندے کو ایک عام سا آدمی سمجھتے تھے مگر یہ جوگی اُس کی کیسی عزت کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں مھندے کی تھوڑی سی زمین تھی جس میں اُس کا ایک ہی بیٹا دُلا واہی بیجی کرتا تھا۔ اور گھر کا کنبہ چلتا تھا۔

اُس کے دونوں ہاتھوں پر سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے داغ تھے، ہر سال اپنے ہاتھوں

اور جسم پر جونکیں لگواتا تھا اور کئی پاؤ خون نچڑواتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ کسی دور میں ایک خطرناک سانپ نے اُسے کاٹ لیا تھا اور مدتیں گزرنے کے بعد بھی بابے مھندے کو اپنا خون نکلوانا پڑتا تھا۔ ایک نائی کو بلاتا۔ وہ ایک تیز نشتر سے اُس کے ہاتھوں کو کٹ لگاتا جاتا اور خون نکلتا جاتا۔

میں چھوٹا سا تھا، تب تو کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ کیا خوفناک عمل ہے مگر جب بڑے ہوتے گئے تو پتا چلتا گیا۔ بابے مھندے کو سیکڑوں قسم کے سانپوں سے واسطہ پڑا اور فتح پائی۔ اُس نے جو کہانیاں اپنی زندگی کی سنائی ہیں اُن میں سے ایک میں اپنے خودنوشت میں لکھ رہا ہوں۔ بہت دلچسپ ہے لیکن اِس سے پہلے اُس کا ایک واقعہ اپنی آنکھوں دیکھا سنا دوں۔

ہمارے گاؤں کے جنوب میں ایک مربع میل کا چھوٹا سا صحرا یا ریت کے ٹیلے کہہ لیں، وہ تھے۔ کسی وقت یہاں سے دریائے بیاس نکلتا تھا اور اب صرف ریت نکلتی ہے۔ صحرا کے خشک پودے یعنی عک اور دوسری جھاڑیاں بکثرت ہوتی تھیں۔ ہم لڑکوں کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ گھر کا چولہا جلانے کے واسطے وہ عک اور جھاڑیاں کاٹ کے لائیں۔

ہم سکول سے فارغ ہوتے، گھر آتے، روٹی کھاتے اور چچازادوں سے مل کر سیدھے اِن ٹیلوں پر پہنچ جاتے۔ یہ ٹیلے کھیل کود میں بہت سہولت کار تھے۔ خرگوش، چوہے، سیہہ، سانپ اور دوسری ہزاروں بلیات یہاں ہوتی تھیں، جن کا شکار ہم کرتے پھرتے تھے اور ایندھن سمیٹتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ ہم دو بھائی، علی اصغر اور میں اپنے دو چچازادوں علی ارشد اور علی اختر کے ساتھ اِن ٹیلوں پر اودھم مچا رہے تھے اور ایک عک کے پودے کی جڑیں ریت سے نکال رہے تھے۔ یہ عک کی جڑیں سوکھ کر دوزخ کے ایندھن کی طرح جلتی تھیں اور بہت آگ دیتی تھیں۔

یہ جگہ ایک بڑے سے ریت کے ٹیلے کی چوٹی تھی۔ ہم ریت کھود کھود کر ہاتھوں سے اور لوہے کے رنبے سے نکالے جاتے تھے کہ ایک دم ایک شُوک سی ریت میں سے اُٹھی۔ ہم فوراً ڈر کر ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے ہٹے۔ تب ہماری عمریں دس سے تیرہ سال تھیں۔ شوک اتنی تیز اور ہولناک تھی کہ ہم باوجود روزانہ کی بلیات اور سانپ دیکھنے والے اُس وقت کانپ کے رہ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں دیکھا تو ایک نہایت زرد رنگ کا سانپ اُس میں سے نمودار ہو گیا۔ یہ سانپ

مشکل سے ڈیڑھ فٹ کا ہوگا اور آدھ انچ موٹا تھا، لیکن اتنا سنہرا تھا کہ اللہ اللہ۔ سورج آسمان پر صاف چمک رہا تھا اور یہ سانپ اُس کی کرنوں میں اتنا سنہرا تھا کہ یوں لگتا سونا پھیلا ہوا ہے۔ سونے کے علاوہ اِس کا کوئی دوسرا رنگ نہیں تھا۔ ہم اِس سے کافی دُور ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اِس طرح کا سانپ چونکہ پہلی بار دیکھا تھا اِس لیے حیران بہت ہوئے۔ اب سوچا کہ چلو اِسے مارتے ہیں۔ مَیں نے دُور سے ایک لکڑی اُٹھائی اور جونہی سانپ کی طرف بڑھا وہ ایسے اُوپر کی طرف اٹھا جیسے زمین پر نیزہ گاڑ دیا گیا ہو۔ اُس کی زردی میں پہلے سے بھی اضافہ ہو گیا۔ سانپ کی آنکھیں اُبل کر باہر کو نکل آئیں۔ یہ آنکھیں اتنی خوفناک تھیں کہ کبھی ایسی نہ دیکھی تھیں۔ مَیں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور اندازہ لگا لیا کہ سانپ ہم سے کہیں زیادہ طاقتور اور تیز ہے لہٰذا اِس سے دُور ہی رہا جائے اور اِسے اِسی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔

ہماری آنکھیں اُس سے دوچار نہیں ہو رہی تھیں۔ ہم نے سب کام وہیں چھوڑا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مگر دل میں ہمارے ایک خوف بیٹھ گیا کہ اب اِس سانپ کے یہاں ہوتے ہوئے ٹیلے ہم سے چھوٹ جائیں گے۔ خالی ہاتھ گھر پہنچے تو والدہ نے ڈانٹا کہ ایندھن لے کر کیوں نہیں آئے۔ ہم نے سب واقعہ دوگنا بڑھا چڑھا کر سنایا۔ تب والدہ نے کانوں پر ہاتھ رکھوائے کہ آئندہ وہاں نہ جائیں لیکن ہمیں چین کہاں پڑتا تھا۔ ہمارے ٹیلے ہم سے چھٹنا اچھا شگن نہیں تھا۔ اُسی وقت بھاگے ہوئے بابے مھندے کی طرف گئے۔ بابا مھندہ اپنی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اُس کی چارپائی پر بہت صاف اور سفید چادر بچھی ہوتی تھی، تکیہ بھی سفید تھا اور یہ سب دودھ کی طرح روشن ہوتا تھا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً تمام واردات بابے مھندے کو سنا دی۔ بابے مھندے نے سب کہانی غور سے سنی اور مجھ سے بار بار پوچھا، واقعی وہ بالکل سنہرا سانپ تھا اور دوسرا کوئی رنگ اُس میں شامل نہیں تھا؟ مَیں نے کہا: 'بابا جی مجھے تو کوئی اور رنگ اُس میں نظر نہیں آیا' اور میرے چچا زادوں نے بھی اِس بات کی تصدیق کی۔

بابا مھندہ اُسی وقت چارپائی سے اُٹھا، اپنے بیٹے دُلے کو جو اُس وقت خود بھی بوڑھا ہو چکا تھا اور ہمیں اور خود کو ایک گدھی ریڑھی پر بٹھایا اور فوراً ٹیلوں کی طرف چل پڑے۔ ہم نے کہا بابا جی

وہ بہت خوفناک تھا، ہم تو قریب نہیں جائیں گے۔ اُس نے کہا: 'بس مجھے وہ جگہ دکھا دینا جہاں تم نے اُسے دیکھا تھا۔' لیجیے جناب تھوڑی دیر بعد ہی ہم سب وہاں موجود تھے لیکن اب یہ حوصلہ تھا کہ بابا مھندہ ہمارے ساتھ ہے۔

ہم نے دُور ہی سے اُس جگہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ اُس جگہ وہ بلا تھی مگر اب نظر نہیں آ رہی تھی۔ بابے مھندے نے وہاں پہنچ کر اپنی چھڑی سے دو سو مربع فٹ جگہ پر لکیر کھینچ دی اور دُلے سے کہا کہ اپنے دونوں پاؤں پر اوپر تک کپڑا باندھ لو اور اِس دائرے میں کھڑی تمام جھاڑیاں اپنی کلہاڑی سے کاٹ دو اور صاف میدان بنا دو۔ اُس نے پہلے اپنا صافہ پھاڑ کر دونوں پاؤں کے گرد گھٹنوں تک لپیٹ لیا اور جھاڑیاں کاٹنے لگا۔ اِس عمل میں اُسے ایک گھنٹہ لگا۔ یہ سہ پہر سے آگے کا وقت تھا اور شام قریب تھی لیکن تمام جھاڑیاں کاٹنے کے باوجود سانپ نظر نہیں آیا۔ بابا مھندہ تھوڑا پریشان ہو گیا۔ ہم نے کہا بابا جی سانپ کہیں دُور نکل گیا ہوگا۔ اُس نے پھر مجھ سے تصدیق کی کہ واقعی وہ سنہرا سانپ تھا، جب مَیں نے ہاں کہا، تو اُس نے کہا: 'پھر یہ اِس جگہ سے دُور نہیں جا سکتا، ہر حالت میں یہیں ہے۔'

اتنے میں شام ہو گئی۔ اب بابے مھندے نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کیا اور اُس کے بعد دوبارہ اپنی چھڑی سے ایک دائرہ کھینچ کر ہمیں کہا: 'اب گھر چلیں کل صبح پھر آئیں گے۔ جب تک اِسے ڈھونڈ نہ لوں چین نہیں آئے گا۔ اِس کا تلاش کرنا اِس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر خُدا نخواستہ اِس نے کسی کو ڈس لیا تو وہ تو فوراً مرے گا ہی لیکن اِس کے منہ کو بھی انسانی خون لگ جائے گا، پھر اِسے عادت ہو جائے گی اور یہ بات پورے گاؤں حتیٰ کہ جانوروں کے لیے بھی خطرناک ہے۔

ہم نے کہا 'لیکن کل تک تو یہ دُور نکل جائے گا۔' اُس نے کہا: 'ہرگز نہیں جائے گا، یہ جو دائرہ مَیں نے کھینچ دیا ہے، اِس سے باہر کبھی نکل ہی نہیں سکتا۔' لو جی ہم اُس دن واپس چلے گئے اور دوسرے دن سکول جانے کی بجائے صبح ہی بابے مھندے کے ساتھ پھر ٹیلوں پر آ گئے لیکن اب کی بار کوئی دس لوگ مزید ساتھ تھے اور پورے گاؤں میں اِس سانپ کی دھوم پڑ چکی تھی۔ بڑی احتیاط

سے تمام جھاڑیوں اور عک کے پودوں کی کھدائی ہونے لگی۔ بابا مھندہ چھڑی تھامے خود ایک ایک جگہ کریدرہا تھا۔ حتیٰ کہ دوپہر ہونے کو آئی اور ہم سب مایوس ہو گئے۔ اتنے میں ایک جگہ سے پھر اُسی طرح کی شُوک سنائی دی۔ ہم بھاگ کر سب دُور ہو گئے مگر بابا مھندہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وہ سانپ مکرر ایک چھوٹی سی جھاڑی سے نمودار ہو چکا تھا اور وہی جوش جذبہ اُس میں موجود تھا۔ ایک دم اپنی دُم پر اتنا بلند ہو گیا جیسے پورے قد کے ساتھ کھڑا ہو۔ آج اُس نے اپنی پھنگلی بھی پھیلا دی تھی۔ اِس پھنگلی میں سنہری دھاریں آگ کی طرح لائیں مار رہی تھیں۔ مَیں نے دیکھا کہ بابے مھندے کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا، جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

اب ہم سب دُور تھے اور فقط بابا مھندہ اور وہ سانپ آمنے سامنے میدان میں تھے۔ بابے مھندے نے اپنی چھڑی سے اُس کے گرد ایک اور دائرہ کھینچنا شروع کر دیا اور کچھ پڑھتے پڑھتے پھر ایک کے بعد دوسرا دائرہ بابا مھندہ اُس کے گرد تنگ کرتا گیا اور کھینچتا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ بابا مھندہ جیسے جیسے دائرہ کھینچتے ہوئے مُڑ رہا تھا وہ سانپ پھدک پھدک کر پیچھے ہٹ رہا تھا اور اپنی پھنگلی اُسی طرف پھیر رہا تھا جس طرف چھڑی پھر رہی تھی۔ یہاں تک کہ دائرہ سمٹ کر دس مربع فٹ میں رہ گیا اور سانپ اُسی دائرے میں قید ہو کر رہ گیا اور وہاں سے ٹَس سے مَس نہ ہوا اور نہ دائرے سے باہر ہوا۔ اُس کے بعد بابے مھندے نے باہر کھڑے ہو کر اپنی چھڑی اُس کی طرف لے جانا شروع کی۔ تب سانپ ایک ہی دم بابے مھندے کی طرف اُچھلا، ہمیں لگا کہ اب بابا مھندہ مارا گیا لیکن بابا اپنی جگہ پہاڑ کی طرح جما رہا۔ سانپ اُچھل کر عین دائرے کے کنارے کے ساتھ اندر ہی گرا اور ایک ناخن برابر بھی باہر نہیں نکلا۔ ہماری حیرانی دوچند ہو گئی کہ یہ لکیر کیوں پار نہیں کر رہا۔ آخر جب وہ نیچے گرا تو بابے مھندے نے اپنی چھڑی آرام سے اُس کے جسم پر رکھ دی، سانپ کو چھڑی لگنا تھی کہ وہ اپنے ہی اندر سمٹ کر گیند کی طرح گول ہونے لگا اور اکٹھا ہو کر یعنی سکڑ کر شانت ہو گیا۔ اُسی عالم میں بابے مھندے نے اُس کے اوپر ایک موٹا کپڑا پھینک دیا، پھر چھڑی ہی کی مدد سے اپنے کوزے میں ڈال لیا اور اوپر سے وہی کپڑا باندھ دیا۔ تب ہم سب گھر کو چل دیے۔

اب ہم نے بابے مھندرے سے اِس سانپ کی خصوصیات پوچھیں۔ اُس نے کہا: 'بیٹا یہ سانپ یہاں اوّل تو اکلوتا ہے اور کسی سیلاب میں سے اترا ہے۔ دوم اِس اکیلے سانپ کا زہر سو کوبرا سانپوں سے زیادہ خطرناک اور طاقتور ہے۔ اگر یہ ہلکا سا چھو بھی جائے تو جسم میں خون ایک لمحے سے پہلے جم کر سیاہ ہو جائے گا۔ سوم اِس کے زہر سے جب مَیں دوائی تیار کروں گا تو وہ ایسا تریاق ہوگا کہ اُس دوائی کا ایک قطرہ زہریلے سے زہریلے سانپ کے ڈسے کو زندگی بخش دے گا۔

ایک بندے نے پوچھا: 'بابا جی زہر نکالنے کے بعد پھر آپ اتنے خطرناک سانپ کو کیا کرو گے؟' اُس نے کہا: 'جب اِس کا زہر کشید کر لوں گا تو اِسے شکر کھلا دوں گا اور اُس کے سبب یہ چند ہی لمحوں میں سیاہ ہو کر مر جائے گا۔ اِس کا نام کلساڑ سانپ ہے۔ اِس کی آنکھیں ایک لکیر کو ایک خندق کی طرح دیکھتی ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ اُس لکیر کو پار نہیں کر سکتا۔ یہ بہت نازک ہوتا ہے، جب تک اِس کے جسم کو کوئی چھڑی چھوتی نہیں یہ بہت خطرناک ہوتا ہے، اگر اِسے ہلکی سی بھی کوئی شے چھو لے تو مست ہو کر لیٹ جاتا ہے، پھر اُسی عالم میں کئی گھنٹے لیٹا رہتا ہے۔ جب تک کہ اگلی صبح طلوع نہ ہو۔ یہ تمام سانپوں کا بادشاہ ہے۔

یہ تو اُس دن کا قصہ تھا۔ اب وہ کہانی سنیے جس کے لیے مَیں نے آنکھوں دیکھا واقعہ سنایا ہے۔

میرا والد اکثر شام کو جب کام سے فارغ ہوتا تو بابے مھندرے کے پاس چارپائی پر بیٹھ جاتا اور حقہ پیتا۔ مَیں بھی اکثر اپنے والد کے ساتھ اُن کے پاس بیٹھ جایا کرتا تھا۔ ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا اور پوچھ لیا، بابا یہ جو آپ کے پاس ہر سال جوگی آتے ہیں یہ کیوں آتے ہیں؟

میرے اِس سوال پر اُس نے ایک لمبی سانس لی اور بولا، بیٹا اِس کی ایک لمبی کہانی ہے پھر کبھی سناؤں گا۔ میرے والد نے کہا، چاچا آج ہی سنا دو، پھر کبھی وقت ملے نہ ملے۔ آپ کی ٹانگیں تو قبر میں ہیں۔ وہ میرے والد کی اِس بات پر ہنس دیا اور کہنے لگا، لو پھر سنو۔

یہ آج سے نوے سال اُدھر کی بات ہے۔ مَیں ایک دفعہ اپنے بابے کے ساتھ راجستھان کے شہر اودے پور سے ہوتے ہوئے مانسی کے جنگلوں میں گیا تھا۔ یہ فاصلہ ہم نے پیدل دو مہینے

میں طے کیا تھا۔ یہ جگہ پہاڑوں اور جنگلوں میں اتنی خطرناک ہے کہ جن دیو بھی یہاں جانے سے ڈرتے ہیں۔ تمھیں تو خیر کیا خبر ہوگی البتہ تمھارا دادا خوشی علی خاں جانتا تھا۔ میرے والد جیسا ہندوستان بھر میں سانپ کا جانوکار کوئی نہیں تھا اور اُنہی دِنوں میں اپنے والد سے سانپوں کے منتر سیکھ رہا تھا۔ مجھے اللہ بخشے ابا نے دوسو سانپوں کی قسمیں بتا کر اُن کے زہر کے توڑ دے دیے تھے مگر ایک سانپ نیل بانیا ہوتا ہے، اُس کے زہر کا توڑ ابھی تک نہیں دے سکے تھے۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سانپ ہمیں مل ہی نہیں رہا تھا اور اُس کے ملنے کی توقع مانسی کے جنگلوں میں ہی تھی۔ جب ہم بڑی دشوار گھاٹیوں کو طے کر کے وہاں پہنچے تو تھکاوٹ اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو چکے تھے۔ مَیں تو خیر اُن دنوں جوان تھا مگر ابا جی ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ وہاں ہم نے چار پانچ دن تو آرام کیا اُس کے بعد مانسی ندی کے پانیوں میں اُتر گئے اور نیل بانیا سانپ ڈھونڈنے لگ گئے۔ یہ بات کہہ کر بابے مصندے نے حقے کا کش لیا۔ اِتنے میں میرے والد نے اُس سے کہا، چاچا اتنی بھی کیا آفت آئی ہوئی تھی، سانپ نہیں ملتا تھا تو چھوڑ دیتے۔ آپ نے اُس سے کوئی نکاح کرنا تھا۔

والد صاحب کی بات سن کر بابا مصندہ ہنس دیا اور بولا، بیٹے بشیر، وہ آجکل کا زمانہ تھوڑا ہی تھا کہ کاٹا اور لے دوڑی۔ اُن وقتوں میں لوگ اپنے ہُنر میں آخیر تک جاتے تھے اور علم شوق کے ہوتے تھے مجبوری کے نہیں۔ ویسے بھی یہ سانپ سب سانپوں میں وزیر کے درجے پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر فتح پانا اور اِس کے زہر کا توڑ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

لو جی ہمیں وہاں بیس دن ہو گئے۔ اِس عرصے میں مَیں تو مایوس ہوگیا اور ابے سے تقاضا شروع کر دیا کہ واپس چلیں مگر وہ نہ مانے اُنھیں یقین تھا سانپ یہیں سے ملے گا اور ضرور ملے گا۔ اُن کے اُستاد نے جب ابا میاں کو اِس سانپ کے منتر بتائے تھے تو صاف بتا دیا تھا کہ سوائے مانسی کے جنگلوں اور ندیوں کے اِس سانپ کا وجود نہیں ہے۔ ایک دن کی بات ہے میرے والد ایک ندی میں نیچے سانپ ڈھونڈ رہے تھے اور مَیں تھک ہار کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک پتھر کے اوپر بیٹھا تھا۔ یہ پہاڑ بالکل لال رنگ کا تھا۔ اچانک مجھے پتھر کے نیچے سے ایک سرسراہٹ کی آواز آئی۔ مَیں ایک دم ڈر کے اُٹھ گیا۔ اِس طرح کی آواز مَیں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ فوراً ابا میاں

جی کو آواز دی۔ وہ نیچے ندی میں تھے۔ اُنھوں نے میری آواز سنی تو جلدی سے بھاگے۔ اِسی اثنا میں وہاں سے ایک سانپ رینگتا ہوا باہر نکل آیا۔ اِس کی موٹائی سوا انچ تھی اور دو گز لمبائی تھی۔ رنگ اتنا لال تھا کہ مہندی کو پچھاڑتا تھا۔ آنکھیں اُبلی ہوئی باہر کو نکلی تھیں اور وہ اتنی کالی اور بڑی کہ الامان۔ مَیں بھاگ کر ایک طرف ہو گیا۔ میری زندگی سانپوں میں کھیلتے جوان ہوئی تھی اور خوف بالکل نہیں رہا تھا مگر یہ سانپ تو الگ بلا معلوم ہوتی تھی۔ مَیں نے تیزی سے منتر شروع کیے لیکن وہ ایک جگہ آ کر ٹھہر جاتے تھے۔ اُس سے آگے نہ چلتے تھے۔ اِس عالم میں میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب یہ سانپ میرے سامنے مقابل کھڑا پھنکار رہا تھا اور اِس کی پھنکار سے جنگل جاگ اُٹھا تھا۔ میرے پیچھے عین گہری گھاٹی تھی اور سامنے سانپ تھا اور ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے کبڈی کا پہلوان راستہ روکے کھڑا ہو۔ مَیں نے سوچا لو بھئی محمد علی، میاں جی نے مانسی کے جنگلوں میں مروا دیا۔ اب مَیں ایک طرف سے ہو کر نکلتا ہوں تو وہ سانپ آگے ہو جاتا ہے، دوسری طرف جاتا ہوں تو سانپ آگے۔ منتر میرا چل نہیں رہا تھا۔ موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ میاں جی کو بلانے کے لیے دوبارہ آواز حلق سے نہ نکلی۔ اُس کی آنکھوں کا میری آنکھیں سامنا نہیں کر سکتی تھیں کہ ایک پل دیکھنے پر دُنیا گھومنے لگ جاتی تھی۔ اب کیا ہوا سانپ نے آہستہ آہستہ میری طرف رینگنا شروع کر دیا اور عین اُسی وقت میاں جی کی آواز آئی۔ اتنے میں میرا اور سانپ کا فاصلہ چھ سات گز رہ گیا۔ مَیں نے فوراً اُلٹے پاؤں ہو کر چلنا شروع کیا اور گھاٹی کے پتّھروں سے لٹکنے کی کوشش کی۔ اِسی اثنا میں ایک پتھر بھی اُٹھا لیا تھا۔ عین اُسی وقت میاں جی پہنچ گئے۔ میری سانسیں خشک ہو چکی تھیں۔ میاں جی کے ہاتھ میں بڑی سی مضبوط چھڑی تھی۔ مَیں نے فوراً آگے ہو کر میاں جی سے چھڑی پکڑنے کی کوشش کی۔ اُس وقت تک اُنھوں نے سانپ کو دیکھ لیا تھا اور دیکھتے ہی اُن کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ جیسے ہی مَیں نے میاں جی کے ہاتھ سے چھڑی کھینچنے کی کوشش کی اُنھوں نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور بولے ممندے کیا پاگل ہو گیا ہے، یہی تو وہ گوہر ہے جسے ڈھونڈنے ہم یہاں تک آئے ہیں۔ یہ نیل بانیا ہے۔ پھر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ اللہ جانے میاں جی میں کیا طلسم تھا یا منتر کی کرامت تھی کہ سانپ نے ایک دم اپنی پچھلی زمین پر رکھ دی اور دوسری طرف مڑنے لگا۔ میاں نے آگے سے

ہو کر اُسے گھیرا، سانپ نے رستہ نہ پا کر ایک دم چھلی کو پھیلایا اور ایسی پھنکار ماری کہ جنگل کے پتے ہل گئے اور پرندے شاخوں سے اڑنے لگے۔ میرا اپنا کلیجا دہل کر رہ گیا۔ مگر میاں جی کو مجال ہے ذرا خوف آیا ہو اور منتر بڑبڑاتے رہے۔

اب کیا تھا سانپ غصّے سے حملہ کرنے کی کوشش کرتا تھا اور میاں جی اپنی چھڑی آگے کرتے تھے اور مسلسل منتر پڑھتے تھے۔ مَیں سُکڑ کے ایک طرف لگ گیا مگر ہاتھ میں پتّھر مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ اب نیل بانیے نے ایک ہی دم یہ بڑا سا چھلاوہ بھرا اور دو گز میاں جی کی طرف ہو کر گرا۔ میاں جی نے وہی چھڑی آگے کر دی اور اچھل کے سانپ کی پشت کی طرف ہو گئے۔ تب کچھ ہی لمحے لگے ہوں گے۔ سانپ نے اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کی جیسے اُس سے بڑا کھلاڑی میدان میں فتح حاصل کر چکا ہو۔ اب میاں جی نے یہ کیا کہ ایک دم اپنا صافہ سانپ کے اُوپر پھینک دیا۔ سانپ اُس میں الجھتا چلا گیا۔ میاں جی نے تھوڑی دیر اُس کی مستیاں چلنے دیں۔ جب نیل بانیا تھک کے نڈھال ہوا اور کپڑے نے حرکت کرنا چھوڑ دی تو میاں جی نے اُسے اٹھالیا اور اُس بوری میں ڈال دیا جو خاص اُسی کے لیے بنوا کے لائے تھے۔ تب ہم دونوں واپس چلے۔ ہمارے راستے میں بیسیوں گاؤں آئے۔ میاں جی اب مجھے بتاتے جاتے تھے کہ مَیں نے کیسے اِس کے چلّے میں اپنے گُر برتنے ہیں۔ دس دن بعد ہم ایک گاؤں میں پہنچے۔ یہ عجیب قسم کا گاؤں تھا۔ یہاں درخت نام کی ایک پتی نہیں تھی۔ سب سیاہ اور سُرخ پتّھروں کی وادی تھی اور اِسی میں گاؤں تھا۔ میاں جی نے مجھے کہا، مَیں یہاں باہر بیٹھتا ہوں تُو اِس گاؤں سے کوئی کھانے پینے کی شے لے آ۔ مَیں نے میاں جی کی بات مان لی اور گاؤں میں چل پڑا۔ یہ گاؤں ایسے لگتا تھا ہزاروں سال پُرانا ہو۔ پُرانی قسم کی گلیاں تھیں۔ کھلے کھلے چوک تھے اور پتّھروں سے تراشی ہوئی چوکیاں تھیں۔ مکان بھی پتّھروں کے تھے۔ سُرخ اور کالے رنگ کے یہ پتّھر عجیب منحوس نظر آتے تھے۔ مَیں نے کبھی ایسا گاؤں نہ دیکھا تھا۔ مَیں ایک دُکان پر آیا۔ میرے پاس موری والے دو روپے تھے۔ مَیں نے ایک بڑی سی دُکان پر آ کر وہ پیسے دیے اور ضرورت کی چیزیں خرید کر واپس ہو گیا۔ جیسے ہی واپس آیا دیکھا میاں جی کے گرد ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے اور اُن سے اُلجھ رہا ہے۔ مَیں نے

تھوڑی ہی دیر میں حالات کا جائزہ لے لیا۔ یہ سارے لوگ جوگی تھے اور میاں جی سے تلاشی لینا چاہتے تھے۔ وہ اُن کو تلاشی نہیں دے رہے تھے۔ آخر سب نے ہمیں زبردستی پکڑ لیا اور باندھ کر ایک لمبے چوڑے احاطے میں لے گئے۔ اِس کی دیوار کالے پتھروں سے نہایت اونچی اور لمبی چوڑی تھی۔ درمیان میں ایک بہت بڑا دالان تھا اُس پر بھی اللہ جانے پتھروں سے چھت کیسے بنی ہوئی تھی۔ اصل میں یہ کوئی پُرانا قلعہ تھا یا کسی گئے وقتوں کے بادشاہ کی حویلی تھی۔ دالان میں ایک چبوترہ تھا۔ اِس کی لمبائی چوڑائی کم سے کم بھی پچاس فٹ تو ہوگی۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں ایک آدمی نہایت گھنے بالوں والا بیٹھا تھا۔ ماتھے پر یہ بڑا سا تلک تھا اور مونچھیں اور داڑھی کے بال آپس میں گھل مل گئے تھے۔ آنکھیں بہت بڑی اور خوفناک تھیں۔

وہ ہمیں حیرت سے دیکھنے لگا اور ایک مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ تب اُن جوگیوں سے ایک انوکھی سی زبان میں اُس نے بات کی اور کچھ دیر وہ آپس میں باتیں کرتے رہے اور ہماری طرف گھور کر دیکھتے رہے۔ ہمیں اپنی موت سامنے نظر آنے لگی لیکن میاں جی نے سانپ والی بوری ابھی تک پکڑی ہوئی تھی۔

آخر آپس میں گفتگو کرنے کے بعد وہ خوفناک بڈھا میاں جی سے مخاطب ہوا۔ کیوں جی یہاں کیا چوری کرنے آئے ہو؟ سچ سچ بولیو ورنہ ابھی خنجر پھیر دوں گا۔

میاں جی نے اُنھیں ایک نظر دیکھا اور بولا، مہادیو جی ہم یہاں ایک سانپ لینے آئے تھے۔ وہ مل گیا اب وطن جاتے ہیں۔

کیا تمھیں خبر نہیں یہ علاقہ ہماری جاگیر میں آتا ہے۔ ہم خود جوگی بھوگی ہیں اور یہ سانپ ہماری رعایا ہیں۔ اِن کو پکڑنا یہاں بہت بڑا جرم ہے۔ ہم سانپ کے چور کو سانپ ہی سے ڈسوا دیتے ہیں۔

اُس کی بات سن کر میاں جی ایک دم سہم گئے اور بولے، مہادیو جی رحم کرو، ہمیں یہ خبر نہیں تھی آپ جوگی قبیلہ رکھتے ہیں ورنہ آپ کی ورشا سے یہاں داخل ہوتے اور سنپولیا لے کر جاتے۔

کہاں سے آئے ہو، مہادیو دوبارہ غصے سے بولا۔

ہم فیروز پور کے ایک گاؤں سرسا سے آئے ہیں۔

کیا وہاں بھی جوگی رہتے ہیں، ہم تو وہاں کسی جوگی کو نہیں جانتے۔

مہادیو جی ہم جوگی قبیلے والے نہیں ہیں۔ زمیندار لوگ ہیں۔ بس سانپ کے کیلن کا شوق چڑھ گیا اور منتر سیکھ لیا۔ ہمارا یہ پیشہ نہیں ہے۔

لو بھئی سن لو، اِن کو شوق ہو گیا اور ہماری رعایا کی جان گئی۔ اب رام جانے یہ کس سانپ کو اٹھائے لیے جا رہے ہیں، جاتے ہی کشتے بنا دیں گے۔ کھولو ذرا اس بورے کو، دیکھوں تو کون سا سانپ ہے۔

اُس کی یہ بات سنتے ہی ایک آدمی نے ایک جھٹکے سے میاں جی سے وہ بوریا چھین لیا اور میاں جی کے کہتے کہتے اُس بوری کا منہ کھول دیا۔ بوری کا منہ کھلتے ہی نیل بانیا ایک چھپاکے سے باہر نکلا اور وہاں کھڑے سامنے کے ایک جوگی پہ چڑھ دوڑا اور ڈس لیا۔ نیل بانیا نے اُسے جیسے ہی ڈنگ مارا ایک دوسرے جوگی نے بھاگ کر اُسے پکڑنا چاہا۔ نیل بانیے نے ایک ہی وار میں اُسے بھی ڈنگ مار دیا۔ باقی جوگی بھاگ کر ایک طرف ہو گئے اور جن کو ڈنگ لگا تھا وہ زمین پر گر کر ایک دم تڑپے اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ ہو گئے۔ اُن کا خون بالکل جل چکا تھا اور وہ ایک ہی منٹ کے اندر اللہ ہو ہو چکے تھے۔ اتنے میں وہی مہادیو آگے بڑھا اور اُسے پکڑنے لگا۔ میاں جی نے فوراً بڑھ کر اُسے روک دیا اور خود نیل بانیا کے پیچھے دوڑے۔ تب مَیں نے ایک بات دیکھی کہ نیل بانیا ہر ایک کی طرف بڑھتا تھا اور پھنکارتا تھا مگر میاں جی کے آگے لگ کے دوڑ پڑتا تھا۔ آخر میاں جی نے آگے بڑھ کر اُسے پکڑ لیا۔ اب وہاں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ دو بندے مرے پڑے تھے اور رونا پیٹنا شروع تھا۔ ہر طرف ماتم کی صفیں بچھ گئیں تھیں۔ مرے ہوئے جوگیوں کی عورتیں پل بھر میں وہاں آ موجود ہوئیں۔ مَیں یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ اچانک یہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ پردیس علاقہ، ہم اجنبی، کوئی جان پہچان کا بندہ نہیں تھا اور مَیں نے دیکھا وہاں دُور دُور تک کسی تھانہ کچہری یا سرکار مدار کا نشان بھی نہیں تھا۔ اگر انھوں نے ہمیں مار کر یہیں گاڑ دیا تو کون پوچھے گا۔ آخر وہاں سے لاشیں ہٹا دی گئیں۔ مہادیو نے ایک ہی دم اٹھ کر میاں جی کو بازو

سے پکڑا اور اپنے سامنے کے مونڈھے پر بٹھا دیا اور بولا، آپ بالکل رنج نہ کریں اور نہ غم کھائیں۔ اِس میں ہمارا ہی گناہ ہے۔ مجھے خبر ہو گئی ہے تم سانپوں کے مہا گرو ہو۔ مَیں نے ہزاروں سانپ کیلے ہیں اور پکڑے ہیں مگر یہ سانپ آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ تم مجھے اِس کی کیل منتر بتا دو۔ ایسا ناگ مَیں نے آج تک نہیں کیلا۔

یہ تو بہت دِنوں کا کام ہے، میاں جی نے جواب دیا۔ چلہ کرنا پڑے گا۔

وہ ہم کریں گے۔

لیکن ہم تو دیس کو ابھی نکلنا چاہیں گے۔

اگر ہم نہ جانے دیں تو کیا کرو گے؟

اب میاں جی ٹھنڈے پڑ گئے، پھر کچھ غور فرما کر کہنے لگے چلیے چالیس دن کا چلہ کھینچے اور مجھے مخاطب ہوئے، مھندے تُو بھی اِنہی کے ساتھ ہی چلہ کر پھر یہیں پر۔

اب مَیں اور وہ مہادیو چلے پر بیٹھ گئے اور میاں جی نے ہمیں گُر دینا شروع کیے۔ اُنھوں نے دو دائرے ایک لکڑی سے کھینچ دیے۔ ایک میرے لیے اور ایک مہا دیو کے لیے۔ دونوں کا آپس میں کئی گز کا فاصلہ رکھا۔ رات ہمارے نزدیک آنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ خوفناک عمل تھا۔ میاں جی کے لیے اُنھوں نے پاس ہی ایک کھٹیا بنا دی تھی اور دال ساگ وہیں مل جاتا تھا۔ رات ہمارے اردگرد سانپوں کے ہالے ہوتے تھے۔ سیکڑوں سانپ اِدھر اُدھر چل رہے ہوتے تھے مگر کوئی ہمارے دائرے میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات یوں لگتا تھا کہ سانپ ابھی ہمیں کھا جائیں گے اور اتنی خوفناک شوکیں مارتے تھے کہ دل دہل جاتا تھا۔ آخر ہمیں اُسی سانپ کے ہیولے نظر آنے لگے جسے ابا میاں نیل بانیا کہتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی ہمیں ڈس لے گا۔ ایک رات مَیں اپنے چلے میں تھا کہ مہادیو کے چلے سے خوفناک چیخوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ مَیں تو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا اور نہ بتا سکتا تھا کہ کیا ہوا کہ مجھے دائرے سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر میرے میاں جی بھاگ کر وہاں پہنچے۔ دیکھا کہ ایک نیل بانیا سانپ اُنھیں لپٹا ہوا ہے۔ دراصل جس سانپ کا منتر سیکھا جا رہا ہو اور جس سانپ کی کیل کا چلہ ہو وہی سانپ روز آ کر

ڈراتا ہے اور چلے کے تیسویں دن اُس کی آمد شروع ہوتی ہے۔ ہمیں پورے انتالیس دن ہو گئے تھے اور یہی رات سب سے بھاری ہوتی ہے۔ سانپ ایک دم پورا منہ کھول کے ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ یہ عمل میرے ساتھ بھی ہوا مگر مجھے میاں جی نے بتادیا تھا کہ اگر میں ذرا بھی ڈر کے دائرے سے باہر ہوا تو مارا جاؤں گا۔ چنانچہ مَیں بیٹھا رہا بلکہ اپنی آنکھیں ہی بند کر لیں لیکن مہادیو بے چارا کہیں ڈر گیا۔ میاں جی نے بھاگ کر اُسے پکڑا۔ اتنے میں سانپ نے ڈنگ مار دیا تھا، میاں جی نے فوراً ایک تریاق کی پڑیا اُس کے منہ میں انڈیل دی اور سانپ کو پکڑا۔ اتنے میں مہادیو بے ہوش ہو چکا تھا۔

دوسری صبح میرا چلہ تو ختم ہو گیا مگر مہادیو کا چلہ رہ گیا۔ اب کیا ہوا کہ اُسے جو سانپ نے ڈنگ مارا تھا اُس کا علاج بھی میاں جی کے پیش پڑ گیا اور ہمیں دو مہینے مزید وہاں رُکنا پڑا۔ روز میاں جی مہادیو کے جسم میں پھیلے ہوئے زہر کو تریاق سے اکٹھا کرتے۔ خیر یہ ہوئی کہ وہ پہلے کئی بار مختلف سانپوں سے ڈسے ہوئے تھے اور زہر سے اُن کا واسطہ رہا تھا۔ چنانچہ نیل بانیا کا زہر جس شدّت سے اُنھیں چڑھنا تھا اُس میں تھوڑا وقت مل گیا اور اِسی میں میاں جی نے اُنھیں تریاق دے دیا جو وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ پھر ایک تریاق اُسی نیل بانیا کے زہر سے تیار کیا جسے ہم پکڑ کر لائے تھے اور مہادیو کو دینے لگے۔ اب مہادیو ٹھیک تو ہو گئے مگر باؤلے باؤلے سے ہو گئے۔ اُن کا تمام جسم نیلے اور کالے داغوں سے بھر گیا۔ بے شمار جگہ خون کی پیپڑیاں جم گئیں۔ دُور دُور سے پھل اور خون پیدا کرنے والی چیزیں کھلانے لگے۔ اِس مدّت میں ہمیں چار ماہ وہیں بسر ہو گئے۔ میری اماں رو پیٹ کر بیٹھ گئی کہ کہیں مر گئے ہیں۔ آخر چار ماہ بعد ہمیں اجازت ملی۔ مہادیو نے کئی جوگی ہمارے ساتھ کر دیے اور کچھ پیسے بھی دیے۔ اُس نے اپنے جوگیوں اور اولاد سے کہا کہ ہر سال ہمیں سلامی کی جائے۔

اِسی عرصے میں مہادیو نے میاں جی سے دوبارہ چلہ کیا اور نیل بانیا کا منتر سیکھا۔

ایک دن مہادیو نے کہا، میاں جی کیا اِس سانپ سے بھی کوئی زیادہ زہریلا سانپ ہو گا؟

میاں جی نے کہا، مہادیو جی یہ سانپ تو وزیر ہے۔ اِن کا بادشاہ تو ابھی مجھے نہیں ملا۔

وہ کہاں ہوتا ہے؟

وہ یہاں نہیں پایا جاتا اور اُس کا ایک ٹھکانا بھی نہیں۔

اچھا اُس کی کوئی نشانی تو ہو گی؟

ہاں نشانی ہوتی ہے۔ سونے کی طرح ہوتا ہے اور ڈیڑھ ہاتھ سے بڑا نہیں ہوتا۔ اُسے گل ساز کہتے ہیں۔ میرے اُستاد نے ایک بار مجھے دکھایا تھا۔ خدا جانے اُس نے وہ کہاں سے لیا تھا۔

آپ نے اُس کا منتر بھی سیکھا؟

منتر تو سیکھا مگر کسی کو سکھا نہیں پایا کہ وہ ملتا ہی نہیں اور یہ جو میرے ہاتھوں پر کالے دھبے نظر آتے ہیں، صرف اُسے پکڑنے کے سبب پڑ گئے ہیں اور یہی چھالے جب یہ میرا بیٹا مھندرہ پیدا ہوا تھا اِس کے بھی پڑے ہوئے تھے۔ اب ہر سال ہم جونکیں لگائیں گے تو ٹھیک رہیں گے۔ جب تک وہ سانپ نہ ملا اور اُس کا تریاق تیار نہ ہوا تب تک یہ کالے دھبے باقی رہیں گے۔

اور اب بابے مھندرے کو وہ سانپ مل گیا تھا۔ شاید اب اُسے نشتر نہ لگانے پڑیں کہ وہ تریاق پیدا کر ہی لے گا۔

بابا مھندرہ اور پیر جتی کا دروازہ

پیر جتی شاہ کا دربار ہمارے گاؤں سے شمال مغرب کی طرف چار میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ وہی پیر جتی شاہ کا مزار ہے جہاں 1958ء میں دریائے بیاس میں سیلاب آنے کے بعد دس پندرہ گاؤں کے لوگوں نے پناہ لی تھی۔ مزار بہت بلند جگہ ایک ٹیلے کے اوپر تھا اِس لیے یہاں پانی کے چڑھنے کا خطرہ نہیں تھا۔ ارد گرد قبرستان اور کریر جنڈ کے درخت تھے۔

مقامی لوگوں کے مطابق اصل میں سخی شہباز قلندر ہی پیر جتی شاہ تھا۔ یہاں پیر صاحب دفن نہیں ہیں بلکہ سینہ گزٹ رپورٹ کے مطابق اُنھوں نے ایک سال یہاں قیام کیا تھا۔ پھر سندھ کے کافروں کو مسلمان کرنے نکل گئے۔ مقامی لوگ یہ نہیں بتاتے کہ یہاں اُن کے ہاتھوں بنائے گئے مسلمان دوبارہ کافر ہوئے کہ نہیں۔ یہاں پیر جتی شاہ کا میلہ لگتا تو ہزاروں لوگ شرکت کرتے۔

اس مزار کے قبرستان میں خاص طور پر دُور دُور سے چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور دیگر پیچیدہ قسم کے گنہگاروں کو لا کر دفنایا جاتا تا کہ پیر صاحب کی قربت کے سبب بخشے جائیں۔ اس مزار کی ایک خصوصیت اور بھی تھی۔ اس کے دروازے پر ایک زنجیر لگی ہوتی تھی۔ اگر کسی مدعی کو شک ہوتا کہ فلاں میرا مجرم ہے تو وہ شرط قائم کر دیتا کہ ملزم سچا ہے تو وہ پیر جتی شاہ کے دروازے کا زنجیر کھول دے۔ اگر زنجیر کھولنے کے دو ماہ کے اندر ملزم کا کوئی نجی نقصان ہو جاتا تو گویا وہ مجرم پکا ہوتا ورنہ الزام سے بری ہو جاتا۔ یہ قسم چوری ڈکیتی سے لے کر قاتل تک پر قائم کی جاتی اور مزے کی بات ہے اکثر چور ڈاکو یا قاتل اپنا گناہ مان لیتے مگر زنجیر نہ کھولتے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ مدعی خود اپنے ہاتھ سے دروازے کی زنجیر لگاتا تھا اور ملزم آگے بڑھ کر کھولتا۔

ایک دفعہ ہمارے گاؤں میں ایک نہایت کنجوس آدمی کے دو سو روپے چوری ہو گئے۔ اُس نے اسی بابا مھدرو کے پوتے پر الزام لگا دیا کہ اُس نے اٹھائے ہیں۔ بابے مھدرے کے ساتھ میرے والد کے تعلقات سب سے زیادہ تھے بات پنچایت تک پہنچ گئی اور پنچایت نے فیصلہ کیا کہ بابا مھدرو کا پوتا اگر سچا ہے تو پیر جتی شاہ کے دروازے کی زنجیر کھول دے۔ مگر کنجوس مدعی برکت علی نہیں مانا۔ اُس نے کہا، اس کے پوتے کی طرف سے زنجیر بابے مھدرے کا دوست محمد بشیر کھولے، تب مانوں گا۔ پنجاب میں اس طرح کی قسمیں مدعی ملزم سے لینے کا حق رکھتے ہیں۔ وعدے کے مطابق میرے والد صاحب، مدعی اور ملزم تینوں پیر جتی شاہ کے مزار پر پہنچ گئے۔ میرے والد کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ملزم کو مجرم تو نہ سمجھتے تھے مگر زنجیر بھی کھولنا پسند نہ کرتے تھے۔ جب وہ تینوں مزار پر پہنچے تو وہاں کے متولی کے پاس چارپائی تھی۔ والد صاحب اُسے ایک طرف لے گئے اور کہا، دیکھو میرے بھائی، یہ مدعی اور ملزم دونوں بہت امیر آدمی ہیں۔ قسم ملزم کی طرف سے میں نے دینی ہے۔ ان دونوں سے کہو زنجیر لگانے اور کھولنے کی قیمت دونوں طرف سے تین تین سو روپے ہے۔ جب تک یہ نیاز نہیں دو گے، زنجیر کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔

دربار کے متولی نے اُن دونوں سے وہی جملے دہرا دیے، اور کہا لاؤ پہلے نذر پیش کرو پھر زنجیر کے پاس جانا۔ اب والد صاحب نے مدعی سے کہا بھائی برکت تین سو روپے دے کر جلدی سے

زنجیر چڑھاؤ اور بابے مھندے سے کہا، میاں آپ بھی تین سو روپے دو تا کہ مَیں آپ کی طرف سے زنجیر کھول دوں۔

اب یہ زمانہ ایسا تھا کہ تین سو روپے آج کے تیس ہزار سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اُدھر اُن کی جیبوں میں تیس روپے نہ تھے لیکن متولی نے ایسی ضد پکڑی کہ تین سو سے نیچے نہیں آیا۔

بابے مھندے نے کہا، میاں مَیں تو پیسے نہیں دیتا، مجھے کیا چٹی پڑی ہے کہ محض جھوٹے الزام پر پیسے دوں؟ قسم لینے کی غرض اِس برکت کو ہے مجھے تو نہیں ہے۔ میرے پیسے بھی مدعی ہی دے۔ اب مدعی صاحب قارون کے ابا جی تھی۔ وہ تو دو روپے دینے کے روادار نہیں تھے۔ اِدھر تو تین سو کے بدے چھ سو دینا پڑتے تھے۔ وہ بے چارا تھوڑی دیر بیٹھا سوچتا رہا، پھر کہنے لگا آؤ چلیں گھر، قسم ہو گئی ہے۔

اب والد صاحب نے اپنی طرف سے جیب سے پچاس روپے نکال کر متولی کے ہاتھ میں دیے اور اُسے کہا، بس مَیں اتنا ہی چاہتا تھا۔ پھر مزار کو سلام کیا اور چل دیے۔ دس بارہ دن بعد برکت علی کے دو سو روپے اُسی کے ایک لکڑی کے صندوق میں پڑے مل گئے کہ وہ وہاں رکھ کر بھول گیا تھا۔

دو اہم واقعے اور ڈسپنسری کا فائدہ

جہاں ہمارا گھر تھا۔ اِس کے سامنے بیان ہو چکا ہے کہ یونین کونسل کا دفتر تھا اور دائیں پہلو ایک ڈسپنسری تھی۔ یہاں باقاعدہ ایک ڈسپنسر ہوتا تھا۔ ہمارے گاؤں اور اردگرد کے دس پندرہ گاؤں کے مریض یہاں سے شفا پاتے تھے۔ اِس میں باغیچہ تھا۔ ٹاہلیوں، جامنوں اور امرودوں کے اونچے اونچے پیڑ تھے۔ اُن کی گھنی چھاؤں تھی۔ ایک پیڑ کے نیچے پانی کا نلکا لگا تھا۔ آدھے گاؤں کی عورتیں یہاں سے پانی بھرتی تھیں۔ سبزیاں اُگی ہوتی تھیں۔ اِسی میں ہم کھیلتے بھی رہتے تھے۔ سچ پوچھیں تو یہ دونوں جگہیں میری ذہنی اور طبعی نشوونما کی تربیت گاہیں تھیں۔ ڈسپنسری کا عملہ بھی اپنے کام میں ماہر اور فرائض کی ادائیگی میں ذمّے دار تھا۔ چھوٹی موٹی بیماریاں مثلاً بخار، زکام، نمونیا، چھوٹی موٹی سرجری اور ہارٹ اٹیک کی ابتدائی ٹریٹمنٹ یہاں دستیاب تھی اور مزے کی

بات ہے یہ سب کام اب ڈسپنسری کا چوکیدار بھی آسانی سے کر لیتا تھا بلکہ بہت عقل کے ساتھ کرتا تھا۔

میرے لیے دو واقعے اِس ڈسپنسری کے بہت اہم تھے۔ پہلا واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن مَیں ایک ٹوکی سے اپنے لیے گنے کی گنڈیریاں بنا رہا تھا۔ ویسے تو عموماً گنا چوستے ہی تھے لیکن ایسے ہی شغل میں ایک دن گنڈیریوں کا پنگا لے لیا۔ ٹوکی بہت تیز تھی۔ جیسے ہی مَیں نے ایک ہاتھ سے گنا پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے ٹوکی چلائی، وہ سیدھی میرے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر لگی اور انگوٹھا اُڑ کر وہ جا پڑا۔ میری والدہ قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُس نے دیکھ لیا۔ وہ فوراً اُٹھی میرے انگوٹھے کا ٹکڑا اُٹھایا اور اُسی کٹی ہوئی جگہ پر اُسے رکھ کر دبا دیا اور مجھے بھاگ کر ڈسپنسری میں لے گئی اِس عمل میں کوئی دو تین منٹ بھی نہ لگے ہوں گے۔ ہمیں اِس طرح حواس باختہ ڈسپنسری میں داخل ہوتے دیکھ کر ڈسپنسری کا ایک چوکیدار فوراً اُٹھا اور ہمیں چھوٹے سے آپریشن تھیٹر میں لے گیا۔ اُس نے جلدی سے اُسی انگوٹھے کو جو میری والدہ کٹی ہوئی جگہ پر دبائے کھڑی تھی ایک دھاگے سے وہیں سی دیا۔ درد سے میری چیخیں نکل رہی تھیں مگر وہ گوشت کو بے دردی سے سی رہا تھا۔ اتنے میں وہاں ڈسپنسر بھاگ کر آ گیا۔ اُس نے میرے بازو پر درد کا انجیکشن لگا دیا۔ لیجیے تھوڑی دیر میں پٹی بھی ہو گئی۔ پھر مَیں خود ہی روز وہاں سے انجیکشن لگوا لیتا تھا اور درد کی گولیاں کھا لیتا تھا۔ حتیٰ کہ تین چار دن میں اچھا بھلا ہو گیا۔ انگوٹھا عین اپنی جگہ پر جڑ گیا۔ آج کل اسی انگوٹھے کی مدد سے سب کچھ لکھتا ہوں۔ ہلکا سا نشان ابھی موجود ہے۔ یعنی ایک چھوٹی سی ڈسپنسری نے میرے ہاتھ کی عزت رکھ لی ورنہ شہر جاتے جاتے شاید انگوٹھے کا کٹا ہوا ٹکڑا مردہ ہو جاتا اور مَیں اپاہج ہو جاتا۔

دوسرا ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ میری والدہ کو ادرک کھانے کا بہت شوق تھا۔ سالن میں بھی انھے واہ ڈالتیں اور بعض اوقات اکیلی ادرک ہی پکا کر کھا جاتیں۔ اس سے اُن کے معدے میں شدید گرمی اور گیس پیدا ہو جاتی۔ والد صاحب عراق میں تھے۔ گیس کی وجہ سے اُن کی سانس بند ہو جاتی اور مرنے کے قریب ہو جاتیں۔ ہم اُنھیں بڑے بڑے ہسپتالوں میں لے گئے۔ لاہور تک پھرے مگر بیماری نہ جاتی تھی۔ بہت پیسے اجاڑ دیے۔ ایک دن تھک ہار کر اُسی ڈسپنسری کے

ڈاکٹر اختر نے ایک چھوٹی سی شیشی شربت کی دی۔ مشکل سے دو روپے کی تھی اور ساتھ اُس نے کہا، کوئی گرمی پیدا کرنے والی شے نہیں کھانی۔ لیجیے میری والدہ چند دن میں ٹھیک ہو گئیں۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کے ٹیسٹ اور دوائیوں اور بڑے ہسپتالوں کی بجائے ایک ڈسپنسری نے دو روپے میں سب ٹھیک کر دیا۔ بخُدا اگر گورنمنٹ ہر گاؤں میں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری بنا دے تو لاکھوں مریض سرے سے پیدا ہی نہ ہوں۔

باب پنجم

دادی اماں فاطمہ چلی گئی

میری عمر کا تیرھواں سال تھا۔ دادی اماں فاطمہ کچھ عرصے سے نماز کے مصلیٰ پر زیادہ رہنے لگی۔ اُس کی عمر پچاسی برس کی ہو چلی تھی۔ اِن دِنوں وہ سب سے زیادہ اپنے مرحوم بیٹے رفیق عرف فرشتہ کو بہت یاد کرتی تھی، اُسی کے لیے دعائیں مانگتی تھی۔ ہندوستان میں اپنے گھر کو بہت یاد کرتی تھی۔ مَیں چونکہ اب بھی جہاں مرضی پھرتا اور کھیلتا کودتا رہتا مگر عشا کے ہوتے ہی اپنی دادی اماں کے بستر میں گھس جاتا تھا۔ کئی بار الگ چارپائی پر سونے کی کوشش بھی کی مگر نیند ہی نہ آتی تھی۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ میری والدہ اور دادی آپس میں کسی بات پر جھگڑا کرتیں تو اُس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ والدہ حکم دیتی، آج اپنی دادی کی گود میں نہیں سونا لیکن جب آدھی رات تک نیند نہ آتی تو مَیں چپکے سے چارپائی سے اُٹھتا اور دادی کی رضائی میں گھس جاتا، تب ایک لمحے میں نیند کی آغوش میں چلا جاتا لیکن اِن دِنوں مجھ پر ایک خوف سا طاری رہنے لگا، مجھے محسوس ہونے لگا کہ دادی اماں جس کثرت سے قبر کو اور اپنے بچھڑنے والوں کو یاد کرنے لگی ہے، چند دن میں یہ بھی اُنھی کے پاس چلی جائے گی۔ اماں کی یہ حالت سارے گھر والے سمجھ رہے تھے۔ لہٰذا ہم نے اپنے والد کو عراق

میں خط لکھ دیا کہ اماں دادی کی حالت میں کچھ اضطراب ہے۔ کچھ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ والد صاحب نے وہاں سے جلد اپنی فلائٹ کروائی اور ہمارے خط لکھنے کے ایک ماہ بعد ہی چھٹی لے کر گھر آ گئے۔ اُنھیں دیکھ کر دادی اماں نہال ہو گئی۔ سارے گھر میں ایک بار پھر خوشیاں دوڑ گئیں۔ والد صاحب آتے ہوئے عراق سے کم از کم پچاس ہزار روپے کا سامان لائے تھے۔ پورے خاندان کے لیے تحفے، بھائیوں کے لیے، بہنوں کے لیے۔ مہنگے ترین کپڑوں کے تھان۔ کچھ سونا اور بہت سے ڈالر، جنھیں کچھ دِنوں بعد چینج کروا لیا گیا۔ والد صاحب دو مہینوں کی چھٹی لے کر آئے تھے۔ ایک ماہ گزر گیا اور ایسے لگنے لگا تھا کہ اماں دادی اب بالکل ٹھیک ہے لیکن ایک مہینے بعد وہ پھر بوجھل ہونے لگی۔ بظاہر اُس کی صحت ٹھیک ٹھاک نظر آتی تھی مگر ایک ہولناک خموشی اُس میں در آئی تھی۔

اب پھر آلِ محمد ﷺ کا ذکر خاص کر بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا کا ورد اُس کی زبان کا وظیفہ بن چکا تھا۔ میرا ایک چچا رفیق سے چھوٹا تھا اور محمد نذیر اُس کا نام تھا۔ مَیں نے اُس پر ایک افسانہ بھی لکھا ہے۔ وہ ایک شاعر، داستان گو اور بنجارہ نکلا۔ شادی بھی اُس نے نہیں کی۔ اپنی موج کا بندہ تھا۔ چائے کا رسیا تھا۔ اگر کبھی بیمار ہوتا یا بخار میں مبتلا ہوتا تو ڈاکٹر کے پاس نہ جاتا۔ اردگرد کے پچاس میل میں اُس کے بے شمار دوست اور ان گنت ٹھکانے تھے۔ اکثر گاؤں سے باہر ہی رہتا اور چھ چھ ماہ واپس نہ آتا تھا۔ نہ اُس کے ٹھکانے کا پتا چلتا۔ دادی ایک بار صبح اٹھتے ہی اُسے یاد کرنے لگی اور بہت بے چین تھی۔ بار بار کہتی، نذیر گھر میں نہیں ہے؟ کاش آج کہیں سے آ جائے۔ اکبر پتر اُسے کہیں سے ڈھونڈ لاؤ۔ اب مَیں کہاں سے لاتا۔ مَیں بھی دادی اماں کی اُداسی دیکھ کر اُداس ہو گیا اور اُسے دلاسا دینے لگا۔ اماں فکر نہ کرو وہ جلد آ جائے گا۔ کہنے لگی پتر اُس کے جلد آنے تک مَیں نہ رہی تو کیا فائدہ۔ اُس کی بے چینی دیکھ کر تمام گھر پریشان ہو گیا۔ والد صاحب ہر وقت اُس کے پاس رہنے لگے۔ میرا چچا رشید رینالے میں تھا، شام تک وہ بھی آ گیا۔ چچا منیر بھی گھر ہی میں تھا لیکن نذیر کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اگلے دن صبح ہوئی تو دادی اماں سورج نکلنے تک مصلیٰ پر بیٹھی رہی۔ وہیں اُس نے چائے پی، کھانا کھایا۔ اُس کے بعد مجھے مخاطب کیا، اکبر پتر یہیں مصلیٰ کے پاس میری

چارپائی لے آ۔ مَیں نے جلدی سے اُس کی چارپائی وہاں بچھادی اور اُسے مصلّٰی سے اُٹھا کر چارپائی پر بٹھادیا۔

وہ چند لمحے چارپائی پر بیٹھی، پھر بولی اچھا ئی نذیر محمدا، ہُن میری قبر تے ای تینوں ویکھاں گی (یعنی خُدا حافظ نذیر محمد اب تم میری قبر پر ہی مجھے ملنے آنا)۔ ابھی وہ یہ جملے کہہ ہی رہی تھی کہ سامنے کے دروازے سے چچا نذیر گھر میں داخل ہو گیا۔ مَیں نے جلدی سے اماں سے کہا، اماں چاچا نذیر آ گیا۔ یہ سنتے ہی وہ دوبارہ چارپائی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تمام گھر پھر جمع ہو گیا۔ چاچا نذیر اماں کے گلے لگا۔ وہ اُس کا منہ سر چومنے لگی اور کہنے لگی۔ پتر نذیر میری اِک گل اج من لے۔ آیندہ ٹوں گھروں باہر نا جائیں۔ یعنی آیندہ گھر سے باہر نہ جانا۔ چاچا نذیر نے جواب دیا، بے بے اب نہیں جاتا، میرا وعدہ۔ اب اماں کی چارپائی کے گرد اُس کے چاروں بیٹے، اور پوتے پوتیاں سب جمع تھے۔ اِسی اثنا میں اُس نے کہا کلمہ پڑھو اور ابھی ہم کلمہ پڑھنے ہی لگے تھے کہ اماں فوت ہو گئی۔ یہ دن مجھ پر سخت بھاری تھے لیکن اُس کے بعد چاچا نذیر نے اماں سے کیا ہوا وعدہ نبھایا کہ کبھی وہ گاؤں سے باہر پھر رات نہیں رُکا۔ اگر گاؤں سے باہر اُسے جانا بھی پڑتا تو رات سے پہلے گھر لوٹ آتا تھا۔

لُٹ گئی گھر کی متاعِ درہم و دینار ختم

دادی کی وفات پر گھر میں ایک ویرانی کا سا سماں تھا۔ کمرے خالی، صحن خالی، دل خالی اور فضائے عالم سوگواری تھی۔ پھر یہ ہوا ایک مہینے بعد والد صاحب بھی واپس عراق چلے گئے۔ اُن کے عراق چلے جانے کے بعد ہمارا گھر دو حصوں میں بٹ گیا۔ ہمارے چچا منیر نے درمیان سے دیوار کھینچ کر اپنا گھر الگ کر لیا اور چچا رشید نے اپنا گھر الگ کر لیا۔ اب ہمارے پاس ایک کنال کا گھر رہ گیا جہاں بابا صدرالدین، اُس کی بیوی اماں حلیمہ میری والدہ اور ہم بہن بھائی رہتے تھے۔ ہمارے مکان کی پچھلی طرف ایک خالی احاطہ اُستاد فضل حسین کا تھا۔ جس کی چاردیواری کی ہوئی تھی۔ مکان ہمارے کچے تھے۔ والد صاحب کو عراق گئے کئی ماہ گزر چکے تھے۔ گرمیوں کے دن

تھے ہم نے پنکھے چلائے ہوئے تھے اور گہری نیند سب گھر کے صحن میں سوئے ہوئے تھے۔ رات کو چوروں نے مکان میں سیندھ لگائی اور جو کچھ دونوں کمروں میں موجود تھا، سب لے گئے۔ حتیٰ کہ ہمارے پہننے کے کپڑے بھی لے گئے۔ ہمیں تب خبر ہوئی جب صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ یہ اُس وقت کوئی پچاس ہزار کا سامان تھا۔ سونا بھی تھا، پیسے بھی تھے۔ بعد میں ہر چیز عیاں ہو گئی کہ چوری جھلیوں نے کی ہے۔ اس چوری کی واردات کے کچھ عرصہ بعد والد صاحب واپس آ گئے۔ جب مَیں نویں کلاس میں ہو چکا تھا۔ اُنھوں نے واپس آ کر تمام خبر چلا لی اور دل میں ٹھان لی کہ اب اپنے معاشی حالات کو کسی زیادہ جد و جہد کے ساتھ ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اپنی مسلسل محنت لیکن اُس کے نتیجے میں قدرتی آفات اور معاشرے کی بدنیتی کی وجہ سے غربت اور افلاس کے بدستور قائم رہنے کے سبب ایک طرح سے مایوس ہو گئے۔ اُنھوں نے تہیہ کر لیا کہ اب نہ ملک سے باہر جائیں گے، نہ کچھ زیادہ کمانے کی طرف راغب ہوں گے۔ یہیں پر جو روکھی سوکھی ہو گی، کھا لیا کریں گے۔ کیونکہ چوروں کا پتا چل جانے کے بعد بھی ہمارے ہاتھ کچھ نہ آیا بلکہ جھلی فیملی مزید ہمارے خلاف ہو گئی۔ اُن کے دل میں ہمارے خلاف ایک حسد اور کینہ بھر گیا۔ جسے بعد میں ہر وقت اُنھوں نے استعمال کیا۔ اگر موقع ملا تو یہ بھی لکھوں گا۔

اب والد صاحب ارد گرد کے گاؤں کی مسجدیں بنانے لگے۔ مَیں مسلسل سکول جاتا تھا اور ادبی کتابیں پڑھتا تھا۔ میرا کتابیں پڑھنے کا معیار بھی ذرا بہتر ہو گیا تھا۔ یعنی میر و غالب و انیس جیسے شاعر اور رتن ناتھ سرشار، مولوی آزاد اور فرحت اللہ بیگ جیسے نثر لکھنے والوں کو پڑھنے لگا۔ شعر و ادب سے بہت زیادہ دلچسپی ہو گئی۔ اِسی کے ساتھ مَیں کھیل کود کو چھوڑ کر کھیتوں کھلیانوں اور ندی نالوں اور پرندوں میں مگن ہو گیا۔ یہ تمام باتیں مجھے اُستاد فضل حسین اور اپنے والد صاحب، چچا نذیر، چچا منیر کے سبب میسر آئیں۔ والد صاحب اور دونوں چچا شاعری کا بہت ذوق رکھتے تھے۔ تمام پنجابی شاعروں کا کلام اُنھیں یاد تھا۔ چچا نذیر خود ہی شعر میں داستانیں بنا بنا کر سناتے تھے اگرچہ اُن کی شاعری ادب کے اُس معیار کی نہیں تھی مگر اُس میں قصے کہانیاں بہت تھے۔ دوسروں کی شاعری جیسے بابو رجب علی کی کوشریاں بہت عمدہ پڑھتے تھے۔ اِسی طرح قصہ جانی چور،

داﺅد بادشاہ کا قصہ، ڈھول باتشاہ کا قصہ، ریل گاڑی کا قصہ، یعنی بیسیوں شاعری کی چھوٹی چھوٹی گویا پنجابی مثنویاں اُنھیں یاد تھیں۔ اِن سب کے ساتھ مَیں اب شہر میں محرم کی مجالس اور محرم کے جلوسوں میں بھی حصہ لینے لگا۔ یہاں بھی مجھے شاعری کا شدید ذوق پیدا ہوا۔ میرا خیال ہے اہلِ سنت کے بچّوں کو بھی اپنی ادبی تربیت کے لیے مجالس میں شرکت کرنا چاہیے۔ یہ بہت مفید ثابت ہوگی۔

علاوہ ازیں اپنے کسی نہ کسی دوست کے ساتھ سائیکل پر شہر گھومنے نکل جاتا۔ اُس وقت شہر میں ٹریفک بالکل نہ تھا۔ کاریں وغیرہ نہیں ہوتی تھیں۔ موٹر سائیکلیں بھی ناپید تھیں۔ شہر کے بازاروں اور سڑکوں پر لوگوں کی آمد وشُد ورفت فقط پیدل ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ تانگہ کی سواری ہوتی تھی۔ تب شاپر اور پلاسٹک بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے سڑکوں پر نہ ہجوم تھا، نہ گندگی ہوتی تھی۔ شہر گھومنے میں گھومنے کا بہت مزہ آتا تھا۔ اِسی شہر گردی کا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں بہت مزے کا تھا۔

ہیرامنڈی کا کوچہ اور ہماری دُرگت

اسلم ڈوگر عرف ماکھی میرا دوست بہت جی دار تھا، مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹا تھا مگر تیز بہت تھا۔ سائیکلیں چلانے کا شوق تب غریب گھروں کے لونڈوں کو بہت ہوتا تھا اور سائیکل کرائے پر ایک گھنٹے کے آٹھ آنے کے حساب سے مل جاتی تھی۔

دو تین گھنٹے کے لیے پکڑ لیتے اور شہر چل نکلتے۔ سائیکل چلاتے ہوئے دیپالپور چوک سے سیدھا ٹِبا پار کرنے کی بجائے ہیرامنڈی میں آتے اور دو چار گلیوں کا چکّر کاٹتے۔ یہاں کا مرکزی بازار بہت کھلا تھا۔ نیم کے درختوں کے سائے اونچے بہت تھے۔ بازار میں چھاؤں گھنی تھی۔ منڈی کی عورتیں اپنی چار پائیاں نکال کر بازار میں بیٹھی ہوتیں، تب یہاں ٹریفک بالکل نہ ہوتی تھی۔ البتہ اِکا دُکا ریڑھی اور پھیری والے گزرتے تھے۔

لوگوں کے پاس زیادہ سے زیادہ سائیکل کی سواری ہوتی، اکثریت پیدل چلتی تھی یا پھر

تانگے پر ہوتی اور تانگہ اِس بازار میں کیا لینے آتا؟ ہم پہلے اِس کے مرکزی بازار سے گزرتے ہوئے سائیکل سے اُتر جاتے جیسے کوئی محترم جگہ سے نکلنے کے لیے یا مسجد کے احترام میں نمازی جوتے اتارتے ہیں، ہم ہیرامنڈی کے احترام میں سائیکل پکڑے پیدل چلنا شروع کر دیتے۔ بازار میں بیٹھی ہوئی عورتیں ہمیں نہ تو کوئی اشارہ کرتیں، نہ جملہ کستیں۔ شاید اُنھیں معلوم تھا ان کی جیبوں میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔

ہم طوائفوں کی رونقیں دیکھ کر محلے سے نکلتے پھر سوار ہو جاتے۔ پھاٹک نمبر دو سے ہوتے ہوئے سبزہ زار کے کنارے، سرور سوڈا چوک سے ایک ایک سوڈے کی بوتل پیتے۔ یہ تب چار آنے کی ہوتی تھی۔ مقامی پانی تھا اور بہت عمدہ۔ ہماری نظر میں سوڈے کا مطلب تب یہی بوتل ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سرور سوڈا چوک کو پیچھے چھوڑ کر بارنیاں والا روڈ پر آتے، ایک روپے کا ایک کلوجا پانی پھل خریدتے۔ اُسے کھاتے ہوئے، شہر کی گلیاں کاچھتے ہوئے ٹھنڈی سڑک پر جا نکلتے۔ ٹھنڈی سڑک کے سامنے کمپنی باغ تھا۔ اِس میں بچوں کی ایک ریل چلتی تھی۔ اُسی پر سوار ہو کر دوسرے گیٹ پر اتر جاتے اور وہیں سے باہر نکل جاتے اور اُسی رستے شام تک گاؤں آ جاتے۔ رستے میں کسی نہ کسی اپنے سے چھوٹے لڑکے یا کمزور آدمی کے بیچ سائیکل مار دیتے۔ جب وہ ہماری طرف گھورتا تو نیچے اُتر کر اُسے دو چار دھولیں جما دیا کرتے۔ یہ ہمارا معمول تھا۔ ہیرامنڈی کے محلے میں ہم کرتے کراتے کچھ نہیں تھے۔ نہ ہمارے پاس اِس عیاشی کی گنجائش تھی، لیکن محلے میں شغل ہم خوب دیکھتے۔ اِدھر اُدھر کے راہ گیروں کے بیچ سائیکل کا پہیہ مار کر پھر اُنھیں دھولیں جما کر ہمارے حوصلے کافی بڑھ چکے تھے۔

ایک دن ہم ہیرامنڈی کے محلے سے گزر رہے تھے۔ ایک آدمی بڑے ڈیل ڈول کا، جسے ہم کبھی کبھار محلے کے چوک میں بیٹھا دیکھتے تھے اور اُسے دلال سمجھ کر تحقیر کی نظر ڈالتے ہوئے جاتے تھے، وہ اچانک ایک گلی سے نکل کر ہماری سائیکل کے آگے آ گیا اور سائیکل اُس میں جا لگی۔ ہم دونوں نیچے گر گئے جب اُٹھے تو اُس نے کہا، 'کیا اندھے ہو؟ یہ محلے کی گلیاں ہیں یا ایئرپورٹ؟ سائیکل دیکھ کر نہیں چلائی جاتی؟

ہم نے اگرچہ اُس کے ڈیل ڈول کی مناسبت سے سائیکل جان بوجھ کر نہیں ماری تھی مگر سابقہ دلیری کے سبب ہمارا خون جوش مار گیا، پھر کہیں یہ بھی سن رکھا تھا کنجروں کی غیرت ویرت نہیں ہوتی۔ چناچہ ہم نے اُس کے بھی گریبان میں ہاتھ دے دیا۔ اُس اللّٰہ کے بندے نے اور تو ہمیں کچھ نہیں کہا، دونوں کی گردنیں، ایک کی دائیں ہاتھ سے دوسرے کی بائیں ہاتھ سے پکڑ کر زمین سے ڈیڑھ فٹ اُونچا اُٹھا لیا۔ اب اُس سے لڑنا تو کیا تھا، ہمارے پاؤں ہی زمین پر نہیں تھے۔ فقط پھانسی کی طرح جھول رہے تھے۔ اس پینگ کو ایک منٹ گزر گیا، جب چھوڑا تو دھپ سے زمین پر آ گرے۔ ہماری ساری اکڑ ہوا ہو گئی۔ اس کے بعد اُس نے ہم دونوں کو کان سے پکڑا اور کھینچتا ہوا ہیرا منڈی کے بڑے چوک میں لے آیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا امام باڑہ بھی بنا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک پیپل کا درخت تھا۔ اُس کے نیچے ایک ٹوٹی پھوٹی چار پائی پڑی تھی۔ ہمیں اُس پر بٹھا دیا اور سائیکل ہماری اپنے قبضے میں کر لی اور بولا، 'اگر یہاں سے ذرا بھی ہلے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ سالو، تمھیں روزانہ یہاں دیکھتا ہوں۔ تماشے کرتے گزرتے ہو، اب تم یہیں ہمارے نوکر بن کے رہو گے۔ اس کے بعد اُس نے بازار میں بیٹھی ہوئی تمام عورتوں کو مخاطب کیا، 'یہ لونڈے دونوں آپ کے خدمت گار ہیں، پان سگریٹ، پانی یا کسی بھی قسم کی کوئی ضرورت ہو تو انہی سے منگوایا کرو، آج سے اسی محلے کی چاکری کریں گے۔'

اُس کے اس اعلان سے ہمارے اوسان جاتے رہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کیا کریں۔ کوئی فون وون ہوتا نہیں تھا کہ گھر والوں کو خبر کرتے۔ ہم اُس کی منتیں کرنے لگے اور روہانسے سے منہ بنا کر رونا دھونا شروع کر دیا اور کہا، 'اب چھوڑ دو آئندہ یہاں سے نہیں گزریں گے۔'

وہ بولا، 'بیٹا گزرنے کا کیا مطلب؟ اب تم یہیں رہو گے۔ یہ سب جتنے محلے میں رہتے ہیں، یہ کوئی سب یہاں کے تھوڑی ہیں؟ ایسے ہی اِدھر اُدھر سے آئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے رشتے دار نہیں ہیں، مگر جب یہاں آئے تو پھر یہیں بس گئے ہیں۔ پہلے پہل انھیں بھی یہاں بسنا اور رہنا بُرا اور عجیب لگتا تھا۔ پھر ان کا دل لگ گیا اور اب یہ خود یہاں سے نہیں جاتے۔ تم بھی دو چار روز یہاں رُکو گے تو دل لگ جائے گا۔ ان عورتوں میں سے کسی نہ کسی سے تمھاری

شادی کر دیں گے۔ پھر یہ تمھیں کما کر کھلائیں گی اور تم اِن کی خدمت تواضع کرنا اور بس موج ہی موج۔

اُس کی یہ باتیں سن کر ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل ہی گئی اور دل دہلنے لگا کہ یہ شخص تو سچ مچ میں سنجیدہ ہو گیا ہے۔ مَیں نے چارپائی سے اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ ایک دم بپھر گیا اور میری گردن کو سختی سے پکڑ کر جھٹکے سے وہیں بٹھا دیا۔ بولا، 'اب اٹھے تو یہ گردن ہی توڑ دوں گا۔ ماکھی سر نیچے کیے رونے لگا اور مَیں بازار میں بیٹھی عورتوں کی طرف ٹر ٹر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی اللہ کی بندی ہماری جان چھڑا دے مگر وہ قہقہے لگا کر ہم پر ہنس رہی تھیں۔ ایک کالی سیاہ طوائف آگے بڑھی اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی، 'شادے مَیں تو اِس سے شادی کروں گی، یہ چٹا گورا منڈا مجھے اچھا رہے گا۔ بچّے گورے گورے پیدا ہوں گے۔'

شادے نے کہا، 'بس ٹھیک ہے، آج رات اِسے یہاں رکھو، شگن وگن پورے کرو۔ کل ہی ہم تیرا اِس سے نکاح پڑھ دیں گے۔'

اب میری حالت کچھ نہ پوچھیے، پسینے پر پسینہ آ رہا تھا حالانکہ سردی کے دن تھے۔ اس عمل کو ایک گھنٹہ گزر گیا۔ محلے والے ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے، وہاں بچوں بڑوں کا ایک مجمع لگ گیا۔ دس پندرہ عورتیں گھروں سے بھی نکل آئیں۔ کوئی گال پر چٹکی لینے لگی اور کوئی کان کھینچنے لگی۔ ایک لڑکا ہماری سائیکل پکڑ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس آدمی نے اُسے کہا، لے جا بوا۔ سائیکل پر محلے کا چکّر کاٹ کے آ۔ اِسے ہم حق مہر میں رکھ لیں گے۔ وہ لڑکا سائیکل لے کر ایک طرف نکل گیا۔ ہمیں فکر ہوئی کہ لیجیے سائیکل بھی گئی۔ پھر تو مَیں بھی واقعی رونے لگا اور گڑگڑا کر اُس سے معافیاں مانگنے لگا۔ عورتیں اور لڑکے ہنس رہے تھے اور تالیاں بجاتے تھے۔

میرا رونا اور گڑگڑاہٹ دیکھ کر اتنے میں ایک عورت آگے بڑھی اور بولی، 'وے کاکا تیرا نام کیا ہے؟

مَیں نے کہا:

'علی اکبر'

وہ میرا نام سن کر ایک دم جھٹکے سے پیچھے ہٹی، پھر بولی، 'مولا کا مانی ہے؟'

میں نے چوک والے امام باڑے کی طرف اشارہ کر کے کہا، 'جی ہاں مجھے اِس امام باڑے کی قسم میں مولا کا ماننے والا ہوں۔ ایوانِ حسین میں مجلس بھی سنتا ہوں۔ جلوس میں بھی جاتا ہوں۔

خود بھی مجلس کرواتے ہو؟

نہیں ہم گاؤں میں رہتے ہیں وہاں ہمارا ایک ہی گھر ہے۔ محرم میں ہمیں شہر میں آ جاتے ہیں۔

اب وہ طوائف آگے بڑھی اور شادھے سے بولی، 'چھوڑ دے شادھے، اِنھیں چھوڑ دے، پاکاں دے مانی نیں (یعنی پاکوں کو ماننے والے ہیں) بے چارے بچّے ہیں۔ آگے غلطی نہیں کریں گے میری ذمّے داری پر چھوڑ دے۔'

تب اُس نے ہم پر رحم کی نظر کی اور بولا، 'جاؤ اب اگر یہاں کا رُخ کیا تو نہیں چھوڑوں گا۔'

مَیں نے کہا، لیکن وہ سائیکل کے بغیر ہم کیسے جائیں گے، وہ ہم کرائے پر لے کر آئے ہیں۔

اُس نے ایک لڑکا بھیجا کہ جلدی سے اُسے لے کر آ جو سائیکل لے گیا ہے۔ اتنے میں ایک عورت چائے لے آئی۔ جسے ماکھی نے تو نہیں پیا لیکن مَیں پی گیا۔ اتنے میں لڑکا سائیکل لے کر آ گیا۔ اب شادھے نے سائیکل لے کر جانے والے کو گردن سے دبوچ لیا۔ کیوں بے تیرے ابے کی سائیکل تھی جسے بھگا کر لے گیا تھا۔ پھر ہم نے اپنی سائیکل اٹھائی اور گاؤں آ گئے۔ اُس گلی دوبارہ نہیں گھسے، نہ اپنے سے طاقت ور کو آج تک دھول جمائی۔

ایک بار پھر یوں ہوا کہ پانچ یا چھ سال بعد جب میں اوکاڑہ کے مرکزی امام بارگاہ ایوانِ حسین میں باقاعدگی سے جمعہ پڑھنے لگا اور مجلس ماتم کرنے لگا تو میری اسی شادھے سے دوبارہ ملاقات ہوگئی۔ میں نے دیکھا، وہ ہر وقت اور ہر حال میں عزاداری میں مشغول رہتا تھا، چاہے دن محرم کے ہوں یا سال کے کوئی اور دن ہی کیوں نہ ہوں۔ تب وہ میرا دوست بن گیا، پھر ہم اُس واقعے کو یاد کر کے ہنستے تھے۔ دو تین سال کی بات ہے، وہ فوت ہو چکا ہے۔ عجب آزاد مرد تھا۔ میری افسانے کی کتاب ''شاہ محمد کا تانگہ'' میں ایک افسانہ ''زیارت کیا کمرہ'' اُسی پر ہے۔

میرا ہائی سکول

ہائی سکول کی تعلیم کے بارے میں بس اتنا عرض ہے کہ یہ کوئی تعلیم نہیں تھی۔ سکول تو وہی تھا جہاں سے پرائمری اور مڈل پاس کیا تھا مگر یوں سمجھ لیں کہ پڑھنے کے نام پر دھوکا تھا۔ سکول کا رقبہ 80 کنال تھا۔ جب مَیں پرائمری جماعت میں داخل ہوا تھا تو اس میں ہزاروں درخت تھے خوب صورت روشیں تھیں۔ گھاس کے میدان تھے، جن کے ارد گرد مختلف پھولوں کی باڑیں تھیں۔ بیسیوں نالے تھے۔ اُن میں نہر کا پانی چلتا تھا، وہ پانی گھاس کے میدانوں، درختوں اور پھولوں کو لگتا تھا۔ اِن درختوں پر ہزاروں پرندے چہچہے مارتے تھے اور شاخوں پر اڈاریاں بھرتے تھے لیکن اب ان اساتذہ کی برکت سے یہ تمام چیزیں ایک ایک کر کے ختم ہو رہی تھیں۔ اُستاد مل کر درخت کاٹ رہے تھے۔ یہ اونے پونے داموں میں بیچ کر اُن کی چائے اور سموسے کھاتے تھے۔ ستم یہ ہوا کہ ایک ہیڈ ماسٹر ایسا آ گیا جس کا شہر میں ایک لکڑی کا آرا تھا۔ اُس نے ٹاہلیوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا اور سیکڑوں سال پُرانی ٹاہلیاں کاٹ کاٹ کر اُن کے فرنیچر بنانے لگا۔

دوسرے بچّوں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے یہ احساس تھا کہ فطرت کے ساتھ اور خود ہمارے ساتھ سخت ظلم ہو رہا ہے اور ہماری کم سنی کے زمانے کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ کم از کم مَیں پچھلے تین چار سال سے سلیبس سے باہر یعنی ایسی کتابیں پڑھنے میں لگ گیا تھا جو ہمارے سکول کے سلیبس سے کہیں دلچسپ اور بارآور تھیں۔ اُن کتابوں نے میرے اندر گہرا احساس پیدا کر دیا تھا۔ مَیں ہر شے کے بارے میں جمالیات کے ساتھ سوچنے لگا تھا۔ فطرت سے بے تحاشا لگاؤ ہو گیا۔ مَیں دل ہی دل میں اِن اُستادوں کو گالیاں دینے لگا۔

لائبریری کی چوری

چلتے ہوئے ایک بات بتا دوں کہ ہمارے سکول میں چھوٹی سی ایک لائبریری تھی۔ وہ جس کمرے میں تھی وہاں صفیں بچھی ہوتی تھیں۔ استاد اُنھی صفوں پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے اور سموسے

کھاتے تھے۔ کتابوں کی الماریاں گرد و غبار سے اَٹی پڑی تھیں۔ اگرچہ اُن الماریوں کو تالے نہیں لگے تھے لیکن اُن کی حالت بتاتی تھی کہ انھیں انسان تو کیا کسی جن بھوت نے بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ سکول کے اُستاد بھی اپنے اور بچّوں کے لیے اِس مال کو ممنوعہ سمجھتے تھے۔ یعنی نہ کبھی خود پڑھتے اور بچوں کو وہاں سے کتاب دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک دو بار مَیں نے کتاب مانگی لیکن منہ کی کھائی بلکہ ایک بار تو گویا طوفان برپا ہو گیا۔ ماسٹر حبیب کہنے لگے، کیا تو اِس گمراہی کے ملبے کو پڑھے گا؟ ایک تو پہلے ہی تمھارا عقیدہ ٹھیک نہیں ہے، اوپر سے یہ کتابیں پڑھے گا جن میں اللہ جانے کیا اول فول لکھا ہوا ہے۔ اب مَیں نے ایک طریقہ نکالا، دن کے وقت کسی طرح آنکھ بچا کر داخل ہو جاتا اور اُس لائبریری کے کمرے کی کھڑکی کی کُنڈی کھول دیتا۔ سکول چونکہ ہمارے گھر کے ساتھ ہی تھا۔ چنانچہ رات کے وقت آتا، اُسی کھڑکی کے ذریعے لائبریری میں داخل ہوتا اور رات کے اندھیرے میں جو کچھ ہاتھ لگتا آٹھ دس کتابیں بغل میں مار کے لے جاتا۔ جب وہ پڑھ لیتا تو دوبارہ یہی کارروائی کرتا چنانچہ اِدھر مَیں میٹرک سے پاس ہوا، اُدھر تمام لائبریری سکول سے نکل کر میرے گھر منتقل ہو چکی تھی لیکن مجال ہے کسی اُستاد کو خبر ہوئی ہو کہ ایک لڑکا عین اُن کی ناک کے نیچے گمراہ ہو چکا ہے۔ اِن میں بڑی کام کی کتابیں تھیں، یعنی ابنِ خلدون، طبری، ابنِ ہشام، ادبی کتابوں میں الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، غرض کس کس کتاب کا نام لوں، سیکڑوں عمدہ اور ادبی کتابیں تھیں۔ یہی کتابیں تھیں جنھوں نے میری زندگی مالا مال کر دی۔

میرا خیال ہے مَیں کچھ تعارف اپنے اِن نابغہ اُستادوں کا بھی کرا دوں جو کتاب اور علم کے خلاف جنگ کے ہراول دستے میں شامل تھے اور ابھی تک اِنھی جیسے اُستاد ہماری نسلوں پر مسلّط ہیں یاد رہے ایک دو اُستاد اچھے بھی تھے، پہلے اُن کا ذکر ہو جائے۔

ماسٹر شریف حسین

اِن صاحب نے ہمیں چھٹی سے آٹھویں تک ریاضی پڑھائی اور خوب پڑھائی۔ قریب کے ایک گاؤں 31 ٹو ایل سے آتے تھے۔ شریف آدمی تھے۔ کلاس میں کسی مذہب کی تبلیغ نہیں

کی، سوائے ریاضی کے اور وہ بھی ہمیں آ کے نہ دی۔ ایک دن میں تین سے زیادہ ڈنڈے نہیں مارتے تھے اور پیٹھ کی بجائے ہاتھوں پر مارتے تھے۔ اِن سے ڈنڈے کھانے کے بعد ہم ریاضی میں کم از کم ایک دن کے لیے بے خطر ہو جاتے تھے۔ سائیکل پر آتے تھے اور اُسے بہت چمکاتے تھے۔ سکول کی حدود میں کبھی سائیکل پر نہ چڑھتے، گیٹ پر آ کر سوار ہو جاتے، پھر اُسے ایف سولہ بناتے۔ آپ کھلی ڈھلی شلوار قمیص پہنتے تھے۔ شلوار کے پائنچے پٹھانوں اور افغانیوں کی مانند چوڑے ہوتے اور ٹخنوں سے اُوپر ہوتے۔ پاؤں میں بند جوتے ہوتے تھے اور قائداعظم کے جوتوں کی طرح خوب چمکے ہوئے۔ پڑھاتے وقت اُردو بولتے تھے مگر وہ پنجابی معلوم ہوتی تھی۔ ہم اِن کی اُردو اکثر نقل کرنے کی کوشش کرتے اور ایک دوسرے سے شرط باندھ کر بولتے مگر نہ بول سکتے۔ ماسٹر شریف حسین واحد اُستاد تھے جنھوں نے سکول کے بچّوں سے کبھی کچھ کام نہ لیا۔ سگریٹ وہ پیتے نہیں تھے۔ حقے کے دو چار گھونٹ لگاتے دیکھا۔ جسم قدرے بھاری تھا مگر ایسا کہ موٹاپے کا احساس نہ تھا۔ مذہب کے وہابی تھے مگر نہ داڑھی تھی، نہ نمازی تھے، نہ دوسروں کو نمازی بنانے کے چکروں میں تھے۔ اکثر اساتذہ سے الگ ہی ہو کر بیٹھتے اور خموش بیٹھتے۔ میرا خیال ہے اُن کی سیاسی اور سازشی چھوت چھات سے ڈرتے تھے۔ اِس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ غور خوض میں غرق رہتے تھے۔ کسی قسم کی علمی ادبی کتاب پڑھتے نہیں دیکھا۔ زمیندار تھے، بوائی کٹائی کی سوچوں میں ہوتے تھے۔ تعلیمی معاملات میں نئے قانون، قاعدے دریافت کرنے، یا طریقہ کار میں تبدیلی لانے جیسی بدعتوں سے بری تھے۔ چالیس سال ایک ہی سکول میں پڑھایا اور چھٹی سے آٹھویں تک پڑھایا اور صرف ریاضی پڑھائی اور ریٹائر ہو گئے۔ یہ پیغمبرانہ جہد گویا سابقہ انبیا کی شریعت نافذ کرتے ہی گزری۔ اپنی نبوت کا اعلان نہ کیا۔ یعنی کبھی کتاب وغیرہ اِن کے ہاتھ میں نہیں دیکھی۔ اِن کا ایک بیٹا بھی اُنھی دنوں سکول میں پڑھتا تھا۔ بیٹا اِن سے اور یہ بیٹے سے غالباً گریز کی حالت میں رہتے۔ آنے جانے کو سائیکلیں بھی الگ الگ تھیں۔ گھر میں شاید اکٹھے رہتے ہوں۔ بیٹا بھی اِنھی کی طرح شریف تھا۔ پچھلے دِنوں اِنھی کے گاؤں کے ایک فرد پر ہم نے چوری کا پرچہ کٹوا دیا، شریف حسین اُس کی سفارش لے کر آ گئے۔ تب مجھے پہلی بار اُن

کی عزت میں کسی بندے کو معاف کرنے کی خوشی ہوئی۔ اللہ سلامت رکھے، اِنھوں نے باوقار زندگی گزاری ہے۔

راؤ فرہاد علی

نویں اور دسویں جماعت کے دو سال فرہاد صاحب نے پڑھایا۔ اِن کی پہلی ہی جوائننگ ہمارے گاؤں 32 ٹو ایل کے ہائی سکول میں بطور ایس ایس ٹی ٹیچر ہوئی۔ سائنس کے چاروں مضمون، ریاضی، فزکس، بیالوجی اور کیمسٹری ہمیں پڑھاتے تھے۔ ہم اِدھر اُدھر کے گاؤں کے ساٹھ لڑکوں کی کلاس تھی اور سابقہ و موجودہ اساتذہ کی بے پناہ کوششوں کے طفیل سب نالائق تھے۔ جتنے ہم نالائق تھے اتنے ہی یہ صابر و شاکر تھے۔ چھڑی کبھی نہیں مارتے تھے، ہاں بعض اوقات زچ ہو کر ہماری ذہنی حالت پر دعا کرتے تھے۔ بہت بھلے آدمی تھے اور نمازی تھے اور اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ جب ہمیں پڑھاتے تھے تب داڑھی نہیں رکھتے تھے۔ ہمارے انگریزی اور اُردو کے اُستادوں سے بہت نالاں تھے۔ سکول کا اصل بیڑہ غرق بھی اُنہی دو استادوں نے کیا تھا۔

انگلش کے ٹیچر ماسٹر حبیب الرحمٰن جن کا ذکر ابھی آئے گا، وہ بہت لالچی آدمی تھے، ایک دفعہ اُنھوں نے ہمیں کہا اگر مجھ سے ٹیوشن نہیں پڑھو گے تو مَیں تمھیں کلاس میں بھی نہیں پڑھاؤں گا۔ اُستاد فرہاد صاحب نے ہمیں کہا، یہ نہ پڑھائے، مَیں تم لوگوں کو انگریزی بھی پڑھا دیا کروں گا۔ تمھاری اپنے گھر کی روٹی پوری نہیں ہوتی، اِسے ٹیوشن کہاں سے دو گے؟ اور پورے تین مہینے انگریزی بھی مفت پڑھاتے رہے۔ واللہ جتنا محنت اور دیانت سے اِنھوں نے کام کیا اپنے سکول دَور میں کسی اُستاد کو ایسے نہیں دیکھا۔ اگرچہ دیوبند گھرانے سے تعلق تھا مگر مولا علیؑ کے معاملے میں تفضیلی تھے۔ اُس کی دلیل میں مسلم شریف کی حدیث 'علی ہارونِ محمدؐ' کا حوالہ دیتے تھے۔ ہمارے گاؤں کے جنوب مغرب میں ایک گاؤں 34 ٹو ایل تھا، وہیں کے تھے۔ سائیکل پر سکول آتے تھے۔ کسی سٹوڈنٹ کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کرتے تھے۔ ہماری عمر سے پندرہ سال

بڑے ہوں گے۔ پچھلے دِنوں ہارٹ اٹیک میں فوت ہو گئے۔ اِن کی موت کا سن کر بہت دھچکا لگا۔ دل دغا دے گیا۔ یہ دل بُری بلا ہے، گاہے گاہے اِس کی خبر لیتے رہا کیجیے ورنہ ایک دن ایسا ڈوبتا ہے کہ پھر نہیں اُبھرتا اور لوگ تب آپ کی خبر پوچھتے ہیں یا اللہ مَیں گواہی دیتا ہوں، یہ اُستاد راؤ محمد فرہاد اچھا انسان تھا، حلال رزق کھاتا تھا۔ تُو بھی اپنی جنّت کے پاکیزہ رزق کو اِس پر کشادہ کر دے۔

ماسٹر حبیب الرحمٰن صاحب

ہمارے انگریزی کے اُستاد تھے۔ چھٹی سے نویں تک پڑھایا، بلکہ ڈرایا، دھمکایا۔ آتے ہی سکول کے آدھے درخت کٹوا کر ڈنڈے بنوائے، پھر ہم پر آزمائے۔ پاس کے گاؤں سے آتے تھے اور سائیکل پر آتے تھے۔ شلوار قمیص پہنتے تھے، لمبی داڑھی رکھتے تھے، پائنچے اور آستینیں برابر چڑھائے رکھتے۔ وہابی سخت ترین تھے۔ دوسرے وہابی اساتذہ سے بھی چنداں خوش نہیں تھے۔ بچّوں کے ساتھ ہمیشہ اِن کی سات اکاون رہی۔ اُن کے ساتھ مجرمین کا سا سلوک رکھتے تھے۔ کان پکڑا کر پیچھے سے یوں لات مارتے کہ بچّہ گولے کی طرح لڑھکتا چلا جاتا۔ جو لڑکا انھیں سگریٹ لا دیا کرتا اُسے معاف رکھتے، بلکہ کلاس کا مانیٹر بنا دیتے تھے۔ ایک بار ایک لڑکا جو کریمنل ذہن کا تھا، گولڈ لیف کے سگریٹ کی ڈبیا کے عوض مانیٹر بنا دیا۔ اُس کے ساتھ میری ایسی دشمنی ہوئی کہ ایک بڑا فساد پیدا ہو گیا۔ ہماری کلاس دو طبقوں میں بٹ گئی۔ ایک مہینا کلاس نہیں ہوئی لیکن اُستاد اپنی ضد پر جما رہا۔ حتیٰ کہ مَیں ایک بار سکول چھوڑ کر شہر میں داخلہ لینے کے لیے تیار ہو گیا پھر ایک دو اساتذہ نے بیچ میں پڑ کر معاملہ ٹھنڈا کیا اور اُس لڑکے کو مانیٹرنگ سے پرے کیا۔

سزا دینے میں بہت شیر تھے۔ پاؤں سے سر تک ڈنڈے مارتے تھے اور برابر مارتے تھے۔ ایک دفعہ اِسی امر میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک لڑکے کے ماتھے پر رسولی نکلی ہوئی تھی اور وہ کافی بڑی تھی، جیسے سینگ ہو۔ اُس پر اِن کے ڈنڈوں کی مشق جاری تھی کہ ایک ڈنڈا عین رسولی پر لگا، رسولی پھٹاک سے باہر جا گری۔ اُس بچّے کا مفت علاج ہو گیا۔ آدھے بچّے ایسے علاجوں کے

ڈر سے سکول چھوڑ گئے۔ ہم بھی چھوڑتے چھوڑتے بچے۔ سوال پوچھنے میں ایسی احتیاط کرتے کہ بچّہ جواب نہ دے پائے۔ یوں گھما پھرا کے پوچھتے کہ اچھا بھلا سمجھ دار آدمی گھوم جائے۔ اِدھر اِن کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے کہ جواب نہیں آیا۔ مارنے کا اتنا شوق تھا کہ اپنی کلاس کی ہٹلری کرتے۔ جی بھر جاتا تو پڑوسی ممالک پر چڑھائی کرتے یعنی دوسرے ٹیچروں کی کلاسوں میں جا کر انگلش کے ٹینس پوچھنا شروع کر دیتے، نہ آتا تو وہیں گولہ باری کا آغاز کرتے، ایک بار ایک کلاس ٹیچر سے اِسی معاملے میں جنگ ہوتے ہوتے ٹلی۔ گالی ہمیشہ ''اوے سوٗر دے پتر'' کی دیتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی خوشامد بہت کرتے تھے بلکہ ہمارے گاؤں اور دیگر گاؤں کے تمام چوہدریوں کی بہت خوشامد کرتے تھے۔ اِن کی کلاس میں سبق لیتے وقت بچّہ کبھی مطمئن اور سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ جیسے نماز پڑھاتے ہوئے حضرت عمرؓ کا دُرہ صفیں سیدھی کرواتا تھا، اِن کا ڈنڈا ٹینس سیدھے کراتا تھا۔ اِس طرح بچّے کو سب کچھ بھول بھال جاتا تھا۔ اِسی کا اثر ہے کہ آج تک میری انگریزی سیدھی ہونے میں نہیں آئی۔ انگلش کی کتاب اُٹھاتا ہوں تو حبیب الرحمٰن کا بھوت سامنے آ جاتا ہے۔ ڈر کر واپس رکھ دیتا ہوں۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے تین مہینے ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ اِس وقفے میں مارتے کم تھے کہ بچّے ٹیوشن سے انکاری بھی ہو سکتے تھے۔ اِن کی کلاس انگریزی کی ہوتی تھی، بات چیت مطالعہ پاکستان کی چلتی تھی۔ ہندوؤں کو اچھا نہیں جانتے تھے یعنی بنی آدم نہیں مانتے تھے۔ سیاست میں کودنے کا بہت شوق رکھتے تھے مگر کود نہ سکتے تھے کہ وسائل درست نہ تھے۔ ہاں مگر اکثر سیاسی لوگوں کے ڈیروں پر پائے جاتے تھے اور اُن کو سیاسی کرتب بازیاں بتاتے رہتے تھے۔ ہمیشہ مسلم لیگی رہے اور بہت رہے۔ کافی عرصہ سے ریٹائر ہیں۔ اپنے گاؤں میں رہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی طالب علم ہو جسے یہ مل کر خوش ہوئے ہوں یا خود سٹوڈنٹ اِنھیں مل کر خوش ہوا ہو۔ ہمارے دسویں کلاس میں جانے پر سب بچّوں نے احتجاجاً اِن سے انگریزی نہ پڑھنے کا فیصلہ کیا جسے ہیڈ ماسٹر نے مان لیا۔ ہمیں ماسٹر غنی صاحب دے دیا اور ماسٹر حبیب صاحب کو مکرر چھٹی کلاس کو فتح کرنے کا ٹاسک بخش دیا۔ سنا ہے وہ بھی جلد زیر ہو گئی تھی۔ اُستاد جی کے اپنے دو لڑکے بھی اِسی اسکول میں پڑھتے تھے۔ جتنا یہ دوسرے لڑکوں سے دشمنانہ سلوک کرتے

تھے، اپنے لڑکوں سے اتنا ہی پیار کرتے تھے۔ وہ اتنے نالائق تھے کہ اُس پر شرمندہ ہونے کا انھیں خوب موقع تھا، نہیں ہوتے تھے۔ اب وہ دونوں بچے بڑی بڑی داڑھیوں والے ہیں۔ اتنی تحریر لکھ چکا ہوں اور سوچتا چلا آتا ہوں اُستاد جی کی کوئی ایسی بات لکھوں کہ قاری سے اِن کی ایک گونا محبت بھی ہو مگر مجھے وہ بات نہیں ملی، اب کیا کروں؟ چلو اُستاد جی اب آپ کی قسمت۔ اگر کسی دوسرے کو یاد ہو جو استاد جی سے انگریزی پڑھا ہے تو بتا دے، مَیں اضافہ کر دوں گا۔

استاد ظفر اللہ قمر لکھوی

ہمارے اُردو کے اُستاد تھے۔ ظفر اللہ نام تھا۔ لکھوی سے یہ نہ سمجھیے کہ لکھنؤ کے نوابین میں سے تھے۔ فیروز پور میں ایک علاقہ ''لکھو کے'' کے تھے۔ اُردو کے علاوہ سب کچھ پڑھاتے تھے۔ یعنی مذہب، دین، دین کی تقریر، ڈی سی صاحب سے ملاقات کا فن، حکمرانوں کی وفاداری کا ڈھنگ، اپنی دوسروں سے جنگ۔ قریب کے گاؤں سے سائیکل پر آتے تھے۔ داڑھی رکھی ہوئی تھی، وہابی بہت تھے۔ اِنھوں نے ہمیں چھٹی سے دسویں تک پڑھایا، 40 منٹ کی کلاس ہوتی تھی، 30 منٹ شیعہ کو کافر ثابت کرتے تھے، باقی 10 منٹ میں قصہ سناتے تھے، یعنی اپنے مناظرے کا احوال بتاتے تھے اور اُردو کو اللہ پر چھوڑ دیتے تھے۔ اِن کی نظر میں آدھے شاعر کافر تھے، آدھے فاسق تھے۔ صرف اقبال بچتے تھے، اُن پر بھی کافی تحفظات تھے۔ شلوار قمیص پہنتے، ایک گھڑی ہاتھ میں ہوتی جس کی چین ڈھیلی رہتی، جو بچّے کو تھپّڑ مارتے وقت کھُل جاتی۔ تب اُس کو دوبارہ کستے اور اگلے تھپّڑ کا رستہ ہموار کرتے۔ ڈنڈے کی بجائے تھپّڑ سے کام لیتے تھے اور اِس میں فخر کرتے تھے۔ اپنے تھپّڑ کے بہت قصے سناتے تھے کہ ایک دفعہ ایک بچّے کو مارا تو اُس کا کان پھاڑ دیا، ایک کو مارا چار دانت نکال دیے، ایک کو مارا تو پیشاب نکال دیا۔ ویسے ایک بچّے کا تو پیشاب ہمارے سامنے نکالا تھا۔

ایک دفعہ جب مَیں کالج میں چلا گیا تو مَیں نے حضرت ابوطالب کا قصیدہ لکھا۔ اُستاد ظفر اللہ قمر لکھوی کو دکھایا۔ انھوں نے اوّل مجھ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ اُس کے بعد اُسے عروض سے بری کر

کے لوٹایا۔ تب سے وہ قصیدہ وہیں پڑا ہوا ہے، دوبارہ اُس پر کام کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اُستاد جی کے بارے میں ایک دفعہ ہمیں پتا چلا کہ وہ بی اے کے اُردو مضمون سے فیل ہیں تو ہمیں بہت فخر ہوا، اُستاد کو بھی اِس پر فخر تھا کہ وہ اُردو کے معاملے میں کسی ڈگری کے محتاج نہیں۔ لاؤڈ سپیکر بہت استعمال کرتے تھے۔ کمشنر آیا ہے تو سپیکر کے ڈائس پر یہی آتے تھے، ہیڈ ماسٹر جی کلاس میں آئے ہیں تو فوراً سپیکر منگواتے تھے، چپڑاسی کو بلوانا ہے تو پہلے سپیکر بلواتے تھے۔ بچّوں سے پیار بھی کرتے تھے، کیوٹ بچّوں سے تو بہت کرتے تھے۔ ایک دفعہ مَیں بھی پیار کی زد میں آنے سے بال بال بچا۔ لطیفے بھی سناتے تھے اور سب سے بڑھ کر سناتے تھے۔ مارتے کبھی کبھی تھے۔ دل کے بھی کافی اچھے تھے، روز کسی نہ کسی بہانے مٹھائی منگوائی جاتی اور کھائی جاتی۔ اُستاد لکھوی صاحب سر پر جناح کیپ بھی رکھتے تھے، جنرل ضیا سے محبّت میں غلو کر جاتے تھے، اُن کے مطابق یزید اور ضیا اللہ کے بندے تھے اور دونوں کا کردار کم و بیش ایک ہی تھا۔ موصوف نے 60 کی عمر سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی۔ آجکل اوکاڑہ جامعہ محمدیہ میں انچارج ہیں۔ نوعمر لڑکوں سے رغبت کا یہ عالم تھا جس نے اُنھیں سکول سے مدرسے منتقل کر دیا۔ یہ معین الدین لکھوی کا مدرسہ ہے اور شہر کے مرکز میں ہے اور یہاں نوخیز بچّے پڑھتے ہیں۔ ویسے ماسٹر ظفر اللہ قمر لکھوی صاحب دوست احباب کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے تھے چاہے وہ مدد معاشی ہو یا کسی بھی طرح کی۔ کنجوس بالکل نہ تھے۔ عربی نہ جانتے تھے مگر بولتے تھے۔ اُردو کا لہجہ البتہ صاف تھا اور وہی اُن کو اُردو کا مضمون پڑھانے میں معاون کار رہا۔ مجھ سے ہمیشہ شاکی رہے کہ صحیح دین پر توجّہ نہیں دیتا، بنی اُمیہ کی طرف سے دل صاف نہیں رکھتا اور کفر اختیار کیے ہوئے ہے۔ ایک دفعہ اِسی بات پر اچھی خاصی تلخی ہوگئی۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں سے چائے وغیرہ پی لیتے تھے۔ بالکل حرام نہیں سمجھتے تھے۔ گھر ہمارا سکول کے پاس تھا، اِس لیے اکثر خورد ونوش کی خدمت کا مجھے موقع مل جاتا تھا۔ پچھلے دو تین سال میں جب ملاقات ہوئی تو مجھ سے بہت دفعہ اُنھوں نے میری کتابیں مانگی ہیں، مگر نہ دے سکا کہ اُن میں بھی کافی کفر بکا ہوا ہے، کہیں اُستاد جی کا ایمان نہ بہک جائے۔ پودوں اور درختوں کی پرورش تو نہ کرتے تھے مگر اُن کے خلاف بھی نہ تھے۔

ماسٹر محبوب عالم

ہمارے ڈرائنگ کے اُستاد تھے۔ اِن کی قامت چھوٹی تھی، شخصیت بڑی تھی۔ بچّوں کے ساتھ دوستی اور اپنائیت رکھتے تھے۔ ہم اِن کے پیریڈ کا انتظار کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بات سے بڑے بڑے لطائف نکالتے تھے۔ سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ بچّوں سے لسی چائے بھی نہیں پیتے تھے۔ مولویوں کے سخت خلاف تو نہیں تھے مگر حلیف نہیں تھے۔ ماسٹر ظفر اللہ قمر لکھوی صاحب انھیں دیکھ کر چھُپ جاتے۔ یہ اُن کو آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ اُسی گاؤں سے آتے تھے جس سے سابقہ دو اُستاد آتے تھے۔ ہمیں آج تک پتا نہیں چلا، ان کا فرقہ کیا ہے۔ شاید مذہب محبّت کا رکھتے تھے۔ شلوار قمیص پہنتے تھے۔ شلوار کے پائنچے زمین سے گھسٹتے تھے اور پٹھانوں کی طرح چوڑے تھے۔ سائیکل پر آتے تھے اور اُسی پر جاتے تھے۔ اکثر چھٹی سے پہلے ہی نکل جاتے تھے۔ ان کو نہ کبھی ہیڈ ماسٹر کے پاس بیٹھے دیکھا، نہ کسی مولوی کے پاس۔ اکثر سکول کے چاروں طرف کے گراؤنڈوں میں گھومتے رہتے۔ ہم نے اپنے سکول دنوں میں اِنھیں کبھی قبض کی حالت میں نہیں دیکھا یعنی ہمیشہ ہنس مکھ رہے۔ ڈرائنگ اِنھیں بالکل نہ آتی تھی۔ جتنی آتی تھی، وہ ہم نے پہلے دو ہفتوں میں سیکھ لی تھی۔ یعنی جگ، گلاس، ٹیبل اور آم بناتے تھے، یہی سکھاتے تھے اور اِسی کو امتحان کا مرکزی نقطہ بتاتے تھے۔ کہتے تھے، الیٹ لوگوں کی زندگی ٹیبل گلاس اور جگ سے شروع ہوتی ہے اور یہیں ختم ہوتی ہے۔ اُس سے آگے سب پانی کا بلبلہ ہے۔ میری ڈرائنگ اچھی تھی بلکہ ان سے زیادہ اچھی تھی۔ امتحان کے دنوں میں باقی بچّوں کی ڈرائنگ بھی مجھ سے بنواتے تھے اور اُنھیں پاس کراتے تھے۔ ہر اُستاد کی کمزوری اِن کے پاس تھی اور اِن کی کمزوری فقط اِن کی کمزور صحت تھی۔ سکول میں پودوں اور درختوں کے لگانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ روزانہ نرسری سے کوئی پودا لیے آتے اور ہم سے لگواتے۔ بندہ ضائع کر دیتے، لطیفہ ضائع نہیں کرتے تھے۔ میرے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا تھا، بلکہ لڑکوں سے کہتے! میاں یہ علی اکبر اتنا بھولا بھالا نہیں، جتنا نظر آتا ہے۔ اس سے بچ کے رہا کرو اور سیکھا کرو اور قدر کرتے رہو۔ ہمارے گھر کے سامنے سے جب

گزرتے تو کئی بار میرے والد نے انھیں زبردستی بٹھا کر چائے پلائی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کئی بار ہمارے پاس آئے۔ والد صاحب کے دوست بن گئے تھے۔ مَیں بھی جب کبھی 31 ٹو ایل گیا، انھیں ضرور مل کے آیا۔ سکول میں ان کے بیٹے بھی پڑھتے تھے۔ مگر یہ اُن سے غیر متعلق رہتے تھے۔ جیسے اور بچوں کو توجہ دیتے ویسی ہی اُن کو دیتے۔ اب کافی عرصہ ہو گیا ان سے ملے ہوئے۔ آئندہ جب بھی گاؤں جاؤں گا، اِن کو مل کر آؤں گا، خُدا صحت دے۔

درخت پر کلہاڑی

جیسا کہ مَیں نے کہا سکول کے سلیبس میں مجھے اتنی ہی دلچسپی رہ گئی تھی کہ جیسے تیسے امتحان پاس کر لیا جائے۔ باقی زمانہ کتابیں پڑھنے اور گھر کے کام دھام میں گزر رہا تھا۔ گھر ہمارا جیسا کہ بتا چکا ہوں ایسی جگہ پر تھا کہ اُس کے ساتھ کھیت کھلیان اور سرسبز باغات شروع ہو جاتے تھے۔ ایک نالہ پانی سے بھرا ہوا پاس سے گزرتا ہے اور جامنوں کے بے شمار اونچے درخت اُس کے کناروں پر کھڑے لہلہاتے تھے اور ایسے ہرے کہ سیاہ لگتے تھے۔ جب ساون آتا تو اور بھی کالے ہو جاتے۔

مَیں اور میرا چچازاد علی اختر گھر میں کھانا وغیرہ پکانے کے لیے ایندھن کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ لاتے تھے۔ ایک دن ہم دونوں باہر نکلے اور جامنوں کے درختوں سے سوکھی لکڑیاں توڑنے کے لیے اُن کے اوپر چڑھ گئے۔ جامنوں کے پُرانے درختوں میں اکثر شاخیں سوکھ جاتی ہیں جنھیں توڑنا عیب کی بات نہیں مگر جامنوں کا مالک یہ فائدہ خود ہی حاصل کرنا چاہتا تھا کہ وہ لکڑیاں جلانے کے بہت کام آتی تھیں۔ ایک جامن پر مَیں اور ایک پر علی اختر چڑھ گیا۔ درخت گھنے بہت تھے اور ہری شاخوں کے بیچ کہیں کہیں سوکھی لکڑیاں تھیں۔ میرے پاس کلہاڑی تھی۔ اختر خالی ہاتھ تھا۔ وہ خشک شاخیں ہاتھ سے توڑ کر پھینک رہا تھا۔ مَیں کلہاڑی سے کاٹے جا تا تھا۔ کلہاڑی کی ضرب کی آواز دُور تک جاتی تھی۔ درختوں کے مالک نے ضربوں کی آواز سن لی۔ اُسے خبر ہو گئی کہ کوئی جامنوں کی لکڑیاں کاٹ رہا ہے۔ دوڑ کر آ گیا اور درختوں کی شاخوں میں دیکھنے لگا۔ ہم خاموشی سے

گھنے پتوں اور شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گئے اور بالکل آواز پیدا نہ ہونے دی۔ اوّل اُس نے یہ کیا کہ ہماری کاٹی ہوئی شاخوں کو اکٹھا کیا، اُنھیں اپنے صافے میں باندھ کر رکھ لیا، اُس کے بعد دوبارہ درختوں کی چوٹیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا چچا زاد اُسے نظر آ گیا۔ اُس کا نام خوشی ڈولا تھا۔ اُس نے کہا! ہاں بھئی کا کا نیچے آ جا، مَیں نے تجھے دیکھ لیا ہے۔

چچا زاد سہم کر بیٹھا رہا کہ شاید ایسے ہی ڈرانے کے لیے بول رہا ہے لیکن جب اُس نے دوبارہ کہا کہ بیٹا نیچے آ جا ورنہ مَیں اُوپر آ کر تجھے نیچے پھینک دوں گا تو اختر نیچے اُتر آیا۔ اب اُس نے کہا، کلہاڑی کدھر ہے؟ اختر نے کہا وہ تو میرے پاس نہیں ہے۔ خوشی محمد نے کہا جھوٹ نہ بولو، بتاؤ کدھر ہے؟ اختر نے مکرر کہا، اللہ قسم میرے پاس نہیں ہے۔ اب اُس نے ڈانٹا! دفع ہو یہاں سے، پھر نظر نہ آنا۔ اختر اُس کی ڈانٹ سن کر دُور جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس شخص کو یقین تھا کہ اِس لڑکے کے پاس کلہاڑی تھی، جسے اُوپر کسی شاخ میں ٹانک آیا ہے۔ جیسے ہی اختر اُس کی نظروں سے اوجھل ہوا، وہ آدمی جامن کے درخت پر چڑھنے لگا تا کہ کلہاڑی اُتار لائے اور اُس پر مفت میں قبضہ جما لے۔ اُدھر دوسرے درخت کی چوٹی پر بیٹھا مَیں سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اُوپر چڑھنا شروع ہوا، مَیں کلہاڑی سمیت اپنے درخت سے نیچے اُترنے لگا۔ حتیٰ کہ وہ اختر والے درخت کی چوٹی پر چڑھ کر کلہاڑی ڈھونڈنے لگا اور مَیں نیچے اُتر آیا۔ جب میرے چچا زاد نے دیکھا کہ مَیں نیچے آ گیا ہوں اور خوشیا درخت پر ہے تو وہ بھی واپس آ گیا۔ ہم دونوں بھائیوں نے اکٹھی کی گئی اور بندھی ہوئی لکڑیاں سر پر رکھیں اور بھاگ نکلے۔ وہ آدمی جامن کی چوٹی پر بیٹھا بے بسی سے ہمیں دیکھتا رہا اور چیختا رہا۔ مصیبت یہ تھی کہ اتنی بلندی سے چھلانگ نہیں لگا سکتا تھا، نہ جلدی اُتر سکتا تھا۔ اِدھر ہم اُس کے صافے سمیت اپنی توڑی ہوئی لکڑیاں گھر لے آئے اور وہ بے چارا کلہاڑی کے لالچ میں صافہ بھی گنوا بیٹھا۔

جب ہم چنگیز خاں تھے

ہمارے گاؤں میں اُن دِنوں ایک ہی ٹیلی ویژن ہوتا۔ وہ بھی بلیک اینڈ وائٹ۔ یہ

ٹیلی ویژن نصوح غلیچے والے کے ہاں تھا۔ فقط پی ٹی وی چلتا تھا، باقی چینل کا کنجر خانہ نہ تھا۔ رات 9 بجے خبریں تھیں۔ اُس کے آگے پیچھے ڈرامے تھے اور کیا ڈرامے تھے بھائی۔ ایک سے بڑھ کر ایک آرٹ کا شاہکار۔ اُنہی میں ایک ڈرامہ آخری چٹان تھا، نسیم حجازی کے ناول سے ماخوذ، جس میں چنگیز خاں اور جلال الدین خوارزمی کی لڑائی زوروں پر تھی۔ ہم لڑکے بالوں نے اُسے ایسا تاریخی سچ سمجھا کہ بس ڈوب ہی تو گئے اور اُسی میں حلوائی کے بندر کی طرح خود ویسی ہی نقلیں کرنے لگے۔ ہمارے گھر کے پہلو میں سکول تھا، سکول کے گراؤنڈ گویا سبز گھاس کے پیالے تھے۔ ایسے کھلے میدان تھے کہ ابلق گھوڑے دوڑالو اور گراؤنڈ ختم نہ ہو۔ ہم آخر کو مسلمانوں کے فرزند تھے، اُسی گراؤنڈ کو جنگ کے لیے منتخب کیا اور سامانِ جنگ یوں جوڑا کہ لڑکوں نے دو ٹولیاں ترتیب دے ڈالیں۔ گاؤں میں اُن دِنوں آوارہ گدھے بہت پھرا کرتے تھے۔ زمیندار اُن پر مویشیوں کا چارا لاد کر لاتے، پھر کھلا چھوڑ دیتے کہ جاؤ اپنا کماؤ اور کھاؤ۔ اُن گدھوں کا حل ہم نے یوں ڈھونڈا کہ جنگ کے واسطے استعمال میں لائے۔ پندرہ بیس لڑکے ایک طرف ہو لیے اور اتنے ہی دوسری طرف۔ سکول کے گراؤنڈ کو میدان منتخب کیا۔ گدھوں پر لگامیں ڈالیں اور رکابیں جمائیں۔ کچھ پیدل، کچھ سوار۔ مَیں نے اپنا نام چنگیز خاں رکھا اور میرا چچازاد علی اختر جلال الدین خوارزمی بن گیا۔ تب گھی کے ٹین ڈبے کے کنستر بہت خالی ہوتے تھے اور اُن کا مصرف کچھ نہ تھا۔ لوگ باگ گھی نکال کر یونہی پھینک دیتے۔ ہم نے اُنھیں کاٹ کاٹ کر تلواریں بنالیں۔ یہ لوہے کے ٹین اِس طرح صیقل اور چمکدار تھے کہ سورج کو چہرہ دکھاتے تھے۔ تلوار اِن کی خوب بنتی تھی۔ غبارے دو دو آنے کے دُکانوں سے ملتے تھے۔ اُن میں لال رنگ اور ہوا بھر کر بغلوں میں رکھ لیتے۔ شام سے ذرا پہلے جب درختوں کے سائے افقوں سے جا لگتے، ہم میدانِ جنگ میں اُترتے۔ جیسا ڈراموں میں دیکھتے ویسا ہی پہلے اپنے گھوڑوں یعنی گدھوں کی لگامیں کھینچ کر میدان میں فرداً فرداً رجز پڑھ کر آگے بڑھاتے۔ ایک ایک دو دو کو مارتے۔ پھر عام لڑائی شروع ہوتی۔ اُدھر سے میرا چچازاد جلال الدین بنا اپنا گدھا آگے ہنکاتا۔ اِدھر مَیں چنگیز خاں اپنا گدھا بڑھاتا اور ایک دوسرے کی تلوار پر تلوار مارتے یا گتے کی ڈھال پر تلوار کا وار روکتے۔ پھر آٹھ دس

گدھے ایک طرف اور آٹھ دس دوسری طرف کے۔ یوں گھمسان کی جنگ چھڑتی کہ نادر شاہ نے کیا لڑی ہوگی۔ یوں تو کٹے ہوئے ٹین کی یہ تلواریں بہت تیز چھریاں تھیں مگر خیال رکھا جاتا کہ یا تو تلوار پر تلوار لگے یا ڈھال پر تلوار لگے۔ جب کسی کے جسم کو چھواتے تو وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگتا اور رنگ اپنے اوپر انڈیل کر خونم خون ہو جاتا۔ بعض اوقات گدھے ہینکنا شروع کرتے تو جنگ میں شور بڑھ جاتا۔ ہم اپنی اپنی فوج کے سامنے گدھے پر بیٹھ کر تقریریں کرتے اور سپاہیوں کے دل بڑھاتے۔ میدان یا سکول کے گراؤنڈ میں یہ منظر اتنا دل کش ہو جاتا کہ اکثر گاؤں کے بڑے بوڑھے تماشا دیکھنے چلے آتے اور کناروں پر بیٹھے لطف لیتے۔ ہلا شیری کرتے۔ یہ کھیل ہم روز کرتے تھے۔

ایک دن جلال الدین کی فتح ہوتی تھی دوسرے دن چنگیز خاں یعنی میری ہوتی تھی۔ اکثر پیدل فوج ماری جاتی گھنٹہ بھر کی لڑائی میں پیدل فوج اپنے غبارے پھاڑ کر رنگ اپنے اوپر انڈیل لیتی۔ کئی سوار بھی اپنا غبارہ پھاڑ کر رنگ انڈیل کر گدھے سے ایسے نیچے گرتے جیسے واقعی تلوار سے گھائل ہو گئے ہوں۔ اللہ اکبر اور یا ہُبل کے نعرے خوب لگتے۔ (اگر چہ چنگیز خاں کا ہُبل سے کوئی لینا دینا نہیں تھا مگر ہم نے اسلام کے مخالف چونکہ بتوں کے پوجنے والوں کو ہی سنا اور بتوں کا بزرگ چونکہ ہُبل ہی تھا اِس لیے یہی ہمارے ذہن میں تھا)۔ قلب لشکر سے میمنہ اور میمنہ سے میسرہ تک پوری طرح جنگ لڑی جاتی۔ بہت مزا آتا۔ خاص کر گدھے پر سواری کا تو ایسا لطف آتا کہ وہی جانے جو گدھے کا اسوار ہو۔ ویسے بھی اُن دنوں قامتیں ہماری چار ساڑھے چار فٹ کی ہوتی تھیں اور گدھا گھوڑا ہی محسوس ہوتا۔ ایک دن یوں ہوا کہ لڑتے لڑتے جب میں نے اپنی تلوار اُٹھائی اور پیچھے سے لا کر اُسے ایک دوسرے یعنی دشمن اسوار کی ڈھال سے ٹکرایا تو خُدا کا کرنا ایسا ہوا، اُسی لمحے پیچھے ایک پیادہ دشمن کھڑا تلوار چلا رہا تھا۔ میری تلوار کی نوک اُس کے بازو کو چھو گئی۔ دس بارہ سال کا وہ چھوکرا، نرم سا جسم تھا۔ مری تلوار نے اُس کے بازو کی جلد میں اچھی خاصی زخم کی لکیر ڈال دی، جس کے سبب خون نکل آیا۔ اُس جواں مرد سپاہی نے جب اپنے بازو سے یوں خون نکلتے دیکھا تو ایسا گھبرایا جیسے مرنے والا ہو۔ پھر اس قدر چیخ و پکار، رونا دھونا شروع کیا کہ جنگ فوراً

روکنا پڑی۔ تمام فوجیں گھبرا گئیں اور گھروں کو بھاگ اُٹھیں۔ خود میرے پاؤں اُکھڑ گئے کہ اب اللہ جانے کیا آفت آئے۔ پاس ہی اُس لڑکے کا گھر تھا۔ ایک دشمن سپاہی نے بھاگ کر اُس کی ماں کو بتا دیا۔ ماں بھاگی ہوئی آئی، اِدھر مَیں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گدھے سے چھلانگ لگائی اور یہ جا وہ جا۔ میدانِ جنگ سے بھاگ گیا۔ زخمی سپاہی کی ماں نے گالیوں کی ایسی ایسی منجنیقیں چلائیں کہ کچھ نہ پوچھیں۔ میرے دماغ کے قصر وایواں گر گر گئے۔ گویا کانوں میں شورے کا تیزاب ڈالا جا رہا ہو۔

خیر مَیں تو بھاگ کر واپس صحرائے گوپی کی طرف نکل گیا یعنی گاؤں سے دُور ایک کلومیٹر ریت کے ٹیلوں کی طرف کہ پکڑا نہ جاؤں، اُدھر جواں مرد کو اُس کی ماں فوراً گاؤں کے اُس واحد ڈاکٹر کے پاس لے گئی جو سائیکلوں کے پنکچر کی دُکان اور کلینک برابر چلاتا تھا۔ اُس نے اُس معمولی سے زخم پر کوئی مرہم لگا کر پٹی باندھ دی۔ اِدھر جب میں عشا کے وقت اندھیرے عالم میں گھر پہنچا تو میری ماں میرے انتظار میں تھی۔ یوں مجھ پر ٹوٹ پڑی جیسے سومنات پر غزنوی نے شب خون مار دیا ہو۔ خوب پٹائی کی۔ جوتے مارتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی، مَیں آج تیرا نادر پن تو نکالوں۔ بے غیرت رہتا نہیں بڑا جنگجو، کسی تیمور لنگڑے کی نسل کا۔ غرض بہت ٹھکائی کی اور آئندہ سے کان پکڑائے۔ دوسرے دن سوجے چہرے سے جب ہم بستہ لیے سکول گئے تو ماسٹر جی نے دُور سے دیکھتے ہی کہا! وہ دیکھو ہلاکو خان کا دادا آ رہا ہے، تمام کلاس اُٹھ کر بادشاہ سلامت کو سلامی دو اور اُستاد جی سمیت پوری نویں کلاس اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مَیں زمین میں گڑا جاتا تھا۔ اُس دن کے بعد یہ کھیل تو بند ہوا مگر دو چار دن چھوڑ کر ایک نیا کھیل شروع کر دیا، اُس میں کچھ نہ پوچھیے کس قدر غضب کا تماشا ہوا لیکن وہ قصہ خودنوشت کے اگلے حصے میں لکھوں گا۔

جاٹوں کی کہانی

اب سچ تو یہ ہے کہ میری عمر جس طرح بڑھ رہی تھی۔ ویسے مصروفیت میں تبدیلی نہیں آ رہی تھی۔ اُس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گاؤں کی اشیا اور اُن کے معمول میں زیادہ کمی بیشی نہیں ہوتی تھی۔

کتابیں پڑھنے اور گھر کے کام کاج میں اگرچہ کافی وقت نکل جاتا تھا لیکن اُس کے بعد گاؤں کے لونڈوں کے ساتھ نیکی بدی میں حصے داری بھی کافی بڑھ گئی تھی۔ مثلاً کبھی کسی کے کھیت سے چارا چوری کاٹ لانا، کبھی پیسوں کی کمی ہوئی تو رات کو کسی کی کپاس چُن لانا اور اُسے دُکان پر بیچ کر پیسے کھرے کر لینا۔ مگر اِس طرح کا عمل کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ مَیں نے اپنے گاؤں کے اکثر واقعات پر افسانے بھی لکھے ہیں جن میں تھوڑی بہت ہی ردوبدل کی ہوگی۔ زیادہ تر بالکل صحیح واقعات پر مبنی ہیں۔

ہمارے گاؤں میں ایک جاٹ برادری کا گھر تھا۔ یہ چار بھائی تھے اور خُدا جھوٹ نہ بلوائے، ہر بھائی کے کم از کم دس دس بچّے تھے۔ گاؤں کے جنوب میں ان کی کچھ زمین تھی اور زرخیز تھی۔ اِس زمین کو گاؤں کی دیواریں لگتی تھیں یعنی بالکل پڑوس میں تھی۔ ذات کے جاٹ ہونے کے سبب عقل کے جاٹ بھی تھے۔ اِن میں سب سے بڑا اصغر جٹ تھا، باقی درجہ بدرجہ تھے۔ یہ بندہ بہت طرح دار تھا لیکن دوسرے ایسے نہ تھے۔

ایک مرتبہ اِنھوں نے اپنی زمین میں ہل وغیرہ چلانے اور غلّہ ڈھونے کے واسطے ٹریکٹر خرید لیا۔ ٹریکٹر چلانا کسی کو نہ آتا تھا اور ڈرائیور رکھنے کی اِن میں طاقت نہ تھی۔ خود ہی چلانے کی کوشش کرنے لگے اور سب سے پہلے یہ کوشش اصغر جٹ نے کی۔ اوّل تو خود اِس کا اپنا وزن ڈھائی سو کلو سے اُوپر تھا۔ مست ہاتھی کی طرح جھوم جھوم کے چلتا تھا۔ دوم ٹریکٹر تو ایک طرف، اِس نے کبھی سائیکل نہ چلائی تھی۔ سب جاٹوں نے اِسے قلبِ لشکر کی کمان دی اور اُس پر چڑھ بیٹھا۔

کہنے لگا، 'یہ بھی کوئی کام ہے، چابی لگا کر گیئر ہی تو لگانا ہے، پھر آرام سے بیٹھ کر اُسے چلتے ہوئے دیکھنا ہے۔'

وہ ٹریکٹر کی سیٹ پر پورا نہ آتا تھا اور پُھرتی جسم میں بالکل نہ تھی۔ بڑی مشکل سے سیٹ میں پھنس پھنسا کر بیٹھا، اگنیشن میں چابی دی اور پہلی ہی ٹرائی میں ٹریکٹر کو ریورس گیئر میں ڈال بیٹھا۔ ٹریکٹر پچھلے قدموں چلنے لگا۔ اب اصغر جٹ کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آگے کی بجائے پیچھے کیوں جا رہا ہے۔ اردگرد کھڑے لوگ دُور دُور ہٹ گئے اور لگے چیخنے کہ 'اگلا گیئر لگاؤ، اگلا گیئر۔'

اِدھر اِسے خبر نہ تھی کہ اگلا گیئر کیسے لگے گا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کچھ سمجھ نہ آئی کیا کروں۔ گیئر لگانے کی بجائے ہینڈل گھمانے لگا۔ قُدرت خُدا کی، ٹریکٹر کی پچھلی طرف مویشی باندھنے والی حویلی تھی۔ اس میں ایک بڑے سے مکان پر چھت ڈال رکھی تھی، اُسی میں رات کو اپنی گائیں بھینسیں باندھتے تھے۔ ٹریکٹر اُسی مکان کی طرف جا رہا تھا۔ گھبراہٹ میں یہ بھی بھول گیا کہ کس پاؤں کے نیچے بریک ہے اور کس کے نیچے ریس ہے۔

جیسے ہی مکان میں گھسنے لگا، بھائی بندوں نے پکارا، 'بھائی جی بریک لگا دو، بریک!' اِدھر اِس نے ریس پر پاؤں رکھ دیا۔ ٹریکٹر اور تیز ہو گیا۔ اب یہ اردگرد کھڑے ہوؤں کو چیخنے لگا کہ پیچھے سے سہارا دے کر ٹریکٹر کو روکو مگر انھوں نے نزدیک ہو کر مرنا تھا؟

جب اِس کی چیخ پکار پر کوئی نزدیک نہ آیا تو خود چلتے ٹریکٹر سے چھلانگ لگا دی۔ پہلے تو دھڑام سے زمین پر گرا مگر جلد اُٹھا اور پہیے کو پکڑ کر روکنے لگا۔ وہ تو خیر ہوئی ٹریکٹر آہستہ ہو گیا تھا ورنہ یہ بھی پہیے کے ساتھ لپٹتے چلے جاتے۔ اُسی لمحے بھاگ کر دو عدد جٹ آگے ہوئے اور اِسے کھینچ لیا اور اگلے ہی لمحے ٹریکٹر مکان میں گھس گیا۔ اُس کے گھستے ہی دیواریں بکھر گئیں اور چھت ٹریکٹر کے اوپر آ پڑی۔ سب نے شکر ادا کیا کہ جان کا صدقہ تھا نکل گیا۔

بڑی مشکل سے مکان کا ملبہ اٹھا کر اندر سے ٹریکٹر کو نکالا لیکن بجائے شرمندہ ہونے کے کہنے لگا، 'اِس مکان کو بہت مدت ہو گئی تھی اور خستہ ہو چلا تھا، مجھے ڈر رہتا تھا کسی روز جانوروں پر ہی نہ آ پڑے۔ آج موقع پا کر میں نے اِسے گرا ہی دیا۔

یہ واقعہ پل کی پل میں سارے گاؤں میں پھیل گیا اور خوب مذاق اُٹھا مگر اُس کے بعد جو انھوں نے پورے گاؤں کے ساتھ مذاق کیا، اُس کا نہ پوچھیے۔

اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا، اسلم جٹ۔ اس کی کہانی سنیے کہ اس نے ایک پیر صاحب کے حجرے میں 15 دن چلہ کر کے پیری ہتھیا لی تھی اور دعویٰ کیا تھا کہ اللہ نے ولایت کا جوہر پیر صاحب سے زبردستی لے کر اُسے عنایت کر دیا ہے اور کئی مریدوں نے اُس کی بیعت بھی کر لی تھی۔ اس واقعے کے چار روز بعد اِس نے ٹریکٹر کی سیٹ پر قابو پایا اور اُس پر سورہ الناس پڑھ کر

گیئر لگا دیا مگر ٹریکٹر صاحب ایمان نہ تھا چنانچہ نہ تو اُس پر سورہ الناس نے اثر کیا اور نہ خود اُس کی بزرگی کی حیا کی۔

پہلے تو بے قابو ہو کر ایک بڑے گڑھے میں داخل ہو گیا، اُس کے بعد جو وہاں سے نکلا تو ایسے سرپٹ بھاگا جیسے ریل کا انجن ڈبوں کے بغیر دوڑ پڑے۔ ایک جگہ کچی سڑک پر ایک گڈے کو دو بیل کھینچے جا رہے تھے۔ اوپر اُن کے ایک آدمی بے چارا آرام سے بیٹھا حقہ پیے جاتا تھا۔ ٹریکٹر نے اُسی کا رُخ کیا اور پیچھے سے ایسی ٹکر ماری کہ گڈے کو بیلوں سمیت دھکیلتا ہوا پانی کے ایک بڑے تالاب میں تیر گیا جو گاؤں کی بھینسوں کے لیے اجتماعی طور پر بنایا گیا تھا۔ وہ تو بچت ہوئی، تالاب بہت گہرا نہ تھا ورنہ گڈے سے بندھے بیل بھی ڈوب مرتے۔ حقہ اور گڈا تو اُس بے چارے کا ڈوب ہی گیا تھا۔ اسلم جٹ کی اِس کرامت کے بعد ٹریکٹر کو اس تالاب سے نکالنے میں ایک ہفتہ لگا۔ اس عرصے میں اس مشین کے رُوں رُوں میں ایسا پانی گھسا کہ اُسے کھلوا کر صاف کروانے میں دو مہینے لگ گئے۔ اس عملِ خیر کے بعد بھی اس خاندان کی مہارت میں کوئی فرق نہ آیا۔ ڈرائیور ایک کے بعد ایک بدلتا گیا اور گاؤں کھنڈرات ہوتا گیا۔ گاؤں کی کوئی دیوار ثابت نہ چھوڑی۔ کوئی راستے کا کھمبا سلامت نہ رہنے دیا۔ معمول یہ بن گیا کہ جب بھی کوئی جاٹ ٹریکٹر پر بیٹھ کر اپنے کھیتوں سے گاؤں کی طرف آنے لگتا، راستے کی ہر شے کو روندتا ہوا آتا۔ کئی غریبوں کی جھونپڑیاں برابر کیں، کمیوں کے کوٹھے گرائے۔ کئی لوگوں کو پھٹڑ کیا۔ ایک دو کی ٹانگیں صدقے میں لیں۔

بات یہاں تک پہنچی کہ جیسے ہی ان کا ٹریکٹر سٹارٹ ہوتا، پورے گاؤں میں ہراس پھیل جاتا۔ لوگ ہارے ہوئے لشکر کی طرح میدانوں میں بھاگتے اور پکارتے پھرتے، 'بھائیو! اپنے اپنے کنارے لے لو، جاٹوں کا ٹریکٹر آ رہا ہے۔'

عورتیں اور لڑکے بالے مکانوں اور درختوں پر چڑھ جاتے۔ سڑکوں کے راہ گیر سڑک چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں ہو جاتے۔ گاؤں کے اکثر لوگوں نے یہ احتیاط کی کہ اپنے مکانوں کی دیواروں کے ساتھ بڑے پتھر رکھ دیے۔

ایک ہمارے گاؤں پر کیا موقوف، ارد گرد کے دسیوں دیہات میں جاٹوں کے ٹریکٹر کی دھوم پڑ گئی۔ مائیں اپنے بچوں کو گھروں کے صحنوں میں پڑی چار پائیوں کی غیر محفوظ جگہ سے اُٹھا کر درختوں پر چڑھا دیتیں کہ جانے کب جاٹوں کا عزرائیل گھر کی دیواریں توڑ کر صحن میں ہل چلا دے۔

میں نے پہلے عرض کیا کہ اس خاندان کے صرف مردوں میں چھوٹے بڑے 140 افراد تھے۔ سب نے اسی ٹریکٹر پر ہاتھ سیدھے کیے اور گاؤں کی چار پائیاں ٹیڑھی کیں۔ انجام کار، آدھا گاؤں پامال کر کے وزیرستان بنا دیا۔ سڑکوں کے کناروں پر بجلی کے کھمبے، پول اور درختوں کے تنے جڑوں سے اکھیڑ دیے اور اتنے ہی جرمانے بھگتے۔ ٹریکٹر کے پرزوں کی حالت یہ ہوئی کہ 'کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا' والا معاملہ ہو گیا۔ ایک ایک کر کے اُس کا صرف ادھورا انجن اور چار پہیے سلامت بچے، باڈی کے قریبا تمام کُل پرزے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

یوں ٹریکٹرانہ جنگ وجدل میں چھ مہینے کے اندر ہی گھر کی تمام جمع پونجی کے ساتھ ٹریکٹر بھی راہی فنا ہوا۔ اس جانکاہ حادثے کے بعد ان کا مزاج کافی چڑچڑا ہو گیا۔ گاؤں کے ہر فرد کو اپنے خلاف اسرائیل سمجھنے لگے۔ اُنھیں شکایت تھی کہ گاؤں میں جو بھی شے اُن کے ٹریکٹر کے سامنے آئی تھی وہ اُن کے خلاف دراصل سازش میں شریک تھی۔ یہی سبب تھا کہ ان کی دشمنی سب سے ہو گئی اور گاؤں گویا دو دھڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

جاٹوں کا حملہ اور عارف کمہار کا پستول

ادھر گاؤں کے لونڈے اور لڑکے بالے شرارت کے اماں باوا تھے۔ جاٹوں کی زمین گاؤں کے ہمسائے میں ہونے کے سبب سب کا نزول یہیں رہتا۔ کسی کو گنا چوسنے کی حاجت ہوتی تو انہی کے کھیت سے اُکھاڑتا، کسی کو ساگ پکانا ہوتا تو انہی کے کھیت پر نظر پڑتی۔ غرض ان کی فصل میں کافی اُجاڑا ہوتا تھا۔ کوئی چارا کاٹ کے لے جاتا اور کوئی اپنی بکریوں کا ریوڑ ان کے کھلیانوں میں گھسا دیتا۔

اس دبڑ دھونس میں جاٹوں کے ہاتھ جو چڑھ جاتا یہ اُس کی اچھی خاصی مرمت کر دیتے۔ دو چار لوگ ہر وقت زمین کی اور فصل کی رکھوالی پر جتے رہتے، ذرا کوئی فصل میں گھسا نہیں، انھوں نے جا پکڑا اور دو چار گُدی پر لگا دیں۔ کئی بار تو ایسے بھی ہوا کہ کوئی شخص یونہی ان کی فصل کے پاس سے گزرا تو اُسے بھی ایک دو دھولیں لگا دیں۔ ان حرکتوں سے قریب سارا گاؤں ان کا دشمن ہو گیا۔ روز فساد برپا ہوتا۔ ایک بار عارف کمہار ان کا چارا کاٹ لایا۔ یہ ہمارے پڑوسی ہی تھے۔ اُس نے چارا بھینس کے آگے ڈالا اور اُس کا دودھ دوہنے لگا۔ ادھر پندرہ بیس جاٹ اپنی ڈانگیں لے کر آ موجود ہوئے اور للکارنے لگے کہ باہر نکل۔ آج ٹانگیں توڑ کے دم لیں گے۔ تمام لوگ جاٹوں کی منتیں کرنے لگے کہ جانے دیجیے آپ چوہدری لوگ ہیں، کیوں ایک غریب کے پیش ہو گئے ہیں، آئندہ وہ غلطی نہیں کرے گا۔ عارف کمہار کے بھائی بھی جاٹوں کی منتیں کرتے رہے مگر یہ مان کے نہ دیے، دروازے پر کھڑے گالیاں دیتے رہے کہ باہر نکلے، آج تو چار ہاتھ کر کے ہی جائیں گے۔ اتنے میں عارف نے دودھ دوہ کر ایک طرف رکھا اور کمرے میں داخل ہوا، باہر نکلا تو اُس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اُس نے پستول کے ٹریگر پر ہاتھ رکھا اور جاٹوں کی طرف نال کر کے بولا، ہاں بھئی کون کون جاٹ میری ٹانگیں توڑنے آیا ہے ذرا سامنے آئے۔ پستول دیکھ کر جاٹوں نے ٹانگیں توڑنے کا ارادہ فوراً کینسل کیا اور یہ کہتے ہوئے واپس چل پڑے کہ اب ہمارے کھیتوں کی طرف آئے گا تو دیکھ لیں گے۔ واپس جاتے ہوئے جب اکرم چکی والے کے پاس سے گزرے تو اُس نے پوچھا، چوہدری صاحب آپ تو بغیر ٹانگیں توڑے واپس جا رہے ہیں؟ انور جٹ نے جواب دیا، بھائی اکرم، ایویں پاگل جھیا ہیگا، کہیں آنکھ منہ پر گولی نہ چلا دے۔ یعنی پاگل سا ہے کہیں آنکھ یا منہ پر گولی نہ چلا دے۔ اِدھر ہم حیران کہ اس کے پاس تو چھری تک نہ تھی، یہ پستول کہاں سے نکال لایا، جب قریب ہو کر دیکھا تو اُس نے دکھایا، اُس کا نہ ٹریگر تھا، نہ میگزین تھی، اور نہ اُس میں کوئی گولی تھی۔ عارف نے بتایا جب نہر سے مٹی نکال رہا تھا تو یہ وہاں سے ملا تھا، مَیں نے لا کر صندوق میں رکھ لیا، آج کام آ گیا، ورنہ جاٹ عشا تک یہیں بھنگڑا ڈالتے رہتے۔

گنے کی چوری اور گُڑ کی تیاری

ہم لڑکے بالے اُن دنوں بہت شرارتی ہوتے تھے۔ گرمیاں ہوتیں یا سردیاں تمام دن سڑکوں پر بھاگتے اور کھیلتے گزرتی اور ضد میں آ کر نقصان بھی انہی کی فصلوں کا کرتے۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا اور سردیوں کے دن تھے۔ سکول ہمارے گھر کے قریب تھا۔ سردیوں کے دس دن کی چھٹیاں سکول سے ہوئی تھیں۔ مَیں اپنے گھر سے نکلا اور کھیلنے کے واسطے سکول میں آ گیا۔ سکول کی جنوبی طرف عین دیوار کے ساتھ ایک پیپل کا بہت بڑا پیڑ ہوتا تھا، جس کی جڑیں دُور تک زمین کے اوپر اُبھری ہوئی تھیں اور شاخوں پر شہد کی مکھیوں کے بڑے چھتے لٹکے ہوتے تھے۔

سردیاں اُن دنوں بہت زوروں پر تھیں، پتے زرد ہو کر گر رہے تھے اور ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی، غرض موسم ایسا مزے کا تھا کہ کچھ نہ پوچھو۔ مَیں جیسے ہی پیپل کے پاس پہنچا، دوسری طرف سے میرا دوست انور آ گیا۔ قریب آیا تو دیکھا کہ اُس کا چہرہ نہایت سُرخ ہوا تھا اور نقاہت جسم پر طاری تھی۔ وہ آ کر میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اُس کی حالت دیکھ کر مَیں نے اندازہ لگایا کہ اس کے ساتھ کچھ واردات ہوئی ہے۔

میرے اِس سوال پر وہ فوراً ہی ہچکیاں مار کر رونے لگا اور بولا، 'مَیں نے جاٹوں کے گنے کے کھیت سے گنا توڑا تھا، اُنھوں نے مجھے پکڑ لیا اور بہت دیر تک کان پکڑوا کر مرغا بنائے رکھا۔ تھپڑ بھی مارے ہیں۔'

آپ یوں سمجھ لیں اُس وقت ہم نویں جماعت میں ہوتے تھے۔ اگرچہ مَیں خود بھی اُن دِنوں لڑکا بالا ہی تھا اور انور سے سال بھر بڑا ہوں گا، مگر اپنے آپ کو بہت سیانا سمجھتا تھا۔ مَیں نے کہا، 'تُو بےفکر ہو جا، ہم اِن کو ایسا سبق چکھائیں گے کہ جاٹ ہاتھ لگاتے رہ جائیں گے۔'

ہمارا ایک دوست اسلم عرف مہا کی ڈوگر تھا اور مجھ سے ایک سال چھوٹا ہی تھا۔ اُن کی زمین اور زمین میں مویشیوں والی حویلی جاٹوں کے کھیت کے ساتھ پڑتی تھی۔ بس یوں سمجھ لو جاٹوں کے کھیت اور اُن کے مویشیوں کے ڈیرے کے درمیان ایک پانی کا نالہ بہتا تھا اور وہی ڈیورنڈ لائن

تھی۔ ہم اُس کے پاس گئے اور سب ماجرا سنایا۔ اُس نے کہا: فکر نہ کرو، ہمارے مولشیوں کے ڈیرے پر گُڑ بنانے کا ویلنا لگا ہوا ہے۔ اُس کے بعد ہم تینوں نے ایک منصوبہ بنایا اور اپنے ہم عمر چار مزید دوستوں کو اس میں شریک کر لیا۔

جانوں کا معمول یہ تھا کہ دو دن کماد چھیل کر رکھ لیتے تھے اور تیسرے دن اپنا ویلنا چلا کر گُڑ بناتے تھے۔ دوسرے دن اسلم ڈوگر نے ہمیں بتایا کہ جاٹوں نے دو دن کا گنا چھیل کر رکھا ہوا ہے۔ کل صبح انھوں نے اُس کا گُڑ بنانا ہے اور ان سے پہلے ہم رات ہی یہ کام کر گزریں گے۔ جیسے ہی رات کا پہلا پہر گزرا، سردی اور دھند میں اضافہ ہوا، ہم حرکت میں آ گئے۔ چھ لڑکے تھے۔ تین چار پھیرے لگا کر پہلے تمام گنا اسلم ڈوگر کے ویلنے پر لائے۔ اُس کے بعد گُڑ بنانے کی تیاری کی۔ سب زمینداروں کے لڑکے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے، پت کیسے چڑھائی ہے، پیڑھ کیسے بنانا ہے اور گُڑ کس طرح تیار کرنا ہے۔ ہم نے بیلوں کو ویلنے پر جوتا اور گنے کا رس نکالنے لگے۔

جیسے ہی پانچ پیپوں کی روہ (گنے کا رس) تیار ہوئی، آگ پر کڑاہا چڑھا دیا۔ اب ایک طرف بیلوں اور ویلنے کے ذریعے روہ نکل رہی تھی، دوسری طرف پت چڑھی ہوئی تھی۔ پہلی پت تیار ہوئی تو دوسری چڑھا دی۔ اس طرح صبح کی اذانوں سے پہلے پہلے ہم نے پانچ پت کا گڑ نکال لیا اور راتوں رات گُڑ بنا کر سب گنا ٹھکانے لگا دیا۔ جاٹوں کے کھیت میں قدموں کے نشان ویسے ہی نہ لگے تھے کہ کماد کے کھیت میں گنے کے چھلکے جنھیں 'پچھی' کہتے ہیں، بہت بکھرے ہوتے ہیں۔

ویلنے کے قریب ہم نے صبح ہونے سے پہلے ایک تنکا بھی نہ چھوڑا۔ سب اٹھا کر زمین میں دفن کر دیا۔ تین من گڑ نکلا، وہ سب گُڑ اُٹھا کر ایک گھر میں جمع کر دیا اور نشان مٹا دیے۔

جب صبح ہوئی اور جاٹ ویلنا لگانے لگے تو دیکھا کہ گنے کا وہاں وجود تک نہ تھا۔ سب جاٹ حیران کہ اتنا سارا گنا زمین نگل گئی یا آسمان نے اُچک لیا۔ اُن کو ایسی ہڑتل پڑی کہ پورے گاؤں میں بکھر گئے اور گھر گھر کی تلاشیاں لینے لگے۔ اتنا نقصان پہلے اُن کی فصل کا کبھی نہ ہوا تھا۔ سب باولے ہو گئے۔ جو ایک گنے کی چوری برداشت نہ کرتے تھے اِتنے کماد کے نقصان پر کیسے چین لیتے۔ گاؤں میں ایک آدمی ہستا بھٹی تھا۔ اُس سے اُن کی بہت لاگ تھی۔ جب بہت کوشش کے

باوجود گنّے کا سُراغ نہ ملا تو اُسی پر الزام دھر دیا۔

ہمارے گاؤں کے ایک کنارے پر سکول تھا۔ اِس کے گیٹ پر مشرق سے اُٹھتے ہوئے سورج کی کرنیں بہت سیدھی پڑتی تھیں اور سردیوں میں یہاں دھوپ سینکنے کا بہت مزا آتا تھا۔ مَیں اور میرے ہمسائے کے انتظار علوی اور اقبال دولڑکے، جو مجھ سے عمر میں بڑے تھے مگر بہت شغلی قسم کے تھے، وہ بھی وہیں کھڑے تھے اور ہم دھوپ سینک رہے تھے۔

اِتنے میں ایک جاٹ بڑی تیزی سے ہمارے پاس سے گزرا۔ اِس کا نام رحمت جٹ تھا۔ انتظار علوی نے اُسے پریشانی سے گزرتے دیکھا تو پوچھا، 'چاچا رحمت کیا بات ہوئی آج تم سب بہت پریشان اور بوکھلائے ہوئے پھر رہے ہو؟'

رحمت جو تھوڑا سا آگے نکل چکا تھا، واپس مڑ کر ہمارے پاس آن کھڑا ہوا اور بولا، 'ماسٹر جی کیا بتاؤں، رات کوئی ہمارے ساتھ بڑا ہاتھ کر گیا۔ سارے گنّے چوری کر لیے۔ کم از کم آٹھ من گڑ نکلتا، اتنے سارے گنّے کوئی چوس بھی نہیں سکتا یا کسی نے شوگر مل پر پہنچا دیے ہیں یا پھر کُتر کے جانوروں کو کھلا دیے ہیں۔

انتظار نے پوچھا، 'تو پھر تمھیں شک کس پر ہے؟'

وہ بولا، 'شک؟ ماسٹر جی، شک نہیں پک ہے۔ یہ اپنا ہستا بھٹی ہے نا، پکا چور ہے، ابھی پرسوں ہی اِس کے ساتھ دنگا ہوا ہے اور تم جانتے ہو، چوری کرنا تو اِن کا خاندانی پیشہ ہے، یہ سب اسی کی کارستانی ہے، اِس کے علاوہ کون کر سکتا ہے؟'

اُس کے بعد رحمت جٹ رخصت ہو گیا اور مَیں ہنستا ہوا گھر آ گیا۔ اگلے دن گنّے کا تمام ملبہ ہستے بھٹی پر ڈال دیا گیا۔ پنچایت ہوئی، پنچایت نے ہستا بھٹی سے کہا، 'اگر تم نے گنا چوری نہیں کیا تو قسم دے دو۔'

ہستے کے لیے قسم کوئی نئی بات نہیں تھی، پھر یہ چوری تو اُس نے کی بھی نہیں تھی۔ وہ قسم دے کر فارغ ہو گیا اور گڑ ہم لڑکوں بالوں نے سب بانٹ لیا۔ پھر یہ گڑ تین تین ماہ ہمارے گھر کی چائے بنانے کے کام آیا۔ تب سے مَیں گڑ کی چائے بہت اچھی بناتا ہوں۔

پیر اسلم جٹ اور میرے کھیت کا پانی

پیر اسلم جٹ نے سفید لباس پہن لیا اور سر پر سبز پگڑی پہن لی اور پیری مریدی شروع کر دی۔ اُس کا مدعا تھا کہ مَیں پیر جھنڈے شاہ کا جب مرید ہوا تھا تو اُن کا وعدہ تھا کہ وہ مجھے خلافت دیں گے لیکن اُنھوں نے وعدہ خلافی سے کام لیا اور خلافت اپنے پوتے کو دے دی مگر اِتنے میں میرا بارہ سال کا جہد بھی پورا ہو گیا۔ اِس لحاظ سے مَیں اب خود بخود پیر بن چکا ہوں۔ اِس عذر کو سامنے رکھتے ہوئے پیر اسلم جٹ نے لوگوں سے بیعت لینا شروع کر دی اور مزے کی بات ہے کئی لوگوں نے اُس کی بیعت بھی کر لی، اب اُس کے گھر پر قوالی بھی ہونے لگی۔ سب سے پہلے تو اُس کا اپنا گھر اُس سے بیعت ہوا، اُس کے بعد پیر جھنڈے شاہ کے سابقہ مریدین جنھیں جھنڈے شاہ کے اصل خلیفہ سے یہ شکایت تھی کہ وہ شیعت کی طرف رجوع رکھتا ہے، وہ سب پیر اسلم جٹ کے مرید ہو گئے۔ دھوم دھام سے قوالی اور جلوس نکلنے لگے اور سالانہ میلاد ہونے لگا۔ پیر اسلم جٹ کی زُلفیں بڑھ گئیں۔ پگڑی کا سائز دُگنا ہو گیا۔

اب اگلا قصہ سنیے، ہمارے کھیت کو ہفتہ وار پانی لگتا تھا۔ جسے مَیں خود لگاتا تھا۔ کھیتوں کو وارابندی کے حساب سے پانی لگانا ایک مشکل ترین کام ہے اور یہ مشکل وہی جانتے ہیں جنھیں پانی لگانے سے واسطہ رہا ہو۔ وارابندی میں کبھی دن کو واری آتی تھی اور کبھی رات کو۔ مَیں جب اپنے کھیتوں کو پانی لگاتا تو اسی وقت نال میں پانی کم ہونا شروع ہو جاتا۔ حتیٰ کہ کھیت سوکھا رہ جاتا۔ پھر ہمیں ٹیوب ویل کے ذریعے سے پانی دینا پڑتا۔ اِس طرح ہم مالہ بھی بھرتے اور ٹیوب ویل کا خرچہ بھی برداشت کرتے۔ میری یہ بات سمجھ میں نہ آتی کہ جب بھی میری پانی کی واری آتی ہے۔ نالے میں پانی ایک دم کم کیوں ہو جاتا ہے۔ ایک دن مَیں اپنے کھیتوں میں پانی لگانے کے بعد نالے کے ساتھ ساتھ واپس چلنے لگا کہ دیکھوں میرے پانی کی ڈکیتی کون کر رہا ہے۔ اب جیسے ہی مَیں جاٹوں کے کھیتوں کے پاس پہنچا، دیکھا کہ پیر اسلم جٹ صاحب نے نال کاٹ کر پانی اپنے کھیت کی طرف موڑا ہوا ہے۔ اب مجھے حیرانی ہوئی۔ مَیں نے کہا، پیر صاحب، آپ کو کیوں شرم

نہیں آتی؟ یہ سر پر سبز پگڑی رکھتے ہو اور رزق سارا حرام کھاتے ہو۔ کہنے لگا، روحانیت اپنی جگہ اور روٹی روزی اپنی جگہ۔ بہر حال اِس نے اپنی عادت نہ چھوڑی، حتیٰ کہ مَیں نے کھیتوں کو پانی لگانا چھوڑ دیا اور والد صاحب کو صاف کہہ دیا، ابا جی یہ دُنیا بے ایمانوں کا سٹیج ہے جہاں مَیں اداکاری نہیں کر سکتا۔

کپاس کی چوری اور چوروں کو مور پڑنا

اِس کے باوجود کہ مَیں چور نہیں تھا، مجھے پیر اسلم جٹ کی اِس بات پر بہت رنج ہوا اور مَیں نے ٹھان لی کہ اس کو سبق سکھا کے دم لوں گا۔ مَیں نے اپنے ایک دوست صادق سے کہا، میاں یہ معاملہ ہے، اِس کا کوئی بندوبست ضرور کریں۔ اُس نے کہا آپ فکر ہی نہ کریں۔ اِس کا تین ایکڑ کپاس کا کھیت تیار کھڑا ہے۔ ہم رات کو اِس کی کپاس چُن لیتے ہیں۔ لیجئے اُس رات ایک میرا چچا زاد علی اختر، ایک مَیں اور ایک صادق اور اُس کا چھوٹا بھائی، ہم چاروں آدھی رات کو پیر اسلم کے کھیت میں جا گھسے اور کپاس چُننے لگے۔ صبح کی اذانوں تک چُن چُن کر کپاس کا ڈھیر لگا دیا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ مَیں اور میرا چچا زاد اس کپاس کو اپنے گھر نہیں لے جا سکتے تھے ورنہ وہ پٹائی ہوتی کہ الامان۔ صادق نے کہا ایسا کرتے ہیں، یہ کپاس اٹھا کر ساری میرے گھر لے چلتے ہیں۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مَیں کل اِسے گلوؤ دکاندار کو بیچ کر آپ لوگوں کو آپ کا حصہ دے دوں گا۔ جتنے بنیں گے پیسے آپ کو مل جائیں گے۔ ہم نے اِس بات پر اتفاق کر لیا اور کپاس اُٹھا کر صادق کے گھر رکھوا دی۔ اگلے دن جب شام کو صادق ملا تو ہم نے اپنے حصے کا مطالبہ کیا۔ اُس نے کہا دیکھو بھائی کل مَیں نے گلو کو بیچ دی ہے۔ کل ملا کر پچاس روپے کی فروخت ہوئی تھی۔ آپ دونوں کو دس دس روپے ملیں گے۔ کیونکہ ہم چاروں کے چالیس روپے اور باقی کے دس روپے میرے کیونکہ اُس کے بیچنے کا رسک تو مَیں نے ہی لیا تھا۔ مَیں نے کہا یار غضب کرتے ہو؟ تین من کے قریب کپاس تھی، ہم ساری رات چُنتے رہے، پیر اسلم کا کھیت اجاڑ دیا اور آپ دس روپے میں ٹرخا رہے ہو۔ وہ بولا بھائی گلو نے کہا ہے چوری کی کپاس لائے ہو، ابھی جا کر بتاتا ہوں، یوں اُس نے وہ ساری کپاس پچاس میں رکھ لی۔ اب مَیں

بھلا صادق سے کیا کہتا، صبر شکر کر کے وہی دس رکھ لیے۔ مگر دو سال بعد صادق نے بتایا، وہ کپاس اصل میں پانچ سو کی فروخت ہوئی تھی لیکن آپ کو اتنا حرام کھلانا مناسب نہیں تھا۔ آپ کو تو اپنا بدلہ لینے سے غرض تھی، وہ لے لیا، باقی کے مال پر تو میرا ہی حق بنتا تھا۔ مَیں نے کہا یار بہت حرامی ہو۔ اِسی طرح کی اِس کی حرام توپیوں کے کئی قصے ہیں جو آگے بھی مناسب جگہ پر آئیں گے۔

بے نظیر کی گودی میں

یہ 1988ء کا زمانہ تھا۔ جنرل ضیا عازم النار ہو چکا تھا۔ بے نظیر پاکستان آ چکی تھی اور الیکشن کی دھوم دھام تھی۔ مَیں غالباً نویں کلاس میں تھا اور باپ کی طرح بہت پُر جوش جیالا تھا۔ ہوا یہ کہ بے نظیر اوکاڑہ آئی، جلسہ کیا اور اُس کے بعد دیپالپور کو روانہ ہوئی۔ ہمارا گاؤں 32 ٹو ایل اوکاڑہ سے دیپالپور جاتے ہوئے رستے میں آتا تھا۔ ارد گرد کے لوگوں نے صلاح کی کہ محترمہ کا 32 موڑ پر استقبال کیا جائے۔ ہم دو چار لڑکے بالے سکول سے بھاگے اور 32 موڑ آ گئے اور جم کر سڑک پر کھڑے ہو گئے، ہجوم بہت بڑھ گیا تھا۔ بڑے لوگوں کی نسبت ہم لڑکوں کے قد اور صحت اگرچہ کمزور تھی مگر جذبہ اُن سے قوی تھا۔ جیسے ہی بے نظیر کی گاڑی آئی مَیں فوراً آگے بڑھ کر اُس کے دروازے سے لٹک گیا۔ بے نظیر کی گاڑی راؤ سکندر اقبال چلا رہا تھا۔ وہ خود اگلی سیٹ پر بائیں طرف بیٹھی تھی۔ اُس کے دروازے کا شیشہ کھلا تھا اور انچ بھر دروازے سے اُٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی مَیں نے اُبھر کر گاڑی کے اندر سر ڈالا، پیچھے سے ہجوم کا ریلا آگے بڑھا۔ اُن کے ایک ہی دھکے سے میرا اگلا دھڑ بے نظیر کی گودی میں جا گرا اور نچلا حصہ دروازے کے اُبھرے ہوئے شیشے پہ رہ گیا۔ اب جو اُوپر سے لوگوں کا پریشر اور دباؤ بڑھا، شیشہ جسم میں کھُب گیا۔ اُس کی تکلیف سے میری ایک دم چیخ بلند ہوئی۔ بے نظیر صاحبہ نے انتہائی خوف زدہ انداز سے لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنا شروع کیا تا کہ وہ پیچھے ہٹیں اور بچّے کی جان چھٹے، لیکن ہجوم بہت تھا اور کسی طور پیچھے نہیں ہٹ رہا تھا۔ تب اُس نے شور مچایا، بچّہ مر جائے گا، پیچھے ہٹو اور اُس کے ساتھ ہی سکندر اقبال سے کہا گاڑی جلدی سے آگے بڑھاؤ۔ سکندر اقبال نے جیسے ہی ریس دے کر گاڑی کو آگے جھٹکا دیا،

لوگ اِدھر اُدھر گر پڑے اِس طرح میرے اوپر سے لوگوں کا دباؤ کم ہوا۔ تب بےنظیر نے ایک دم مجھے اندر کھینچا اور دروازہ مکمل کھول دیا۔ اس عمل سے پہلے تو مَیں پوری طرح گویا بےنظیر کی گودی میں ہی جا بیٹھا لیکن دروازہ کھلتے ہی میں نے گاڑی سے نیچے چھلانگ لگا دی کہ دوبارہ نہ پھنس جاؤں۔ بڑی مشکل سے لوگوں کی ٹانگوں کے نیچے سے ہو کر ہجوم سے باہر نکلا اور دُور جا کر کھڑا ہو گیا۔ شیشہ کافی کھُب گیا تھا جس کے سبب مسلسل درد ہو رہا تھا۔ ایک بار تو یوں لگا فوت ہی ہونے والا ہوں۔ مَیں اپنی پسلیاں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہاں 5 منٹ کھڑے ہو کر بےنظیر نے چھوٹی سی ایک تقریر کی جو مجھے اپنی پسلیوں کے درد کے سبب گویا سنائی ہی نہیں دی۔ بس اُس کا ایک جملہ میرے کانوں میں گونج رہا ہے، اے ڈکٹیٹر سن لو، اِس قوم کے بچّوں کا یہ جذبہ ہے کہ وہ ہجوم کی پروا نہیں کرتے۔ یہ اتنے بےوقوف نہیں ہیں کہ اِنھیں دھوکا دیا جا سکے۔ یہ ظالموں کے آگے کبھی نہیں جھکیں گے۔

میاں انور کا قصہ

میاں انور اُسی میاں شفیع کا چھوٹا بیٹا تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ حضرت ایئرفورس میں تھے۔ باپ کے مرنے کے کافی عرصے بعد گاؤں میں آئے۔ مگر اِن کے آنے سے پہلے باپ کی غیرمنقولہ جائداد پر اِن کا بڑا بھائی میاں سرور قابض ہو چکا تھا۔ میاں شفیع کا ذاتی رقبہ بہت کم تھا جس میں سے اِسے دو تین ایکڑ ملے۔ لہٰذا بنیادی طور پر یہ ایک غریب آدمی تھے۔ مگر گاؤں میں آ کر اِن کے سر میں یہ سودا سمایا کہ والد کی طرح گاؤں کو ترقّی یافتہ گاؤں کی شکل دینی ہے اور جو کچھ بہت سی بُرائیاں پیدا ہو چکی ہیں اُنھیں دُور کرنا ہے لیکن یہاں قصہ یہ ہوا کہ گاؤں پہلے کی طرح نہ رہا تھا۔ معاشرہ بدل گیا تھا، قدریں تبدیل ہو گئی تھیں۔ دوم اِن کے بڑے بھائی کی خودسری، تعصب اور ضد کی وجہ سے لوگوں میں اِس خاندان کا وہ پہلا سا وقار بھی نہ رہا تھا۔ پھر یہ کہ اِن کا اپنا سگا بھائی بھی اِن کے خلاف تھا۔ اُس نے کچھ ایسے اقدامات کیے کہ گاؤں کے لوگ اِسے نیم پاگل سمجھیں۔

اِدھر ہمارے بھی بچپن کا زمانہ تھا، واقعی اِنھیں پاگل سمجھنے کی طرف مائل ہو گئے حالانکہ یہ کام

احمقانہ نہ تھے لیکن ہماری تربیت ایسے معاشروں کی مرہون ہے جہاں رائے عامہ سے ہٹ کر چلنے والا ہر انسان پاگل سمجھا جاتا ہے۔

شروع شروع میں تو خالی ہاتھ گاؤں سُدھارنے نکلے مگر جب نوجوانوں اور اکثر شر پسندوں نے بدتمیزی شروع کر دی تو اِنھوں نے طریقہ کار بدل لیا۔ ایک ہاتھ میں پستول لیا، دوسرے میں ڈنڈا اور چل میرے بیلی اللہ وارث۔ سب سے پہلے چوک چوراہوں پہ بے وجہ کھڑے لونڈوں کو گھر وگھری کیا کہ آتی جاتی خواتین کو گھورنے اور پان تھوکنے کا سلسلہ موقوف ہو۔ ذرا کسی نے چوں چراں کی نہیں، اِنھوں نے ٹھاہ گولی دبائی۔ وہ تو اللہ کا شکر فوجی بندہ ہونے کی وجہ سے نشانہ کبھی ٹھیک نہیں لگا ورنہ پچھلی عمر جیل میں رہتے اور خود اِن کی اصلاح ہوتی۔

خیر گلیوں گلیوں پھرتے، جہاں کہیں نظامِ حیات میں اصلاح کی گنجائش نکلتی وہیں دو بندے حاضر کرتے اور ڈگر کو صراطِ مستقیم پر لے آتے۔ رات کے اگلے پہر، پچھلے پہر، پہلے پہر اور سارے پہر گاؤں کی گلیاں ہوتیں اور میاں صاحب ہوتے۔ چور یار یعنی شب دار لوگوں نے ان کی وجہ سے اِس گاؤں سے گریز کیا۔ چند ہفتوں میں تمام آوارہ کتے مار دیے۔ سب نالیاں صاف ہو گئیں، سڑکوں کا کچرا اور گندا پانی اپنے اصلی مقام تک چلا گیا۔

یہاں اِن کے تین واقعات درج کرنا چاہوں گا جو بہت مزے کے ہیں۔ پہلا واقعہ یوں ہے کہ ایک دن مَیں ابھی صبح چارپائی پر ہی تھا کہ باہر کسی شور کی آواز سنائی دی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ مَیں اپنے بستر سے اُٹھا، باہر نکلا، دیکھا، سڑک پر اُستاد منشی فضل حسین کا بیٹا انتظار حسین بول رہا ہے اور اُن کے سامنے میاں انور کھڑا ہے۔ جب بات واضح ہوئی تو پتا چلا، بھٹی فیملی کا ایک آدمی اپنا مرا ہوا کُتا اِن کے خالی احاطے میں پھینک گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ بات خود ہمارے لیے بھی تشویش ناک تھی کیونکہ یہ احاطہ بالکل ہماری دیوار سے جڑا تھا اِس لیے بدبو ہم تک بھی پہنچتی۔ میاں صاحب اُسے کہہ رہے تھے، اِس کتے کی ٹانگ میں رسی ڈالیں اور دوبارہ اُسی کے گھر کے دروازے پر پھینک کر آئیں، مَیں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ انتظار نے حوصلہ کیا اور کتے کو باندھ لیا اور گھسیٹتے ہوئے اُن کے دروازے تک لے گیا۔ اب جب اُس آدمی نے دیکھا کہ میاں انور ساتھ ہے اور

اُس کے ہاتھ میں پستول بھی ہے تو وہ سامنے نہ آیا۔ جب کُتا پھینک کر واپس لوٹے تو میاں صاحب وہاں سے سیدھا آگے نکل گئے۔ اب انتظار صاحب اکیلے گھر لوٹنے لگے تو سامنے سے وہ شخص نکل آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ وہ انتظار حسین کے پیچھے دوڑا۔ اِدھر مَیں نے اندازہ کرلیا کہ یہ شخص کہیں ڈنڈا ہی نہ مار دے۔ انتظار بے چارا بہت ڈر گیا۔ اب میاں صاحب کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ اب مجھے بھاگ کر بیچ میں آنا پڑا۔ مَیں سامنے ہوگیا اور کہا کہ یہ کُتا واپس آپ کے گھر مَیں نے پھینکا ہے۔ اِدھر میرے ساتھ بات کرو لیکن وہ بھاگ بھاگ کر انتظار کی طرف ہی دوڑتا تھا۔ آخر مَیں بھی دودھ گھی کا پلا ہوا تھا، ہاتھ پاؤں بھی اچھے خاصے مضبوط ہو چکے تھے چنانچہ اُسے پکڑ کر نیچے پھینکا اور سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں انتظار اپنے گھر میں داخل ہوگیا۔ مختصر بات یہ کہ بہت مشکل سے اُس بلا کو دُور کیا۔ اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے، پوری اشرافیہ نے اپنے مردہ کُتے کمزوروں کے گھروں میں پھینک رکھے ہیں۔

میاں صاحب کا اکھاڑے پر حملہ

اُس زمانے میں لوگوں کی تفریحات میں سے ایک تفریح کھسروں کے مُجرے دیکھنا بھی ہوتی تھی۔ یہ ایک عام بات تھی۔ ہر گاؤں میں لوگ اِن کا ناچ دیکھتے تھے بلکہ کھاڑے کرواتے تھے۔ کُھسروں کے تھیٹر کو اُس وقت کھاڑا ہی کہا جاتا تھا۔ میاں صاحب کے خیال میں کھسروں کا ناچ سراسر دین کی تباہی تھی۔ اس لیے اُسے موقوف کرنے میں سردھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔

اِسی سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ میاں صاحب کی برادری ہی کے ایک آدمی نے باوجود روکنے کے، اپنے بیٹے کی شادی میں کھسرے بلوا لیے۔ رات کھاڑا جم گیا۔ اِدھر میاں صاحب نے جب اپنی رِٹ چیلنج ہوتے دیکھی تو دَورانِ مُجرا اکھاڑے میں نادر شاہ کی طرح داخل ہوئے کہ ایک قیامت ہی آگئی۔ بغل سے پستول نکالا اور گیس کے ہُنڈوں کو فائرنگ سکواڈ میں لے لیا۔ بس پھر ایسا ہوا کہ فضا میں کانچ کی بارش ہوگئی۔ کُھسرے مجرا گاہ میں اُچھلتے پھرتے تھے اور گھنگھرو اُن کے پنڈال میں بکھرتے پھرتے تھے۔

پیسے اُچھالنے والوں کی لنگیاں کھل کھل گئیں۔ ہر کوئی اِدھر اُدھر بھاگتا تھا۔ ایک کے اوپر دوسرا گرتا تھا اور چھپنے کی راہ ڈھونڈتا تھا۔ پل کی پل میں تماشائی خود تماشا بن گئے۔ اِدھر انھوں نے بے چاروں کے گیس کے ہنڈے توڑنے کے بعد ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ ڈھولکی بجانے والے، چمٹا بجانے والے اور اِسی طرح سب سازندے اپنا سامان بے سہارا چھوڑ کر بھاگ کر گرنے لگے اور چیخ و پکار شروع کر دی۔ ناچنے والے میاں صاحب کے قدموں میں گر گئے اور منتیں کرنے لگے۔ جب میدان خالی ہو گیا تو انھوں نے بغل سے ڈنڈا نکالا۔ اُن غریبوں کے ایک ایک جمایا۔ وہ اپنا سامان وہیں چھوڑ کر نکل بھاگے اور یہ خود وہاں کرسی لگا کر بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ وہیں نمازِ شب کی نیت کر لی اور سجدے میں گر گئے۔

وہ دن اور آج کا دن، ہمارے گاؤں میں مجرا نہیں ہوا اور کھسرے نہیں پلٹے۔ ہاں البتہ گاؤں نے دو چار خود پیدا کر لیے ہیں۔

گورکن سے لڑائی اور میاں صاحب کا سانپ

یہ سب باتیں تو ایک طرف، اب نہایت دلچسپ قصہ سنیے۔ گاؤں کی صفائی ستھرائی اور دین نافذ کرنے کے بعد میاں انور صاحب کو خیال آیا کہ قبرستان کو بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ جہاں دراصل قبریں ہونی چاہیے تھیں وہاں جھاڑ جھنکاڑ، سرکنڈے، عاک اور جھاڑیوں کے جنگل ہیں جن میں سانپ، بچھو اور سیکڑوں بلیات بھر گئیں ہیں۔ غرض قبرستان کا نقشہ ایسا ہے کہ اُسے دیکھ کر خُدا سے خوف کی جگہ کیڑوں مکوڑوں سے خوف آتا ہے۔

آپ نے فوراً گورکن کو کان سے جا پکڑا اور کہا 'حرام خور مفت کی روٹیاں توڑتا ہے۔ اِس کی صفائی تمھاری اماں نے کرنی ہے؟'

میاں صاحب نے گورکن کے ساتھ خود بھی پھاوڑا پکڑ لیا۔ لیجیے قبروں کی صفائی شروع ہوئی اور چند دنوں میں جھاڑیاں صاف ہوئیں اور سب قبریں نئی نئی بن گئیں، جہاں نہیں بھی تھیں وہاں بھی بن گئیں۔ اس عرصے میں بے شمار سانپ نکلے جنھیں میاں صاحب پکڑ پکڑ کر گھڑے میں ڈالتے

گئے۔ ایک دن ہوا یہ کہ ایک قبر کی صفائی کے دوران میاں صاحب اور گورکن میں صاحب قبر کے کردار پر اختلاف ہو گیا۔ گورکن کا کہنا تھا کہ 'اس مرنے والے نے ایک دفعہ میرا ٹیپ ریکارڈر چوری کر لیا تھا۔ پھر میری ٹیپ کی واپسی کے تقاضے پر مجھے مارا بھی تھا چنانچہ میں یہ قبر صاف نہیں کروں گا۔ دوسری طرف میاں صاحب کا کہنا تھا 'مرنے والا قبر کے اندر ہے، ہم نے صفائی باہر سے کرنی ہے۔

اختلاف کے بعد تلخ کلامی ہوئی، اُس کے بعد گالی گلوچ اور پھر دھینگا مشتی۔ میاں صاحب کا منہ دو چند ہو گیا۔ پستول گھر رکھ کے گئے تھے کہ کون سا مُردوں کے ساتھ لڑائی کا امکان ہے۔ اب خالی ہاتھ کیا کریں؟! اچانک اُن کو ایک ترکیب سوجھی فوراً گھڑے کا ڈھکن کھول کر ایک سانپ نکال لیا اور گورکن کو ڈرانے کی طرف مائل ہوئے۔

اب گورکن سانپ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور میاں صاحب اُسے سر کی طرف سے پکڑے گورکن پر جھکے پڑے ہیں۔ گورکن نے موت کو جب یوں آنکھوں کے سامنے لٹکتے دیکھا تو ڈیلے اُبل کر باہر آ گئے۔ دونوں بڈھے ساٹھ سال کے۔ چیخ پکار کا شور بلند ہوا تو ہم بھی لڑکے بھاگ کر وہیں جمع ہو گئے۔ سانپ کے ڈر سے کوئی آگے نہیں بڑھتا تھا۔ میاں صاحب کے سانپ والے ہاتھ کو گورکن نے دونوں ہاتھوں سے پورے زور سے پکڑا ہوا تھا۔ آخر 15 منٹ بعد جب گورکن ہانپ کر گر گیا اور میاں صاحب بھی تھک کر گرے تو اُن کے ہاتھ سے سانپ خود بخود چھوٹ کر گورکن کے سینے پر جا پڑا جسے دیکھتے ہی گورکن بے ہوش ہو گیا۔ اُدھر میاں صاحب نے دیکھا کہ سانپ تو اب سچ مچ اِسے ڈس لے گا اور وہ یہ سوچ کر بے ہوش ہو گئے۔ مگر ہوا یہ کہ جس وقت میاں صاحب نے سانپ کو سختی سے پکڑ رکھا تھا اور دھینگا مشتی جاری تھی تو سانس بند ہونے کے سبب وہ غریب اسی وقت اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔

خیر گاؤں والے دونوں بے سدھ بڈھوں کو اُٹھا کر ہسپتال لے آئے۔ اگلے دن دونوں پھر قبرستان کی قبریں صاف کرتے پائے گئے۔ آج اُن دونوں کی قبریں بھی اُسی قبرستان میں موجود ہیں۔ رہے نام اللہ کا!

چن پیر

آپ دُنیا کے کسی گاؤں اور کسی قصبے میں چلے جائیں، آپ کو دو چیزیں وہاں ضرور ملیں گی۔ ایک چن پیر نام کا بزرگ اور دوسری سات گزے پیر کی قبر۔ ہمارے ہاں بھی یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ سات گزے کو تو رہنے دیجیے البتہ چن پیر کا قصہ سن لیجیے۔

ہمارے گاؤں میں ایک آدمی اکرم چکی والا ہے۔ سکول کے بالکل ساتھ ہی اس کا گھر اور آٹے کی چکی ہے۔ یہاں ایک دو نیم کے بڑے درخت تھے جن کا سایہ بہت تھا۔ اِس چکی کے دروازے پر ایک چار پائی اور تین چار مونڈھے پڑے رہتے اور حقہ تازہ لگا رہتا۔ اِن موڈھوں اور چار پائی پر دو چار آدمی ہر وقت بیٹھے رہتے اور گپیں ہانکتے۔ مَیں بھی یہیں بیٹھ جاتا تھا۔ اکرم چکی والا بہت دھیمے مزاج کا بھلا آدمی تھا۔

اکرم چکی والا اور اُس کا کنبہ اصل میں راوی کے علاقے سے آئے تھے۔ وہیں یعنی راوی کے علاقے سے ہی اِس کے ہاں ایک پیر آیا کرتا تھا۔ جانگلی زبان بولتا تھا اور اکثر باہر چار پائی پر ہی بیٹھتا تھا۔ اُس کا نام چن پیر تھا اور بہت موٹا تھا۔ پہلے تو پیر صاحب کبھی کبھی اپنے مرید کے ہاں چکّر لگاتا تھا۔ پھر مسلسل آنے لگا اور پھر کچھ عرصے بعد اُس نے واپس جانا ہی چھوڑ دیا، اور وہیں فوت ہوا، فوت کیسے ہوا؟ یہ ایک افسوسناک حقیقت تھی جس کا بیان تھوڑی دیر میں آئے گا۔

القصہ اب یہ چن پیر اکرم چکی والے کے ہاں رہنے لگا اور جو دال ساگ اُس کے ہاں پکتا، کھا لیتا۔ اُس کے یہاں مسلسل رُکے رہنے سے ہمارے بھی پیر صاحب سے اچھے تعلّقات بن گئے۔ یہ ایک غریب آدمی تھا اور روٹی پانی کو پھاہا لگائے بیٹھا تھا۔ پیر صاحب ایک معصوم فطرت اور سادہ آدمی تھا۔ موٹا بہت تھا اِس لیے گرمیوں میں اِسے گرمی بہت لگتی تھی اور یہ کبھی کی چار پائی پر پڑا گرمی سے تنگ آ کر اللہ میاں کو کوسنے دینے لگتا تھا۔ کبھی تو گالی تک دے ڈالتا تھا۔ ہم لڑکے بالے اِس کی باتوں سے بہت ہنستے تھے، جو لطیفوں سے کم نہ ہوتی تھیں۔ اسلام کے متعلّق اِس کی معلومات انتہائی معصوم تھیں۔ چند ایک آپ بھی سن لیں۔

اُس کا کہنا تھا، روزے صرف امیر آدمی کے لیے ہیں، غریب آدمی تو ساری عمر روزے سے رہتا ہے۔ اِس لیے اُسے ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔ خود بھی ٹینشن نہ لیتا۔ آرام سے حقہ پیتا رہتا۔

نماز کے متعلق بھی اُس کا بیانیہ سادہ تھا کہ یہ گنہگاروں کے لیے ہے اور غریب کو گناہ کا موقع ہی نہیں ملتا۔ نماز کا موقع کیسے ملے۔

جہاد کے بارے میں اُس کی رائے تھی، جہاد صرف پٹھانوں کے ساتھ جائز ہے۔

زکوٰۃ کے متعلق فرماتے یہ ہر اُس آدمی کے لیے حلال ہے جو خود نہیں دے سکتا۔

پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں فرماتے کہ پڑوسی صرف گاؤں میں ہوتے ہیں اِس لیے اِن کے حقوق بھی گاؤں میں ہیں۔ شہر میں سب ایک دوسرے کے دُشمن ہوتے ہیں۔

گرمی کے بارے میں ارشاد تھا، یہ اللہ کی وہ آگ ہے جس کے ذریعے غریبوں کی عقل مارتا ہے تاکہ امیر لوگ ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر اُن کے لوٹنے کے ذرائع تلاش کریں۔

کھانے کے متعلق فرماتے کہ ایک دن میں ایک آدمی کو بیس سے زیادہ روٹیاں نہیں کھانی چاہئیں، اِس سے رزق ضائع ہوتا ہے۔ خود بھی اِسی تعداد پر اکتفا کرتے۔

پانی کے بارے میں ارشاد تھا کہ صرف میٹھا اور شکنجبین پینی چاہیے۔ سادہ پانی پینے سے بندہ گنہگار ہوتا ہے۔

سالن کے بارے میں فرماتے کہ دیسی مرغ انسان کے کھانے کو بنا ہے، باقی سب ہماری اوچھی ایجادات ہیں۔

چن پیرا اور شہد کی مکھیاں

ایک دن کا ذکر ہے اور یہ دن جولائی کی سخت گرمی کا تھا۔ دوپہر کا عالم تھا۔ سکول میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ سکول میں ایک پانی کی ٹینکی ہوتی تھی۔ جس میں بہت ٹھنڈا پانی ہر وقت جمع رہتا تھا کیونکہ اِس ٹینکی پر ہر وقت پیپل کا گہرا سایہ رہتا تھا اور پڑوس کے اکثر لوگ یہاں نہانے چلے

آتے۔ مَیں اور میرا ایک دوست جس کا یہاں نام لینا مناسب نہیں، سکول میں یونہی اُسی پیپل کے سائے میں بیٹھے تھے۔ اِس کی شاخوں پر دو تین شہد کی مکھیوں کے چھتے لگے ہوئے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ چن پیر صاحب لوٹا اُٹھائے پانی کی ٹینکی کی سمت چلے آتے ہیں۔ اُن کی غرض یہ تھی کہ معمول کے مطابق اچھے سے نہا کر گرمی دُور کریں۔ چن پیر صاحب نے اپنا کُرتہ اُتار دیا۔ ٹینکی کے پہلو میں ایک پتھر پر بیٹھ گئے اور پانی کے لوٹے بھر بھر کے اپنے اوپر ڈالنے لگے تو میرے دوست کو ایک شرارت سوجھی، مجھے کہنے لگا، ہم شہد کی مکھیوں کے چھتے پر اینٹ مار کے بھاگ جاتے ہیں۔ پیر صاحب مکھیوں میں پھنس جائیں گے اور ہم دُور بیٹھے تماشا دیکھیں گے۔ ابھی مَیں اُسے اِس خیال پر ملامت ہی کر رہا تھا کہ اُس نے اپنے اِس قبیح خیال پر عمل بھی کر دیا۔ اب ہوا یہ کہ ہم تو بھاگ اُٹھے اور ساری مکھیاں پیر صاحب پر آ پڑیں۔ وہ بے چارے پہلے ہی اتنے موٹے اور سانس کی تنگی کے مارے تھے، اِن مکھیوں سے کیا مقابلہ کرتے۔ بڑی مشکل سے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے سکول سے باہر نکلے۔ تب ایک ڈاکٹر نے اُنھیں اینٹی الرجی انجیکشن لگا دیے لیکن دو تین دن میں چل بسے۔ مجھے آج تک یہ واقعہ نہیں بھولتا۔ خُدا بخشے کسی کے اچھے بُرے میں نہ تھے۔ بالکل معصوم آدمی تھے۔

گنے کی مِل اور ''کیمیا گر'' کا صفدر

مَیں دسویں جماعت میں ہی تھا۔ ہمارا دو ایکٹر گنا تھا۔ اِسے ٹیٹرون نسل کا گنا کہتے تھے، بہت میٹھا اور وزنی ہوتا تھا۔ اِس گنے کی قسم کو چوہا بہت کھاتا تھا۔ گنے کی فصل بہت زیادہ ہوئی تھی۔ اُن دِنوں لوگوں نے اپنے اپنے گڑ بنانے کے ویلنے لگائے ہوئے تھے۔ زمیندار اِنھی ویلنوں کے ذریعے مقامی طور پر شکر اور گڑ بناتے تھے۔ مِلوں کو گنا بہت کم دیتے تھے۔ ہم نے بھی ایک ویلنا لگا لیا تھا۔ ابھی تین چار من شکر ہی بنائی تھی کہ حکومت نے مل مالکان سے مل کر کسانوں کے خلاف ساز باز کی اور اور زبردستی کسانوں کے ویلنے اکھاڑنے شروع کر دیے تاکہ وہ اپنا گنا شوگر مِلوں میں بیچیں۔ پولیس کی گاڑیاں بھر بھر کے آتیں اور کسانوں کے ویلنے اُکھاڑ کر لے جاتیں۔

کسانوں کو بھی کچھ ہفتوں کے لیے اٹھا لے جاتیں۔ اِسی سلسلے میں کسانوں اور پولیس کے درمیان بہت جگہ سر پھٹول ہوئی۔

یہ سلسلہ جنرل ضیا نے شروع کیا تھا۔ بزنس مینوں اور بڑے زمینداروں کو خوش کرنے اور اپنی حکومت کو طول دینے کے لیے اُس نے کئی حربے استعمال کیے تھے۔ اُن میں یہ بھی ایک چیز تھی۔ اِس کام کو اُس کے ٹٹو نواز شریف نے تیزی سے آگے بڑھایا۔ یہ صرف گنے کی حد تک نہیں تھا بلکہ تمام فصلوں کی مقامی طور پر کھپت کو ختم کر کے کسانوں کو بزنس مینوں کے لیے فقط خام اجناس مہیا کرنے کا ایک کردار بنا کے رکھ دیا۔ تاکہ تمام فائدہ بزنس کمپنیوں، بڑے بلیک مارکیٹوں کے مالکان اور تاجر مافیا کو پہنچے۔ ضیا کا منشور تھا کہ مافیاز کو طاقت دے کر عوام کو اُن کے شکنجے میں جکڑ دیا جائے، پھر وہ جدھر چاہیں چھوٹے کسانوں اور عوام کو کان سے پکڑ کر پھرائیں۔ اس طرح عوام میں سے ضیا کی طرف کوئی آنکھ نہ اُٹھائے۔ افسوس کہ بعد میں پیپلز پارٹی نے بھی اِسی سلسلے کو جاری رکھا۔

قصہ مختصر ہمارا اوپلنا بھی پولیس لے گئی۔ چنانچہ ہمیں باقی گنا اوکاڑہ میں قائم بابا فرید شوگر مل میں لے جانا پڑا۔ گھر میں میرے سوا سب چھوٹے تھے۔ ہم نے ایک ٹریکٹر اور ٹرالہ کرائے پر لیا، اُس پر بڑی محنت سے گنا لادا۔ کچھ نہ پوچھیے کتنا وقت گنا کاٹنے اور لادنے میں لگا۔ دو تین دن میں یہ کام ہوا۔ والد صاحب نے گنے کے ساتھ مجھے بھیج دیا کہ مِل میں دے کر پیسوں کا پرمٹ لے آؤں۔ جیسے ہی ٹریکٹر دیپالپور روڈ پر چڑھا۔ اُنچاس اڈے سے پہلے ہی ایک بس کو کراس کرتے ہوئے ناتجربہ کار ڈرائیور کے ہاتھوں ٹریکٹر ایک گڑھے میں اُتر گیا اور گنوں کی ٹرالی اُلٹ گئی۔ لیجیے جناب اب یہ ایک نئی مصیبت پڑ گئی۔ جو لوگ گنے مِلوں پر لے کر جاتے ہیں وہ اس مصیبت کو سمجھتے ہیں کہ گنوں کی اُلٹی ہوئی ٹرالی دوبارہ لوڈ کرنی کتنی مشکل ہے۔ دوسرے دن شام تک جا کر یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ یوں تین چار دن کی تھکاوٹ اور کام کی شدت نے مجھے نڈھال کر کے رکھ دیا۔ جب ہمارا گنا مِل میں پہنچا تو دیکھا کہ مِل کے کنڈے پر چڑھنے کے لیے ایک کلومیٹر کی لمبی لائن لگی ہوئی ہے۔ لہذا مِل کے اُن بوسیدہ برآمدوں میں ہی ٹھہرنا پڑا جہاں گنے لے کر آئے ہوئے ڈرائیور اور کسان حضرات کو کئی کئی دن رُکنا پڑتا تھا۔ اِن برآمدوں میں کافی

ساری ہوٹلیں تھیں۔ فرش پر گنے کے چھلکوں سے فرش بچھایا ہوا تھا۔ یہ سردیوں کے دن تھے۔ زمیندار اپنے گھروں ہی سے سونے بیٹھنے کا بندوبست کر کے نکلتے تھے۔ اِس عرصے میں اُنھیں ٹریکٹر ٹرالیوں کا کرایہ بھی پڑتا تھا۔ گنا بھی سوکھنے لگ جاتا تھا اور وزن کافی کم ہو جاتا تھا۔ پھر گنے سے کاٹ بھی کرتے تھے۔ اُس کے بعد تین چار مہینے پیسوں کے لیے انتظار کروایا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ کسان کے ہاتھ میں سوائے ہاتھ ملنے کے کچھ نہیں بچتا تھا۔ بعض زمیندار وہیں چلتے پھرتے بیوپاریوں کے ہاتھوں لدا لدایا گنا سستے داموں بیچ کر اور نقد پیسے وصول کر کے جان چھڑا لیتے تھے۔ مجھے تب اِس قسم کے بیوپاریوں کا علم نہیں تھا چنانچہ مَیں اپنی باری آنے تک وہیں رُک گیا۔

خوش قسمتی یہ ہوئی کہ گھر سے آتے ہوئے مَیں ایک ڈائجسٹ ''کیمیا گر'' اٹھالایا تھا۔ اِس کا ہیرو صفدر علی پہلے سونا بنانے کے لیے ایک بوٹی تلاش کرنے تبت کی پہاڑیوں میں جا نکلتا ہے، پھر کئی مصیبتوں کا شکار ہوتا ہے۔ کئی لوگوں کو قتل کرتا ہے۔ پھر اُس کے ہاتھ ایک پارس پتھر لگ جاتا ہے۔ غرض یہ کہ یہ تین یا چار جلد میں بہت عمدہ اور دلچسپ ناول تھا۔ مَیں اِس میں گم ہو گیا۔ وہیں رات برآمدوں میں سو جاتا اور آٹھوں پہر اِس ڈائجسٹ کو پڑھتا۔ جب ایک جلد ختم ہو جاتی، پاس ہی دو کلومیٹر پر اوکاڑہ شہر تھا، وہاں سے دوسری جلد، پھر تیسری لے آیا۔ تین دن تک مَیں اِسی مِل کے علاقے میں رہا۔ عجیب لوگ دیکھے۔ اِس ڈائجسٹ میں ہیرو جان پر کھیل کر کئی ایسے قدم اٹھاتا تھا جس میں اُسے فتح ہوتی تھی۔ مجھے مِل کی انتظامیہ اور اپنی مشکلات سے بہت دفعہ یہ خیال آیا کہ اِسی ہیرو کی طرح مَیں بھی کوئی ایسا قدم اُٹھاؤں کہ پوری مِل میں بھونچال آ جائے۔ اِس فتنہ خیز خیال کو مدِ نظر رکھ کر مَیں نے پوری مِل میں چل پھر کر جائزہ لیا کہ کہاں پر آگ لگائی جا سکتی ہے، جس سے پوری مِل جل کر بھسم ہو جائے۔ کبھی خیال آتا کہ مِل اگر جل گئی تو مِل مالک نے تو کروڑوں روپے کی انشورنس کروائی ہو گی۔ یہ تو سب پیسے ہفتوں میں انشورنس کمپنی سے کھرے کر لے گا مگر اتنے ہزار ٹن گنا جو کسان بے چارے لے کر آئے ہوئے ہیں یہ بھی سب برباد ہو جائے گا۔ اُلٹا اِنھی کو نقصان ہو گا۔ اس کے باوجود دماغ میں کیمیا گر ناول کے ہیرو کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے عجیب عجیب مفسد قسم کے خیال آتے۔ مثلاً یہ کہ موقع پا کر کنڈے پر گنا تولنے والے منیجر کو

موقع پا کر قتل کر دوں۔ ہو سکے تو مِل مینجر کو قتل کر دوں، جس نے اتنی سست رفتاری سے کام جاری رکھا ہے۔ اُس سے کسانوں کا کتنا زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔ یہ سب خیالات کچے پکے اِسی طرح ذہن میں پک رہے تھے کہ تیسرے دن عشأ کے وقت مجھے خبر ملی کہ میرا گنا کنڈے پر چڑھ گیا ہے۔ مَیں نے تمام منصوبے وہیں ادھورے چھوڑے اور پرمٹ لے کر آدھی رات گھر پہنچ گیا۔ اُس کے بعد کبھی مِل کا رُخ نہیں کیا بلکہ کبھی گنا کاشت ہی نہیں کیا۔

گندم کی کاشت اور کٹائی

مجھے گندم کاشت کرنے اور کاٹنے کا اچھا خاصا تجربہ رہا۔ کاشت یعنی بوائی میں تو خیر ایسی کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ سردیوں میں یعنی نومبر کے آخر یا دسمبر کے شروع میں اِس کی کاشت کی جاتی ہے۔ ایک ایکڑ میں چالیس کلوگرام گندم کا بیج پھینکا جاتا ہے۔ اِس کے کاشت کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے زمین میں پانی بہایا جاتا ہے، پھر انتظار کیا جاتا ہے کہ تھوڑی خشک ہو جائے، اِس عمل کو وتر کہتے ہیں۔ یعنی زمین خشک اور نرم ہو تو کہتے ہیں کہ اب پہلی وتر پر آ گئی ہے۔ اُس کے بعد اُس میں ہَل چلایا جاتا ہے۔ پہلے پہل بیلوں کے ذریعے ہَل چلتے تھے، پھر ٹریکٹر آ گئے۔ ہم ٹریکٹر سے ہَل چلواتے تھے۔ اُس کے بعد اُس میں پوٹاش کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔

ایک ایکڑ میں اُن دِنوں 80 کلو نائٹروجن، 32 کلو فاسفورس اور 90 کلو پوٹاش استعمال کرتے تھے۔ گائے بھینسوں کا گوبر بھی زمین میں ڈالا جاتا تھا۔ گندم کی اچھی پیداوار کے لیے فاسفورس کے بجائے نائٹروجن اور پوٹاش کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ درمیانی زمینوں میں نائٹروجن، فاسفورس اور فصل حاصل کرنے کے لیے یہ کھادیں ضروری ہوتی تھیں۔ کچھ کھادیں بیج ڈالنے سے پہلے ڈالتے تھے۔ کچھ بعد میں اور کچھ جب بیج پودے بن جاتے تھے تب پانی لگانے کے ساتھ اُس میں کھاد کا چھڑکاؤ کرتے تھے۔ مَیں بھی یہ سب کچھ اپنے ہاتھ سے کرتا رہا۔ یہ تمام کام سردی کے موسم میں انجام دینے ہوتے تھے، اس لیے بعض اوقات کلفت سے گزرنا پڑتا تھا۔ لیکن مزہ آتا تھا۔ اُن دِنوں سردیاں بہت زوروں کی پڑتی تھیں۔ زمین پر برف کی پپڑیاں جم

جاتیں۔ یہ برف کی باریک تہیں گندم کے پودوں پر بھی جم جاتی تھیں۔ اِسے کورا کہتے تھے۔ کسانوں میں یہ بات مصدقہ تھی کہ جتنا زیادہ کورا پڑے گا اتنا ہی گندم کی فصل اچھی ہوگی۔ ایک دفعہ مَیں رات کو گندم کی فصل کو پانی لگانے گیا تو عجیب واقعہ ہوا۔ کھیت میں پانی پھیل رہا تھا۔ رات کا اندھیرا خوب تھا۔ ایسے اندھیرے میں کسان لوگ کھیت میں خود چل کر دیکھتے ہیں کہ کہیں کھیت کسی جگہ سے خشک تو نہیں رہ گیا۔ ننگے پاؤں سے چلتے تھے۔ مَیں بھی کھیت میں چلنے لگا۔ اچانک میرے پاؤں سے کوئی شے ٹکرائی۔ مَیں نے سمجھا سانپ ہے کیونکہ اُس کے چلنے سے پانی میں ایک لمبی سی لکیر محسوس ہوئی۔ مَیں ڈر گیا اور کھیت سے باہر جانے کے لیے بھاگ اٹھا۔ میرے بھاگنے سے وہ اور زیادہ بھاگا۔ لہٰذا ہم ایک دوسرے کے پاؤں سے ٹکراتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ کھیت سے باہر نکل کر دیکھا تو وہ چوہا تھا۔ دراصل جب وہ بھاگتا تھا تو پانی کی ایک لمبی لہر سی پیچھے پیدا ہوتی تھی جسے مَیں سانپ سمجھ لیتا تھا۔ لیکن اُس چوہے کم بخت نے میرے چھکے چھڑوا دیے تھے۔ کسانوں کو چونکہ اکثر پانی لگاتے ہوئے سانپ کاٹ لیتے تھے، تو میرے لاشعور میں بھی یہ خوف ہمیشہ رہتا تھا۔

اُس کے بعد مئی میں گندم کی کٹائی ہوتی تھی۔ تب لوگ اپنے ہاتھوں سے اور درانتی سے ہی گندم کاٹتے تھے۔ یہ ایک نہایت مشکل اور صبر آزما کام تھا۔ ایک تو شدید گرمی کے دن ہوتے۔ گندم کاٹتے ہوئے گرد وغیرہ ناک، کان اور منہ میں ایسے گھس جاتی کہ الامان۔ تمام دن درانتی سے کٹائی کرنا، پھر پرالی کے سُبڑ بنا کر اُن میں گندم کے گٹھڑ باندھنا۔ اُس کے بعد تھریشر میں اُسے ڈال کر گندم نکالنا۔ یہ تمام کام نہایت کٹھن اور کھپا دینے والے تھے۔ جو بہر حال کرنا پڑتے تھے لیکن اِن معاملات میں کسانوں کے ہاں ایک چہل پہل ہوتی تھی، ونگاریں ہوتی تھیں۔ لوہار درانتیاں بناتے تھے۔ لوگوں کے گھروں میں کھانے پکتے تھے۔ میٹھے چاولوں اور پلاؤ اور آلو گوشت سے تواضع کی جاتی تھی۔ کمھاروں کے ہاں پچاس ساٹھ گدھوں کی لائنیں لگی ہوتی تھیں، وہ تمام غلّہ ڈھوتے تھے۔ پورا بیساکھ ہاڑ رونقیں لگی رہتی تھیں۔ اب یہ ساری چیزیں بدل گئی ہیں۔ سب کچھ پل دو پل میں منڈی پہنچ جاتا ہے۔ جدید مشینری اور بزنس مین طبقے نے اقدار بھی بدل

دی ہیں، رشتے بھی ختم کر دیے ہیں۔ ایک پل میں کٹائی کی مشینیں آتی ہیں اور صفایا کر کے چلی جاتی ہیں۔ یوں گندم کی کاشت اور کٹائی کا معاوضہ بیس گھروں میں جانے کی بجائے ایک ہی گھر میں جمع ہو جاتا ہے۔

عجائب گھر کے مُردے کا قتل

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے یعنی جب مَیں لاہور یونیورسٹی مَیں پڑھاتا تھا، اپنے ایک اپر مڈل کلاس مارکسی دوست سے طبقاتی تقسیم پر لیکچر لے کر نیر علی دادا کی نیرنگ گیلری سے نکل رہا تھا۔ اُسی لمحے عقب سے کسی نے 'اکبر' کہہ کر پکارا۔

مُڑ کر دیکھا تو ایک پہچانی صورت نظر آئی۔ یہ شخص بوسیدہ اور میلے کپڑوں میں ملبوس ربر کے ٹوٹے چپل پہنے کھڑا تھا۔ غور سے دیکھا تو میرے بچپن کا دوست صادق تھا۔ میں بھاگ کر انتہائی جوش کے ساتھ گلے ملا۔

صادق نہ صرف میرے گاؤں کا تھا بلکہ ہمسایہ بھی تھا اور آج بیس سال بعد ملا۔ میرا مارکسی دوست یہ منظر دیکھ کر کچھ پریشان سا ہوا کہ کس طرح کے میلے کچیلے بندے سے جپھیاں ڈال رہا ہے۔ اُس نے صادق سے تین انگلیاں ملا کر سلام لیا۔ میں نے ارادہ ظاہر کیا کہ تھوڑی دیر واپس گیلری میں بیٹھتے ہیں، صادق کے ساتھ وقت گزارتے ہیں، گپ شپ کرتے ہیں اور کھانا کھلا کر رخصت کرتے ہیں، مگر میرے مارکسی دوست نے ایک میٹنگ میں شریک ہونا تھا جس میں اُس کی مزدُور اور طبقاتی تقسیم پر گفتگو تھی، اِس لیے وہ اپنا عذر بیان کر کے چلا گیا۔ مجھے ایسی میٹنگوں یا تقریبوں سے کچھ دلچسپی نہیں تھی اور وقت بھی میرے پاس کافی تھا اِس لیے میں صادق کو لے کر واپس گیلری میں آ گیا۔ گیلری کے اندر واقع ریستوراں کے سُرمئی اور رومان انگیز ماحول کو دیکھ کر صادق بہت خوش ہوا، کہنے لگا: 'یار اکبر، تُو واقعی بڑا آدمی بن گیا ہے۔ بڑے لوگوں کے ساتھ گھومتا ہے اور ایسی جگہوں میں بیٹھ کر کھانے کھاتا ہے جہاں حوروں جیسی لڑکیاں بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتی ہیں۔

میں نے کہا 'چھوڑ میاں اِن سب باتوں کو، سب گھپلا ہے۔ تُو یہ بتا آج کل کہاں ہے اور کیا

کرتا ہے اور اِس جگہ کیا کرتا پھرتا ہے؟

اُس نے کہا ’میں اِدھر داروغہ والا میں کسی کے مکان پر مزدُوری کر رہا ہوں۔ اللہ کا کرم ہے، ایک ہزار کی دہاڑی لگ جاتی ہے۔ میں تو بھائی اتوار بھی نہیں چھوڑتا۔ مہینے کا تیس ہزار بن جاتا ہے۔ پانچ، چھ ہزار میرا اپنا خرچہ ہوتا ہے باقی گھر بھیج دیتا ہوں۔ یہاں پنجاب کارڈیالوجی میں ای سی جی کرانے آیا تھا اور ٹُول گیا۔ تیرا تو سنا ہے ڈبی لگا ہوا ہے۔ سارے مُلک میں مشہور ہے۔ لوگوں کو جھوٹی مُوٹی کہانیاں سنا کر پیسے کماتا ہے؟

اِنہی باتوں کے دَوران میں نے کھانا منگوایا، صادق نے بڑی رغبت سے کھانا شروع کیا۔ اِس دَوران گیلری کا عملہ اور دیگر لوگ مسلسل ہمیں ناگواری سے دیکھتے رہے۔ اُنھیں صادق کے کپڑوں اور مکمل دیہاتی حلیے سے شکایت تھی جو کم از کم اِس جگہ کے لیے مناسب نہیں تھے۔ اِس بات کا مجھے بھی احساس تھا مگر وہاں بیٹھے کچھ لوگوں سمیت گیلری کا عملہ مجھے جانتا تھا چنانچہ کچھ کہنے سے قاصر تھے۔

ہم نے وہاں بیٹھے بچپن کی بہت یادیں دہرائیں، بیتے موسموں کو یاد کر کے اُجڑے دن آباد کیے۔ اُن میں سے ایک دو دلچسپ یادیں اِنہی دِنوں کی تھیں جب مَیں دسویں جماعت میں تھا۔ ہم اُن باتوں پر بہت ہنسے، چلیے آپ بھی سن لیجیے۔

ایک دن صبح سویرے ہم دونوں سائیکل پر گاؤں سے اوکاڑہ شہر آئے اور اُسی وقت ہنگامی منصوبہ بنا لیا کہ ابھی ریل پر بیٹھ کر لاہور چلتے ہیں۔ تب ہم نے اپنے گاؤں میں لوک گلوکاروں سے انارکلی بازار اور شالامار کے گانے اور لطائف سن رکھے تھے اور سوچتے تھے یہ مقام بھی بہشتِ بریں سے آگے کے ہوں گے۔ مَیں لاہور کئی بار پہلے آ چکا تھا لیکن وہ صرف کتابیں لینے کا چکّر ہوتا تھا۔ سیر سپاٹے کا وقت نہیں نکل پاتا تھا۔

اِس بار ارادہ ہمارا کچھ اِس طرح ہوا کہ ابھی صبح آٹھ بجے کی لاہور جانے والی خیبر میل پر بیٹھ کر ساڑھے دس بجے لاہور کے بڑے سٹیشن پہنچ جائیں گے۔ عصر تک انارکلی بازار، شالامار باغ اور مینارِ پاکستان کے میدانوں میں پھر پھرا کر شام پانچ بجے کی تیز گام پکڑ کر دوبارہ اوکاڑہ بسرام

کریں گے اور گھر والوں کو کچھ پتا نہ چلے گا کہ کہاں کہاں سے ہو آئے ہیں۔

اب سنیے اصل قصہ۔ ہم نے اپنی سائیکل وہیں اوکاڑہ کے ریلوے سٹیشن کے سٹینڈ پر کھڑی کی اور پورے آٹھ بجے لاہور جانے والی خیبر میل میں بیٹھ گئے۔

ریل نے ہمیں 11 کے عمل میں لاہور سٹیشن پر لا پھینکا۔ لاہور کے آثار و احوال کی ہمیں ذرا خبر نہ تھی۔ کون سی جگہ کس مقام پر ہے؟ پہلے کسے دیکھا جائے اور بعد میں کسے؟ یہ سب کچھ معما تھا۔

ایک تانگہ چار سواریوں سمیت سامنے کھڑا تھا، اُس کا کوچوان 'مال روڈ، مال روڈ' کی آوازیں دیے جاتا تھا۔ اِدھر ہم نے سن رکھا تھا انارکلی بازار کہیں اُدھر مال روڈ ہی کے آس پاس ہے، چلیے اِس تانگے پر بیٹھتے ہیں اور وہیں چلتے ہیں۔

تب لاہور میں سڑکیں سنگل ہوتی تھیں اور درخت ڈبل تھے۔ تانگہ درختوں کے سائے سائے چلتا ہوا لارنس باغ کے پاس سے آنکلا۔ مال روڈ پر آتے ہی کوچوان بولا 'لو بھئی اُترو مال روڈ آ گیا' اور ہم کرایہ تھما کر وہیں کود گئے۔ تانگے والا تو یہ جا وہ جا اور ہم کھڑے دیکھتے رہ گئے کہ انارکلی کہاں ہے۔ ایک صاحب سے پوچھا تو وہ ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولا 'لڑکو مال روڈ دس میل لمبی ہے اور جہاں تم کھڑے ہو یہاں سے انارکلی بازار تین میل ہوگا۔ اِدھر سے جنوب کی طرف سیدھ لو اور چلتے جاؤ۔ ایک وقت آئے گا تم انارکلی کے دہانے پر کھڑے ہو گے۔

ہم نے تانگے والے کو دیہاتی گالیاں دیں اور چل پڑے۔ اب یہ کہ چلے جاتے ہیں، چلے جاتے اور انارکلی نہیں آتی۔ گرمی سے بھُرکس نکل رہا تھا اور ہم چل رہے تھے۔ راہ میں جو ملتا اُس سے انارکلی کا پوچھتے۔ وہ یہی جواب دیتا بس تھوڑا سا آگے ہے۔ اللہ اللہ کر کے پہنچ ہی گئے۔ اب جو دیکھا تو انارکلی ویران تھی۔ چھوٹی موٹی ریڑھیاں، جن پر لنڈے کی پینٹیں شرٹیں بکنے کو پڑی تھیں۔ یہاں ذرا رش زیادہ تھا۔ صادق نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جلدی سے چار پانچ پینٹیں بغل میں دابیں اور ہجوم میں گھس گیا۔ مَیں ڈر کے مارے بھاگ کر دُور جا کھڑا ہوا، کہیں پکڑے گئے تو کئی سال جیل میں سڑیں گے اور ہاتھ پاؤں الگ سے ٹوٹیں گے۔ پھر یہ بھی سنا تھا کہ لاہوریے مارتے کم ہیں کھینچتے زیادہ ہیں۔ مگر اِس ظالم نے ذرا خوف نہ کھایا اور چار پانچ پاجامے اُڑا لیے۔ مَیں

نے اورینٹل کالج کی طرف راہ لی۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو پیچھے آن کھڑا ہوا۔ میں نے کہا سالے کیا غضب کرتے ہو۔ آئندہ یہ کام نہ کرنا اور ہم تھوڑی دیر کے لیے ناصر باغ میں جا بیٹھے۔ پھر اُٹھے اور دوبارہ مال روڈ پر آ گئے۔ یہاں گرمی اور ویرانی برابر ہو نکتی تھی۔ اِس ویران، سنسان اور دھوپ بھرے گستان منظر کو دیکھ کر سچ پوچھیں تو دل بہت بوجھل ہوا۔ اتنا عذاب اِس بے کار کوچے کو دیکھنے کے واسطے کیا تھا۔ اِس سے اچھا تو اوکاڑہ کا قینچی بازار تھا۔

غرض ایک بجے دن کا عمل ہو گیا۔ گرمی کا مزاج بپھرا ہوا اور ہم مرجھائے ہوئے۔ جیبوں میں پیسے اتنے نہ تھے کہ کٹورہ شربت کا پی لیتے۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے۔ اِسی عالم میں سامنے کے عجائب گھر پر نظر پڑی، بے تابانہ وہیں گھس گئے۔ اندر داخل ہوئے تو ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ہم دونوں آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔

اب یہاں ایک تماشا عجیب ہوا۔ شیشوں میں کچھ ہڈیوں کے ڈھانچے پڑے تھے۔ شیشے بہت صاف تھے اور اُن کے وجود و عدم کا کچھ پتا نہ چلتا تھا۔ صادق کو کچھ اندھیرے، کچھ بھینگے پن کے سبب اِس کا احساس نہ ہو سکا۔ وہ بے دریغ آگے بڑھتا چلا گیا اور ایک دم شیشے سے ٹکرا گیا۔ ٹکراتے ہی شیشہ کرچیاں ہو کر ڈھانچے سمیت فرش پر بکھر گیا۔ صادق کا ماتھا پھٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔ شور سن کر تمام طرف سے لوگ بھاگ کر ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ عجائب گھر کے عملے نے ہمیں گردنوں سے پکڑ لیا اور فٹ بال کی طرح اِدھر اُدھر دھکیلنے لگے، کبھی ایک ہماری گدی پر دھول جماتا کبھی دوسرا۔

ہمارا یہاں نہ کوئی پرسانِ حال تھا نہ واقف کار تھا۔ اللہ جانے اُن کا یہ ڈھانچہ کتنے کا تھا اور کس قبرستان سے منگوایا گیا تھا۔ شیشہ تو خیر بازار سے مل جاتا اور اُس کے لیے بھی ہمارے پاس پیسے کہاں تھے۔ پھر وہ لاش جو نہ جانے کس نابکار کی تھی، کہاں سے لاتے؟ میں نے بہتیرا کہا 'میرا دوست دونوں آنکھوں سے بھینگا ہے، بلکہ یوں سمجھیں تقریباً اندھا ہے۔ اِسے شیشہ نظر نہیں آیا تھا ورنہ جان بوجھ کر اسے ٹکر مارنے کی کیا ضرورت تھی؟

میں تو عجائب گھر کے عملے کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میری عذر بیانی صادق

کو اپنی توہین معلوم ہوئی اور وہ چیخ اُٹھا 'نہیں مجھے سب نظر آتا ہے، یہ ڈھانچا خود آگے بڑھ کر مجھ سے ٹکرایا ہے۔ صادق کے اِس جملے پر کئی لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ تو میں نے بھی پینترا بدلا اور کہا 'یہ ٹھیک کہتا ہے، اصل میں ڈھانچے کو میرا دوست نظر نہیں آیا تھا۔ مگر وہ نہ مانتے تھے، کہتے تھے تم نے جان بوجھ کر شیشہ اور ڈھانچا توڑا ہے۔ میں نے کہا 'ہمیں کیا ضرورت تھی ڈیڑھ سو میل دُور سے آکر اِس مُردے کو توڑنے کی۔ آپ اِس شیشے کو تھوڑا سا میلا رکھتے تو نہ ٹوٹتا۔ مگر وہ ہٹ دھرمی پر اترے ہوئے تھے، کہنے لگے 'کسی نے تمھیں ایک سازش کے تحت بھیجا ہے۔'

اُن کے بڑے افسر نے ہمیں زمین پر بٹھا لیا اور کہا 'بیٹا دو صورتیں ہیں، اوّل جس نے تمھیں بھیجا ہے اُس کا نام بتاؤ، دوم اِس نقصان کا ازالہ کرو ورنہ یہاں سے گھر کے بجائے سیدھے جیل جاؤ گے۔'

میں نے اُس افسر کو اوّل سے آخر تک اپنے سفر کی تمام واردات سنائی اور بتایا کہ اِس بستی میں ہم اجنبی ہیں اور ہر لحاظ سے دیہاتی ہیں۔ پیسے تو ہم دے نہیں سکتے۔ بھیجا بھی ہمیں کسی نے نہیں، اِس لیے نام بھی نہیں بتا سکتے۔

اُس نے کہا 'میں کیسے مان لوں، یہ جو پاجاموں کی گٹھڑی اٹھائے پھرتے ہو، یہ ٹھیکریوں کے عوض خریدی ہیں؟'

مَیں نے شتاب کہا، سب پیسے انھی پر تو خرچ ہو گئے ہیں، ہماری تلاشی لے لو، ایک روپیا نہیں ملے گا۔

وہ بولا، خیر مَیں نہیں مانتا کہ تمھیں کسی نے نہیں بھیجا جبکہ تم نے ہزاروں سال پرانا اثاثہ ضائع کر دیا۔ اچھا یہ بتاؤ کیا تمھیں ڈائریکٹر ہیری مج شفیقی صاحب نے بھیجا ہے؟ دیکھو سیدھے سے اُس کا نام بتا دو ورنہ تمھیں 20 سال جیل ہو گی۔ اگر بتا دو گے تو ابھی چھوڑ دوں گا۔

اُس افسر کی یہ بات سن کر ہم حیران تھے۔ ہمارے فرشتوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہ شفیقی صاحب کون ہیں اور کیا بیچتے ہیں۔ اگر جان چھڑانے کو کہہ دیں کہ جی اُسی نے بھیجا ہے تو ایک نئی مصیبت میں پھنسیں۔ اب یہ لاہور شہر اور ہم بیگانے سراسر۔

آخر میں نے کہا ’سر بات یہ ہے کہ بھیجا تو ہمیں کسی نے نہیں۔ اگر آپ کی کسی سے دشمنی ہے تو ہمیں بتا دو، اُس کا نام لے دیں گے۔ باقی پیسے وغیرہ کی جنس ہمارے پاس نہیں ہوتی اِس لیے شیشہ بھی خرید کر نہیں دے سکتے البتہ ہمارے ساتھ کوئی آدمی بھیج دو تو اپنے گاؤں کے قبرستان سے کوئی لاش نکال کر دے سکتے ہیں مگر یہ کام بھی رات میں ہی کر پائیں گے، دن کے وقت گاؤں والے ماریں گے۔

اُس افسر نے ہماری تمام گزارشات رد کر دیں اور کہا ’یہاں ایک طرف بیٹھ جاؤ اور اپنے گھر کا پتا بتاؤ؟

یہ مصیبت بھی عجیب تھی گھر تو ہم بتا کر نہ آئے تھے کہ کس جہنّم میں جا رہے ہیں۔ فون اُس دَور میں ہوتا نہیں تھا۔ میں نے پھر عرض کیا ’عالی جناب، ہمارے گھر میں سوائے غربت کے کچھ نہیں ہے، فون بھی نہیں ہے، گھر کا پتا لے کر کیا کرو گے۔ مگر اُس نے اب میری طرف سے کان بند کر لیے تھے۔ اب ہم بیٹھے ہیں اور بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی ہمیں وہاں سے اُٹھا کر بڑے دالان میں لے آیا۔ ہمارے ہاتھ میں بوسیدہ کپڑے کی ٹاکیاں تھما دیں اور صابن مِلے پانی کے ڈول پاس رکھ دیے۔ کہنے لگا ’یہ سب فرش اِن ٹاکیوں اور صابن سے صاف کرو۔

اب جو ہم نے صفائی شروع کی تو کچھ نہ پوچھیے۔ ہمیں توقع تھی کہ یہ صفائی کروا کر چھوڑ دیں گے۔ اِس خیال میں لگے رہے اور فرش کو رگڑ رگڑ کر شیشہ کر دیا حتیٰ کہ شام چھ کا عمل ہو گیا۔ سارا دن ظالموں نے پانی نہ دیا، روٹی کھانا تو دُور کی بات ہے۔

چھ بجے اُسی افسر صاحب نے دوبارہ طلب کیا اور بولا ’دیکھو یہ کاغذ ہے، اِس پر اپنے دستخط کر دو اور انگوٹھے بھی لگا دو۔ آئندہ اوّل تو اِس میوزیم میں گھسنا نہیں، اگر دوبارہ آؤ تو شیشے کے پاس نہیں پھٹکنا، اب دفع ہو جاؤ۔

اللہ تیرا بھلا کرے۔ یہ دو جملے اُسی وقت کہہ دیتا تو کون سا زبان پر چھالے پڑ جاتے۔ ہم نے کاغذ دیکھا تو وہ صاف خالی تھا۔ خیر دونوں نے اُس پر اپنے انگوٹھے جما دیے اور دستخط کر دیے۔ تب دستخط کے معنی ہمارے نزدیک یہی تھے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا نام لکھ دو، وہ ہم نے لکھ دیا

اور جلدی سے اِس اُجاڑ خانے سے نکلے کہ کہیں ہم بھی ماضی کا حصہ نہ بن جائیں۔
باہر نکلتے ہی سٹیشن کی طرف بھاگے اور شکر خُدا کا شام ساڑھے سات بجے کی گاڑی سے اپنے وطن کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات دس بجے اوکاڑہ کے سٹیشن پر پہنچے تو وہاں ویرانی کے بھوت ہو نکتے تھے۔ ہمیں بہت تشویش تھی کہ ہماری سائیکل کوئی اُٹھالے گیا ہو گا مگر اوکاڑہ کے چوروں کی روایتی کاہلی کے سبب سائیکل وہیں کھڑی تھی۔ ہم نے سائیکل اُٹھائی اور رات 11 بجے اپنے گاؤں پہنچ لیے۔

بینڈ پروفیسر اور گدھا

اب لگے ہاتھوں میرا اور صادق کا ایک دلچسپ قصہ اور سن لیجیے۔
چھ سال پہلے یعنی 2016ء میں مَیں نے لاہور یونیورسٹی میں پڑھانے کا آغاز کیا۔ مَیں نے اپنی رہائش چونگی امرسدھو میں رکھی اور وہاں موٹر سائیکل کے ذریعے کاہنا کے رستے یونیورسٹی جانے لگا۔ رستے میں ایک چائے کے ہوٹل پر نظر پڑی۔ ہوٹل کے ایک کونے میں شیشے کی بوسیدہ الماری میں میدے کی پیسٹریاں اور برفی کی ڈلیاں رکھی تھیں اور ساتھ ہی دودھ کا کڑاہا تندور پر چڑھا پک رہا تھا۔ اِس کھوکھا نما ہوٹل کو دیکھتے ہی میں ایک دم ٹھٹھکا، تھوڑی دیر رُکا، پھر کچھ یاد کر کے ہلکا سا مسکرایا اور وہیں پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گیا۔ یہاں دو چار پُرانی کُرسیاں اور ایک چار پائی دھری تھی۔ میں کُرسیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کھجی سے بُنی چار پائی پر بیٹھا اور چائے کا آرڈر دے کر چوتھائی صدی پُرانے ایک دلچسپ واقعے کو یاد کرنے لگا۔ آپ بھی سن لیجیے۔
یہ میٹرک کے امتحان کے بعد کا قصہ ہے۔ ایک بات بتا تا چلوں کہ صادق کی ایک آنکھ بھینگی ہے اور جیسا کہ آپ پہلے دو واقعات سے جان چکے ہیں کہ شیطان پرلے درجے کا تھا۔ بھوکے ننگے ہم دونوں ہی تھے۔ ہم نے صلاح ٹھہرائی کہ لاہور چلتے ہیں، مزدوری کرتے ہیں، اپنی کما کر کھاتے ہیں اور لنڈے بازار سے کپڑے لتے خرید کر لاتے ہیں۔ شالامار باغوں اور شاہی قلعوں کی سیر بھی کریں گے اور داتا دربار سے لنگر بھی کھائیں گے۔

یہ گرمیوں کے دن تھے۔ ہم بغیر ٹکٹ کے ریل میں گھس گئے۔ کبھی ڈبے میں، کبھی باتھ روم میں چھپتے چھپاتے اور ٹکٹ چیکر سے آنکھ مچولی کھیلتے گھنٹے میں لاہور وارد ہوئے۔ رات اِچھرہ کے ایک چھوٹے پارک میں مچھروں سے تلوار بازی کرتے گزری۔ اگلے دن نہار منہ دونوں مزنگ چوک کے مزدوروں کے اڈّے پر جا کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر میں ایک آدمی آیا، اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور ہم دونوں پر آن ٹکائی۔ پھر پاس آیا اور بولا، 'آپ مزدوری کریں گے؟ ہم نے ہاں میں سر ہلایا۔ کہنے لگا 'تین بجے کام ختم ہو جائے گا، 40 روپے مزدوری ہے لیکن آپ کو 50 دوں گا اور کھانا بھی مفت اور شاندار قسم کا۔'

میں نے پوچھا، کام کیا ہے؟

کہنے لگا بہت آسان ہے، وہیں جا کر بتاؤں گا۔ بس یوں سمجھ لو تھوڑی دیر پیدل چلنا ہے اور بس۔

ہم بہت خوش ہوئے۔ تھوڑی دیر کیا، ہم تو پیدا ہی پیدل ہوئے تھے، چاہے سو میل چلا لیتا۔ اُس نے ہم دونوں کے علاوہ اِنھی شرائط پر ایک اور مزدور بھی پکڑا، یہ تیسرا مزدور کچھ مسکین سا آدمی تھا، جیسے آنکھوں پر فالج گرا ہو۔ اُس بندے نے ہم سب کو ایک تانگے پر بٹھایا اور چل پڑا۔ تانگہ فیروز پور روڈ پر چلتا گیا۔ مسلم ٹاؤن موڑ، ماڈل ٹاؤن، والٹن سب پیچھے چھوڑا حتیٰ کہ چونگی امر سدھو سے دائیں مُڑ کر کاہنہ کی طرف ہو گیا۔ اُن دنوں یہ سب جگہیں ویران ہوتی تھیں اور اُن کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کہ کون کون سے گاؤں ہیں۔ ہمیں تشویش ہوئی اور طرح طرح کی فکروں نے گھیرنا شروع کیا۔ اُدھر تانگہ ہے کہ رُکتا نہیں، چلا ہی جاتا ہے۔ بالآخر ہم نے گھبرا کر نیچے چھلانگ لگا دی اور کہا 'بھاڑ میں جائیں آپ کے پیسے، مزدوری اور کھانے، ہم تو آگے نہیں جائیں گے۔ تب اُس صاحب نے تانگہ رکوایا اور بہلانے لگا 'دیکھو بیٹا آپ میرے بیٹوں کی طرح ہیں، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔'

میں نے کہا، 'بیٹوں کی طرح ہی ہیں، بیٹے تو نہیں ہیں نا؟ اللہ جانے تمھیں کون سا شوق ہے کہ ہمیں بلی چڑھاؤ گے۔'

وہ بولا 'بیٹا خدا جانتا ہے آج تک مجھے کوئی ایسا شوق نہیں ہوا جس کی قیمت کسی معصوم کو ادا کرنا پڑے۔ دراصل کام شہر میں نہیں، یہیں کاہنے میں ہے، ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے۔ اِس بہلاوے میں ہم پھر تانگے پر بیٹھ گئے۔ حتیٰ کہ کاہنہ پھاٹک کے پاس ایک چھوٹے سے بازار میں آ رُکے۔ تب وہ بزرگ صورت ہمیں ایک دُکان میں لے کر داخل ہوئے۔ دُکان کے ماتھے پر 'پروفیسر دین محمد بینڈ والا' کا بورڈ لگا تھا۔ دُکان بہت کھلی تھی۔ اندر آٹھ دس لوگ بینڈ باجے کی وردیاں پہنے بیٹھے تھے اور سو قسم کے طوطیاں، باجے، بینڈ، شہنائیاں، مُرلیاں، بانسریاں اور پتا نہیں اِسی طرح کی کیا کیا سوغاتیں دیواروں پر لٹکی پڑی تھیں۔ دُکان میں داخل ہو کر ہم کھڑے ہی تھے کہ اُس بندے نے ایک آدمی کو مخاطب کیا ''لے چاچا دین محمد، بندے پورے ہو گئے ہیں'' پھر وہ ہم سے مخاطب ہوا، 'چلو پتر جلدی جلدی وردیاں پہن لو، وقت بہت کم رہ گیا ہے۔

اُس کی بات سن کر ہم بِدکے کہ یہ ہمیں کہاں لے آیا اور اُس آدمی سے کہا 'میاں ہم نواب اور شُرفا لوگ ہیں، یہ تو ہم سے کیا کرانے لگا ہے۔ ہم یہ کام نہیں کریں گے۔'

اُس نے پھر منت سماجت شروع کی ''بیٹا! ہمارے بندے کم ہیں، ایک دن ہمارے ساتھ لگا لو، کچھ حرج نہیں۔'' مگر ہم صاف مُکر گئے اور کہا ایسا واہیات کام ہم تو نہیں کریں گے اور نہ ہمیں کرنا آتا ہے، پہلے کیوں نہ بتایا؟ ہمیں واپسی کا کرایہ دو، یہاں نہیں رُکیں گے۔

ہمارا سخت انکار دیکھ کر پروفیسر دین محمد آگے بڑھا اور کہنے لگا دیکھو بیٹا مزدُوری میں کوئی عیب نہیں، یہاں ہر کوئی کبھی نہ کبھی نواب رہا ہے، پھر یہ ماتھے پر تو لکھا نہیں کہ کب مراثی نواب بن جائے اور نواب مراثی ہو جائے۔ سب عزت ذلت حلال کی کمائی میں ہے۔ تین چار گھنٹے کی تو بات ہے۔ رہی کام کے نہ آنے کی بات، تو کون سا ہر کوئی ماں کی ناف سے سیکھ کے نکلتا ہے۔ کام کوئی بھی ہو، مشق کرنے سے آتا ہے۔ یہ وردی پہنو اور ہمارے ساتھ ہو لو۔ شادی والے گھر سے اچھا کھانا بھی ملے گا، پیسے بھی ملیں گے اور زیادہ محنت بھی نہیں کرنی ورنہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔ کرایہ بھی پلے سے لگا کے واپس جانا ہو گا۔ اب جو تمھاری صلاح۔

لو بھئی ہم دونوں مفلس حال، خالی جیبیں، واپس پھرنے کا فاصلہ کم سے کم 18 کلومیٹر اور دن

بھر کی خجالت الگ۔ ہم فکر مندی میں پڑ گئے۔ ذرا جب حالات کی سختی پر غور کیا تو نوابی کچھ مدہم پڑی۔ ہم دونوں نے آنکھ ہی آنکھ میں ہینچ پینچ کی تو نفسِ غیر مطمئن نے اطمینان کا ارادہ کیا۔ گاؤں ہمارا دُور تھا، واقف اور شناسا یہاں کوئی نہ تھا اور یہ بھی سنتے آئے تھے کہ ہمارے گاؤں کا چوہدری لطیف برطانیہ میں کتوں کی مالش کر کے پہلے مالدار بنا پھر واپس آ کر دوبارہ چوہدری بنا اور کسی نے اُس کے منہ پر طعنہ نہ دیا۔ اگر ہم دو پَل کو بینڈ باجے بجا لیں گے تو کون سا لہنگا اُتر جائے گا۔ کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا، آخر تیار ہو ہی گئے اور سر جھکا کر آمادگی کا اشارہ دیا۔

بینڈ پروفیسر ڈی ایم نے تسلیم و رضا کی حالت دیکھ کر فوراً وردی ٹوپی ہماری طرف اُچھالی اور کہا لو بھئی چاہو تو اپنا نوابی خلعت اُتار کر اِسے پہن لو، چاہے اُسی کے اُوپر چڑھا لو۔ ہم نے جھٹ وہ بینڈ باجے کی وردی پہنی اور ایک دوسرے کو تمسخرانہ دیکھنے اور ہنسنے لگے۔ ظالموں نے میرے گلے میں قد سے بڑا طوطی ڈال دیا اور صادق کی بغل میں فرانسیسی ہارن ٹھونس دیا۔

میں نے جب طُوطی میں پھونک ماری تو وہ ثابت ہی نکل گئی، کچھ آواز پیدا نہ ہوئی۔ یہی حال صادق کا تھا۔ ہماری حالت دیکھ کر پروفیسر دین محمد سٹپٹا گیا۔ اُکتا کر بولا یار شیدو یہ کہاں سے گنوار پکڑ لائے ہو۔ جاہلوں کو کچھ نہیں آتا۔ وہاں اِن کی شکلیں تھوڑی دکھانا تھیں؟ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے مجھے طُوطی اور سدی کو ہارن سکھانے میں پندرہ منٹ لگا دیے کہ کیسے پھونک ماری جاتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ آخر کو ہم ہونہار نکلے اور جلد سیکھ گئے۔ کوئی ساڑھے گیارہ کے عمل میں ہمارے تانگے نے کاہنہ سٹیشن کے قریب گاؤں میں لینڈ کیا اور ایک بارات کو جا پکڑا۔

ہم کوئی آٹھ آدمی تھے اور ایک دو کے علاوہ سب اِدھر اُدھر سے پکڑے گئے تھے۔ سب کی اپنی اپنی مُرلی تھی، ایک کا سُر کہیے جاتا تھا تو دوسرے کا داتا صاحب۔ ڈھول کی تھاپ بینڈ سے نہیں ملتی تھی اور شہنائی کی ڈیڑھ اینٹ الگ تھی۔ غرض بینڈ باجا نہ تھا مُلاؤں کی فقہ تھی جن کے اپنے اپنے مجتہد تھے۔ میرا اپنا طوطی چار پانچ پھونکوں کے بعد کہیں جا کر ایک بار بجتا تھا۔ جبڑے پھونکیں مار مار کے ہلکان ہو گئے۔ اللہ جانے کیا کیا آوازیں نکلتی ہوں گی۔ اِتنے بے سُرے شور میں مجھے خود سنائی نہ دیتی تھیں۔ بارات والوں کو کچھ سمجھ نہ تھی، کیا بجا رہے ہیں۔ تب ایک روپے والے نوٹ

بہت ہوتے تھے۔ باراتیے نوٹوں کی ویلیں دیے جاتے تھے اور چھڑی گھمانے والا یعنی پروفیسر دین محمد ویلیں پکڑے جاتا تھا۔ ایک آدمی سے ایک روپے کی ویل مَیں نے پکڑی تو دین محمد نے میری گُدی میں ایک دائیں ہاتھ کی جمادی، کہنے لگا روپوں پر نہیں طوطی پر دھیان دو۔ جبکہ مَیں دیکھ رہا تھا سدی نے آنکھ بچا کر کم از کم دس روپے کی ویل اُڑالی تھی۔ قصہ مختصر، قافلہ مدھم رو میں چلا جاتا تھا کہ اچانک ایک ہنگامہ پیدا ہو گیا اور ساری بارات بمع بینڈ باجا کو بہالے گیا۔

ہوا یہ کہ ایک وحشی گدھا اللہ جانے کہاں سے برآمد ہوا۔ نہایت بے تکے عالم میں تھا جیسے نادر شاہ کا سانڈ پاگل ہو کر شاہی حمام میں گُھس گیا ہو۔ وہ گدھا خیبر میل کی طرح دوڑتا آیا اور ہیلی کاپٹر کے پنکھے کی تیزی سے دولتیاں چلانے لگا۔ منہ سے جھاگ چھوڑتا تھا اور باؤلا ہو کر دانت مارتا تھا۔

چند لمحوں میں اُس نے تین چار بندے پھٹڑ کر کے گرادیے۔ بارات میں ایسی ہل چل مچی کہ سب بھاگ اُٹھے۔ دولہا میاں خود سہروں سمیت قلابازیاں کھا گئے اور سڑک پر پڑے گائے کے گوبر میں نہا گئے۔ اُن کے سہرے گانے ایسے بکھر گئے جیسے پٹاخے کے پُرزے بکھرتے ہیں۔ مَیں بھی اپنے طوطی سمیت گرا۔ گدھے کی ایک دولتی میرے طُوطی کو ایسی لگی کہ اُس کے اگلے حصے میں چھ انچ کا ڈنٹ پڑ گیا۔ جیسے تیسے میں اُٹھا اور بھاگا۔ جس کا منہ جدھر آیا نکل گیا۔ دُولہے کے کپڑے ایسے ہو گئے جیسے کیچڑ سے کیچوا نکالا ہو۔ صادق میرے پیچھے تھا، اُس نے مجھے سہارا دیا۔ ہم گرتے پڑتے ایک گھر میں گھس گئے اور ایک موٹی تازی عورت کے پہلو میں امان پائی۔

اُس اللہ والی نے سر پر ہاتھ پھیرا، چاٹی کی ٹھنڈی لسی پلائی اور بیٹھنے کو چار پائی بچھائی۔ بولی پتر تم واجے والے تو نہیں لگتے، کہیں اُن کا سامان تو نہیں لے کر بھاگے؟

ہم نے اُس بی بی کو ساری کتھا سنائی۔ ہماری حالت پر کبھی وہ ہنستی کبھی روہانسی ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہوا کہ گدھا پاگل ہو گیا تھا، اُسے گولی ماردی گئی ہے۔ دولہا سمیت تمام باراتیوں اور بینڈ والوں سے گزارش ہے وہ جہاں کہیں پناہ لیے بیٹھے ہوں، گاؤں کے سکول میں اکٹھے ہو جائیں، وہیں کھانے کا بھی انتظام ہے۔

اعلان سنتے ہی ہم سکول جا پہنچے۔ دیکھا تو دولہا سمیت اکثر باراتی موجود تھے اور اِس واردات پر ہنس رہے تھے۔ دولہے کے کپڑے بدلے گئے تھے۔ اب بینڈ باجے تو معطل ہوئے کہ دولہا والوں نے اُنھیں ویلیں کم ہونے کے سبب اکٹھے کچھ پیسے دے دیے تھے۔ تب کھانا شروع ہوا جو میٹھے چاول اور نان گوشت پر منحصر تھا اور بہت مزے کا تھا۔ چار بجے فارغ ہو گئے اور ساڑھے چار بجے دوبارہ کاہنہ قصبے پہنچ گئے۔ پروفیسر ڈی ایم صاحب نے ہم سے وردی اُتروائی اور مزدوری کے ساتھ دس دس روپے کرایے کے اضافی دیے۔ یوں ہم واپس پلٹے اور ایک دوسرے سے وعدہ لیا کہ یہ بات گاؤں میں نہیں بتائیں گے ورنہ ساری عمر بینڈ والے کہلائیں گے۔ یہ تو تھی صادق کی اور میری واردات۔ اب اُس ہوٹل والے کی کہانی سنیے جہاں بیٹھ کر مجھے یہ واقعہ یاد آیا تھا۔

مَیں نے اس تحریر کے شروع میں چائے کے جس ہوٹل کا ذکر کیا تھا اور جہاں سے بہترین چائے پی تھی، 25 سال پہلے یہی بینڈ باجے کی دُکان تھی اور چائے بنانے والا آدمی پروفیسر دین محمد کا بیٹا تھا۔

اُس آدمی نے مجھے بتایا ’’کافی عرصے سے کوئی ہم سے بینڈ باجے کے لیے نہیں آتا تھا۔ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ اگر ہم بینڈ والوں کو بلوائیں گے تو لوگ ہمیں گنوار دیہاتی کا طعنہ دیں گے۔ باپ میرا فاقوں سے مرا مگر آبائی کام نہ چھوڑا۔ پروفیسر صاحب دس سال پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ اُن کے مرنے کے بعد مَیں نے بینڈ باجے جھاڑ پونچھ کے گھر میں رکھ دیے ہیں اور چائے کی دُکان کھول لی۔ اللہ کا کرم ہے اب روٹی چل نکلی ہے۔

جماعت دہم میں ہماری کایا کلپ

اِس جماعت میں ہم عمر کے پندرہویں سال میں تھے۔ مَیں آج محسوس کرتا ہوں تو واضح ہوتا ہے کہ تعلیم کے اِسی درجے میں میرا ذہن اپنی جماعت کے قریباً ہر لڑکے سے مختلف ہو چکا تھا۔ ایسا نہیں کہ جماعت کے تمام لڑکوں سے سلام دعا بند کر دی تھی، ہرگز نہیں مگر سوچ کے زاویے بدل گئے تھے۔ مثلاً کچھ اُستادوں اور اکثر طالب علموں سے ایک طرح کا غیر شعوری نظریاتی اختلاف

بن لے چکا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ سکول کے نوے فیصد اُستاد وہابی تھے۔ وہ بچّوں کے دماغ پر اپنے ہی مذہبی نقوش مرتّب کرتے تھے اور بچّے اُن کی باتوں کو اگر قبول نہیں بھی کر رہے تھے تو کم از کم اُن کے اندر سوال کرنے کی قوت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ مثلاً ایک اُستاد ایک دن یزید کو رضی اللہ کہہ رہا تھا اور بچّے اُس کی بات پر سر ہلا رہے تھے۔ اُس سے میری اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی جس کی وجہ سے مجھے تین دن تک کلاس سے باہر نکال دیا گیا۔ ایک اُستاد افغانستان اور کشمیر میں جہاد کے لیے بچّوں کو مسلسل موٹی ویٹ کرنے کی کوشش میں تھا اور اکثر خوفناک داڑھیوں اور عجیب و غریب حلیے والے مجاہدوں کو سکول میں بلوا کر جہاد پر تقریریں کرواتا تھا۔ اُس سے بگڑ گئی۔ ایک اُستاد نے ایک غنڈے کو کلاس کا انچارج مانیٹر بنا دیا۔ اُس غنڈے اور اُس اُستاد دونوں سے ٹھن گئی۔ مَیں چاہتا تھا اگر بچّے غیر نصابی ادب، درختوں اور پودوں سے متعلق دلچسپی نہیں لیتے تو پھر صرف سکول میں اپنا سلیبس پڑھیں اور چلے جائیں۔ مگر سکول میں ایک دو اُستادوں نے نسلی اور طبقاتی تقسیم کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ مَیں حیران تھا کہ ہم جنھیں ابھی تک کسی نسل، ذات پات، امیر غریب کی خبر نہیں تھی، یہ اُستادوں نے کیسے ہمیں باور کرانا شروع کر دیا ہے اور کیوں بتا رہے ہیں کہ تم امیر ہو، چودھری باپ کے بیٹے ہو، تم غریب ہو، تم جولا ہے ہو، تم فلاں ہو۔ دراصل یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب ایک نابالغ ذہن احساسِ کمتری اور احساسِ برتری کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے اور اِس کا سب سے پہلا ذریعہ والدین اور دوسرا اساتذہ ہوتے ہیں اور آج کل تو ماشاءاللہ ہمارے سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اور دیگر ادارے اِس نسلی، معاشی اور طبقاتی تفاخر کو برملا پروموٹ کرتے ہیں۔ آج بھی میرے کچھ دوست میری اِس تحریر کو پڑھیں گے تو وہ دیکھ لیں گے کہ مَیں اپنے قول و فعل میں کتنا سچ بول رہا ہوں۔ اِس تمام احساس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ بچّے اپنے اصلی مقصد کو بھول کر ایک نئی بدی میں داخل ہو جاتے پھر تمام عمر اُسی میں مبتلا رہتے ہیں۔

اِنھی اسباب کے پیشِ نظر اب مَیں نے اپنے تمام کلاس فیلوز کے ساتھ میل جول کم کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آدھ دوست، جو کبھی کبھار کوئی کتاب پڑھ لیتا تھا، آج ایک مدت بعد اُس کے علاوہ مجھے کسی کلاس فیلو کا نام تک یاد نہیں رہا۔ اُن میں سے کسی کے ساتھ کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ اُس

کی وجہ یہی تھی کہ جب مَیں کلاس میں کسی اُستاد سے اختلاف کرتا تھا تو میرے ہم جماعت اُسے میری گستاخی اور بدتمیزی تصور کرتے تھے اور اُستاد کی معاونت میں مجھ پر ہی لعن طعن شروع کر دیتے تھے۔ اِس کی صاف وجہ یہ تھی کہ اُن اساتذہ کے ساتھ ساتھ طلبا نے کسی تاریخی، سماجی، معاشرتی یا اساطیری کتاب کا لمس تک نہ لیا تھا۔ اُستاد اگر کوئی غیر نصابی کام کرتے بھی تھے تو وہ فقط بچوں کو ہنسانے کے لیے گندے لطیفے سناتے یا مزاحیہ شعر سنا دیتے۔

قصہ مختصر مجھے غیر نصابی مطالعے اور اپنے اجداد کی طرف سے سنائی گئی اُن کہانیوں نے بالکل اپنی جماعت، اپنے سکول اور اپنے تمام روایتی چکر سے نکال کر کسی اور طرف لگا دیا۔ چنانچہ مَیں نے کسی بھی دوسرے دھندے میں پڑنے کی بجائے تین باتوں پر اپنا دھیان لگا دیا۔ اوّل والد کے ساتھ کام میں مصروف ہو جاؤں، دوم کتاب پڑھوں، سوم فطرت کی بازیافت کے لیے بجائے انسانوں کے فطرت کی وادیوں میں زندہ رہوں۔

احمد ندیم قاسمی سے ملاقات کا دلچسپ احوال

میرا بھولپن دیکھیے کہ دسویں جماعت تک مَیں نے تین چار سو صفحات کا شاعری کا ایک دیوان کھڑا کر لیا تھا۔ دو رجسٹر بے وزن قسم کی غزلوں سے بھر گئے۔ جنھیں مَیں نواب داغ کے پائے کا کلام خیال کرتا تھا۔ اُن غزلوں کو اپنے گاؤں کے لڑکوں اور ہم جماعتوں کو سنا کر داد لیتا تھا۔ یہ سمجھ لیجیے کہ اِن میں صرف قافیہ اور ردیف کا لحاظ ہی رکھا جاتا تھا۔ جب یہ غزلیں بہت زیادہ ہو گئیں اور گھر میں اِن کے لیے جگہ نہ رہی تو خیال آیا کہ اب انھیں شائع کروا دیا جائے۔

اُن دِنوں فیروز سنز پبلشنگ کا بہت بڑا ادارہ تھا۔ اِن کا کتب خانہ مال روڈ پر پاکستان کا خوب صورت ترین کتب خانہ تھا۔ اِس کتب خانے کی بربادی بہت بڑا زیاں ہے۔ ہم جیسے ناسٹلجیک کاروانوں کا پڑاؤ یہاں ہوتا تھا۔ اب جب بھی لاہور جاتے ہیں تو اُس کتب خانے کے کھنڈر پر کھڑے ہو کر دو چار آنسو بہاتے ہیں۔ خیر مَیں نے غزلوں کا دفتر باندھا اور وہیں چلا گیا۔ سیدھا کاؤنٹر پر جا کر اُنھیں اپنا مدعا بتایا۔ وہاں موجود آدمی نے کہا، دیکھو شاعر بھائی، یہ جہاں آپ

کمرے ہیں صرف کتب خانہ ہے۔ ہمارا پریس ایبٹ روڈ پر ہے۔ ریڈیو پاکستان کے بالکل پچھلی طرف۔ آپ وہیں چلے جائیں۔ وہاں ہمارے پبلیکیشن کے مینیجر الطاف صاحب ہوتے ہیں۔ کتابیں چھاپنے کے وہی ذمّے دار ہیں۔

مَیں پیدل مال روڈ سے نکل کر الحمرا کے پیچھے سے ہوتا ہوا پہلے شملہ پہاڑی پہنچا وہاں سے ایبٹ روڈ کی راہ ناپی۔ وہاں سے ریڈیو پاکستان کے عقب میں جا کر آخر فیروز سنز کا دفتر ڈھونڈ لیا۔ پھر تھوڑی دیر میں مینیجر الطاف صاحب کے سامنے آ موجود ہوا۔ یہ حضرت نہایت نفیس شخص معلوم ہوتے تھے۔ پینتالیس سال کے لگ بھگ عمر تھی۔ مَیں نے سلام کیا، اُنھوں نے جواب دیا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے، گرمیوں کے دن تھے۔ ان کے کمرے میں ایئر کولر لگا تھا۔ کولر کی ٹھنڈی ہوا سے ایک دم طبیعت میں سکون سا پیدا ہوا۔ اُنھوں نے مجھے سامنے والی کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مَیں نے وہی غزلوں کا پلندہ نکالا اور اُن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بھلا آدمی میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا کہ یہ کیا کر رہا ہے؟ میری بے تکلفی نے اُس کی حیرانی تشویش میں بدل دی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ پاگل خانے میں فون کر کے پوچھتا کہ آپ کے ہاں سے کوئی پاگل فرار تو نہیں ہوا، مَیں نے خموشی توڑی اور کہا، سر یہ میری غزلوں کا مسوّدہ ہے، آپ اِسے چھاپ دیں۔ اُس نے پہلے غور سے میری طرف دیکھا، پھر مسوّدے کی طرف دیکھا، پھر میری طرف دیکھا اور بولا، بیٹا وہ تو ٹھیک ہے، لیکن پہلے آپ بتائیں، کہاں سے آئے ہیں؟

مَیں نے کہا، مَیں اوکاڑہ سے آیا ہوں اور صرف اِسی کام سے آیا ہوں۔ اب اُسے فکر لاحق ہوئی کہ یہ پندرہ سالہ نوجوان تو بالکل سیریس ہو گیا ہے۔ اُس نے وہ پلندہ پکڑ کر اپنے سامنے رکھا اور ملازم کو بلا کر میرے لیے کوک منگوائی۔ اُس کے بعد اُس نے مسوّدے کو اُلٹنا پلٹنا شروع کیا اور ایسے دیکھنے لگا جیسے واقعی متاثر ہو رہا ہو۔ نہایت غور سے پانچ دس منٹ دیکھتا رہا۔ اِس طرح کہ مَیں سمجھا یہ صاحب اب بالکل میری شاعری کو دو چار دن میں چھاپ دے گا۔ ایسا اچھا مال اِسے اور کہاں سے ملے گا۔ اُس کے غور و خوض کو دیکھتے ہوئے مَیں نے ایک غضب اور کیا، مَیں نے کہا، دیکھیے آپ گھبرائیں نہیں۔ اِسے چھاپیں اور جتنا چاہے چھاپیں۔ مَیں آپ سے رائلٹی وغیرہ بالکل

نہیں لوں گا۔ میری اِس بات پر اُس نے ایک دم آنکھیں کھول کر یوں دیکھا جیسے اُس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

یہ الطاف صاحب کوئی نہایت شریف خاندان کا بیٹا تھا، ورنہ اس بات پر حق رکھتا تھا کہ میرے اوپر ہتکِ عزت کا دعویٰ کر دیتا۔ وہ آرام سے میری بات سنتا رہا اور مسودے کو پرتا لتا رہا، اُس کے بعد نہایت تحمل سے میری طرف دیکھا اور بولا، دیکھو، مَیں نے آپ کا یہ کلام دیکھا ہے۔ میر صاحب کے درجے کا تو خیر نہیں ہے لیکن آج کے دَور کے کسی بھی شاعر سے کم نہیں ہے اور میرا جی چاہتا ہے، یہ کل ہی پریس میں چلا جائے۔ اتنا اچھا کلام ضرور شاعری کے قدردانوں کی نظر میں آنا چاہیے لیکن مصیبت یہ ہے کہ مَیں اکیلا اِس ادارے کا ذمے دار نہیں ہوں۔ ہماری ایک کمیٹی ہے جو کوئی بھی کتاب چھاپنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اِس کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ دو سال تک فی الحال کوئی کتاب نہیں شائع کرنی۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ دو سال تک مَیں مجبور ہوں، اُس کے بعد اگر آپ ہم سے کتاب شائع کرانا پسند کریں تو ہم حاضر ہیں لیکن آپ کو دو سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اُس وقت تک اگر آپ یہ مسوّدہ یہاں میرے پاس رکھنا چاہیں تو یہاں چھوڑ جائیں اور اگر آپ اِس پر مزید کام کرنا چاہیں، یا آپ کو لگے کہ فلاں شعر میں نقص رہ گیا ہے یا مزید بہتر ہو سکتا ہے تو ساتھ لے جائیے اور اِس دَوران اِس کو دیکھ لیجیے۔

آپ دیکھیے اُس نے کس خوبی کے ساتھ مجھے جواب دیا کہ میرے دل میں ذرا بھی خیال نہ آئے کہ میرا یہ کلام جسے مَیں میر صاحب کے پلہ کا سمجھ کر اور لے کر یہاں پہنچ گیا تھا، وہ کچرے دان کے بھی لائق نہیں ہے۔ وہ دروازے تک مجھے رخصت کرنے آیا اور مجھے ایک وقار اور آبرو کے ساتھ رخصت کیا۔ جیسے ہی مَیں باہر نکل کر رخصت ہونے لگا، اُس نے مجھے دوبارہ مخاطب کیا اور کہا، سنیے، آپ کبھی کسی شاعر کی محفل میں بیٹھے ہیں؟

مَیں نے جواب دیا، نہیں ابھی تک تو مَیں اپنے گاؤں کے ایک شاعر کے علاوہ کسی شاعر سے نہیں ملا۔ اُس نے تب مجھے کہا، دیکھو یہاں ریڈیو پاکستان میں ہر روز سہ پہر کو احمد ندیم قاسمی صاحب آتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد اُن کے آنے کا وقت ہو جائے گا۔ آپ اُنھیں ضرور ملیے

اور اُن کے علاوہ بھی کچھ شاعروں سے اپنے کلام کے متعلق بات چیت کر لیں۔
بخدا وہ کتنی شریف اور پاکیزہ ماں کا بیٹا تھا جس نے مجھے نہایت صفائی سے بتا دیا کہ مجھے اصلاح کی ضرورت ہے۔ دو سال کا وقت اِس لیے دیا کہ اتنے میں اپنی حقیقت کا پتا چل جائے اور مَیں کسی پبلشر کو سخت امتحان میں ڈالنے سے خود ہی گریز کر لوں۔ اللہ جانے ابھی کہاں ہوگا، یا زندہ بھی ہوگا کہ نہیں۔

الغرض مَیں اپنا پلندہ تھامے وہاں سے باہر نکلا اور پاکستان ریڈیو کے دفتر کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر میں دفتر کا گیٹ آ گیا۔ مَیں نے استقبالیہ پر بیٹھے آدمی سے پوچھا، احمد ندیم قاسمی صاحب یہاں موجود ہیں؟ اُس نے کہا ابھی تو نہیں آئے، تھوڑی دیر میں آئیں گے۔ آج اُن کے پروگرام کے بعد ریڈیو پر لائیو مشاعرہ ہے۔ آپ کیوں ملنا چاہتے ہیں؟

مَیں نے کہا مَیں شاعر ہوں، اُنھیں اپنا کلام دکھانا چاہتا ہوں۔ چند لمحے دیکھ کر بولا، اتنے چھوٹے ہو ابھی، شاعری کیسے کر لیتے ہو؟ پھر اُس نے میرا نام پتا پوچھا اور کہا ٹھیک ہے اندر چلے جایے لیکن سٹوڈیو کی طرف نہ جا نکلیے گا۔

اُن دنوں کسی بھی ادارے میں داخل ہونے سے کوئی نہیں روکتا تھا۔ استقبالیہ بھی رہنمائی کے لیے ہوتا تھا، لوگوں کو تذلیل کے ساتھ روکنے کے لیے نہیں تھا۔ خیر مَیں اندر جا کر ایک ڈیوڑھی میں بیٹھ گیا۔ یہاں لکڑی کی ایک بینچ پڑی تھی اور پنکھا چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھا ہوں گا تو وہی استقبالیہ والا آدمی آیا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا، مَیں پاس گیا تو کہنے لگا، قاسمی صاحب آ گئے ہیں۔ اُس کے ساتھ ہی دو تین لوگ گیٹ کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اُس نے ایک لمبے قد کے منحنی سے آدمی سے میری طرف اشارہ کر کے کہا، سر یہ بچّہ آپ سے ملنا چاہتا ہے اور مَیں تیزی سے بڑھ کر آگے ہوا۔ مَیں نے سلام کے لیے ہاتھ بڑھایا، اُس نے اپنے ہاتھ کی دو چار انگلیاں میرے ہاتھ کو چھوائیں اور چلنا جاری رکھا۔ مَیں دو چار قدم تک ساتھ چلا اور کہنے کی کوشش کی کہ مَیں شاعر ہوں اور آپ کو کلام دکھانا چاہتا ہوں مگر وہاں تو کوئی کھڑے ہو کر دو لمحے سن ہی نہیں رہا تھا۔ قاسمی صاحب نے حسبِ معمول سمجھا ہوگا، لڑکا میرا فین ہے اور اب ''فنون'' میں چھپنے کے

لیے کہے گا، لہٰذا جلدی سے قدم اٹھائے جاتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مَیں دراصل شاعر کی بجائے بڑے سرکاری افسر سے مل رہا ہوں۔ آخر مَیں تھک کر رُک گیا اور وہ سٹوڈیو کی طرف چلے گئے۔ مَیں نے سوچا چلیے کوئی بات نہیں مَیں یہاں باہر ہی انتظار کر لیتا ہوں، باہر نکلیں گے تو پھر مل لوں گا۔ ابھی اِنھیں جلدی ہوگی۔

ڈیوڑھی میں پاکستان ریڈیو کی ٹرانسمشن چل رہی تھی۔ اِس عرصے میں کچھ اور لوگ بھی سٹوڈیو میں داخل ہوئے، مجھے خبر نہیں یہ کون کون نام تھے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد مشاعرے کی اناؤنس منٹ ہوئی اور مَیں باہر تحمل سے بیٹھ کر اُسی ٹرانسمشن سے مشاعرہ سننے لگا۔ آدھ گھنٹا مشاعرہ جاری رہا۔ اُس کے بعد اناؤنسر نے قاسمی صاحب کا نام لیا کہ وہ صدارت کی کُرسی پر ہیں اور شعر سنائیں گے۔ تب قاسمی صاحب نے اپنی غزل شروع کی اور مَیں غور سے سنتا رہا، باقی شعر تو بھول چکا ہوں، ہاں ایک شعر ابھی تک حافظے میں موجود ہے۔

خُدا کرے کہ تری عمر میں گنے جائیں
وہ دن جو ہم نے ترے ہجر میں گزارے تھے

قاسمی صاحب کی غزل سننے کے بعد مَیں نے فیصلہ دیا کہ اِس سے کئی درجہ بہتر مَیں خود شاعر ہوں۔ خواہ مخواہ وقت ضائع ہوا۔ اصل مَیں میرا اپنا کلام تو خیر جیسا بھی تھا لیکن مَیں میر و غالب اور دیگر کلاسک شعرا کو پڑھتا تو آ رہا تھا۔ جلدی سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ استقبالیہ پر موجود آدمی نے کہا، کیا آپ ملیں گے نہیں؟ مَیں نے کہا، نہیں اِن سے تو مَیں خود اچھا شاعر ہوں، یہ کیسی غزلیں لکھتے ہیں؟ وہ میری بات پر ہنس دیا اور مَیں نے وہاں سے نکل کر اپنے شہر کا رُخ کیا۔

اِس واقعے کے ٹھیک چھ ماہ بعد اماں حلیمہ نے میری وہ تمام غزلیں بارش کے دِنوں میں چولھے میں جھونک دیں، کیونکہ پاتھیاں گیلی ہونے کے سبب اُنھیں آگ نہیں لگتی تھی۔ اماں نے کہیں یہ بے کار رجسٹر دیکھے اور اُن سے متواتر آگ جلاتی رہی۔ تب تو مَیں نے گھر مَیں ایک ہنگامہ کھڑا کیا تھا اور بہت رویا دھویا تھا مگر یاد آتا ہے تو خُدا کا شکر کرتا ہوں کہ آج کے کئی شاعروں کا ہم

پایہ کلام آگ کی نذر ہوگیا اور مَیں ذلت سے بچ گیا۔ کاش ہمارے ہاں کے ننانوے فی صد شاعروں کے گھروں میں بھی اماں حلیمہ ہوتی۔

احمد ندیم قاسمی سے دوسری ملاقات مئی یا جون 2006ء میں اکادمی ادبیات میں ہوئی۔ تب میں وہاں ایک معمولی سا ملازم تھا۔ وہ یہاں کسی پروگرام کی صدارت کرنے آئے تھے اور وہی چار انگلیاں پھر چھوائیں۔ تیسری ملاقات کی توفیق نہیں ہوئی کیونکہ جولائی 2006ء میں فوت ہوگئے۔ اللہ غریقِ رحمت کرے، اپنے پیچھے شعروادب کے بہت سے لطائف چھوڑ گئے۔ بس یہ سمجھیے کہ اُن کی ادبی تربیت سے محرومی کا اثر آج تک چلا آتا ہے۔

بابِ ششم

والد کے ساتھ مزدوری

یہ دسویں جماعت کے اُن دِنوں کا ذکر ہے جب جون سے اگست تک تین ماہ کی گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ ہمارے ہی گاؤں کی مسجد تھی جس کے مینار بنانے تھے اور والد صاحب یہ کام کر رہے تھے۔ اُس وقت میرے والد کا روزینہ یعنی ایک دن کی مزدوری کا معاوضہ ساٹھ روپے تھا۔ یہ 1990ء کا زمانہ تھا۔ تب یہ ایک مناسب مزدوری تھی۔ مَیں اُن کے ساتھ پچیس روپے روزینے پر کام کرنے لگا۔ سخت ترین گرمی کے دن تھے۔ مینار کی بلندی کم و بیش ساٹھ فٹ تھی۔ یوں ہم دونوں باپ بیٹے کی کمائی پچاسی روپے روزانہ ہوگئی۔ اِن دِنوں کام کا معمول یہ تھا کہ صبح چھ بجے کام پر جاتے تھے، گیارہ بجے گھر آ جاتے، پھر تین بجے جاتے، اِس وقت دھوپ تھوڑی کم ہو جاتی تھی اور چھ بجے لوٹ آتے۔ وقفے کے اِن دَورانیوں میں میرا ادبی مطالعہ جاری رہتا اور یہ سب وقت مَیں کتابوں میں صرف کرتا۔ تین مہینے مَیں نے یہ کام متواتر کیا اور کم و بیش اِن تین مہینوں میں سب کچھ سیکھ بھی لیا۔ میرے لیے یہ مزدوری اِس لیے بھی مشکل نہیں تھی کیونکہ چار بھینسوں کی پرورش اور کھیتوں میں کام کرنے والا آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ جب سکول کھلے تو مَیں

نے دوبارہ سکول جانا شروع کر دیا۔ اِس عرصے میں والد صاحب چیچہ وطنی کے ایک علاقے 13 ماڑی میں مسجد بنانے چلے گئے۔ وہاں کے سجاد نعیم ہمارے بہت اچھے دوست ہیں جو آجکل بہاولپور یونیورسٹی میں اُردو پڑھاتے ہیں۔ یہ تمام زمانہ ہمارے لیے معاشی طور پر اگر آسودہ نہیں تھا تو ایسا بھی نہیں تھا کہ ہمیں روٹی کپڑے کا فکر ہو۔ یعنی ہمارے پاس سب کچھ تھا۔ مڈل کلاس کی وہ تمام اشیا یعنی ٹیلی ویژن، کپڑے استری کرنے والی استری، ریڈیو، بجلی، اور کھانے پینے کو تمام بنیادی ضروریات کی چیزیں موجود تھیں۔ سکول سے چھٹی کے بعد اکثر اپنے گھر کے سامنے ٹاہلیوں کی چھاؤں میں چارپائی بچھا کر کتابیں پڑھنے کا سلسلہ جاری رہا اور اپنے گاؤں کی تینوں لائبریریز یعنی سکول، یونین کونسل اور مولوی عبدالستار کی لائبریری کی تمام کتابیں پڑھ چکا تھا۔

اِن میں سے دو کتابوں کے متعلق دلچسپ قصہ سناتا ہوں:

پہلا واقعہ

ایک دن میرے ہاتھ میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی کتاب ''مباحث'' آ گئی۔ مختلف مضامین کی دلچسپ کتاب تھی۔ اُسی میں ایک مضمون ''مَیں اور میر'' بھی تھا۔ اِس میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے مولوی محمد حسین آزاد پر جرح کی تھی کہ اُس نے اپنی کتاب ''آبِ حیات'' میں میر کے متعلق انصاف سے کام نہیں لیا اور اُس کے کردار کو بہت متنازع بنا ڈالا۔ میر کی سیادت پر شک کیا، میر کو مبالغہ کی حد تک خود پسند ثابت کیا۔ غرض مولوی آزاد نے میر صاحب کو تباہ کر دیا۔ مجھے اِس مضمون میں دیے گئے دلائل بہت عجیب اور متضاد لگے۔ مضمون پڑھ کر اُلٹا مَیں آزاد کے لیے تڑپ اُٹھا۔ مجھ میں ایک دم جوش پیدا ہوا کہ جلد مولوی آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' کو پڑھوں۔ میرے گاؤں کی لائبریریوں میں جتنی کتابیں تھیں، اُن میں آبِ حیات نہیں تھی۔ میرے پاس اُن دِنوں پیسے نہیں تھے۔ مَیں نے اپنی والدہ سے چوری چھپے اپنے بھڑولے سے بیس کلو گندم نکالی، اُسے ایک دُکان پر بیچا اور اوکاڑہ شہر میں کتاب ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا لیکن کسی دُکان پر ''آبِ حیات'' نہیں تھی۔ کرائے پر دی جانے والی کتابوں میں زیادہ تر ڈائجسٹ اور افسانے اور ناول ملتے تھے۔

چنانچہ اُسی دن ریلوے اسٹیشن پر آیا۔ ایک بجے کی ریل پر بیٹھا اور لاہور پہنچ گیا۔ اُردو بازار لاہور میں علمی کتاب گھر سے ''آبِ حیات'' خریدی اور شام کی ٹرین سے اپنے شہر نکل لیا۔ راستے میں کتاب کا بے صبری سے مطالعہ شروع کر دیا۔ پھر بہت عرصہ یہ کتاب میری حرزِ جان رہی اور مَیں مولانا کا عاشق ہو گیا۔ اِس کتاب نے مہمیز کیا کہ تمام شاعروں کا مکمل مطالعہ کروں بلکہ دہلی، لکھنؤ اور لاہور کے متعلق ہر شے جان لوں اور اُس میں درج کتابوں کی کھوج میں لگ گیا، جو جو ملتی گئی پڑھتا گیا۔

پھر مولانا آزاد کی ساری کتابیں پڑھیں۔ حتیٰ کہ آزاد کے متعلق سب کچھ پڑھ لیا، جہاں سے جو کچھ بھی آزاد کے حوالے سے ملا، پڑھ ڈالا۔ پھر لاہور میں آزاد کے ٹھکانوں کو تلاش کیا کہ وہ کہاں کہاں رہے۔ جب دہلی گیا تو وہاں بھی آزاد کے پُرانے گھر اور کھجور والی مسجد کو ڈھونڈا۔ آزاد کے رشتے داروں کو ڈھونڈا۔ اُن میں ایک آغا سلمان باقر ملے، اُنھوں نے مجھے آزاد کے متعلق بہت مالا مال کر دیا، خُدا اُنھیں سلامت رکھے۔ حتیٰ کہ آزاد کے بارے میں میری معلومات دہلی، لکھنؤ، لاہور اور دیگر مقامات کے حوالے سے انتہائی اہم ہو گئیں۔ بعض معلومات اتنی دلچسپ، بالکل نئی اور ہمہ رنگ تھیں کہ پہلے تحریر میں نہیں آئی تھیں اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ سب دستِ غیبی ہے۔ قدرت چاہتی ہے کہ اِن کو اُن قارئین تک پہنچایا جائے، جو اُردو ادب سے محبت کرتے ہیں، انسان سے محبّت کرتے ہیں اور اُن اشیا سے محبت کرتے ہیں جنھیں خُدا نے خلق کیا ہے اور مولانا محمد حسین آزاد سے محبّت کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک وقت آیا کہ میں نے آزاد پر قلم اُٹھایا اور میری کتاب ''فقیر بستی میں تھا'' وجود میں آئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اِس کتاب کے سرِ ورق کے عنوان سے لے کر ابواب کے تمام عنوانات تک اُسی میر کے مصرعوں سے لیے۔ وہی میر جس کے متعلق سیّد عبداللہ کا اپنے مضمون میں دعویٰ تھا کہ اُس کے ساتھ مولوی آزاد نے انصاف نہیں کیا لیکن مَیں کہوں گا کہ بخُدا خود قاضی عبدالودود سے لے کر سیّد عبداللہ اور وہاں سے آج تک کے تمام نقادوں نے مولوی آزاد کے ساتھ انصاف نہیں کیا جنھیں مَیں نے اِس کتاب میں ظاہر کیا ہے۔

دوسرا واقعہ

وہی دسویں جماعت کے دن تھے۔ دفتر میں سیکرٹری کم آتا تھا بلکہ نہیں آتا تھا البتہ چوکیدار صاحب بلاناغہ تشریف لاتے اور جمعہ کے روز بھی ناغہ نہ فرماتے (اُن دنوں جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی) اِس کی بڑی وجہ فرض شناسی کی بجائے وہ چائے تھی، جو ہم عین 3 بجے گھر سے بنا کر لاتے، اُسے پلاتے اور عوض میں کتابوں کی پوٹلی پاتے۔

یہیں سے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے ہماری جان پہچان ہوئی۔ جب ایک کتاب تفہیم غالب اور دو جلدیں شعر شور انگیز کی پڑھنے کو ملیں۔ یہ کتاب اور اِسی طرز کی دیگر کتابیں ہندوستان کے شہر دہلی سے یہاں کیسے پہنچیں؟ یہ مصطفیٰ زیدی صاحب جانیں یا اُن کی انتظامیہ جنھوں نے اِس یونین کونسل کو بنا کر یہاں لائبریری قائم کی۔ مگر ہوا یہ کہ اِنہی کے ذریعے ہمیں پہلے غالب اور میر سے محبت ہوئی، پھر خود فاروقی صاحب سے ہوگئی کہ نصیب میں بقائے دوام لکھی تھی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ ہم نے جو رشتہ میر و غالب سے عقیدت کا شعر شور انگیز اور تفہیم غالب سے آغاز کیا تھا، وہ مولوی محمد حُسین آزاد کی آبِ حیات سے ایسا وسیع ہوا کہ پھیلتا ہوا اُردو کے تمام کلاسیک شاعروں تک نکل گیا اور مولانا سے محبّت کا عریضہ بھی اُنہی عرصوں میں ہاتھ لگا۔

ہمارا وطیرہ تھا، سکول سے آتے، بستہ پھینکتے اور مویشیوں کا کھا جا لینے نکل جاتے جو ہم نے مکرر خرید لیے تھے۔ قریب دو گھنٹے میں بھینسوں کو چارا ڈال کر جلدی سے کلاسیکل ادب کی کتاب پکڑ لیتے۔ پھر تو رات دو بجے ہاتھ سے چُھٹتی اور صبح سکول جانے کے لیے سلیبس کا بستہ ڈھونڈنا پڑتا۔ سکول کا کام ہم نے کبھی کر کے نہ دیا اور روزانہ مار کھائی۔ اُن ہی دنوں کا ایک مزیدار واقعہ سن لو۔ یہ 1990ء کا زمانہ تھا، ہم ابھی میٹرک میں تھے اور چھٹی کا دن تھا۔ معمول کے مطابق گھر کے سامنے سے گزرتی سڑک کے کنارے چار پائی بچھائے لیٹے تھے۔ نیچے ٹھنڈے پانی کا نالہ بہتا تھا اور اُوپر شیشم کے درختوں کے سائے تھے۔ فاروقی صاحب کی ایک کتاب تفہیم غالب پڑھ رہے تھے، جو دہلی سے غالب انسٹیٹیوٹ نے چھاپی تھی۔ ہم غالب کے اشعار کے معنی و مفہوم میں کھوئے

ہوئے تھے اور طبیعت پر سحر طاری تھا۔ اچانک سڑک سے گزرنے والی ایک موٹر سائیکل گر گئی۔ موٹر سائیکل پر مرد کے پیچھے غرارہ پہنے عورت سوار تھی اور غرارہ کیا تھا بقول میرؔ:

آنچل اُس دامن کا ہاتھ آتا نہیں
میر دریا کا سا اُس کا پھیر ہے

خُدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ دریا کا سا پھیر موٹر سائیکل کے پہیے کی تاروں میں آ گیا، جس کا اُنھیں پتا نہ چلا اور پہیہ گھومنے کے ساتھ غرارہ تاروں میں پھنستا چلا گیا اور ایسا پیچ در پیچ پھنسا جیسے غالب کے اشعار اپنی رعایتوں میں پھنسے تھے اور اُنھیں فاروقی صاحب کھولنے کی کوشش میں لگے تھے۔ خیر عین ہمارے گھر کے سامنے آ کر وہ دونوں میاں بیوی گر گئے۔ خاتون موٹر سائیکل کے نیچے آ گئی اور غرارہ تاروں کے بیچ۔ اب بے چارا وہ آدمی جیسے ہی موٹر سائیکل اُٹھانے لگتا، بی بی درد کی کراہ سے چیخ مارتی۔ چنانچہ وہ موٹر سائیکل پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور چار پانچ منٹ تک کھڑا دیکھتا رہا کہ شاید کوئی مدد کو آئے۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ یہاں مَیں تفہیمِ غالب میں مگن اور ایسا مگن کہ پاس کے حادثے کی خبر تک نہ ہوئی۔ فاروقی صاحب کی شرحوں میں غروب رہا۔ اِتنے میں والد صاحب باہر نکل آئے۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ عورت بے چاری گری پڑی ہے اور مرد موٹر سائیکل پکڑے کھڑا ہے اور میرا برخوردار مزے سے لیٹا کتاب میں مصروف ہے، تو سیدھا میری طرف آئے، کان پر ایک جما کر دی اور کتاب ہاتھ سے چھین لی۔ اُس کے بعد دونوں خاتون کے غرارے کو موٹر سائیکل کی تاروں سے نکالنے لگے، مگر وہ اِس طرح پھنس گیا کہ ہزار کوشش کے باوجود غرارۂ پُر پیچ وخم کے پیچ وخم نہ نکلے۔ آخر گھر سے قینچی منگوائی اور بڑی مشکل سے کاٹ کاٹ کے تاروں سے نکالا، یعنی طُرہ کے پیچ وخم کھول کر اُسے دھجیوں میں تبدیل کیا۔ یوں خاتونِ ظالم کے خدوخال کا بھرم کُھلا اور وہ بے چاری پہیے کی تاروں سے آزاد ہوئی۔ تب ایک چادر گھر سے لا کر اُسے دی اور دوبارہ موٹر سائیکل پر سوار کرایا۔ اُس کے بعد فاروقی صاحب کی تفہیم غالب کتاب والد صاحب نے پکڑ لی اور دو مہینے اُسی میں گرفتار رہے۔ یہی واقعہ ہے جو فاروقی صاحب سے پہلے تعارف کا سبب بنا۔

میٹرک پاس کا زمانہ اور لاہور کا تھانہ

میٹرک میں ہماری دو کلاسیں تھیں جن میں کم و بیش ستر لڑکے تھے۔ اِن میں اساتذہ کے فیضِ بے بہا سے جو پاس ہوئے وہ سات لڑکے تھے، باقی سب فیل ہو گئے۔ اُن سات مَیں دو لڑکے ہمارے گاؤں کے تھے یعنی ندیم اور مَیں علی اکبر طرطوسی تھا۔ یہ طرطوسی کیا چیز تھی؟ میرا پُرانا تخلص تھا، جسے دو وجوہ سے جلد ترک کرنا پڑا، دوسری وجہ یہ تھی کہ اِس کے قافیے بہت بُرے بنتے تھے۔

قصہ مختصر رزلٹ آ گیا تھا، ہم پاس ہو لیے تھے۔ ایک مہینے بعد کالج کے داخلے تھے لیکن ہمارے رزلٹ کی لسٹ آئی تھی رزلٹ کارڈ یا میٹرک پاس کا سرٹیفکیٹ نہیں آیا تھا۔ یہ چیزیں تب لاہور بورڈ سے جا کر وصول کرنا تھیں اور اُنھیں رشوت میں ایک یا دو سو روپے دینے تھے کیونکہ کالج میں داخلے کے لیے یہ چیزیں ضروری تھیں۔ تب رشوت متعارف ہو کر باقاعدہ مارکیٹ میں داخل ہو گئی تھی۔ اب دو دوستوں کے ساتھ مَیں رزلٹ کارڈ لینے لاہور نکل کھڑا ہوا اور اِس میں ہمارے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ ذرا دھیان سے سنیے۔

1991ء کے دن شروع ہو چکے تھے۔ ہمارے رزلٹ کارڈ لاہور سیکنڈری بورڈ نے روک لیے، اُن کے مطابق اُن کی کوئی اضافی فیس رہتی تھی، جب کہ جو لڑکے فیل ہو گئے تھے اُن کے رزلٹ کارڈ پہنچ گئے تھے معاملہ یہی تھا کہ ہمارا ہاتھ گرم کرو اور رزلٹ کارڈ لے جاؤ۔ ہم تینوں دوست ایک سائیکل پر بیٹھ کر 32 موڑ تک آئے، وہیں سائیکل کھڑی کر کے تالا لگا دیا۔ اکثر شہر کو جانے والے اِس جگہ سائیکل کو تالا لگا کر رکھ دیتے تھے اور آگے بس کے ذریعے شہر جاتے تھے۔ واپسی پر سائیکل پکڑ کر گاؤں آ جاتے۔ یوں تو تانگے بھی یہاں چلتے تھے مگر سائیکل میں انتظار نہ کرنا پڑتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہاں سائیکلیں کبھی چوری نہ ہوتیں۔ آٹھوں پہر پڑی رہتیں۔ اردگرد کوئی آبادی نہیں تھی نہ کوئی دُکان تھی۔

ہمارا ارادہ یہ تھا کہ سات بجے اوکاڑہ سے بس پر بیٹھیں گے، چار گھنٹے میں یعنی 11 بجے لاہور پہنچ جائیں گے۔ تین سے چار گھنٹے وہاں رہ کر اپنا کام کر کے اگر تین بجے بھی چلے تو شام

سات بجے واپس اوکاڑہ آ جائیں گے۔ شام سے پہلے اپنی سائیکل اٹھائیں گے اور گھر روانہ ہو جائیں گے۔ تب کوئی سوا سات بجے شام ہوتی تھی۔

سب کچھ پروگرام کے مطابق تھا۔ اُن دِنوں ہمارے پاس سٹوڈنٹس کارڈ ہوتے تھے اور کرائے کی جگہ صرف یہی دکھائے جاتے تھے۔ اُس کے ساتھ چونی کرایہ بھی دیا جاتا تھا۔ اِن کارڈز کی وجہ سے اکثر سٹوڈنٹس اور بس والوں کے درمیان تیغ وسناں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اگر سٹوڈنٹس اکیلے ہوتے تو بس والے تیغ نکالتے تھے، سٹوڈنٹس زیادہ ہوتے تو بس والے صرف ڈھال نکال پاتے تھے، وہ بھی گتے کی۔ پھر تو چونی بھی نہ دیتے، کارڈز پر ہی گزارہ چلاتے۔ کرایہ اُس وقت لاہور کا فقط دس روپے ہوتا تھا۔

ہم تینوں لاہور آ گئے۔ ایک بجے لاہور بورڈ سے اپنے رزلٹ کارڈ لے کر اور اُن کو پیسے دے کر نکلے تو دل میں عجیب تمنا جاگی کہ چلو ایک پھیرا اپنے رشتے داروں کے ہاں لگالیں اور دال پانی کھالیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ گاؤں سے لاہور سال بہ سال ہی جانا ہوتا تھا۔ تب غریبوں کے واسطے لمبے فاصلوں کے شہر دوسرے ملک اور پرائے دیس لگتے تھے۔ ہم نے اِس موقع کو غنیمت جانا اور رشتے داروں کے ہاں چکّر لگانا مقدر میں رکھ لیا۔ رشتے دار صدر کینٹ میں بستے تھے۔ ہم ایک لوکل بس پر بیٹھ گئے۔ جب بس والے نے کرایہ مانگا تو اُنھیں کارڈ دکھا کر پانچ روپے بھی دیے کہ تینوں کے بارہ آنے کاٹ کر باقی واپس کرے۔ پرائے دیس میں اتنی شرافت تو دکھانی ہی چاہیے۔ اُس نے کارڈ دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ لونڈے لاہور کے نہیں ہیں اور پانچ کے پانچ رکھ لیے۔ ہم نے پیسے واپسی کا تقاضا کیا تو کنڈیکٹر اکڑ گیا، بولا، 'بکواس نہ کرو، ورنہ جوتے ماروں گا۔'

ان دنوں ہم بھی پرجوش تھے۔ پانچ روپے سے زیادہ جوتوں کا لفظ ہمیں کھا گیا۔ یعنی عجیب دھونکنی مثال تھا جو دھواں بھی دیتی ہے اور پھونک بھی لیتی ہے۔ مَیں نے کہا اوئے چمگادڑ کے بچے کیا اندھا ہے؟ ہم تجھے عورتیں نظر آتی ہیں یا زنخے؟ وہ ہنس کر بولا، آپ دونوں سے بڑھ کر چکنے ہو۔ اب ہمارا خون کھول گیا۔ چنانچہ لڑائی شروع ہوگئی۔ ہم تینوں نے کنڈیکٹر کی تو دھلائی کر دی مگر میٹرک کا بچہ تو بس لونڈا ہی ہوتا ہے۔ ڈرائیور بہت گینڈے کی طرح موٹا تازہ تھا۔ اُس نے لاری

وہیں رکی اور اپنی سیٹ سے اُٹھ کر سیدھا ہماری طرف آ گیا اور ہم تینوں کو کان سے دبوچ لیا۔ چھ فٹ کا لمبا اور موٹا تازہ پلا ہوا سانڈ تھا۔ مجھے گردن سے پکڑ کر یوں اوپر اٹھایا کہ قدم زمین سے ایک فٹ اٹھ گئے۔ ہم کانپنے لگے اور جی میں آئی کہ اب سخت قضا آئی۔ اتنے میں ہماری خوش بختی کہ پولیس کے دو آدمی چلے آئے۔ چنانچہ ڈرائیور کی مار سے بچ گئے مگر پولیس والوں نے ہم تینوں کو پکڑ لیا اور قریب کے تھانے میں لے گئے کہ بدمعاشی کرتے ہیں۔ پہلے تو اُنھوں نے تھانے میں تین گھنٹے بٹھائے رکھا۔ ایک ہم سے کہنے لگا، اوکاڑہ والے کیا بدمعاش ہوتے ہیں؟

ہم نے کہا نہیں!

پھر بولا کیا جرنیلوں کے لونڈے ہو؟

ہم نے کہا وہ بھی نہیں!

پھر پوچھا کسی رانی خاں کے بھتیجے ہو؟

جی نہیں!

اب اُس نے کان مروڑے اور بولا، جب تم کچھ بھی نہیں ہو تو غنڈہ گردی کیسی؟ نکالو یہاں ناک سے لکیریں۔

ہم نے کہا ناک سے مت نکلواؤ، ہاتھ سے نکال دیتے ہیں۔

بولا تو پھر بیٹھے رہو۔

ہم روتے رہے اور منتیں کرتے رہے۔ تب کہیں شام کے پانچ بجے اُس نے ہم سے سو روپیا لے کر چھوڑا۔ جب ہم نے کہا بھائی اب تو اوکاڑہ جانے کا کرایہ بھی نہیں ہے تو 30 روپے واپس کیے کہ لو یہ پیسے اور نکلو یہاں سے۔ اب ہمیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر شام تک نہ پہنچے تو 32 موڑ پر پڑی سائیکل کوئی اُٹھا کر لے جائے گا۔ ان دِنوں بادامی باغ سے بسیں اوکاڑہ کے لیے جاتی تھیں۔ ایک تانگے پر بیٹھ کر وہاں پہنچے اور اللہ اللہ کر کے رات نو بجے اوکاڑہ آئے۔ اُس کے بعد جب رات دس بجے کے قریب 32 موڑ پہنچے تو دیکھا کہ وہاں ہماری سائیکل غائب تھی۔ یہ نئی نکور سائیکل تھی۔ جسے مَیں نے قسطوں پر لیا تھا اور ہر ماہ کی قسط 65 روپے تھی۔ کچھ نہ پوچھیں کس

قدر افسوس ہوا۔ تب سائیکل آج کی موٹر سائیکل کی قیمت جتنی ہوگی۔

یہاں سے چار میل پیدل چل کر رات 12 بجے گھر پہنچے۔ اُس کے بعد گیارہویں جماعت میں داخل ہونے کے بعد ایک اور سائیکل قسطوں پر خریدی۔ یوں سائیکل تو میرے پاس ایک تھی لیکن قسطیں دو سائیکلوں کی دیتا تھا اور دیہاڑی مزدوری سے پیسے ادا کرتا تھا۔ اِس واقعے کو زمانے گزر گئے یعنی کم وبیش 12 سال۔ حتیٰ کہ 2003ء کا زمانہ آ گیا۔

ان دنوں سیّد انور حسین شیرازی ہمارے گاؤں سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر رہتے تھے اور 32 موڑ سے ایک کلومیٹر پر تھے۔ 32 موڑ کی وہ زمین جہاں کبھی ہم نے سائیکل کھڑی کی تھی اُسی شیرازی صاحب کی تھی۔ سیّد صاحب سے میرا بہت دوستانہ تھا۔ وہ بوڑھے آدمی تھے مگر بہت جی دار تھے۔ کہنے لگے، 'ناطق، میرا جی چاہتا ہے یہاں ایک مسجد بنا دوں اور نلکا لگوا دوں کہ آتے جاتے مسافروں کو راحت ہو۔ آپ کو میں مزدوری اور تعمیر کا سامان دیتا ہوں یہاں ایک مسجد کھڑی کر دیں۔' نیکی اور پوچھ پوچھ، میں تیار ہو گیا۔ مَیں نے وہاں دو تین مزدور لے کر مسجد کی بنیادیں کھدوانا شروع کر دیں۔ وہاں ایک چھوٹا کنواں تھا جس کا پانی نہایت کڑوا تھا، اُس کنویں کا پانی پینے کے کم ہی کام آتا تھا حتیٰ کہ وہاں موجود تانگوں میں جُتے گھوڑے بھی اِس کا پانی نہیں پیتے تھے اور فقط اینٹوں کی ترائی ہی ہو سکتی تھی۔ یہ کنواں اللہ جانے کتنے عرصے سے بند پڑا تھا اور پانی سوکھ چکا تھا۔ کسی اللہ کے بندے نے اِس کے منہ پر دو تین پتّھر رکھ دیے تھے کہ کوئی کنویں میں نہ گر جائے۔ یہ علاقہ اُن دنوں شورزدہ تھا۔ کبھی پانی زمین کے نیچے چلا جاتا اور جب بارشیں زیادہ ہوتیں تو پانی اوپر آ جاتا۔

اب مسجد بنانے کے لیے ہمیں پانی کی ضرورت تھی اور اردگرد پانی موجود نہیں تھا۔ ہم نے سوچا کیوں نہ اِس کنویں کو دوبارہ آباد کیا جائے۔ اگر اِس میں سے مزید تھوڑی سی کھدائی کر لی جائے تو پانی اُوپر آ جائے گا اور ہم آسانی سے مسجد کی تعمیر کر سکیں گے۔ جب مسجد کی بنیادیں کھود دی گئیں اور اُن میں اینٹیں چُننے لگے تو مَیں نے کنویں کو استعمال کرنے کے لیے پہلے مزدوروں سے کہا، اِس کنویں میں داخل ہو کر ذرا اِس کی مزید ایک دو فٹ کھدائی کر دو تا کہ پانی نکل آئے۔ ہم

نے کنویں کے منہ پر پڑی پتھر کی سِلیں اٹھانا شروع کر دیں۔ جب سِلیں اُٹھا چکے تو دیکھا ایک سائیکل اُس میں پڑی ہوئی ہے۔ سائیکل کو باہر نکالا اور دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ تو وہی میری 12 سال پرانی سائیکل ہے اور کسی بھڑوے نے اِس کنویں میں پھینک کر اوپر اُسی طرح سِلیں جما دی تھیں۔

یہ اُس بندے کی شرارت تھی یا چوری تھی، مگر بعد میں وہ بھی اِسے نکالنا بھول گیا۔ سائیکل کی کچھ چیزیں سلامت تھیں اور باقی کو نمک کھا گیا تھا۔ مَیں سلامت شدہ چیزیں اٹھا کر گاؤں لے آیا اور اُسے نئے سِرے سے مرمت کرا کر باقی سائیکل اُس میں ڈال کر دوبارہ استعمال میں لے آیا۔ اِس مسجد کو مَیں نے چار ماہ میں مکمل کر دیا۔ اتفاق سے مسجد مکمل کرتے ہی سیّد انور حسین شیرازی صاحب فوت ہو گئے۔ آج وہ مسجد وہیں کھڑی ہے، وہ کنواں، وہ نلکا بھی وہیں موجود ہے۔

گورنمنٹ ڈگری کالج اوکاڑہ

میٹرک کے رزلٹ کی اتنی سیسہ پلائی دیوار کو توڑ کر نکل جانا معمولی بات نہ تھی چنانچہ اب یہ طے ہو گیا کہ مَیں واقعی وہ لڑکا ہوں جسے زمانے کی ہوائیں مات دینے کی بجائے کھوتی کالج کا منہ دکھائیں گی۔ معاف کیجیے گا آپ سے پردہ کیا، گورنمنٹ اوکاڑہ کالج کو اُن دِنوں کھوتی کالج ہی کہتے تھے۔ اُس کی وجہ بھی شاید وہاں کے اساتذہ اور اُن کا تعلیمی معیار تھا۔ کالج میں داخلے کے لیے مَیں نے اِس بار سائنسدان بننے کی بجائے تھوڑا سا عقل کا استعمال کر کے اکنامکس اور شماریات کے مضامین لے لیے مگر ندیم نے یہاں بھی پُرانی عقل پر انحصار کیا اور مکرّر سائنس کے مضامین رکھ لیے۔ یوں ہم دونوں الگ الگ بلاک میں چلے گئے۔

کالج کے داخلے میں میری نصرت افتخار حسین نے کی۔ یہ وہی افتخار حسین تھے جو فضل حسین کے بڑے بیٹے تھے، اکنامکس میں ایم اے کر کے کالج چلے گئے تھے۔ اُن دِنوں اردگرد دُور تک کوئی دوسرا کالج نہیں تھا اور پرائیویٹ کالجز کا کینسر بھی نہیں پھیلا تھا۔ اس لیے ایک طرف سے ہیڈ سلیمانکی اور دوسری طرف سے راوی تک کے طلبا یہیں آتے تھے۔ اوکاڑہ تحصیل کی اپنی تعداد

بھی کافی تھی۔ اِس لیے سب مل ملا کر فرسٹ ائیر کی تعداد تین ہزار کے قریب ہو جاتی تھی۔ اِس سے کالج میں بہت زیادہ رونق ہو گئی۔ میرا رول نمبر 777 تھا اور سیکشن بی تھا۔ پہلا پیریڈ شماریات کا تھا۔ پہلے دن کی کلاس میں مجھے سب سے آخری بینچ پر جگہ ملی۔

چونکہ یہاں میرے گاؤں یا سکول کا ایک بھی لڑکا نہیں تھا اس لیے ایک بے نام سی جھجک اور شہر کی بجائے پینڈو ہونے کے ناطے ایک خود اعتمادی کی وہ کمی موجود تھی جو شہر کے لڑکوں میں ذرا کم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود میں نے شعوری طور پر خود کو احساس دلایا کہ مَیں اِس پوری کلاس سے اگر زیادہ بااعتماد نہیں تو کم بھی نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ میرے اندر جمالیات اور حُسن کا احساس قدرے بڑھ گیا تھا۔ اُس کی خاص وجہ شاید وہ ادبی کتابیں اور فطرت سے لگاؤ تھا جس نے حُسن کے لطیف احساس کو مہمیز کیا تھا۔ چنانچہ مَیں نے یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے یہاں جو بھی اپنا دوست بنانا ہے وہ زیادہ نہیں تو کم سے کم مجھ جتنا تو خوب صورت ہونا ہی چاہیے۔ اِس خیال کے زیرِ اثر مَیں نے پچھلے ڈیسک پر بیٹھے بیٹھے آگے بیٹھے ہوئے لڑکوں پر نظر کی اور میری نظر سب سے اگلے بینچ پر بیٹھے ایک لڑکے پر رُک گئی۔ اگرچہ مجھے اُس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن سر کے بالوں کی چمک اور گردن کی ہیئت سے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لڑکا خوب رہے گا۔

جب کلاس ختم ہوئی اور لڑکے باہر نکلنے لگے تو مَیں نے آگے بڑھ کر اپنی حسِ جمال کو پرکھنا چاہا کہ واقعی میرا انتخاب ٹھیک ہے؟ جب اُسے سامنے ہو کر دیکھا تو بخُدا مَیں اپنی نظر کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ لڑکا ایک تو بہت زیادہ خوب صورت تھا، دوم اُس کے ڈیل ڈول، چال ڈھال اور لباس میں انتہا کی نفاست تھی لیکن اُس دن مَیں نے اُس سے کوئی سلام دعا نہ کی اور تمام کلاسیں اٹینڈ کر کے اپنے گاؤں لوٹ آیا۔ اگلے دن مَیں جیسے ہی کلاس میں داخل ہوا۔ وہ اُسی سامنے والے بینچ پر بیٹھا تھا۔ چونکہ ایک بینچ پر تین لڑکوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، دو لڑکوں کی جگہ خالی پڑی تھی۔ لہٰذا مَیں نے بھی اپنی کتابیں اُسی بینچ پر رکھ دیں۔ اُس نے نہایت آہستہ آواز سے کہا، یہاں ایک اور لڑکے کی جگہ رکھ لیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہاں ایک لڑکے کی جگہ ہے، آپ کسی اور بینچ پر بیٹھ جائیں۔ مَیں نے اپنی کتابیں جیسے ہی اُٹھانا چاہیں تو اُس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا کہنے لگا، نہیں

آپ بیٹھ جائیں اور ساتھ کسی اور کو نہ بیٹھنے دیں۔ یہاں ایک اور ہمارا دوست آ کر بیٹھے گا۔ لیجیے جناب مَیں اب اُس کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ اگلے دن مَیں نے بھی ایک چال چلی، کہ اُس کی بجائے کلاس میں داخل ہوتے ہی اپنی کتابیں اُس کے برابر والے بینچ پر رکھ دیں حالانکہ وہ کہتا رہا کہ یہیں میرے ساتھ بیٹھیں۔ مَیں نے سوچا اگر تو یہ خود اٹھ کر میرے بینچ پر آ جائے گا تو سمجھو دوستی ہو گئی، ورنہ شہری لڑکے دوستی میں ذرا اُتھلے ہوتے ہیں۔ مگر جب مَیں اُس کے ساتھ نہ بیٹھا تو اُس نے تھوڑی دیر بعد اپنی کتابیں اٹھائیں اور میرے ساتھ آ بیٹھا۔ اب مَیں نے جان لیا کہ یہی وہ دوست ہے جو میرا کالج دوست کہلائے گا۔ پھر واقعی وہ میرا ایسا دوست بنا کہ اپنے سکول اور شہر کے تمام دوستوں کو چھوڑ کر میرے ہی ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگ گیا۔

عمر رفیق کاشمیری

اِس خوب صورت لڑکے کا نام عمر رفیق بٹ تھا۔ یہ کشمیری تھا۔ اِس کے والد کا شہر میں ایک قالینوں کا کارخانہ تھا۔ جہاں سیکڑوں کاریگر کام کرتے تھے۔ سات نمبر چونگی اوکاڑہ کے پاس اِن کا گھر تھا۔ گھر بھی بہت بڑا تھا۔ عمر رفیق کے پاس ایک نازک سی سائیکل تھی۔ اِس میں گیئر تھے۔ اُن وقتوں میں یہ سائیکل اپر مڈل کلاس کے بچّوں کے لیے ہوتی تھی۔ اگرچہ کافی مضبوط سائیکل تھی لیکن دوسرا آدمی اِس پر نہیں بیٹھ سکتا تھا یعنی اِس کی پچھلی سیٹ نہیں ہوتی تھی۔ گاؤں سے شہر کا فاصلہ گیارہ کلومیٹر تھا۔ مَیں اپنے گاؤں سے شہر تک ایک بس کے ذریعے آتا۔ دیپالپور چوک (تب یہ وہ جگہ تھی جہاں سے شہر شروع ہوتا تھا) سے کالج تک پہنچنے کے لیے دو کلومیٹر پیدل چلنا ہوتا تھا۔ عمر رفیق نے اپنی اِس سائیکل پر میرے لیے ایک پچھلی سیٹ لگوا لی۔ جیسے ہی مَیں دیپالپور چوک پر بس سے نیچے اُترتا، وہ یہاں میرے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ مَیں پیچھے بیٹھ جاتا اور ہم اکٹھے کالج جاتے۔ واپسی پر بھی عمر رفیق مجھے گاؤں کے لیے یہاں بس پر بٹھا کر اپنے گھر جاتا۔ دیپالپور چوک سے اِن کا گھر بالکل نزدیک تھا۔ کالج کے دِنوں میں یہ ہمارا معمول رہا۔ اِس کے علاوہ اب ہم نے شہر کی تمام گلیوں میں گھومنا پھرنا اپنا روزنامچہ قرار دے لیا۔ ہر ریڑھی سے چاٹ کھائی۔ ہر

چوک سے قلفیاں کھائیں۔ یعنی اوکاڑہ کی ہر گلی، محلہ، چوک چوراہا، پارک اور سڑکیں اسی سائیکل پر گھومیں۔ کالج کے تمام لڑکے جانتے تھے کہ ہم دوست ہیں اور یہ دوستی ایک مثال بن گئی۔ یوں تو کالج میں میرے اور عمر رفیق کے الگ الگ کئی عاشق تھے مگر ہم نے اُنھیں کوئی لفٹ نہیں دی۔

مجھے چونکہ کتابوں کا چسکا بُری طرح لگ چکا تھا اس لیے مَیں اکثر کالج کی لائبریری میں پایا جاتا تھا اور عمر رفیق کہیں اِدھر اُدھر بھی ہوتا تو وہیں چلا آتا۔ شروع شروع میں شماریات کی ہمیں کوئی سمجھ نہ آئی کیا بلا ہے؟ پروفیسر صاحب روز آتے، حاضری لگاتے اور بلیک بورڈ پر کچھ بچے لکھ کر اُنھیں اِدھر اُدھر پلٹاتے رہتے، کچھ سمجھ نہ آتا۔ مَیں دیکھتا کہ لڑکے بڑے غور سے اُن کو ویسے ہی اپنی کاپیوں پر درج کر رہے ہوتے لیکن مَیں بدھو بنا اُنھیں دیکھتا رہتا اور حیران ہوتا کہ ان سب لڑکوں کو یہ سب کیسے سمجھ آ رہا ہے؟ مَیں نے اپنی کوئی کاپی کالی نہ کی جیسے کورا گھر سے آتا تھا ویسے ہی واپس چلا جاتا۔ ایک دن مَیں نے عمر سے کہا، یار یہ بلیک بورڈ پر کیا لکھ رہا ہوتا ہے، کچھ تو مجھے بھی سمجھاؤ؟ اُس نے کہا، سمجھ تو مجھے بھی کچھ نہیں آ رہا، ایسا کرتے ہیں، ہم اِن کے ہاں ٹیوشن رکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ٹیوشن رکھ لی۔ غالباً پچاس روپے ماہانہ ٹیوشن تھی۔ میرے پاس اتنے پیسے نہ تھے اس لیے عمر رفیق نے اپنی اور میری ٹیوشن فیس پروفیسر کے ہاں جمع کرا دی اور ہم ٹیوشن جانے لگے۔ پھر یوں ہوا کہ تین مہینے میں تمام شماریات آنے لگی۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ میرے شماریات میں نمبر پوری کلاس میں سب سے زیادہ تھے۔ عمر رفیق کے نمبر بھی مجھ سے کم تھے۔ عمر رفیق کے والد رفیق کاشمیری اوکاڑہ کے ایک معروف شاعر تھے۔ بعد میں اِن کے ساتھ اکٹھے مشاعرے پڑھتا رہا۔ اکثر جب مَیں اُن کے گھر جاتا تو رفیق کاشمیری صاحب سے بہت گپ شپ رہتی لیکن 2012ء کے بعد میرا اُن سے رابطہ ختم ہو گیا، روزگار کے مندے اور دُنیا کے دھندے میں ایسا پڑا کہ اوکاڑہ جانے کے بعد ایک دو دوستوں سے ہی ملاقات ہو پاتی جن میں لالہ احمد شہزاد، مسعود احمد اور شفقت رسول قمر تھے۔ باقی دوستوں سے ملنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ پچھلے دِنوں جب مجھے اپنی خود نوشت لکھنے کا خیال آیا تو مَیں نے عمر رفیق کی خبر لی، پتا چلا کہ اُن کے قالینوں کا کاروبار تباہ ہو گیا تھا اور اُنھیں ایک چھوٹی سی ملازمت کرنا پڑ گئی۔ وہ ملازمت کے سلسلے

میں پچھلے نو سال سے راولپنڈی میں ہوتے ہیں۔ ایک ماہ بعد گھر چکر لگاتے ہیں۔ عمر رفیق کی شادی ہوگئی تھی۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ شاید کچھ دِنوں میں اُن سے ملاقات ہو۔

یہ کالج کا پہلا سال تھا۔ کم و بیش کالج کے تمام لڑکوں سے جان پہچان نکل آئی تھی۔ اِس میں میرا خیال ہے دو باتیں تھیں۔ ایک تو ہم دونوں کا خوب صورت ہونا لیکن اصل بات شخصیت کا وہ نامعلوم پہلو تھا جو مجھے اساتذہ کے ساتھ بات چیت اور سوال جواب پر جرأت مندی سے اظہار کرنے پر اُکساتا تھا۔

طلبا تنظیموں کا میدانِ جنگ

کالج میں اُن دِنوں طلبا تنظیمیں عروج پر تھیں۔ اوکاڑہ کالج کی طلبا تنظیموں میں پی ایس ایف، یعنی پیپلز پارٹی کے طلبا کی تنظیم، ایم ایس ایف، یعنی مسلم لیگی طلبا، اے ٹی آئی، اہلسنت طلبا اور جمیعت کے طلبا کی جماعتیں تھیں۔ آئی ایس ایف یعنی امامیہ سٹوڈنٹس فیڈریشن کی جماعت بھی تھی لیکن یہ معدودے چند تھے۔ جمیعت اور مسلم لیگی طلبا کا زیادہ تر اتحاد ہوتا تھا اور پیپلز پارٹی اور امامیہ کا اتحاد تھا۔ جمیعت اوکاڑہ میں بہت کم تھی لیکن دھونس چلانے میں آگے آگے ہوتی تھی۔ آئے دن کسی نہ کسی دنگے کو جنم دیتے رہتے۔

ایک دن پرنسپل نے پیپلز پارٹی کے طلبا کو شہہ دی کہ ذرا جمیعت کی ٹھکائی کر دیں تاکہ کالج میں سٹرائیک اور بے امنی کا ماحول تھوڑا کم ہو جائے اور اِس طرح سے ٹھکائی ہو کہ دوبارہ کالج کا رُخ نہ کریں۔ اِنھوں نے ایک دن پہلے ہی اپنے ڈنڈے لا کر چھپا دیے۔ سب کو پتا چل چکا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ مسلم لیگی طلبا کو پرنسپل نے کہا کہ آپ الگ رہیں ورنہ آپ کے خلاف بھی ایکشن لیا جائے گا اور کالج میں آپ کی جماعت بین کر دی جائے گی۔ اگلے دن گیارہ بجے کے وقت جمیعت نے کالج میں کشمیر کے نام پر سٹرائک کرنا تھی اور اُسی وقت یہ بلوا ہونا تھا۔

ہم جیسے طلبا جو کسی بھی تنظیم کا حصہ نہیں تھے وہ تماشائی تھے۔ میری تمام ہمدردیاں امامیہ کے ساتھ تھیں مگر اِن لوگوں نے صلاح کی کہ کم از کم کالج میں کسی بھی قسم کے فساد میں حصہ نہیں لینا،

چاہے پرنسپل بھی ہمارے ساتھ برابر لائن میں لگ کر ڈنڈا اٹھا لے۔ لیجیے اگلے دن کالج کے گراؤنڈ میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جمیعت کو توقع نہیں تھی کہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ کالج میں چونکہ اُن کی تعداد بہت کم ہوتی تھی لہٰذا اپنی طاقت شو کرنے کے لیے اکثر لڑکے پنجاب یونیورسٹی سے بلواتے تھے جو زیادہ تر کریمنل ہوتے تھے۔ اِن کے توڑ کے لیے پرنسپل نے کالج کے باہر پولیس کو بلا لیا اور نہایت سختی کر دی کہ کوئی ایسا لڑکا جو کالج میں نہیں پڑھتا وہ اندر داخل نہ ہونے پائے۔ پولیس نے تمام سٹوڈنٹس کی تصدیق کرنے کے بعد طلبا کو کالج میں انٹری دی۔ اس کی وجہ سے جمیعت کے ایسے لوگ جو کالج کے سٹوڈنٹ نہیں تھے کالج میں نہ آ سکے۔ جیسے ہی ہنگامہ شروع ہوا، پی ایس ایف کے طلبا نے اپنے چھپائے ہوئے ڈنڈے نکال لیے۔ پھر ایک پل میں کالج میدانِ جنگ بن گیا۔ مشورہ یہ تھا کہ صرف سروں پر وار نہ کیا جائے جس سے جان کے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ایک گھنٹا تک یہ لڑائی جاری رہی۔ ایک تو جمیعت کے طلبا کی تعداد بہت کم تھی دوم اُن کے حمایتی کالج میں داخل نہیں ہو سکے، تیسری بات یہ ہوئی کہ وہ خالی ہاتھ تھے اور پی ایس ایف والوں کے پاس ڈنڈے تھے۔ چوتھی بات یہ تھی کہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اُن کی چیخیں آسمان کو چھوتی تھیں۔ چنانچہ ایک گھنٹے کے اندر اُن سب لڑکوں کے بازو، ٹانگیں، ہاتھ وغیرہ ٹوٹ گئے۔ وہ کالج کے اوول میں یوں پڑے تھے جیسے گاڑیوں کے کٹے پھٹے پُرزے پڑے ہوں۔ جب جمیعت کو شکست فاش ہو گئی تو لڑائی خود بخود روک دی گئی۔ اِس ہنگامے کو تیس سال ہو گئے، وہ دن اور آج کا دن اوکاڑہ کالج میں جمیعت قائم نہیں ہو سکی۔ ہمیں ایک قسم کی کمینی سی خوشی تھی اور بہت تھی۔

یہ تو جمیعت کا حال تھا لیکن اُس کے بعد بھی جب مَیں نے اِن جماعتوں کے طلبا پر اجتماعی نظر ڈالی ہے تو مجھے یاد پڑتا ہے ایسے تمام طلبا جن کا تعلق سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی تنظیموں سے رہا تھا اُن میں اکثر کوئی ٹرکوں کے اڈے کا انچارج بن گیا، کسی نے بسوں کے اڈے پر تھڑا جما لیا، کوئی چرس، افیون اور ہیروئن بیچنے لگ گیا اور کوئی پیشہ ور قاتل بن گیا۔ اس کا سبب اصل میں تب بھی اور آج بھی یہ ہے کہ پاکستان میں طلبا کو کتاب پڑھنے سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ لٹریچر، کتاب

اور تاریخ سے دُور دُور کا واسطہ نہ ہونے کے سبب اُن کے ہاں وہ شعور اور وژن پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک سیاسی لیڈر کو چاہیے جس سے وہ عوام الناس کے لیے مفید انسان بنتا ہے۔ لہٰذا جب اُنھیں ان سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی پشت پناہی سے تھوڑی سی طاقت ملتی ہے تو وہ اُس طاقت کو دنگا گیری میں گنوا دیتے ہیں۔

کالج کے زمانے کی بہت سی یادیں ہیں، بہت سے قصے ہیں مگر یہاں اُن کا بیان کرنا طوالت کو جنم دینا ہے۔ مختصر یہ کہ نہایت سنہری زمانہ تھا۔ درخت ہرے تھے، پات کھلے تھے، کم کم بادوباراں تھا۔ ٹوٹی پھوٹی غزلیں کہنے لگا تھا، نثر لکھنے لگا تھا، حُسن کے رنگوں سے واقف ہو چکا تھا۔ پھولوں سے خوشبو آنے لگی تھی۔ راتوں کو مہکانے لگی تھی۔ کالج کے سبزے ہرے تھے، ہوائیں نرم تھیں، جوانی پھوٹی پڑتی تھی۔ یہی زمانہ تھا جب شہر کی ایک لائبریری سے شکیل عادل زادہ کا بازی گر پڑھ رہا تھا۔ کالج کے رستے میں گرلز کا جونیئر ماڈل سکول پڑتا تھا اور وہاں سے میں بازی گر ناول کا ہیرو بابر زمان خاں بن کر گزرنے لگا تھا۔ آپ بھی سن لیجیے وہ کیسے؟

بعض اوقات عمر رفیق کسی وجہ سے جب مجھے دیپالپور چوک لینے نہ آتا تو مَیں پیدل چلتا ہوا فیصل آباد روڈ پر چل کر پہلے کچہری روڈ آتا۔ جس کے ایک طرف آفیسر کالونی تھی اور دوسری جانب کچہریاں تھیں۔ تھوڑا آگے جا کر گرلز جونیئر ماڈل ہائی سکول تھا اور یہاں سے سڑک سیدھی کالج جاتی تھی۔ اِسی رستے سے کالج جاتا تھا۔

پہلا عشق آم کے پیڑ تلے

ایک دن یوں ہوا کہ مَیں کالج کی طرف پیدل چل رہا تھا۔ جونیئر ماڈل سکول کے پاس ایک تانگہ رُکا۔ مَیں ذرا پیچھے تھا۔ تانگے سے دو بچیاں نیچے اُتریں باقی اُسی تانگے پر بیٹھی رہیں، وہ کالج کی لڑکیاں تھیں۔ گرلز کالج گھوڑے شاہ قبرستان کی مشرقی جانب تھا۔ اتنے میں مَیں تانگے کے برابر پہنچ چکا تھا کہ ایک لڑکی نے تانگے سے اُترنے والی ایک بچی کو آواز دی، آمنہ آپ کی کتاب یہیں تانگے پر رہ گئی ہے، یہ لو، اور کتاب بچی کی طرف پھینکنا چاہی، لیکن مَیں اچانک درمیان میں آ

گیا۔ مَیں یہ دیکھ کر کہ کتاب کہیں میرے سر پر نہ لگے، پیچھے رُک گیا۔ مگر تانگے والی لڑکی نے کتاب نہ پھینکی۔ اب یہ سوچ کر مَیں پھر آگے بڑھا کہ شاید میری وجہ سے اُس نے کتاب لڑکی کی طرف نہیں اچھالی۔ جیسے ہی مَیں دوبارہ تانگے کے برابر آیا کتاب ایک دم میرے سر میں لگی۔ مَیں چکرا کر رہ گیا۔ تانگے پر بیٹھی تمام لڑکیاں ہنس دیں۔ مَیں نے وہ کتاب نیچے سے اُٹھالی اور آگے چل دیا۔ تانگہ آگے بڑھ گیا، اور وہ بچّی میرے پیچھے دوڑی، کہنے لگی بھیا، میرا کیا گناہ ہے یہ کتاب تو میری ہے مجھے واپس کر دیں۔ مَیں نے ترس کھا کر کتاب بچّی کے حوالے کر دی اور آگے چل دیا۔ مجھے اب وہ تانگہ ایک موڑ مُڑتے دکھائی دیا یعنی تانگہ کالج کی طرف مُڑ رہا تھا اور اُسی وقت تانگے سے ایک کاغذ نیچے گرا۔ مَیں نے بھاگ کر وہ کاغذ اٹھالیا، اُس پر لکھا تھا، ''اے وہ لڑکے جس کا نام مجھے معلوم نہیں ساڑھے بارہ بجے گرلز کالج کے گیٹ کے سامنے آم کے پیڑ کے نیچے چلے آنا۔ آپ کا نام پوچھنا ہے۔ میرا نام رابعہ ہے۔''

کاغذ پڑھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، خوشی کے جذبات تھے یا ہیجان کے، مجھے معلوم نہیں مگر لگ رہا تھا کہ مَیں پرندوں کے ساتھ پرواز کر رہا ہوں۔ ہوا میں اڑتا پھرتا ہوں۔ ساڑھے بارہ بجے کا وقت صدیوں پر محیط ہو گیا۔ ایک ایک منٹ دِنوں پر بھاری پڑ گیا۔ خُدا قسم آج تک وقت کی سمجھ نہیں آئی کیا بلا ہے، کبھی تو لمحوں میں نکل جاتا ہے کبھی زمانوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ مَیں ساڑھے گیارہ بجے ہی گرلز کالج کے سامنے کے اُس میدان میں جا بیٹھا جہاں دس بارہ آموں کے پیڑ ساونی برسا رہے تھے۔ اب تو وہ جگہ ایک پلازے نے لے لی ہے۔ یہاں وقت کو بہلانے کے لیے مَیں نے ایک ڈائجسٹ کا سلسلہ وار حصہ مجاہد کھول لیا اور پڑھنے لگا۔ اچانک مَیں نے دیکھا تین لڑکیاں وہاں گھس آئی ہیں۔ اُن میں ایک وہی کتاب پھینکنے والی تھی۔ اگرچہ یہ عمر سب خوب صورتیوں کا احاطہ کر رہی ہوتی ہے مگر یقین جانیے وہ اُن سب میں ممتاز تھی۔ تینوں میرے قریب بیٹھ گئیں۔ پہلے گاؤں پوچھا، پھر نام پوچھا، عمر پوچھی پھر کام پوچھا۔ میں نے صحیح صحیح جواب دیا۔

کہنے لگی، آپ نے اتنا سفید رنگ اور روشن چہرہ کہاں سے پایا ہے؟ اِس سوال کے جواب میں مَیں صرف ہنس دیا اور اُلٹا پوچھ لیا، آپ اتنی شریر کیسے ہیں؟ بولی آپ بدھو کو دیکھ کر شریر ہو گئی

ہوں ورنہ تو معصوم سی ہوں۔

الغرض کالج میں اُس کا دوسرا سال تھا۔ یعنی مجھ سے ایک سال سینئر تھی۔ 53 ٹو ایل گاؤں کی تھی۔ یہ گاؤں شہر کے ساتھ ہی تھا اور اب تو شہر کا حصہ ہے۔ اگلے دن پروگرام یہ بنا کہ گول چوک میں "گیٹ اِن فریش" پر بالکل اِسی وقت ملاقات ہوگی مگر رابعہ ایک سہیلی کے ساتھ آئے گی۔ لیجیے صاحب اب ہمارے کالج کی کلاسوں سے ناغے شروع ہو گئے اور اگلے ایک سال تک یہ ملاقاتیں چلیں۔ پھر وہ اپنے بھائی کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی پڑھنے چلی گئی اور ہم بنجارے کے بنجارے رہ گئے۔ یہ تب کے زمانے تھے جب عشق میں چھوٹی چھوٹی شرارتیں چلتی تھیں، بڑے دھماکے نہیں ہوتے تھے۔ پھر وہ گئی تو یوں ہوگئی گھر کی صورت، نہ وہ دیوار کی صورت، نہ وہ در کی صورت۔

کسووال کے دن

فرسٹ ایئر کا امتحان دینے کے بعد مَیں ساہیوال کے ایک قصبے کسووال میں چلا گیا۔ وہاں میرے والد صاحب ایک گاؤں 13 ماڑی میں مسجد بنا رہے تھے۔ مَیں نے خیال کیا کہ آگے تین چار ماہ کی چھٹیاں ہیں۔ چلیے کام کرتے ہیں اور کام سیکھتے ہیں۔ آپ سمجھ لیں اُن دنوں 13 ماڑی گاؤں ہمارا دوسرا گھر ہو گیا تھا۔ وہاں گاؤں کا ہر فرد والد صاحب کا دوست تھا اور اِس طرح سے اُن کو چاہتے تھے جیسے اپنے قریبی عزیز کو چاہتے ہیں۔ روزانہ ہی کوئی نہ کوئی دوست اُن کی اپنے گھر میں دعوت کر لیتا تھا۔ مَیں بھی چونکہ ساتھ ہی ہوتا تھا لہٰذا اُن کے سارے دوست میرے ساتھ بھتیجے کی طرح سلوک رکھتے تھے۔ اُن کے سب سے بہترین دوست نواب ریاست علی تھے۔ والد صاحب کا قیام بھی اُنہی کے ہاں رہتا تھا۔ چونکہ وہ گاؤں کے ایک طرح سے چوہدری بھی تھے۔ لہٰذا تمام گاؤں اُن کی عزت کرتا تھا۔ انہی کے ساتھ زیادہ گپ شپ اور مذاق کا معاملہ تھا۔ گاؤں میں جاٹ برادری کی اکثریت تھی۔ زراعت اور باغات بہت تھے۔ خاص طور پر آم اور مالٹے کے باغات اتنے تھے کے پورا گاؤں سیاہی مائل سبز ہو گیا تھا۔ باغوں کی کثرت کی وجہ سے انھیں نہری پانی دُگنا الاٹ تھا۔ یہاں کی مسجد بہت بڑی تھی جس کی تعمیر میرے والد کے ذمہ تھی۔

اِس کے علاوہ گاؤں والوں کے آپس میں چھوٹے موٹے جھگڑوں میں اُنھیں پنچایت میں بھی بلایا جاتا تھا۔ چونکہ اُن کا مزاج جیسا کہ مَیں پہلے بتا چکا ہوں، کافی ظریفانہ ہے، اُنھیں نواب ریاست نے ''اسرائیلیا'' کا نام دے رکھا تھا۔ پھر یہ نام باقاعدہ جاری ہو گیا اور میرے والد کے اصل نام کو لوگ بھول ہی گئے۔ والد صاحب کے ایک دوست منشا جٹ شیعت کی طرف رغبت رکھتے تھے، لٰہذا اُن کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا زیادہ تھا۔ اکثر صبح کا ناشتہ اُنہی کے پاس کرتے تھے اور آپس میں ہی اہلِ بیت کے متعلّق باتیں کر کے جی پر چاتے تھے۔ مَیں بھی اُن کے ہاں بہت مانوس ہو چکا تھا۔ یہاں ایک بات والد صاحب کے متعلّق مشہور ہو گئی تھی کہ وہ کسی بھی بات میں لاجواب نہیں ہوتے۔ ایک دن ایک آدمی نے کہا کہ آج اسرائیلیے کو مَیں لاجواب کروں گا۔ شام کو جب کام دھام سے فارغ ہو کر والد صاحب اپنی قیام گاہ میں آئے تو معمول کے مطابق وہاں کئی لوگ جمع تھے۔ اُس آدمی نے کہا، میاں اسرائیل، اگر آج میرے سوال کا جواب مل جائے تو پھر آپ کی لیاقت کا پتا چلے گا، والد صاحب نے کہا بھائی دیکھو، ہم ''سلونی والے'' کے غلام ہیں، ذرا سوچ کے بات کرنا۔ وہ کہنے لگا سوچ لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ میرے پاس چالیس اونٹ ہیں۔ ہم تین بھائی ہیں۔ ہم نے اونٹ برابر آپس میں تقسیم کرنے ہیں۔ اب یہ اونٹ ہم میں تقسیم کر کے دکھایئے؟ کسی کی طرف کم یا زیادہ نہیں جانا چاہیے اور نہ اونٹ کو کاٹنے کی کوشش کیجیے۔ اُس کا سوال سن کر تمام لوگوں نے تالی بجا دی کہ اب اسرائیلیا پھنس گیا۔ اِدھر والد صاحب نے آرام سے حقّے کا کش لیا اور بولے، دیکھیے بھائی پہلے میرے ایک دو سوالوں کا جواب دیں؟

اُس نے کہا پوچھیں۔

والد صاحب نے کہا کیا آپ نے کسی کا قرض دینا ہے؟

اُس نے کہا ہرگز نہیں۔

یہ اونٹ آپ کے پاس کتنے عرصے سے ہیں؟

وہ بولا، آپ سمجھیں ایک سال سے میرے پاس ہیں۔

کیا مسلمان ہو؟

جی ہاں الحمدللہ مسلمان ہوں۔

اب والد صاحب نے حقے کا ایک اور گہرا کش لیا اور کہا، اچھا ایک کام کرو۔ اِس میں سے پہلے ایک اونٹ زکوٰۃ کا نکال دو۔ کیونکہ وہ تمھارا نہیں ہوسکتا۔ باقی کے تیرہ تیرہ تینوں رکھ لو۔ والد صاحب کے اس جواب پر سب نے تالی بجادی۔ وہ بولا، یہ تو روندی ہوگئی لیکن اُدھر سب نے کہا میاں اسرائیلیے نے جواب تو سولہ آنے سیدھا دیا ہے۔ تب وہ کہنے لگا کاش مَیں چالیس کی بجائے کوئی اور ہندسہ سوچ لیتا۔

چک 42 ڈی کا مینار اور قاسو بلوچ

چک 42 ڈی ہمارے گاؤں سے مشرق کی طرف تین کلومیٹر واقع ہے۔ یہ تمام گاؤں بلوچوں کا ہے۔ اِس کے مرکز میں ایک مسجد تھی۔ جس کا مینار بنانے کا کام والد صاحب کو مل گیا۔ تب مَیں بھی اُن کے ساتھ کام پر جانے لگا۔ ہم نے وہاں گاؤں سے تین چار مزدور لیے اور کام شروع کر دیا۔ جیسے جیسے مینار بلند ہوتا گیا، ہم بانسوں اور لکڑی کے تختوں سے پَیڑ کرتے گئے (پَیڑ اُس جگہ کو کہتے ہیں جس پر کھڑے ہوکر بلندی پر کام کیا جاتا ہے)۔ چار ماہ میں رفتہ رفتہ مینار کو ایک سو چالیس فٹ بلند لے گئے۔ اب مسئلہ یہ ہوا کہ جب مینار اتنی بلندی پر پہنچ گیا تو اُس میں ایک لچک پیدا ہوگئی۔ مینار کے اندر کی طرف اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بھی رکھی تھیں۔ جب کوئی بھی شخص ساٹھ ستر فٹ سے اوپر چڑھتا تو مینار اُسے ہلتا ہوا محسوس ہوتا۔ چنانچہ وہ آدمی بھاگ کر نیچے اُتر جاتا۔ اُسے لگتا کہ مینار گرنے والا ہے۔ ہم چونکہ آہستہ آہستہ مینار کو اوپر اٹھا رہے تھے اور اُسی وجہ سے خود بھی ساتھ اُٹھ رہے تھے لہٰذا ہمیں نہ تو اس کے ہلنے سے خوف آتا تھا اور نہ چوٹی پر چڑھنے سے۔ اِسی طرح گاؤں کے دو مزدور بھی مینار کی چوٹی پر بے خوف چلے جاتے تھے۔ اِن میں ایک قاسم بلوچ بھی تھا جسے قاسو کہتے تھے۔ باقی کوئی فرد بھی اوپر نہیں جاسکتا تھا۔ مینار کی سب سے اوپر کی منزل پر، جہاں مینار کا گنبد لگا تھا، اُس میں ہم نے ایک گول اور کھلے ہوئے دروں کا ایک کمرہ سا بنا دیا۔ یہ کمرہ اتنا سا تھا کہ ایک آدمی کے لیٹنے اور بیٹھنے کی کھلی جگہ تھی۔ مینار کی چوٹی پر

کبوتر وغیرہ بیٹھے رہتے تھے۔قصہ مختصر یہ کہ ہم نے چھ ماہ میں مینار بنا کر گاؤں کے حوالے کیا اور کام ختم کر دیا۔

ایک بار یوں ہوا کہ اُسی قاسم بلوچ کا گاؤں میں ایک دوسرے آدمی سے جھگڑا ہو گیا۔بات آگے بڑھی اور قاسو بلوچ نے مخالف آدمی کی ٹانگ توڑ دی۔اُنھوں نے پرچہ کرا کے پولیس بلالی۔ اِدھر قاسو بلوچ کو یہ سوجھی کہ دو وقت کی روٹی اور پانی لیا اور اور پیشاب کرنے کے لیے ایک خالی بڑی بوتل لی اور مینار پر چڑھ کے اُس چھوٹے سے گول کمرے میں بیٹھ گیا۔اب پولیس اور باقی لوگ نیچے اُسے اُترنے کا حکم دیتے رہے لیکن وہ نہ اُترا۔ پولیس والوں نے اور گاؤں کے دوسرے کئی افراد نے بار بار اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر جیسے ہی ستر اسی فٹ پر جاتے، ڈر جاتے اور کانپتے ہوئے نیچے اتر آتے۔ کیونکہ مینار ہلنا شروع کر دیتا تھا۔ پولیس بضد تھی کہ ملزم کو لے کر جائیں گے مگر مسئلہ یہ تھا کہ اُوپر چڑھ کر اُسے کون اُتارے۔حتیٰ کہ دس بارہ گھنٹے اسی طرح گزر گئے مگر وہ اوپر سے نہیں اُترا۔آخر تھانے دار نے دو پولیس والے مینار کے ساتھ بیٹھا دیے اور خود چلا گیا۔پھر پورا ایک دن بیٹھ کر یہ بھی چلے گئے۔ جیسے ہی پولیس والے گئے، وہ جلدی سے رات کو ایک بجے کے بعد نیچے اُترا اور مزید کھانے پینے اور حاجات کرنے کا سامان لے کر پھر اوپر جا بیٹھا۔اسی طرح قاسو بلوچ نے دس پندرہ دن گزار لیے۔ پولیس آتی تھی اور اُسے مینار پر بیٹھا دیکھ کر چلی جاتی تھی۔ اتنے عرصے میں سب کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور آخر مخالف آدمی نے صلح کر لی۔تب قاسو بلوچ نیچے اُترا۔

گاؤں کے چار پاگل

ویسے تو ہمارا سارا گاؤں پاگل ہے مگر فی الحال یہاں صرف پانچ پاگلوں کا ذکر مقصود ہے۔

حلیمہ کملی: یہ ہمارے گاؤں کی بوڑھی کملی عورت تھی۔بھٹیوں کے خاندان سے تھی۔ بوسیدہ مگر صاف دھوئے ہوئے کپڑے پہنتی تھی۔جسم ہڈیوں کی مُٹھ تھا۔ ہر وقت گاؤں کی گلیوں

میں گھومتی رہتی۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی چلی جاتی یا پھر جو سامنے آتا اُس سے باتیں شروع کر دیتی۔ ہر گھر میں بغیر اجازت داخل ہو جاتی۔ کھڑے کھڑے گھر والوں کو چند باتیں سناتی اور باہر نکل جاتی۔ باتیں سو فیصد سچ کرتی تھی، چاہے اُس میں کتنا ہی بڑا فتنہ کیوں نہ کھڑا ہو جاتا۔ اکثر سامنے والے سے کہتی ''بھلا بتاؤ تو میں کملی ہوں؟ سب کہتے ہیں حلیمہ کملی ہے۔ حلیمہ کملی نہیں، حلیمہ سیانی ہے۔''

اُس کے رشتے دار اکثر چوریاں کرتے تھے اور یہ اُن کا سارا کچا چٹھا بازاروں میں کھولتی پھرتی۔ لوگوں کے گھر گھر جا کر اُن کے دُکھ سنتی، اپنے سناتی، نہ کچھ پیتی نہ کھاتی اور اُٹھ جاتی۔ تمام دن ایک پل آرام نہ کرتی، نہ سوتی۔ شام ہوتے ہی اپنے گھر چلی جاتی پھر صبح ہونے سے پہلے باہر نہ نکلتی، چاہے قیامت آ جائے۔ اُس کے بیٹوں کی شادی نہ ہوئی تھی۔ ایک بیٹا کہیں گم ہو گیا، اللہ جانے کسی نے مار دیا یا کیا ہوا۔ اکثر اُسی کا نام لے لے کر روتی تھی۔ غریب بہت تھی۔ پندرہ سال ہوئے اسی غربت میں مر گئی۔

شیدا کملا: یہ پچاس سال کا آدمی تھا۔ ہمارے گاؤں کے چوک میں سڑک کے درمیان آ کر کھڑا ہو جاتا اور تمام دن وہیں کھڑا رہتا۔ جون اور جولائی کی سخت گرمی میں بھی وہیں کھڑا رہتا۔ ایک دفعہ میں نے کہا رشید میاں اُدھر سائے میں کھڑے ہو جاؤ، کہنے لگا کیا سردیاں نہیں آئیں گی؟ میں چپ ہو گیا۔ کسی کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ اگر کوئی اُسے چھیڑ دیتا تو ایسی ایسی گالیاں دیتا کہ کان بند کیے نہ بنتی۔ ہنسنا شروع کرتا تو ہنستا چلا جاتا۔ ایک چھوٹی سی بوری پاس رکھتا تھا۔ سڑک پر کاغذ یا لکڑی کا ٹکڑا پڑا ملتا، اُسے اُٹھا کر بوری میں ڈال لیتا اور آگے چل دیتا۔ جب سڑک کے درمیان کھڑا ہو جاتا تو دُنیا کی کوئی طاقت ہٹا نہ سکتی۔ اکثر نمازیوں کو گالیاں دیتا۔ خود سڑک کے درمیان ہی نماز کے لیے ہاتھ باندھ لیتا۔ اُس کے نام پر کچھ زمین تھی۔ ورثا وہ زمین اپنے نام کروانا چاہتے تھے۔ ایک دن وہ شیدے کو تانگے پر لاد کر شہر لے جانے لگے تا کہ کچہریوں میں جا کر کاغذات پر انگوٹھے لگوا لیں۔ شیدے کملے نے وہ اُدھم مچایا کہ الامان۔ تانگے پر چڑھنے سے صاف انکاری ہو گیا۔ گالیاں دینے

رگا۔ کہنے لگا تم مجھے کملا سمجھتے ہو؟ مرتے دم تک تمھارے نام زمین نہیں کراؤں گا۔تم چاہتے ہوئیں انگوٹھے لگا دوں پھر تم میری گردن دبا دو۔ آخر بے چاروں نے چھوڑ دیا۔ جب مرا چوک کی رونق ختم ہو گئی۔

مبین کملا: اِسے لوگ راؤ مبین کہتے تھے۔ یہ بھی سارا دن سڑکوں پر گھومتا پھرتا۔کوئی مذاق کرتا تو پتھر اُٹھا کر پیچھے لگ جاتا لیکن زندگی بھر کسی کو پتھر مارا نہیں۔ اس کی ایک خصوصیت تھی کہ جس سمت منہ ہوتا، اُسی سمت چل پڑتا اور جب تک کوئی دیوار یا رکاوٹ سے ٹکرا نہ جاتا، چلے جاتا اور نہ رُکتا۔ اِسی عالم میں کبھی دس میل تک نکل جاتا تھا۔ وہاں کوئی جاننے والا دیکھ لیتا تو وہ روک کر اِس کا منہ گاؤں کی طرف کر دیتا، پھر یہ واپس چل پڑتا۔ اپنی سیدھ میں چلتا تھا۔ تمام ٹریفک اِسے دیکھ کر خود رستہ کاٹ لیتی۔ بہت دفعہ اِس کی سخت ٹکر بھی ہوئی اور مرتے مرتے بچا۔ کھاتا بہت کم تھا، سوتا بالکل نہ تھا۔ رات دن پھرتا تھا۔ ٹانگیں عموماً سوجی رہتیں۔ اپنے بھائیوں کو پہچانتا تھا۔ ایک دفعہ اِس کا ایک بھائی سخت بیمار ہوا تو یہ تین دن مصلے سے نہیں اُٹھا، دعائیں ہی پڑھتا رہا۔ تب اُٹھا جب وہ ٹھیک ہوا۔ فضول اور ایرے غیرے کاغذ اُٹھا کر ایسے پڑھنے لگتا جیسے کوئی عالم کتاب پڑھ رہا ہو۔ ایسی زبان میں بڑبڑاتا جو سریانی ٹائپ ہی ہوتی تھی، کسی کی سمجھ میں نہ آتی۔ جب چلتا تو سامنے بالکل نہ دیکھتا۔ آنکھیں زمین کی طرف ہوتی تھیں یا آسمان کی طرف۔ اِس کے مرنے کے بعد احباب نے میرا نام مبین رکھ دیا تھا، کہ میری بھی چلتے ہوئے کتاب پڑھتے جانے کی عادت تھی اور اِسی عالم میں کسی نہ کسی سے ٹکرا جاتا تھا۔

جاجی کملا: یہ ہمارے گاؤں کا انوکھا کملا ہے، ابھی تک حیات میں ہے۔ اپنی طرف سے اِس نے تمام گاؤں کو فوت کرا دیا ہے۔ یعنی جس سے ناراض ہوتا ہے، پھر سارا دن کہتا پھرتا ہے، فلاں مر گیا ہے، فلاں کا جنازہ قبرستان گیا ہے۔ اکثر لوگوں سے پیسے مانگتا ہے اور ایک روپے سے زیادہ نہیں لیتا۔ کوئی زیادہ دینے لگے تو بھاگ جاتا ہے۔ یہ صرف ایک روپے کے نوٹ کو اصلی سمجھتا ہے، باقی نوٹوں کو جعلی خیال کرتا ہے۔ کئی دفعہ گاؤں کے مشٹنڈے اِس کے پیسے چھین لیتے ہیں، تو

یہ اُنھیں دو دو دن تک فوت کراتا رہتا ہے۔ نہاتا دھوتا بھی ہے لیکن ایک دو مہینے کے بعد۔ تمام گاؤں کو پہچانتا ہے اور جانتا ہے۔ کبھی کبوتروں کے پیچھے لگ جاتا ہے اور تمام دن اُنھی کے چکر میں رہتا ہے۔ لوگوں کے جنازے بھی پڑھتا ہے۔ کسی کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیتا۔ اِس کی مٹھی میں پیسے ہوتے ہیں۔ یہ سمجھتا ہے مجھ سے پیسے چھیننے کے لیے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا ایک دم نعرہ لگا کر بھاگ اٹھتا ہے۔

گاؤں کا مشہور کبوتر باز، شیدا کھوکھر

اِس آدمی کو جب مَیں نے دیکھا، اُس وقت پچپن سال کے لگ بھگ تھا۔ سر پر طرہ دار پگڑی باندھتا تھا۔ اُنچا شملا رکھتا تھا۔ پاؤں میں اُونچی کنی والا کھُسہ ہوتا تھا۔ سفید لٹھے کا کُرتا اور ریشمی لاچا پہنتا تھا۔ جب چلتا لاچے کے نچلے سرے زمین پر گھسٹتے جاتے۔ بڑی موچھیں تھیں، قد ساڑھے پانچ سے اوپر نکلتا تھا۔ بڑی شان سے چلتا تھا۔ کبھی ایک ہاتھ میں بٹیر ہوتا، اُسے مٹھلاتے ہوئے چلا جاتا، کبھی ہاتھ میں کبوتر ہوتا۔ راہ چلتے ہوئے اکثر جاننے والے سے باتیں کرنے لگتا۔ اُس کے ساتھ ساتھ بٹیر کو بھی مٹھلائے جاتا۔ بعض دفعہ اصیل مُرغا لیے بازار میں گزرتا۔ یہ حقیقت میں ہمارے گاؤں کا نہیں تھا۔ ہمارے گاؤں میں اِس کی بہن بیاہی ہوئی تھی۔ اُسی کے پاس رہتا تھا اور چار پانچ سال تک رُکا رہتا۔ شاید اِسے یہ گاؤں پسند آ گیا تھا۔ باوقار آدمی تھا، کبھی کسی سے لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا، نہ ہمارے گاؤں میں اِس کا کسی سے معاشقہ تھا۔ شاید یہاں کا ماحول اِس کی کبوتر بازی اور مرغ بازی کے لیے ساز گار تھا۔ ایک بار اِس نے کسی غریب آدمی کو پچاس روپے دیے تا کہ وہ شہر سے سامان لا کر ریڑھی پر پھیری لگا کر بیچ لیا کرے اور جب اُس کا کاروبار چل جائے تو پچاس روپے واپس کر دے۔ جب وہ پھیری لگا کر چیزیں بیچنے لگا تو اِس نے اپنے پیسوں کی واپسی کا تقاضا کرنا شروع کر دیا۔ وہ کہتا رہا کہ ابھی آپ کی رقم اکٹھی نہیں ہو سکی۔ کچھ دن بعد دے دوں گا۔ دو تین ماہ گزرنے کے باوجود وہ اِس کے پیسے واپس نہیں کر رہا تھا۔ ایک دن مَیں اپنے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی پھیری لگانے والا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ یہ جگہ چوک

سا بن جاتی تھی۔ پھیری والے کی بد قسمتی، عین اُسی وقت اپنے مرغے کے ساتھ شیدا کھوکھر آ موجود ہوا۔ اُس نے پیسوں کا تقاضا کیا۔ اُس نے وہی بہانہ بازی کی۔ شیدے نے ایک دم اپنے مرغے کو زمین پر رکھا اور اُسے پکڑ کر اُلٹا کر دیا۔ پھیری والے کی جیبوں سے سارے پیسے نیچے گر گئے۔ اِس نے اُن میں سے اپنے پچاس روپے الگ کر کے باقی اُسے تھما دیے لیکن وہ ناراض ہو گیا اور باقی کے پیسے بھی پھینک کر آگے چل دیا۔ شیدے نے وہ سب پیسے اکٹھے کیے اور مجھے پکڑا دیے، کہنے لگا، یہ پیسے اپنی دادی کو تھما دو، جب اِس کا مزاج ٹھنڈا ہو گا اِسے واپس کر دینا۔ مَیں نے وہ پیسے جو 80 روپے بنتے تھے، لا کر اپنی دادی کو دے دیے۔ مَیں نے دیکھا شام کو وہی پھیری والا اپنے پیسے لینے آ گیا اور میری دادی نے اُسے سب پیسے دے دیے۔ آج اس واقعے کو بیالیس سال ہو گئے ہیں، مَیں واقعہ نہیں بھولا۔ بعد میں جب مَیں میٹرک میں ہوا تو اُس کے بعد شیدے کو مَیں نے نہیں دیکھا، اللہ جانے فوت ہو گیا یا کہیں چلا گیا۔

مشہور تانگے والا، شاہ محمد تانگے والا

یہ ایک جی دار آدمی تھا۔ بالکل ان پڑھ تھا مگر ایک قسم کا وقار رکھتا تھا۔ تاش کھیلتا تھا، فلم دیکھتا تھا۔ نماز بالکل نہیں پڑھتا تھا۔ نہ داڑھی رکھتا تھا، تانگہ چلاتا تھا۔ اکثر تانگہ چلاتے ہوئے گپیں لگاتا تھا۔ اگر کسی سواری کے پاس کرائے کے پیسے نہ ہوتے تو کرایہ نہ لیتا۔ اپنے گاؤں کے چوہدریوں کے ساتھ محاذِ جنگ گرم رکھتا تھا۔ کسی چوہدری کو نہیں مانتا تھا۔ اپنی ڈب میں پستول رکھتا تھا مگر کبھی دکھاتا نہیں تھا۔ اکثر اوقات تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواریوں کو مذہبی تبلیغ کرتا تھا۔ مولویوں کی سنی سنائی باتیں آگے سناتا تھا۔ ایک بار ہم اِس کے تانگے پر بیٹھے تھے، بابا محمد علی بھی تانگے پر تھا۔ اُس کے ہاتھ میں عصا تھا۔ اِس نے چلتے چلتے مذہبی مسائل شروع کر دیے اور حضرت ابو طالب کے بارے میں ایک مجہول سی گستاخانہ روایت بیان کر دی۔ بابا محمد علی نے ایک دم کہا، او بکواس بند کر اور یہ بتا، حلیمہ سعدیہ کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ کہنے لگا اُن کے بارے میں علم نہیں۔ بابے محمد علی نے کہا، جب تجھے اپنے گھوڑے کی لید کے سوا کسی شے کا علم نہیں، تو اُسی لید کے بارے

میں بات کیا کر۔ مذہب سے تیرا کیا لینا دینا۔ اور یہ حضرت اس طرح چُپ کر گئے جیسے منہ میں زبان ہی نہ تھی، جب اپنے تانگے سے سواریاں اُتارنے لگے تو بولے، بابا جی یہ بات بھی مولوی سے پوچھوں گا۔

گاؤں کی مشہور عورت، مائی بشیراں

یہ تھی تو عورت مگر گفتگو کی بے باکی میں واہیات مردوں کو ٹکر دیتی تھی۔ جسم کی بھاری تھی، باتیں کرتی نہ تھکتی تھی۔ ایوب کے زمانے میں گاؤں والوں نے اِسے عورتوں کی سیٹ پر یونین کونسل کا اعزازی ممبر بنا دیا پھر تمام عمر ممبر ہی کہلائی۔ اِس کا اصل پیشہ دائی کا تھا مگر گاؤں کے ہر کام میں دخیل تھی لیکن لوگ اِسے سنجیدہ کم ہی لیتے تھے۔ تھانے کچہری میں یوں بات کرتی جیسے برصغیر کا بڑا وکیل یہی تھی اور ہر قانون انگلیوں پر ازبر ہو۔ جھوٹ بولنے میں بہت دیدہ دلیر تھی۔ وزیرِاعظم سے لے کر امریکہ کے صدر سے تعلّقات کے دعوے رکھتی تھی۔ جو اِس کے پاس پہلے مدد کو پہنچ جاتا، بس پھر اُسی کی طرفداری میں جان مار دیتی۔ ہر گھر کی سچی جھوٹی اسٹوری بنا رکھتی تھی۔ وہ موقع بہ موقع سنانے میں دیر نہ کرتی۔ ایک بار مَیں نے کہا، مائی بشیراں مجھے پرسوں ارسطو ملا تھا، کہہ رہا تھا، مائی بشیراں کو میرا اسلام کہنا، کہنے لگی، ہائے ہائے تجھے کہاں مل گیا، وے اکبر تجھے کیا بتاؤں بچپن میں ہم ایک دوسرے سے کتنا عشق کرتے تھے؟ اُس وقت جوانی مجھ پر ایسے تھی جیسے پریوں کی ملکہ ہوں۔ ارسطو اور مَیں اکٹھے پاکپتن میں رہتے تھے، رات کو چھپ چھپ کر ملتے تھے۔

بے چاری کو یہ بھی پتا نہ تھا کہ ارسطو کی خاک بھی اب راکھ ہو چکی ہے۔ ڈھائی ہزار سال پُرانے آدمی کا نام لے کر اُسے احمق بنا رہا ہوں۔ مگر اُس نے وہیں گھڑ کے ایک گھنٹے کی اپنی اور ارسطو کی داستانِ عشق سنا دی۔ بے چاری کی یہی معصومیت سب جانتے تھے۔

مائی بشیراں کے یوں تو سیکڑوں قصے دلچسپ ہیں مگر ایک واقعہ بہت دلچسپ ہوا۔ آپ سنیے اور داد دیجیے۔ اگرچہ واقعے میں تہذیب کا دامن ذرا میلا ہو جائے گا مگر اِسے بیان کرنے کا جی کر رہا ہے۔

ہوا یہ کہ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی، جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، اصغر جٹ تھا۔ اُس کے بیٹے نے اپنے پڑوسیوں کے بچّے سے بدفعلی کر لی۔ بچّے والے ہسپتال سے میڈیکل رپورٹ تیار کروا لائے کہ پرچہ کرواتے ہیں۔ اِدھر گاؤں والوں نے مشورہ کیا کہ دونوں غریب گھر ہیں۔ تھانے میں گئے تو لٹ جائیں گے اور آخر میں بات صلح پر نمٹے گی تو کیوں نہ ابھی صلح ہو جائے۔ لیجیے صاحب گاؤں کے چوک میں پنچایت بیٹھ گئی۔ ہم لڑکے تماشا دیکھنے کو پنچایت کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ بچّے کے والدین کو پانچ ہزار روپیا دیا جائے۔ پانچ ہزار کی رقم اُس وقت بہت ہوتی تھی۔ یہ فیصلہ سن کر اصغر جٹ غصّے سے تلملانے لگا، بولا یہ پانچ ہزار کس بات کا؟ پیسے درختوں سے لگتے ہیں کہ اتنے پیسے دے دوں؟

اللہ دتہ نے کہا، بھائی اصغر دیکھ بچّے کی سُرین زخمی ہوگئی ہے۔ اُس کے ٹانکے لگے ہیں۔ یہ خرچہ تو دینا پڑے گا۔

اِدھر مائی بشیراں نے اصغر جٹ کی طرفداری شروع کر دی، بولی، نہ نہ مَیں تو اتنے پیسوں کے حق میں نہیں ہوں۔ چلو دو چار سو ہوا، دلجوئی کو دے دیں، یہ پانچ ہزار بہت ہیں بلکہ مَیں تو کہتی ہوں بچّے کو ٹافیوں شافیوں سے بہلا دیں۔ پیسے دیے تو آئندہ رسم پڑ جائے گی۔

امین ممبر بھی وہیں بیٹھا تھا، وہ بولا، مائی بشیراں پیسے بچّے کو نہیں، اُس کے والد کو دینے ہیں۔ ٹافیاں مَیں تجھے کھلا دوں گا۔ چوہدری فرید بھی وہیں تھا، وہ کہنے لگا بھئی چوہدری اصغر یہ پیسے تو دینے پڑیں گے۔ بچّے کی پیٹھ میں ٹانکے لگے ہیں، ورنہ تیرا بیٹا جیل جائے گا۔

اس بات پر اصغر جٹ کو بہت غصّہ آیا، بولا، چوہدری فرید، یہ سراسر ظلم ہے، بچّے کی سُرین کیسے پھٹ گئی؟ ہم نے بھی بچپن گزارا ہے، لیکن یہ پھٹتے تو کبھی نہیں دیکھی۔ اِس کی سُرین ریشم کی بنی تھی کہ پھٹ گئی۔ یہ پیسے زیادہ ہیں۔

اِس بات پر بہت قہقہے بھی لگے لیکن اصغر جٹ اپنی بات پر اصرار کرتا رہا اور شریف ارائیں کو گواہ بنا کر بولا، کیوں بھائی شریف کیا کبھی کسی کی پھٹی تھی؟

شریف بے چارا فوراً پنچایت سے بھاگ نکلا لیکن پانچ ہزار جرمانہ ڈال ہی دیا گیا اور

جرمانے کی ادائیگی کا ضامن اللہ دتہ نمبردار بن گیا۔ اب مائی بشیراں غصے سے بُڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور پوری پنچایت کو گالیاں دیتے ہوئے باہر نکل گئی۔ سامنے سے محمد یحییٰ آ رہا تھا، اُس نے کہا مائی بشیراں کیا ہو گیا ہے؟ کس کو گالیاں دیتے آ رہی ہے؟ فوراً اس کے پاس کھڑی ہو کر اُسے تمام واردات اور پنچایت کا فیصلہ سنانے لگی اور آخر میں بولی، بھائی یحییٰ تم ہی فیصلہ کرو، ہم ساری عمر مفت پھڑواتی ہیں، کوئی پچاس روپے نہیں دیتا اور اسے پانچ ہزار دلوا رہے ہیں، بھلا یہ کون سا انصاف ہے؟ یحییٰ نے جیسے ہی یہ جملہ سنا کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرتا ہوں بھاگ اُٹھا۔

غرض یہ کہ خُدا بخشے اِسی طرح کی بے باک اور بہت جی دار عورت تھی۔ آخری عمر میں اُسے موٹاپا لے ڈوبا۔ غریب بہت تھی علاج معالجہ بھی نہ تھا، ساٹھ سال کی عمر میں چل بسی۔

فضل کمہار کی بکریاں چوری

ہمارے پڑوس میں فضل کمہار ہوتا تھا۔ یہ اچھو کمہار کا بڑا بھائی تھا، جس کا قصہ مَیں سانپ کے معاملے میں سنا چکا ہوں۔ نہایت غریب آدمی تھا۔ اِس کی دو تین بکریاں تھیں۔ اُن دِنوں غریب آدمی کا سہارا یہی بکریاں ہوتی تھیں جنھیں بڑی عید پر بیچ کر اپنا وقت گزار لیتے تھے۔ یہ بکریاں اکثر بازار میں اور ہمارے مکانوں کے پچھلی طرف کے کھیت میں کھلی پھرتی رہتی تھیں۔ شام کو خود ہی گھر پہنچ جاتیں۔ ایک دن شام سے ذرا پہلے مَیں اپنے کوٹھے کی چھت پر کھڑا تھا اور سورج کے ڈوبنے کا نظارا کر رہا تھا۔ پتا نہیں کس لیے اچانک مَیں نے منہ پھیر کر مشرق کی جانب دیکھا، نظر دُور تک جاتی تھی۔ مَیں نے دیکھا ایک لڑکا دو بکریاں ایک گنے کے کھیت میں کھینچ کے لے جا رہا ہے۔ مجھے بکریوں کی شکل تو واضح نظر نہیں آئی کہ کس کی بکریاں ہیں؟ البتہ لڑکے کے چال سے اور قد سے اندازہ ہو گیا کہ وہ عابی بھٹی ہے لیکن تصدیق کرنے کے لیے مَیں نے اپنی نظریں وہیں جمائے رکھیں تاکہ اچھی طرح سے دیکھ لوں۔ تھوڑی دیر میں وہ لڑکا دوبارہ گنے کے کھیت سے باہر نکل آیا لیکن بکریاں اب اُس کے ساتھ نہیں تھیں۔ مَیں حیران ہوا کہ اِس نے یہ کیا کیا ہے؟ چلتا چلتا وہ ہمارے مکانوں کے پیچھے بہتے ہوئے نالے کے پاس آ گیا۔ وہ وہی عابد عرف عابی تھا۔

مَیں دوبارہ اپنے منظر میں غرق ہو گیا اور بھول گیا کہ کچھ ہوا ہے۔ عابی بھٹی دراصل بھٹی خاندان کا ایک لڑکا تھا۔ مَیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ پورا خاندان جرائم پیشہ اور چور تھا اور غریب غربا کو مار پیٹ بھی کرتے رہتے تھے۔

اُسی دن کی عشا کے وقت مجھے پتا چلا کہ فضل کمھار کی دو بکریاں غائب ہو چکی ہیں اور وہ بے چارے پورے گاؤں میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ فضل کمھار کی بیوی بے چاری بازار میں باولی سی کبھی اِدھر بھاگتی جاتی تھی کبھی اُدھر۔ اِسی طرح اُس کا خاوند بھی۔ جب مَیں نے اُنھیں پریشان دیکھا تو پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ اُنھوں نے بتایا کہ بکریاں نہیں مل رہیں۔ اُن کی یہ بات سُن کر مجھے فوراً عابی کا گنے کے کھیت میں بکریاں لے کر جانا یاد آیا۔ مَیں نے فضل کمھار سے کہا تمھاری بکریاں ایک لڑکا لے گیا تھا۔ اگر تم میں جرأت ہے تو اُس لڑکے سے جا کر پوچھو۔ فضل نے پوچھا کس لڑکے سے پوچھوں؟ آپ نام بتا دیں۔

مَیں نے کہا عصر کے وقت عابی لے کر جا رہا تھا اور گنے کے کھیت میں کسی جگہ باندھ دی تھیں۔ اب پتا نہیں وہیں ہیں یا وہاں سے نکال کر کسی کے حوالے کر دی ہیں۔ عابی کا نام سُنتے ہی فضل کمھار کے طوطے اُڑ گئے۔ بے چارا غریب آدمی ڈر گیا، لیکن اُدھر اُس کی ساری معاشی پونجی دو بکریاں تھیں۔ کہنے لگا اگر مَیں اُنھیں پوچھوں گا تو کیا آپ اُن کے سامنے گواہی دیں گے؟ کیونکہ اگر آپ گواہی سے مُکر گئے تو وہ میری ٹانگیں توڑ دیں گے۔ مَیں نے کہا، آپ جا کر نام تو لو، مَیں وعدہ کرتا ہوں گواہی دوں گا۔ لیکن اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ بھٹیوں کے ڈیرے پر جا کر کہے کہ تمھارا لڑکا میری بکریاں چوری کر کے لے گیا ہے۔ نہ ہی اُسے یقین آ رہا تھا کہ مَیں اُن ظالموں کے سامنے یہ گواہی دے دوں گا۔ نام لیتے ہی اوّل تو وہیں چھترول شروع کر دیتے اور اگر مَیں گواہی سے مکر جاتا تو پھر بالکل ہی شامت آ جاتی۔ چنانچہ کافی دیر ہچکچاتا رہا لیکن میرے اصرار پر کافی دیر کے بعد بے چارا بھٹیوں کے ڈیرے پر چلا گیا۔

وہ پندرہ بیس لوگ ڈیرے پر بیٹھے تھے۔ اُن میں عابی بھی بیٹھا تھا۔ فضل کمھار نے جا کر اُن کے سردار امین بھٹی سے کہا، سردار صاحب، آج عصر سے میری بکریاں غائب ہو گئی ہیں۔ اُس نے

کہا، پھر مَیں کیا کروں؟ کہنے لگا مجھے مخبری ہوئی ہے کہ میری بکریاں تمھارا بھتیجا عابی لے گیا ہے۔ فضل کی یہ بات سُنتے ہی وہاں سب لوگوں کے پاؤں تلے گویا آگ لگ گئی۔ ایک دم فضل کمہار پر چڑھ دوڑے۔ گالیاں دینے لگے۔ امین بھٹی نے کہا، جس کی گُڑی اُدھل جاتی ہے، ہم پر الزام لگا دیتا ہے۔ ایک لڑکے نے اُٹھ کر فضل کمہار کے ایک دھول جمائی۔ وہ بے چارا سٹپٹا گیا لیکن ہمت کر کے پھر بولا، اگر مخبر نے آپ کے سامنے گواہی دے دی کہ اُس نے دیکھا ہے تو پھر تو مَیں سچا ہوں۔ اب سب کو حیرانی ہوئی کہ کون ایسا دلیر مخبر پیدا ہو گیا جو ہمارے خلاف گواہی دے گا۔ اُنھوں نے کہا، اگر کوئی گواہ نہ ہوا اور تو نے جھوٹا الزام لگایا تو سمجھ لے آج تیری میت یہاں سے نکلے گی۔

لیجیے جناب امین بھٹی نے وہاں بیٹھے تمام لڑکوں کو اُس کے ساتھ لگا دیا اور کہا کہ سب جاؤ اور اُس مخبر سے بھی نپٹو۔ اب کیا تھا؟ مَیں نے دیکھا کہ فضل کمہار پندرہ بیس لڑکوں کے بیچ اِس طرح کانپتا، لرزتا اور سہا ہوا آ رہا تھا جیسے اُلٹا وہ چور ہو اور باقی مدعی ہوں۔ مَیں اپنے دروازے کے سامنے کھڑا حالات کا منتظر تھا۔ جب مَیں نے اُنھیں آتے دیکھا تو بہت خوش ہوا کہ چلیے اِس نے نام تو لیا ورنہ غریب کی بکریاں مفت میں چلی جاتیں۔ جیسے ہی میرے قریب آئے تو فضل کمہار نے میری طرف اشارہ کر دیا اور بولا کہ میرا مخبر یہی علی اکبر ہے۔ جیسے ہی سب نے میرا نام سُنا وہیں سٹپٹا کر کھڑے ہو گئے کیونکہ اُنھیں میرے بارے میں یقین تھا کہ یہ نہ تو ڈرتا ہے اور نہ گواہی دینے سے باز آئے گا۔ اُن میں سے ایک بڑا لڑکا آگے بڑھا اور بولا، ہاں اکبر کیا یہ بات سچ ہے کہ آپ نے عابی کو بکریاں لے جاتے دیکھا ہے؟ مَیں نے کہا جی ہاں دیکھا ہے۔ پھر مَیں سیدھا عابی سے مخاطب ہوا، مَیں نے کہا اوئے عابی چوتیے، وہ کماد کے کھیت میں عصر کے وقت اگر بکریاں نہیں تھیں تو کیا اپنی اماں باندھ کے آیا ہے؟ میرا اتنی دیدہ دلیری سے بات واضح کرنے پر عابی بالکل ہی ٹھس ہو گیا اور واپس پلٹ کر اپنے رشتے دار سے کہنے لگا، بھائی غلطی ہو گئی۔ اُس کا اعتراف سُن کر سب شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ پرویز نے تین چار چپیڑیں دے ماریں اور کہا، تو نے کہاں کہاں ہمیں ذلیل کروایا ہے۔ وہ بولا مجھے کیا پتا تھا کہ اکبر مجھے دیکھ رہا تھا۔ کوئی اور مخبر ہوتا تو مَیں نپٹ لیتا۔ اِس بات پر سب کا قہقہہ بلند ہو گیا۔ تب اُسے سب نے ساتھ لیا، مَیں بھی ساتھ تھا تا کہ

بے چارے فضل کو راستے میں دوبارہ نہ ڈرالیں۔ اور گنے کے کھیت سے وہ بکریاں جا کر نکلوائیں جنھیں اگلے ہی دن فضل کمہار نے بیچ کر قصہ پاک کیا۔

انٹر کا دوسرا سال اور حادثات کا ہجوم

انٹر کے دوسرے سال میں میری نصابی تعلیم میں دلچسپی بالکل نہ رہی۔ انگریزی بھی کمزور تھی۔ گھر کے معاشی حالات بھی دِگرگوں تھے۔ اِس کے علاوہ اِسی سال دو تین حادثے ایسے پیش آئے کہ مَیں نے سلیبس کی کتابوں کو ہاتھ لگانا بند کر دیا۔

ایک حادثہ تو یہ ہوا کہ میرا سگا چچا محمد نذیر جس کی شادی نہیں ہوئی تھی، پہلے اِس کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ یہ ایک بنجارہ آدمی تھا، ملکوں شہروں پھرا کرتا تھا اور شاعری سے شَغف رکھتا تھا۔ سیکڑوں پنجابی مثنویاں اور قصے کہانیاں اسے یاد تھے، خود بھی موزوں کرتا تھا۔ دادی اماں کی وفات کے وقت گھر آیا اور اُن سے وعدہ کیا کہ دوبارہ گاؤں سے باہر نہیں جاؤں گا، اور نہیں گیا۔ ہمارے سارے گھر کی رونق تھا۔ یہ چائے بہت پیتا تھا اور روٹی کم کھاتا تھا۔ یہ تو خیر اچھی بات تھی لیکن اِس میں بُری بات یہ تھی کہ چائے میں نمک بہت ڈالتا تھا۔ ہمارے گھروں میں چائے میں نمک ڈالنے کا رواج بالکل نہیں تھا۔ یہ بُری عادت کہیں باہر سے لے کر آیا تھا۔ وہی اِسے لے ڈوبی۔ اِسے اکثر بلڈ پریشر رہنے لگا۔ تب صحت کے معاملے میں زیادہ سنبھال نہیں کی جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ بخار اور سر درد یا پیٹ درد کو بیماری سمجھا جاتا تھا۔ بلڈ پریشر کا علم نہیں تھا۔ اِسے سر درد رہنے لگا۔ جس کے تدارک کے لیے اسپرین کھاتا رہا۔ دراصل نمک کے زیادہ استعمال کے سبب یہ بلڈ پریشر تھا۔ ایک رات اِسی عالم میں سویا اور صبح جب آٹھ بجے تک سویا رہا تو گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ کیونکہ یہ صبح چھ بجے کے بعد بستر پر لیٹا رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ جب آگے بڑھ کر دیکھا تو فوت ہوا پڑا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک کہرام سا پیدا ہو گیا۔ والد صاحب اُن دنوں کسووال میں تھے۔ مَیں جلدی سے بس پر بیٹھا اور اُنھیں جا کر اطلاع دی۔ عصر تک ہم گاؤں واپس آ گئے۔ اُس دن والد صاحب بہت روئے۔

بابا صدرالدین اور اماں حلیمہ بھی گئے

اِسی سال بابا صدرالدین اور اماں حلیمہ لاہور آ گئے۔ یہاں بابا صدرالدین بیمار پڑ گئے۔ ہمیں اطلاع ملی، والد صاحب اُنھیں لینے کے لیے لاہور کینٹ آئے لیکن اُن کی حالت گاؤں جانے کی نہیں تھی۔ اصل میں وہ کافی بوڑھے ہو گئے تھے۔ اس لیے خوراک میں احتیاط چاہیے تھی مگر لاہوری رشتے دار اُنھیں اپنے ناشتے یعنی ڈالڈے گھی کے تلے ہوئے بازاری پراٹھے اور چنے کھلاتے رہے۔ صبح گھر میں ناشتہ تیار کر کے کھانے کا اِن کے ہاں رواج ہی نہیں تھا۔ حلوہ پوری، چنے پراٹھے اور بازاری کھانے کھانے سے اِن کے معدے میں سوزش ہو گئی اور دل کی حالت تباہ ہو گئی۔ پھر بھی والد صاحب نے بہت کوشش کی کہ اِنھیں اوکاڑہ لے جاؤں مگر تمام لوگ آڑے آ گئے۔ رشتے دار کہنے لگے، لوگ کہیں گے کہ ہم لاہور میں ہوتے ہوئے اِن کا علاج نہ کر سکے۔ چنانچہ اُنھیں گھر نہ لانے دیا۔ والد صاحب نامراد واپس آ گئے۔ دو دن بعد اُنھیں پھر خیال آیا کہ چاچا صدرالدین کو ہر صورت یہاں لے آنا چاہیے اور ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ لاہور کو نکلوں کہ اُن کے فوت ہونے کی خبر آ گئی۔ لہٰذا والد صاحب لاہور تو گئے مگر اُن کی بجائے اُن کی لاش واپس لائے۔ اماں حلیمہ بھی چلی آئی لیکن اب وہ بالکل خموش رہنے لگی اور بابا صدرالدین کے چھ ماہ بعد ہی وہ بھی فوت ہو گئی۔ اِن تین افراد کی موت نے ہمارے گھر کو ایک بار پھر بے رونق کر دیا۔ اِن متواتر حادثات، غیر نصابی مطالعہ اور کام کاج کے تسلسل میں یہ ہوا کہ مَیں نے انٹر کے دوسرے سال کا امتحان ہی نہیں دیا اور باقاعدہ راج گیری کرنے لگا، مجھے تین شوق اِن دِنوں ایسے لگے کہ پہلے زیادہ نہ تھے۔ ایک جہاں کہیں مجلس ہوتی تھیں وہاں چلا جاتا۔ ہمارے علاقے میں مصطفیٰ آباد ایک گاؤں تھا، یہ سیّد گلزار حسنین کا گاؤں ہے اور تمام سادات یہاں بیٹھے ہیں۔ سیّد گلزار حسنین بعد میں میرے اچھے دوست بن گئے۔ اِن کے ہاں پورے چالیس دن مجلس ہوتی تھی، جس میں علامہ طالب جوہری اور پروفیسر عبدالحکیم بوترابی بھی آتے تھے۔ مَیں اِن مجلسوں سے کبھی ناغہ نہ کرتا تھا۔ دوم مجھے شہر شہر گھومنے اور مختلف علاقے دیکھنے کا بہت شوق ہو گیا۔ سوم تاریخ اور

مذہبی تاریخ پڑھنے کا بہت ذوق پیدا ہوا۔ تب مَیں نے عربوں کی تاریخ، ہندوستان کی تاریخ اور یورپ کی تاریخ کا بہت مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ معماری کے کام میں بھی روز بروز ماہر ہوتا چلا گیا۔ اُس کی خاص وجہ یہ تھی کہ میرے والد کو اب صرف مسجدوں کے کام ہی ملتے تھے۔ اِن میں سیکھنے کو بہت کچھ تھا۔

یہاں تک کہ 1994ء آ گیا۔ اچانک ایک دن مجھے خیال آیا کہ مجھے انٹر کر ہی لینا چاہیے۔ چنانچہ مَیں نے پرائیویٹ داخلہ بھیجا اور 1994ء میں پرائیویٹ انٹر کا امتحان پاس کر لیا۔

باب ہفتم

ملازمت کی کوشش

اِسی دَوران مَیں نے چند ایک سرکاری اور غیر سرکاری نوکریاں بھی کیں۔ یہ زیادہ تر کلرکیاں تھیں مگر چھوڑ دیتا تھا۔ نوکریوں میں ایک تو میرا زیادہ دل نہیں لگتا تھا دوسری اہم بات یہ ہوتی تھی کہ جہاں نوکری لگتا تھا وہاں کوئی نہ کوئی ایسا حرام توپ بیٹھا ہوتا جو اُس جگہ کو اپنی جاگیر سمجھ کر سب کو اپنا غلام سمجھتا تھا چنانچہ میری چند دن میں ہی اُس سے لڑائی ہو جاتی تھی۔

بس ایک واقعہ سنا کر آگے نکل جاتا ہوں۔ ایک بار مجھے بابا فرید شوگر مل کی لیبارٹری میں کام مل گیا۔ لیبارٹری میں چھ لوگ تھے۔ کام یہ تھا کہ ہر گھنٹے بعد گنے کے رس کو صاف کرنے والے مختلف ٹینکروں میں سے کیمیکل کے سیمپل لے کر آنا تھے اور اُن کو لیبارٹری میں چیک کرنا تھا کہ کہیں کیمیکل کے ضائع شدہ مواد میں گنے کا رس تو شامل نہیں ہو رہا۔ مل میں گنے کے رس کو شوگر بنانے تک بیسیوں مختلف ٹینکروں اور کیمیکل میں سے گزارا جاتا تھا۔ گنے کا موسم اور شوگر کی تیاری سخت سردیوں کے موسم میں ہوتی تھی۔ اب ہوا یہ کہ لیبارٹری میں جتنے چھ سات لوگ تھے۔ اُنھوں نے یہ تمام کام مجھ اکیلے کے ذمے ڈال دیا اور خود ہیٹر لگا کر آرام سے گرم کمرے میں بیٹھے گپیں مار رہے

ہوتے تھے۔ میری ڈیوٹی کے اوقات بھی رات کو تھے۔ رات کو سردی مزید بڑھ جاتی۔ مَیں شوگر مل میں ساری رات سخت سردی میں کبھی ٹینکروں کے اوپر چڑھ رہا ہوں کبھی نیچے اُتر رہا ہوں۔ ایک رات میں آٹھ بار کے سیمپل کم و بیش بیس ٹینکروں سے اکٹھا کرنے ہوتے تھے اور ہر گھنٹے بعد یہ چکّر لگنا ہوتا تھا، یعنی آرام کا ایک لمحہ نہ تھا۔ تین دن تک مسلسل مَیں یہ کام کرتا رہا مگر مجال ہے اُن کو ذرا بھی شرم آئی ہو کہ ایک آدمی جو نیا آیا ہے اُسے سولی پر چڑھا دیا ہے۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہوتی تھیں۔ چوتھی رات مَیں بالکل بیزار ہو چکا تھا۔ اب مَیں نے اُنھیں کہا بھائی ذرا میرے ساتھ تم بھی ہاتھ بٹاؤ۔ مَیں تھک جاتا ہوں اور مجھے ہلکا سا بخار بھی ہو رہا ہے تھوڑا سا انصاف سے کام لو۔ آخر تم مجھ سے زیادہ تنخواہ بھی لیتے ہو۔ اُن میں ایک آدمی نے بہت بدتمیزی کی اور بولا اگر کام کرنا ہے تو یہ ڈیوٹی کرنا پڑے گی۔ تُو آتے ہی ہمیں عدل و انصاف سکھانے لگا ہے تو بعد میں کیا کرے گا؟ مَیں نے آدھی رات تک یہ کام کیا لیکن اب مجھے بخار بھی شدید ہو رہا تھا اور بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ چنانچہ اُس کے بعد غصہ قابو سے باہر ہو گیا۔ جب رات کے ایک بجے مَیں سیمپل لے کر واپس آیا تو وہ بجلی کا ہیٹر لگا کر اُس کے اردگرد آرام سے بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ مَیں نے آتے ہی سیمپل ایک دم اٹھا کر دیوار کے ساتھ مارے اور ایک لات کھینچ کے ہیٹر کو ماری۔ ہیٹر بھی ایک طرف لُڑکتا ہوا دُور جا پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھے پکڑ کر پھینٹی لگاتے، اُنھیں گالیاں دیتے ہوئے باہر نکل گیا۔ رات کے عالم میں کوئی سواری نہ ملی چنانچہ بیس کلومیٹر پیدل طے کر کے صبح صبح گھر پہنچا۔ جیسے ہی گھر پہنچا شدید بخار کے عالم میں تھا۔ ایک تو کیمیکلز کا اثر، پھر سردی کا عالم اُس پر چار راتوں کا جگراتا اور تیسرا بیس کلومیٹر کا فاصلہ، کم و بیش دس دن تک بخار اور نزلے زکام میں پھنسا رہا۔

آپ سمجھیں کم و بیش میری تمام نوکریوں کی حالت یہی رہی ہے۔ جب ذرا تندرست ہوا دوبارہ مزدُوری کے دھندوں میں چل پڑا۔ اِسی دَوران ایک دفعہ ایک سال مَیں اسلام آباد بھی رہا۔ یہ قصہ بھی بہت دلچسپ ہے مگر طوالت کے سبب گریز کرتا ہوں۔ اُس وقت یہ شہر بہت عمدہ تھا جسے مَیں نے اپنے ناول ''کماری والا'' میں مصور کیا ہے۔ ایک سال بعد مَیں پھر واپس چلا گیا اور معماری کے کام میں لگ گیا۔

اسی دوران مجھے اپنے والد کے ساتھ چیچہ وطنی کے ایک گاؤں 51 بارہ ایل میں کام ملا۔ دو تین مہینے بعد والد صاحب یہ کام میرے ذمے ڈال کر خود ہمارے اپنے گاؤں کی مسجد کے باقی ماندہ کام کرنے واپس آ گئے اور مَیں وہیں کام کرنے لگا۔ یہاں مسجد کے ساتھ ہی مولوی صاحب کا گھر تھا۔ اِس گھر کے ایک کمرے میں عربی ادب کی بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ مَیں اُن کے مطالعے میں جُت گیا۔ آپ سمجھیں مَیں ڈیڑھ سال یہاں کام کرتا رہا۔ اس ڈیڑھ سال میں وہ ساری کتابیں مَیں نے پڑھ لیں اور خود مولوی صاحب نے ایک دن بھی کسی ایک کتاب کو نہیں چھوا۔

نیسلے کمپنی میں ملازمت

1994ء میں نیسلے ملک پیک میں بطور سپر وائزر بھرتی ہو گیا۔ کمپنی نے مجھے ایک نئی یاماہا موٹر سائیکل دے دی۔ پیٹرول بھی جتنا خرچ ہوتا سب بل دیتے تھے لیکن ظالم تنخواہ بہت کم دیتے تھے۔ حویلی لکھا میری پوسٹنگ ہو گئی۔ میرا دریائے ستلج اور پاک بھارت کے سرحدی علاقے کے قریب سے نیسلے کمپنی کے لیے دودھ کی خریداری کا کام تھا۔ مَیں نے یہاں تین سال تک کام کیا اور اِن تین سالوں میں مجھے خاص طور پر دریاؤں کے اردگرد کے لوگوں کا مزاج اور بارڈر ایریاز میں لوگوں کی بود و باش اور اُن کے ذریعہ معاش کے متعلق بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ اس وقت مَیں یہ سمجھ رہا تھا کہ میرا یہ وقت ضائع ہو رہا ہے لیکن بعد میں جب مَیں ادبی زندگی میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ زمانہ مجھے بہت کچھ مالا مال کر گیا ہے۔ یہاں نیسلے کمپنی کا دفتر ایک برف کے کارخانے میں تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ ہیڈ سلیمانکی بارڈر سے فقط بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میرے اجداد جب ہندوستان سے آئے تھے، یہاں اُنھوں نے ایک یا دو سال قیام کیا تھا۔ اِسی علاقے میں مجھے دریا کے سیلاب سے بھی واسطہ رہا۔ علاقے کے چوروں اور ڈکیتوں سے ملنے اور اُن کے مزاج کو بھی سمجھنے کا موقع ملا۔ حویلی لکھا اور بصیر پور میں خاص طور پر ایک ایسی دُنیا آباد تھی جو پاکستان کی دوسری دُنیاؤں بلکہ یوں کہیں پنجاب کے مرکزی اور بنیادی شہروں سے پرے کی دُنیا تھی۔ میرا

ناول نولکھی کوٹھی اور بہت سے افسانے بلکہ قائم دین کا بنیادی افسانہ یہاں کی ہی خاک سے اٹھا ہے۔ نیسلے ملک پیک میں رہتے ہوئے یہاں میرے ساتھ کئی دلچسپ واقعات پیش آئے۔

ملک شرافت خاں کے بھیڑیے اور اماں صالحہ

نیسلے ملک پیک کی طرف سے بطور مِلک کولیکشن سپروائزر کام کرتا تھا۔ میرا کام اُن زمین داروں سے تعلّقات بنانا تھا جن کے پاس ہزاروں ایکڑ رقبہ ہو، گائیں بھینسیں زیادہ ہوں اور دودھ کی فراوانی ہو۔

اِس سلسلے میں وہاں کے تمام بڑے زمینداروں سے رسم و راہ ہو گئی۔ مَیں اُن سے مقامی قیمت سے قدرے زیادہ پر کمپنی کے لیے دودھ کا سودا کرتا اور کمپنی کی گاڑی دودھ اُٹھا کر لے جاتی۔ یہ زمیندار طرح طرح کے شغل رکھتے تھے۔ کوئی کتوں کا شوقین تھا، کوئی بٹیر پالتا تھا، کسی نے ڈیرے پر دو چار پاگل باندھے ہوتے تھے اور اُن سے گالیاں کھاتا تھا۔ کوئی رسہ گیری اور چوری کراتا تھا، کوئی زمیندار دوسروں کی زمینوں پر قبضے کرنے کا شوق رکھتا تھا۔

اُنہی سورماؤں میں سے ایک ملک شرافت خاں تھا۔ اِس کے گاؤں کا نام محمد پورہ تھا۔ یہ پورا گاؤں اُس کی ذاتی جاگیر میں تھا اور کافی کھلا تھا۔ اُس نے پتا نہیں کہاں سے بھیڑیے کے دو بچّے لا کر رکھ لیے۔ یہ بچّے دیکھنے میں گیدڑ نما تھے۔ اُس نے اِن بھیڑیوں کو اپنے ڈیرے میں کھڑے نیم کے درخت تلے باندھ رکھا تھا۔ اُن کے سامنے روز زندہ مرغی کھڑی کر دیتا، بھیڑیے اُسے نوچتے اور کھاتے۔ شرافت خاں سامنے بیٹھ کر مرغی کی چیر پھاڑ کا تماشا دیکھتا۔ نوکر چاکر اور ملنے جلنے والے تماشا دیکھ کر لطف لیتے۔ یہ ایک بہت عجیب اور ڈرا دینے والا عمل تھا۔ زندہ مرغی کی چیخ و پکار کوئی سننے والا نہ ہوتا تھا۔ تھوڑے بڑے ہوئے تو بھیڑ اور بکری جیسے کسی جانور کو سامنے کرنے لگا۔ یہ چیر پھاڑ مرغی سے کہیں زیادہ دردناک اور اذیت آمیز ہوتی تھی۔ ایسے وقت میں مَیں وہاں سے اُٹھ جاتا تھا۔

ایک دن مَیں نے پوچھا: 'ملک صاحب آپ نے اِن بھیڑیے کے بچّوں کو کیا کرنا ہے؟ یہ تو

بہت خطرناک جانور ہیں۔'

کہنے لگا:

'بھائی یہ بھیڑیے اصل میں بہت کام کی چیزیں ہوتی ہیں۔ سُدھا لیا جائے تو لڑائی میں اپنے وزن کے برابر تین لڑاکا کتوں پر بھاری ہے۔ آپ کو پتا ہے، آئے روز اردگرد کے زمینداروں کے کتوں سے مقابلے کرنے پڑتے ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک کتا میدان میں اتارتے ہیں۔ کتے کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ اُس پر کئی ملازم دیکھ بھال کے لیے کھپانے پڑتے ہیں، دودھ اور گوشت کے ٹوکرے کھاتے پیتے ہیں اور نتیجہ کچھ خاص نہیں نکلتا۔ میں نے سوچا کیوں نہ دو ایک بھیڑیے پال کر سب کے کتے ٹھکانے لگا دوں، علاقے میں نام ہو جائے گا۔'

مَیں نے اس کی بات سن کر تعجب کا اظہار نہ کیا کہ ان کے شوق اور دانش کی کوئی تُک نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ وقت نکلتا گیا، اب ہفتے بعد اُن کے سامنے بکری یا بھیڑ کی بجائے کتا کر دیا جاتا جنھیں وہ اپنے تیز دانتوں اور نوکیلے ناخنوں سے دو چار منٹ میں ہی اُدھیڑ کر چادر کی طرح پھیلا دیتے۔ اُس کے بعد جو گوشت بچتا اُسے سنبھال کر اگلے دو تین دن اُن کو دیا جاتا۔ مَیں یہ سب ماجرا دیکھتا تھا اور چُپ رہتا تھا۔ مجھے صرف اپنے دودھ سے غرض تھی جس کے سبب میری نوکری بچی ہوئی تھی۔ اس لیے خوامخواہ پرائے دھندے میں ٹانگ نہ اُڑاتا لیکن اِن معصوم جانوروں کی آہ سے ڈرتا تھا۔ اب ڈیڑھ سال اُن کو ہو گیا تھا، دانت پورے نکل آئے تھے۔ گوشت کھا کھا کر اور چیر پھاڑ کر کے نہایت ظالم ہو چکے تھے۔ میں جب بھی وہاں جاتا اُنھیں دیکھتا، اُن کی آنکھوں کا وحشی پن مجھے ڈراتا تھا۔ ایک دو لوگ اُنھیں کبھی کتوں سے، کبھی کُتیوں سے لڑائی کی مشق کرا رہے ہوتے، کھانے کو اُنھیں عمدہ گوشت، دودھ، دہی اور پتا نہیں کیا کیا دیا جاتا۔ روز لمبی رسی باندھ کے دوڑایا جاتا۔ اُن کے پنجے اور ناخن تیز کیے جاتے۔

یوں چھ ماہ اور گزر گئے۔ ملک شرافت خاں بھیڑیوں کو جوان اور طاقت ور ہوتا دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ بھیڑیے اتنی جلدی بڑے بڑے کتوں کو پھاڑنے لگے کہ الامان اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتے اُنھیں دیکھتے ہی سہم جاتے تھے۔ تمام علاقے میں ملک شرافت خاں کا راج ہو گیا۔

اُس کی ٹوہر اور عزت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ پورے علاقے میں ملک شرافت کے دونوں بھیڑیوں کے ہزاروں قصے داستانوں کی شکل میں سنائے جانے لگے۔ نوکر چاکر بھی اُن کی لڑائی کے تذکرے ملک کے آگے ایسے کرتے جیسے وہ بھیڑیے نہیں عزرائیل قبضے میں رکھتا تھا۔ اُن کے تذکرے سے ملک کی مونچھیں مزید پھیل جاتیں۔ شرافت خان نے اُن کی حفاظت کے لیے بھی بہت سے بند باندھے ہوئے تھے۔ ایک پنجرہ لوہے کی سخت تاروں سے تیار کر کے اُس میں اُنھیں کھلا چھوڑ دیا تھا اور پنجرے کو لاک کیا جاتا تھا۔ بھیڑیوں کی آنکھیں رات کے وقت بلبوں کی طرح چمکتی تھیں جنھیں ملک صاحب دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ملک صاحب جہاں کہیں جاتے یہ دونوں بھیڑیے اُن کے ساتھ رہتے، مگر اُنھیں سخت سنگلوں سے باندھ کے رکھا جاتا تھا۔ الغرض ملک شرافت خاں کی واقعی ایک دھاک بیٹھ گئی۔

ایک دفعہ کافی دنوں بعد مَیں شرافت خاں کے ڈیرے پر پہنچا تو وہاں سوگ کا ماتم بچھا تھا۔ ڈیرے پر موجود ہر آدمی غمزدہ لگ رہا تھا۔ شرافت خاں وہاں موجود نہیں تھا۔

میں نے اِس تمام سوگوار فضا کا سبب پوچھا تو ایک آدمی نے بتایا: 'علی اکبر صاحب، بات یہ ہے کہ ملک صاحب کو بس یوں سمجھ لیں اللہ کی مار پڑی ہے۔ بہت سے معصوم جانوروں کا ناحق خون اُن کی گردن پر چڑھ گیا تھا۔'

مَیں گھبرا گیا، خُدانخواستہ ملک صاحب فوت ہو گئے ہیں یا قتل ہو لیے۔ میری بے چینی بڑھ گئی، پوچھا: 'خیر تو ہے ملک صاحب کو کیا ہو گیا؟' مجھے دراصل ملک صاحب کی نسبت اپنے دودھ کی فکر زیادہ تھی کہ وہ نہ بند ہو جائے۔

وہ بولا: 'ملک شرافت خاں جن بھیڑیوں کو اپنے پالتو کتے بنا کر پال رہے تھے، وہ اصلی اور جینوئن بھیڑیے نکلے۔ ہوا یہ کہ ملک صاحب نے پچھلے ایک دن سے اپنے بھیڑیوں کو بھوکا رکھا ہوا تھا۔ چک دارے والے کے نواز حیات خاں کے ایک بڑے فائٹر سے اُن کا مقابلہ بندھا تھا۔ درمیان میں ایک لاکھ روپے کی شرط تھی اور ملک صاحب چاہتے تھے کہ اُن کا بھیڑیا مخالف کتے کو اپنی خوراک سمجھ کر حملہ کرے اور اُسے چیر پھاڑ کے رکھ دے۔ کل رات کی بات ہے اللہ جانے کسی

نوکر سے کوتاہی ہوئی یا کسی فرشتے نے پنجرے کا تالا کھول دیا یا ملک نواز حیات کی شرارت تھی کہ اُس نے بندہ بھیج کر یہ حرکت کروائی، کسی بھی بات کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ دونوں بھیڑیے زنجیر تڑوا کر بکریوں کے باڑے میں گھس گئے اور دو بکریاں پھاڑ دیں۔ عین اُسی وقت کہیں ملک شرافت خاں کی والدہ تہجد نماز کے لیے اُٹھی، بکریوں کی آواز سن کر باڑے کی طرف چلی گئی۔ بھیڑیوں نے بکریوں کو تو وہیں چھوڑا اور اماں صالحہ پر حملہ کر دیا۔

بے چاری اماں کو کیا خبر تھی یہ کیا بلائیں ہیں، وہ تو اُنھیں کتے سمجھ کر چھڑی سے مارنے نکلی تھی۔ بھیڑیوں نے اُنھیں اپنے ناخنوں اور دانتوں پر رکھ لیا۔ پورے باڑے میں کبھی ایک طرف کھینچتے ہوئے نکل جاتے تھے اور کبھی دوسری طرف۔ رات اُن کی چیخیں بہت سنائی دیں لیکن جب تک ملک شرافت خاں اور دوسرے لوگوں کو خبر ہوئی اماں صالحہ بے چاری بکھر چکی تھی، کان کہیں پڑے تھے، انتڑیاں کہیں تھیں اور کھال کہیں اور تھی۔ ڈرتا ہوا کوئی باڑے میں اِس وقت داخل نہیں ہو رہا تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا ابھی تھا۔ آخر رائفل لائی گئی۔ نشانے باندھ باندھ کر مارے گئے اور بھیڑیوں کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی گئی مگر مسئلہ یہ تھا کہ باڑے میں بکریوں کی بہتات بھی تھی۔ بالآخر ہوا یہ کہ وہ دونوں بھیڑیے بھاگ بھی گئے مگر اماں صالحہ کے پیٹ کی ساری انتڑیاں باہر نکال دیں۔ اب معاملہ یہ ہے کہ ملک صاحب اندر اپنی والدہ کی میت پر بیٹھے دھاڑیں مار کر رو رہے ہیں اور باہر ہم بھیڑیوں کے جی کو رو رہے ہیں۔ بس یوں سمجھیں ملک صاحب نے سو پیاز بھی کھائے ہیں اور سو جوتے بھی۔ مَیں نے تو اکبر صاحب، اِس بات سے یہی سیکھا ہے کہ آپ بھیڑیے کو پالیں گے تو اُس کے منہ کو لگا خون اپنی اور دشمنوں کی ماں کے خون میں فرق نہیں کرتا۔ پالتو بھیڑیے کبھی پالتو نہیں رہتے اور یہ بھی نہیں پتا خاص بھیڑیے کب عام بھیڑیے بن جائیں۔

نہر ہمیں بہالے گئی

نیسلے میں ڈاکٹر وارث میرا کولیگ تھا ہم ایک نہر کے کنارے جا رہے تھے۔ یہ نہر حویلی لکھا کے قریب جا کر دریائے ستلج میں گرتی تھی اور اِس کا پانی بہت تیز ہوتا تھا۔ دونوں ایک ہی موٹر

سائیکل پر سوار چلے جاتے تھے اور نہر کی گہرائی اور تیز رفتاری پر حیران ہوئے جاتے تھے۔ اچانک مَیں نے شیخی ماری، ڈاکٹر صاحب دیکھیے! اگر مَیں اِس نہر سے تیَر کر دوسرے کنارے پر ہاتھ لگا کر واپس آ جاؤں تو کیا دو گے؟ اُس نے فوراً جیب سے سو سو روپے کے پانچ نوٹ نکالے اور کہا یہ لیجیے پانچ سو روپیا یہاں کنارے پر رکھا ہے، آپ نہر میں چھلانگ لگائیے اور دوسرے کنارے کو ہاتھ لگا کر آئیے اور اِسے اُٹھا لیجیے۔ اگر یہ نہ کر سکو تو 500 روپے مَیں آپ سے وصول کروں گا۔ اب مَیں نے جوتے وہیں پھینکے، کُرتا اُتارا، شلوار کے پائنچے اُوپر کیے اور چھلانگ لگا دی مگر نہر میں گرتے ہی ہاتھ پاؤں میرے اختیار سے باہر ہو گئے۔ پانی کا بہاؤ ایسا تیز تھا کہ کسی طرح کا بس نہ چلتا تھا۔ ایک منٹ کی کوشش کے بعد مَیں نے دیکھا کہ اگر سیدھے رُخ تیرنے کی کوشش کی تو ڈوب جاؤں گا۔ پانی نیچے کی طرف دباتا تھا۔ مَیں نے فوراً پانی کے رُخ اپنے آپ کو چھوڑ دیا اور تھوڑا سا ترچھا ہو کر ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ اِس عمل میں دو چار غوطے بھی کھائے۔ مگر دل کو کڑا کیا کہ بھائی اب بھلائی اِسی میں ہے کہ ہاتھ چلاتے رہو۔ اُدھر مَیں نے ہلکا سا شور ڈاکٹر وارث کا سنا جو کسی کو مدد کے لیے پکار رہا تھا اور اُس کے بعد کچھ سنائی نہ دیا۔ خیر اِس بہاؤ میں پانی مجھے قریب ایک کلومیٹر تک آگے لے گیا اور بالآخر مَیں نے کنارے کو چھو لیا مگر واپس نہر میں کود کر پہلے والے کنارے پر آنے کی بجائے وہیں سے باہر نکل گیا۔ ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ کافی دیر بے سُدھ پڑا رہا۔ میرے پاؤں اور جسم ننگا تھا اور محض شلوار تھی۔ دوسرے کنارے پر کانٹے دار جھاڑیاں اور بھکھڑا بہت تھا۔ جولائی کی دھوپ میں دن کے بارہ بجے تھے لیکن اب نہر میں کودنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ اُٹھ کر کنارے کنارے واپس چل دیا۔ اللہ اللہ کر کے جب عین اُسی کنارے کے برابر آ گیا جہاں شرط باندھی تھی تو دیکھا کہ وہاں ڈاکٹر وارث موجود ہی نہیں تھا۔ مَیں نے دوسری طرف سے ہی کھڑے ہو کر دو چار آوازیں دیں مگر اُس کا کہیں اتا پتا نہ تھا۔ صرف میرے کپڑے اُس طرف پڑے نظر آ رہے تھے۔ اب حیران کہ کیا کروں اور کپڑوں اور جوتوں تک کیسے پہنچوں؟ اوّل تو کوئی آس پاس آدمی نظر نہیں آ رہا تھا اور اگر ہوتا بھی تو نہر کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ وہ کپڑے اور جوتے میری طرف اچھال نہیں سکتا تھا۔ اِدھر ڈاکٹر وارث ڈر کے

بھاگ گیا تھا۔ اُسے شبہ ہوا کہ میں ڈوب چکا ہوں اور میرے مرنے کا سارا وبال اُس کی گردن پر پڑے گا۔

اب میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، کیا کروں؟ نہر میں دوبارہ کودنے کا مَیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پُل 7 کلومیٹر آگے تھا۔ کافی دیر تو وہیں بیٹھا رہا۔ پھر پُل کی جانب چل پڑا۔ شام 4 بجے 14 کلومیٹر کا چکّر کاٹ کر دوبارہ اُس جگہ پہنچا جہاں شرط باندھی تھی اور کپڑے اور جوتے اُتارے تھے مگر اب وہ 500روپے سمیت جو ڈاکٹر نے جیب سے نکال کر رکھے تھے، وہاں موجود نہیں تھے۔ وہ سب چیزیں کوئی اللہ کا بندہ اُٹھا کر چمپت ہو چکا تھا۔ اِدھر میرا جسم دھوپ کی شدّت سے جل رہا تھا اور پاؤں کانٹوں سے لہولہان ہو گئے تھے۔ ناچار اُسی ننگی حالت میں دس کلومیٹر مزید چلا اور رات دس بجے ایک اڈّے پر آیا جہاں سے چھوٹی کھٹارا بسیں بصیر پور کو جاتی تھیں۔ بسیں رات کے اِس سمے بند ہو چکی تھیں، کافی دیر وہیں ننگا کھڑا رہا کہ ایک ٹریکٹر بصیر پور کو جانے والا رُکا۔ مَیں نے اپنی سب بپتا اُسے کہی اور وہ رات 2 بجے مجھے لے کر واپس شہر پہنچا۔ جب کمپنی کے الاٹ شدہ گھر میں پہنچا جہاں ہم آٹھ دس ملازم کمپنی کے رہتے تھے تو ہمارا خانساماں مجھے دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا، کہنے لگا سر آپ زندہ ہیں؟ اور آپ کے کپڑے اور جوتے کہاں ہیں؟ مَیں نے کہا وہ تو بعد میں بتاتا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ ڈاکٹر وارث بہن چ کہاں ہے؟ اُس کی ماں کی ایسی کی تیسی۔ وہ بولا، سر وہ کمپنی کے سب ملازموں کو ساتھ لے کر آپ کی لاش ڈھونڈنے نہر کی اُس فال پر پہنچے ہیں جہاں سے نہر دریا میں گرتی ہے۔

اُس وقت موبائل فون وغیرہ ہوتے نہیں تھے کہ اُنھیں فون کر کے واپس بلاتا، مَیں نے کہا اچھا بھائی اب تُو سو جا اور مجھے بھی آرام سے سونے دے۔ صبح کو دیکھیں گے۔ پھر ایک آدمی کو موٹر سائیکل دے کر اُن کے پیچھے بھیجا کہ فال سے سب کو بلا لائے۔

جب ڈاکٹر وارث اور اُس کے ساتھی صبح اذانوں کے وقت لوٹے تو مَیں نے اُس کی وہ ایسی تیسی پھیری کہ کچھ نہ پوچھیں۔ اُس کے بعد تہیہ کیا، آئندہ شرط نہیں لگاؤں گا چاہے چار فٹ کا نالہ ہی کیوں نہ ہو۔

سرحد پار اُتر گئے

میرا زیادہ تر کام ہیڈ سلیمانکی کے آس پاس اور دریائے ستلج کے پار تھا۔ یہاں سے ہندوستان کی سرحد مشکل سے دو کلومیٹر تھی۔ ارد گرد اتنا گھنا جنگل تھا کہ دیکھنے سے ہول آتا تھا۔ اِس جنگل میں زیادہ تر پانی پھیلا رہتا تھا اور پانی میں ہزار ہا بلیات تھیں۔ اِس جنگل اور دریا کے درمیان لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھاریاں تھیں جہاں بھینسیں اور گائیں کثرت سے تھیں۔ یہ لوگ کھیتی باڑی نہیں کرتے تھے، فقط گائیں بھینسیں پالتے تھے اور اُن کا دودھ اپنے سروں پر لاد کر ہیڈ سلیمانکی تک لاتے ہیں۔ کیونکہ سائیکل یا موٹر سائیکل کا رستہ نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یہ علاقہ عجیب سا اساطیری لگتا تھا۔ دودھ کے سروے کے لیے تو مجھے جانا ہی پڑتا تھا مگر ایک شوق یہ بھی تھا کہ کسی طرح سرحد پر پہنچوں۔ جنگل کے دوسری طرف دس دس فٹ اونچائی میں ڈیلے کے جھاڑ اور سوروں اور بھیڑیوں کی آماجگاہ تھی۔ اوّل تو جنگل پار کرنا ہی مشکل تھا کیونکہ وہ بارشوں اور دریا کی چڑھائی کے پانی سے بھرا رہتا تھا، جس میں ہزاروں طرح کے سانپ اور الا بلا تھیں اور بالفرض اُسے کسی طرح پار کر بھی لیا جاتا تو ڈیلے کے ہولناک جھاڑ رستہ روک لیتے۔

میری وہاں کے باسیوں سے اچھی علیک سلیک بن گئی تھی۔ اکثر اُن کے ساتھ انڈیا کے بارڈر کے متعلق بات چیت چلتی۔ ایک دن مجھے خبر ہوئی کہ یہاں کے لوگوں کا دودھ کا کاروبار تو ایک بہانہ ہے اصل روٹی روزی تو اِن کی بارڈر پار سے اشیا کا بارٹر سسٹم چلاتا ہے۔ مَیں حیران تھا کہ یہ لوگ جنگل اور ڈیلے کے جھاڑ کو پار کیسے کرتے ہوں گے، پھر سرحد پر بیٹھے محافظوں سے کس طرح آنکھ بچا کر نکلتے ہوں گے۔ مَیں نے اُن لوگوں سے کئی بار اِس شے کی وضاحت چاہی مگر کسی نے کچھ معلومات نہ دیں۔ گویا اُن کے درمیان ایک خموش قسم کا سمجھوتا تھا کہ باہر کے کسی بھی شخص کو کچھ نہیں بتایا جائے۔

کافی عرصہ مَیں اُن کے ہاں آتا جاتا رہا اور کمپنی کے لیے ایک بڑے پیمانے پر دودھ کی سپلائی شروع کر دی۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے زمینی راستے مشکل ہونے کے باعث گوالے

انھیں دودھ کا ریٹ بہت کم دیتے تھے۔ مَیں نے وہ ریٹ دُگنا کر دیا۔ چنانچہ کم و بیش تمام دودھ مجھی کے پاس آنے لگا اور میرا ٹارگٹ پورا ہو گیا۔ اب میرے پاس فرصتیں ہی فرصتیں تھیں۔
ایک دن یونہی جنگل کے کنارے کنارے میں شمال مشرق کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں کیکروں کے ہزاروں درخت بہت گھنے تھے۔ دوپہر ایک بجے کا وقت تھا۔ ایک جگہ مجھے ایک بلند سی پگڈنڈی نظر آئی جو جنگل کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ مَیں اُسی پگڈنڈی پر چڑھ گیا اور جنگل میں آگے نکلتا چلا گیا۔ یہ پگڈنڈی ایک ہی آدمی کے چلنے کی تھی۔ تھوڑی دُور جا کر اِس پگڈنڈی کا وجود کبھی ختم ہو جاتا تھا اور گھٹنے گھٹنے پانی آ جاتا تھا اور کبھی پگڈنڈی دوبارہ ظاہر ہو جاتی تھی۔ ارد گرد اتنا گھنا جنگل تھا کہ اُلوؤں اور عجیب و غریب چیزوں کی آوازیں آنے لگیں اور راستہ ایک طرح سے بند ہو گیا تھا۔ مَیں نے سوچا واپس مُڑتا ہوں لیکن اب مَیں دو ڈھائی کلومیٹر جنگل کے اندر آ چکا تھا۔ واپس مُڑنا بھی تکلیف دہ تھا۔ چنانچہ دس بارہ قدم اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے اچانک ڈیلے کی جھاڑیاں نظر آنے لگیں۔ آگے کافی اونچی جگہ آ گئی تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں دریا کا پانی زیادہ تر نہیں چڑھتا مگر جگہ گیلی سی تھی، اگرچہ پاؤں میں کیچڑ نہیں بنتا تھا۔ دُور تک جھاڑ جھنکاڑ ہی تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک مجھے کوئی درندہ یا سانپ نظر نہیں آیا تھا۔ مَیں اِسی جھاڑ میں آدھا کلومیٹر اور آگے بڑھ گیا۔ یہاں رستہ بالکل نہیں تھا، بس جھاڑیوں کو ہاتھوں سے ایک طرف کر کے آگے بڑھنا تھا۔ رستے میں مجھے ایک جگہ دو یا ڈیڑھ فٹ اونچی چھوٹی سی بُرجی ملی۔ جس پر کوئی نمبر درج تھا لیکن مَیں نے اِس پر کوئی دھیان نہیں دیا اور آگے نکلتا چلا گیا۔ مَیں جلد اِس ڈیلے کے جھاڑ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ پندرہ بیس منٹ چلنے کے بعد ایک دم جھاڑ ختم ہو گیا اور کھیت کھلیان شروع ہو گئے۔ دُور تک گندم اور سرسوں کے کھیت نظر آ رہے تھے۔ مَیں حیران کہ ایک دم یہ کیا کایا کلپ ہوئی ہے۔ سامنے کچھ ہی فاصلے پر ایک ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ مَیں کافی دیر چلا تھا، پیاس محسوس ہوئی، خیال آیا پانی پی لوں، مَیں ٹیوب ویل کے حوض پر جا بیٹھا اور پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اُٹھا اور قریب ہی ایک کچی سڑک کی طرف چل دیا، جس کے کناروں پر ٹاہلیوں کے درخت کھڑے تھے۔ میرا خیال تھا یہ سڑک مجھے ہیڈ سلیمانکی پر لے جائے گی۔ وہاں سے اپنا موٹر سائیکل اٹھاؤں گا اور حویلی لکھا

نکل جاؤں گا لیکن جیسے ہی سڑک پر پہنچا ایک سکھ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اُس کے ہاتھ میں درانتی تھی اور آگے آگے ایک گدھا تھا جس کے اوپر واہنا رکھا تھا۔ مَیں حیران ہوا کہ یہ سکھ یہاں کیا کر رہا ہے؟ قریب آیا تو اس نے بھی حیرانی سے میری طرف دیکھا، پھر ست سری اکال کہا، مَیں نے آگے سے علیک السلام کہہ دیا، تب وہ فوراً رُک گیا اور اُس کا گدھا چلتا رہا۔ کہنے لگا، اوئے، تُو ایتھے کی کردا؟ یعنی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ مَیں نے کہا یہی مَیں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم پاکستان میں کیا کر رہے ہو؟

وہ ہنس پڑا اور پھر کہا، بابو مترا ایہہ پاکستان نئیں پھروز پور آ، بھارت دا شہر'' پاکستان نہیں، فیروز پور ہے ہندوستان کا شہر۔''

اب ایک دم مجھے خیال آیا کہ مَیں تو سرحد پار پہنچ چکا ہوں اور وہ جو رستے میں ایک چھوٹی سی بُرجی تھی، وہی بارڈر لائن تھی۔ مَیں نے اُسے کہا، بابا جی یہ بتائیں یہاں سے ہندوستان کا قریب ترین شہر کون سا ہے، وہ بولا، اوہ تاں کا کا بنگلا فاضلکا ہے پر تو ایتھوں دے شہرنوں کی کرنا؟ چھیتری پچھانوں مُڑ جا، جس راہ آیا، اوسے راہ، جے کر ایہناں تینوں پھڑ لیا تے ساری حیاتی قید سڑیں گا۔ یعنی وہ تو یہاں قریب بنگلا فاضلکا شہر ہے لیکن تم نے انڈیا کے شہر کا کیا کرنا ہے، جلدی سے جس راستے سے آیا ہے اُسی راستے سے واپس چلا جا۔ اگر اِنھوں نے تجھے پکڑ لیا تو تمام عمر جیل میں سڑتا رہے گا۔ اُس سردار کی بات سن کر مَیں جلدی سے پیچھے کی طرف چل پڑا اور جھاڑ اور جنگل کو عبور کرتا ہوا عصر کے وقت وہیں آن پہنچا جہاں سے جنگل میں داخل ہوا تھا۔

اگلے دو ماہ اِسی طرح گزر گئے۔ ایک دن مَیں نے وہاں ایک آدمی کو یہ ساری داستان سنا دی۔ اِس کا نام لال دین تھا اور ایک من روزانہ کی بنیاد پر ہمیں دودھ دیتا تھا۔ اِس آدمی پر مجھے یقین تھا کہ بات آگے نہیں کرے گا۔ اُس نے کہا، ڈاکٹر صاحب (بیلے میں ہم ڈاکٹر کہلواتے تھے) آپ کن چکروں میں پڑتے ہیں۔ اگر اتنا ہی جوش ہے بنگلا اور جلال آباد دیکھنے کا تو لاؤ مجھے پانچ ہزار کا خرچہ دو تمھیں وہاں کا چکر لگوا لاتا ہوں۔ یہ بات سن کر میرا جذبہ ایک دم جوان ہو گیا، مَیں نے سوچا کیوں نہ اپنے اجداد کا علاقہ ہی دیکھ لوں۔ مَیں نے لال دین سے کہا، دیکھو بھئی پیسے تو

میرے پاس اتنے نہیں ہیں البتہ کمپنی سے تیرے دودھ کا ریٹ سو روپیا من زیادہ دلا دوں گا۔ لیجیے جناب، ہمارا معاہدہ ہو گیا۔

اب آپ خود ہی سمجھ لیں نولکھی کوٹھی میں مشرقی پنجاب کا پورا لینڈ سکیپ کیسے لکھا ہے۔ باقی سب کچھ اِس کتاب میں لکھنا مناسب نہیں۔

ایک دلچسپ مجرم

نیسلے مِلک پیک نے اُس وقت گاؤں گاؤں میں دودھ اکٹھا کرنے کے سینٹر کھول رکھے تھے۔ جنھیں چلنگ پلانٹ کہتے تھے۔ چھوٹی گاڑیاں دُودھ اٹھا کر لاتیں اور بصیر پور شہر میں موجود نیسلے کے بڑے چلنگ پلانٹ میں جمع کر دیتیں جہاں سے فیکٹری میں بھیج دیا جاتا۔ چھوٹی گاڑیاں صبح اور شام دو وقت دودھ اکٹھا کرتیں۔ اِن کا مخصوص وقت میں پہنچنا ضروری تھا کہ دودھ خراب نہ ہو۔ بصیر پور اور حویلی کا علاقہ چونکہ بارڈر کے ساتھ ہے اس لیے یہاں جگہ جگہ رینجرز کی چوکیاں تھیں، اور دودھ بھی بارڈر کے نزدیک والے گاؤں سے آتا تھا۔ جب بصیر پور سے مہاراں کے علاقے میں اُترتے تو ایک بڑی نہر آتی۔ اِسے سہاگ نہر کہتے ہیں۔ یہاں بھی رینجرز کی ایک چوکی تھی جہاں دس پندرہ جوان موجود رہتے۔ اِس علاقے میں ہماری ایک گاڑی روزانہ شام کو لیٹ ہو جاتی اور دودھ بھی اُس میں سے دس لیٹر کم ہوتا۔ ہم عملے کی روز تفتیش کرتے کہ اتنا دودھ کیا ہوا، کہیں رستے میں بیچ کر کمپنی کو تیل تو نہیں لگا رہے۔ وہ کہتے جی راستے میں کچھ فرشتے بیٹھے ہیں، وہ وصول کر لیتے ہیں اور نام کسی کا نہ لیتے۔ ایک شام مَیں نے کہا، بیٹا آج میں خود آپ کے ساتھ جاتا ہوں، دیکھتا ہوں کون سے فرشتے ہیں۔

جب تمام علاقے سے دودھ اکٹھا کر کے ہماری گاڑی یہاں سہاگ نہر کے پل پر پہنچی تو رینجر والوں نے گاڑی روک لی۔ گاڑی میں بیٹھے ورکرز نے اُنھیں سمجھایا، دیکھیے آج ہمارے افسر ساتھ بیٹھے ہیں۔ آج دودھ وصول نہ کریں ورنہ کام گڑبڑ ہو جائے گا۔ اُنھوں نے کہا کون افسر ہے؟ ڈرائیور نے میری طرف اشارا کر دیا کہ یہ صاحب ہیں۔ اب رینجر والے دوست نے کہا، اچھا تو

جناب آپ افسر ہیں بیلے والوں کے؟ مَیں نے جی ہاں کر کے سر ہلایا۔ کہنے لگا ذرا نیچے آیئے بھائی گاڑی کی چیکنگ ہوگی، اِس کی تلاشی لی جائے گی، گاڑی ایک طرف کر دیں۔ مَیں گاڑی سے نیچے اُتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور کہا لے لو تلاشی۔ اب جناب ایک گھنٹہ گزر گیا، دو گھنٹے گزر گئے، نہ تلاشی شروع ہوتی ہے نہ جان چھوٹتی ہے۔ میرا عملہ مجھ سے کہنے لگا، جناب اِن کو دس لیٹر دودھ دیں اور یہاں سے نکلیں۔ مجھے بھی دودھ کے خراب ہونے کا اندیشہ ہوا، میں نے کہا ٹھہرو، میں اِنھیں کہتا ہوں۔ اب میں نے اُن کے باس، جو میجر صاحب تھے، سے کہا بھائی صاحب آپ کیوں تنگ کرتے ہیں؟ گاڑی جانے دیں۔ اُس نے مجھ سے پورے فوجی انداز میں شٹ اپ کہا۔ اُن دنوں مَیں بھی بہت بھڑکیلا تھا، بھول گیا کہ یہ وہی فوجی بھائی ہیں جن سے ایک بار پٹ چکا ہوں فوراً اُسی لہجے میں جواب پلٹایا اور اُسے واپس شٹ اپ بول دیا۔

اب کیا تھا، اُس نے اپنے عملے کو کہا الرٹ ہو کر اِن سب کی تلاشی لو، یہ غدار ہیں اور انڈیا سے مخبری کے بدلے شراب لاتے ہیں۔ لیجیے فوج حرکت میں آ گئی۔ میری خوش نصیبی کہ عین اُس وقت ایک بس وہاں رُکی اور میں اندھیرے میں موقع پا کر اُس پر سوار ہو گیا۔ بس چل پڑی، اب مسئلہ یہ ہوا کہ میرے تینوں ورکر ڈرائیور سمیت وہیں مُرغا بنا دیے گئے اور میری ڈھنڈیا پڑ گئی کہ اصل مجرم کہاں گیا؟ پیچھے جیپ دوڑا دی گئی۔ تمام لائنوں پر کال چلا دی گئی کہ ایک دہشت گرد اور غدار یہاں سے بھاگ نکلا ہے، اُسے پکڑا جائے۔ اِدھر میں ایک ہی کلومیٹر آگے جا کر بس سے نیچے اُترا اور کھیتوں ہی سے ہوتا ہوا بصیر پور کی طرف چل پڑا۔ اُدھر بس میں سے کچھ نہ نکلا تو پورے علاقے کی ناکہ بندی کے سگنل چل گئے۔

میرے تینوں بندوں پر شراب سمگلنگ کا پرچہ درج کر لیا گیا اور بیان حلفی لے لیا گیا، جس میں کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر علی اکبر (اُس وقت مجھے ڈاکٹر کہتے تھے، کیوں؟ یہ بھی بڑا دلچسپ قصہ ہے بعد میں سناؤں گا) شراب کا ایک بہت بڑا اسمگلر ہے۔ ہم سو لیٹر شراب لے کر آ رہے تھے۔ الغرض ایک بڑا کیس تیار کر لیا گیا۔ اِدھر سردیوں کے شدید دن تھے، دُھند اور کُہر میں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ رات تین بجے مَیں پیدل شہر پہنچا۔ اگلے دن مجھے تمام کارروائی کا علم ہوا۔ گاڑی وہاں کھڑی

رہی، بندے رات وہیں بندھے پڑے رہے۔

ہمارے پورے علاقے کے بڑے زمینداروں سے تعلّقات تھے۔ اِدھر نیسلے کے ہیڈ آفس خبر دی۔ شام 4 بجے ہماری برگیڈیئر صاحب سے ملاقات ہوئی، جس میں اُسے پتا چلا کہ میں سمگلنگ کے ساتھ شاعری بھی کرتا ہوں، تو وہ بہت ہنسا۔ خیر معاملہ رفع دفع ہوا اور رفع دفع اس بات پر ہوا کہ دس لیٹر دودھ باقاعدہ وہیں چوکی پر روزانہ دیا جائے کہ سردیوں کی راتوں میں مُلک کی حفاظت کرنے کے لیے آخر رینجر کے جوان چائے کیسے پئیں۔ دس کلو دودھ برگیڈئیر صاحب کے گھر بھی دینا مقرّر رہا کہ جب تک فوجی افسر خالص دودھ نہ پیے گا، دشمن کے دودھ کے دانت کیسے توڑے گا۔ 5 لیٹر دودھ میجر صاحب کے ہاں پہنچنا مقرّر رہا کہ بھائی اگر میجر صاحب نہیں تو کوئی بھی نہیں پی سکتا، پھر یہ کہ محاذ تو میجروں ہی نے سنبھالنا ہوتا ہے۔ یوں 25 لیٹر دودھ روزانہ کے عوض مجھے دہشت گردی اور غداری سے رہائی ملی۔ اب خود ہی بتایئے مَیں نیسلے ملک پیک کو کتنے میں پڑا؟ بھائی کچھ ہی عرصے بعد ہم نے تو وہ نوکری ہی چھوڑ دی۔ اب پتا نہیں وہی 25 لیٹر چل رہا ہے کہ بعد میں آنے والے سپروائزر نے اُسے 50 کر دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!!

بصیر پور کی ہنگامہ آرائیاں

آپ بصیر پور کو ایک چھوٹا سا لکھنؤ سمجھ لیجیے۔ طبلہ اور ہارمونیم ہر ایک بجا سکتا تھا۔ مشاعرے اور مناظرے چلتے تھے۔ ہر گھر میں مجرا ہوتا تھا۔ بٹیر بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی، کنّے لڑانا، گھوڑوں کا رقص وہاں کے معمول تھے۔ شہر کے دو حصے تھے۔ ایک پُرانا بصیر پور تھا۔ تقسیم کے وقت کہتے ہیں اِس شہر سے صرف چودہ گھر ہندوؤں کے بچّے تھے، باقی سب یہاں کے حاجیوں نے ذبح کر دیے تھے۔ یہ چودہ گھر وہی تھے جو قلعے میں پناہ لے کر وہاں دو مہینے تک بند رہے تھے اور بعد میں پولیس انتظامیہ نے اُنھیں حفاظت سے نکالا تھا۔ یہ پُرانا شہر بلند جگہ پر قلعے کے آس پاس تھا۔ اِسے ڈھکی کہتے تھے۔ اِس کی چھوٹی چھوٹی گلیاں تھیں۔ یہ نئے شہر سے پچاس فٹ کے لگ بھگ اونچا تھا۔ بہت چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ اِن کے گھروں میں اکثر دُکانداروں

اور چھوٹے پیشہ ور لوگوں کی تعداد تھی۔ یہاں چائے بہت عمدہ ہوتی تھی۔ برفی زبردست بناتے تھے۔ اکثر لوگ چائے کی پیالیاں سامنے رکھے لکڑی کی چوکیوں پر بیٹھے تاش کے پتے پھینٹتے تھے۔ مَیں ایک سال تک اِسی ڈھکی پر رہا تھا۔

دوسرا حصہ نئے شہر کا تھا، یہ شہر منڈی اور اُس کے آس پاس تھا۔ شہر میں ایک ریلوے لائن نکلتی تھی اور ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ یہ ریلوے لائن لاہور سے قصور اور وہاں سے چونیاں، منڈی احمد آباد، بصیر پور، حویلی لکھا، پاکپتن سے ہوتی ہوئی بہاولپور سے مرکزی ٹریک پر چڑھ جاتی تھی۔ لوگوں کو اس پر سفر کی بہت سہولت تھی۔ اب شاید بند ہو گئی ہو۔ انڈین شراب، دیسی شراب اور افیون اور ہیروئن یہاں نمک کی طرح بکتی تھی۔

یہاں کے تین نوجوان میرے بہت دوست بن گئے۔ اِن میں احسن شاہ، محسن شاہ اور حیدر شاہ تھے۔ اِن کے والد کا نام مہدی شاہ تھا۔ شہر میں اِن کی زمینداری تھی۔ تینوں بھائی بہت پڑھنے والے اور لائق تھے۔ یہ نہایت نفیس اور خوب صورت تھے۔ میرا دوپہر کا کھانا متواتر اِن کے گھر میں اِنہی کے ساتھ ہوتا تھا۔ روزانہ کھانے میں پلاؤ ضرور پکتا اور جب تک مَیں نہ جاتا، یہ تینوں کھانا نہ کھاتے اور میرا انتظار کرتے۔ اِن کے پاس ایک وی سی آر تھا۔ مَیں نے اُسی پر پروفیسر عبدالحکیم بوترابی، طالب جوہری، علامہ رشید ترابی، علامہ نصیر الاجتہادی، علامہ عقیل ترابی، علامہ علی نقی نقن صاحب اور دیگر کئی علما و ذاکرین کی کم و بیش تمام تقریریں سنیں۔ میرا کام تین سال تک متواتر یہ رہا کہ تین تین گھنٹے روزانہ اِن کی ویڈیو مجلسیں سنتا تھا۔

غرض یہ کہ کم و بیش تمام بصیر پور کے لوگ میرے نام سے واقف تھے اور بیشتر سے نہایت قریبی تعلقات تھے۔ اُن دِنوں اگرچہ مَیں شعر کہنے میں اتنا طاق نہیں تھا لیکن بصیر پور کے مقامی مشاعروں میں میری شاعری کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔ شہر کے ایک ایسے خاندان نے ہمیں اپنے ہاں شادی کی آفر بھی کی جن کی معاش کا دھندہ ہیروئن پر چلتا تھا۔ لڑکی بہت حسین و جمیل تھی لیکن ہیروئن کے کاروبار میں ڈوبنے کا فی الحال ہمارا ارادہ نہ تھا۔

ایک عُرس میں جھگڑا اور حوالات میں

ایک دفعہ بصیر پور میں ایک عُرس چل رہا تھا۔ مقامی پیر صاحب خواجہ محمد اکبر کی خانقاہ تھی۔ خواجہ صاحب ڈیڑھ سو برس پہلے فوت ہوئے تھے مگر اِن کی کرامات ابھی تک چل رہی تھیں۔ اِن کرامات کو ہر سال دُنیا پر منکشف کرنے کے لیے خانقاہ کے مجاور اور متولی عرس میں قوالی کراتے تھے۔ مجھے قوالیاں سننے کا بہت شوق تھا۔ عرس تین دن چلتا تھا۔ مَیں بھی پہلے دن عرس میں جا دھمکا۔ رات کا عالم تھا۔ سردی کے دن تھے لیکن سردی اتنی بھی نہیں تھی کہ عرس نہ دیکھا جا سکے۔ ہجوم بہت زیادہ تھا۔ دس بجے قوالی شروع ہونا تھی مگر مَیں آٹھ بجے ہی چلا گیا۔

بصیر پور میں پان اور شراب کی لت ہر ایک کو تھی۔ اِس میں چھوٹے بڑے، نیک و بدمعاش کی قید نہیں تھی۔ سب ہی کھاتے پیتے تھے۔ مَیں عرس میں اِدھر اُدھر چہل قدمی کر رہا تھا۔ اتنے میں تین چار ٹین ایج لڑکے سامنے آ گئے۔ سب نے شراب پی ہوئی تھی۔ اِن میں ایک ایسا لڑکا بھی تھا جو ہمارے آفس کے سامنے ایک پنکھے ٹھیک کرنے والی دُکان میں بیٹھتا تھا۔ دُکان میں بیٹھا ہوا شریف لگتا تھا۔ پندرہ سولہ برس اِس کی عمر تھی۔ منہ متھے کا بھی اچھا تھا لیکن یہاں اُس کے تیور ہی کچھ اور نظر آ رہے تھے۔ گریبان کھلا ہوا، گلے میں ایک لاکٹ۔ منہ میں پان دبایا ہوا۔ وہاں میلے میں جیسے ہی اِس نے مجھے دیکھا پلٹ کر پہلے تو میری طرف اشارہ کر کے ہوا ہی میں گردن ٹیڑھی کر کے تھوکا پھر لڑکوں کے کان میں کچھ بات کی۔ چونکہ وہ چاروں شراب کے نشے میں بھی تھے لہٰذا وہ بھی اُس کے ساتھ ہو گئے اور مجھ پر آوازے کسنے لگے۔ مَیں اُن سے گریز کر کے اِدھر اُدھر ہونے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ کسی طرح میرا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے اور مسلسل تنگ کرتے ہوئے بدزبانی سے آوازے کستے رہے۔ مجھے سخت خجالت ہونے لگی لیکن دو وجوہ کی بنا پر اُن کے ساتھ اُلجھنے سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ وہاں میرا اسٹیٹس ایک باوقار آدمی کا تھا۔ مجھے ڈر ہوا کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے کہ لوفروں کے ساتھ آخر اِس کا کیا لینا دینا تھا۔ کوئی وجہ تو ہو گی جس کے سبب یہ لڑکے اِس سے دست و گریبان ہوئے ہیں۔ دوم یہ بھی ڈر تھا کہ اگر اِنھوں نے

بھرے مجمعے میں میری پھینٹی لگا دی تو مَیں اِس شہر میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا۔ وہ چار تھے اور مَیں اکیلا تھا۔ مار تو مجھے ہی پڑنی تھی۔ پھر بھی مَیں پٹائی سے کم ڈرتا تھا، اُس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی شرمندگی سے زیادہ خوف تھا۔ لہٰذا کسی نہ کسی طرح اُن سے گریز کرنا چاہا مگر وہ ڈھیٹ ایسے تھے کہ آخری دم تک میرے پیچھے پڑے رہے۔ مَیں حیران تھا آخر اِس لڑکے کو مجھ سے کیا بَیر ہے اور اچانک اِسے کیا ہو گیا ہے؟ جان اُس میں اتنی تھی کہ میرا ایک گھونسا اُس کے جبڑے نکال دیتا لیکن میری مسلسل لڑائی سے گریز کی وجہ سے اُسے پکا گمان ہو گیا کہ مَیں اُس سے ڈر گیا ہوں کیونکہ وہ گویا محمد علی باکسر ہے۔ اِس زعم نے اُسے دیدہ دلیر کر دیا تھا۔ بالآخر کسی طرح اُن سے جان چھڑا کر مَیں نکل ہی آیا لیکن ساری رات اپنے آپ کو کوستا رہا کہ ایسی ذلت سے تو بہتر تھا وہیں مر رہتا۔ بہت غصّہ تھا اور کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔

صبح مَیں نے اپنے دو کولیگ سے کہا کہ بھائی آج آپ نے میرے ساتھ میلہ پر جانا ہے۔ یہ کچھ معاملہ ہوا ہے لیکن یاد رہے بصیر پور کے ہمارے دیگر احباب کو اِس بات کی کانوں کان خبر نہ ہو۔ آپ نے کچھ نہیں کرنا بس اُس بھڑوے کے ساتھیوں کو آگے نہیں آنے دینا۔ باقی مَیں خود سنبھال لوں گا۔

اگلے دن جب گئے تو ہجوم پہلے سے بھی زیادہ تھا لیکن مَیں اب اُن لڑکوں کی تلاش میں تھا۔ میرے کولیگ غیر محسوس طریقے سے میرے ساتھ ساتھ تھے۔ ایک جگہ بالآخر مَیں نے اُنھیں دیکھ لیا۔ اب یہ تین دوست اکٹھے پھر رہے تھے۔ مَیں نے پاس پہنچ کر فوراً مطلوبہ لڑکے کو کاندھے سے پکڑ کر ایک دم اُس کا منہ اپنی طرف کیا۔ جب اُس نے مجھے یوں اپنے ساتھ بدتمیزی کرتے دیکھا تو حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا کہ آج تو اِس نے خود پنگا لے لیا ہے۔ مزا آئے گا لیکن اِس سے پہلے کہ اُس کی خوشی اور نشاط انگیزی کو مزید پر لگتے مَیں نے اُسے اپنے گھونسوں پر رکھ لیا۔ اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کل جو آدمی اتنی بزدلی دکھا رہا تھا، آج اُس پر اتنی تیزی سے مکوں اور گھونسوں کی بوچھاڑ کرے گا۔ اُس کے ساتھی جیسے ہی آگے بڑھے میرے ساتھیوں نے اُنھیں روک لیا۔ وہ لڑکا نیچے گر گیا، بالکل نازک سا لڑکا تھا۔ منہ اور ناک سے خون نکلنے لگا۔ گرے پڑے

کو مَیں نے دو چار تھڈے بھی مار دیے۔ اب وہ رونے لگا۔ اتنے میں لوگ تماشا دیکھنے کے لیے بھاگ کر جمع ہو گئے۔ ہجوم پہلے ہی بہت زیادہ تھا۔ وہیں پولیس موجود تھی۔ پلک جھپکنے میں آن پہنچی اور مجھے دبوچ لیا۔

اب یہ ہوا کہ میرے کولیگ تو رفو چکر ہو لیے لیکن اُس لڑکے کی حمایت میں پورا مجمع وہاں جم گیا۔ لڑکے کے ہونٹ پھٹ چکے تھے۔ اُس کی کچھ حالت تو میرے گھونسوں کی وجہ سے بُری تھی، کچھ اُس نے اپنا گریبان پہلے سے کھول رکھا تھا، منہ میں پان کی پچکاریاں بھی جمع تھیں اور شراب کی بُو بھی آ رہی تھی۔ اِس پوری ہیئت نے اُسے ایک طرح سے غنڈہ کا حلیہ دے رکھا تھا۔ قدرتِ خُدا کی جس پولیس والے نے مجھے دبوچا تھا، وہ سیّد علی مظہر نقوی تھا اور مومن تھا۔ جب میرا نام پوچھا تو مَیں نے علی اکبر بتایا۔ تب اُس نے فوراً مجھے ہجوم سے الگ کیا اور تھانے میں لے کر چل دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ مجھے وہیں چھوڑ دیتا تو لڑکے کے حمایتی میرا حلیہ بگاڑ دیتے۔

تھانے میں گئے تو اُس لڑکے کو ساتھ لیے آٹھ دس لڑکے تھانے میں چلے آئے۔ یہاں تھانے دار نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پہلے مجھ سے پوچھا ہاں بھئی کیا معاملہ ہوا؟ مَیں نے کہا جناب یہ کچھ میرا تعارف ہے اور اِس لڑکے نے مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے غصہ آیا اور مَیں نے اِسے دو تین گھونسے مار دیے۔ تب تھانے دار لڑکے کی جانب متوجہ ہوا، لیکن وہاں موجود جتنے لڑکے کھڑے تھے، بڑھ کر مجھے بھی دھمکیاں دینے لگے اور تھانے دار سے کہنے لگے اِس پر ایف آئی آر کاٹ دیں، یہ ہمارے ہی شہر میں آ کر ہمارے آگے اکڑتا ہے۔

اب ایک تو لڑکے کا حلیہ، اُس پر اُس کے حمایتیوں کا غنڈوں کا سا اندازِ گفتگو۔ تھانے دار کو بھی غصہ آ گیا، وہ بولا یعنی آپ کے شہر میں آپ جیسے چاہیں شرفا کو ذلیل کریں؟ تب اپنے اسسٹنٹ اُس نقوی صاحب، جو ہمیں لے کر آیا تھا، سے کہا، نقوی صاحب: اِن دونوں پر سات اکیاون کی دفعہ لگا کر دونوں کو حوالات میں بند کر دیں اور اِن لڑکوں کو بھی پکڑ لو جو ساتھ آئے ہیں۔ تھانیدار کی بات سن کر وہ تمام لڑکے تو ایک دم بھاگ گئے مگر مجھے اور میرے مضروب کو پکڑ لیا گیا اور

حوالات میں بند کر دیا۔ مَیں تو خیر بائیس تئیس سال کا تھا، کچھ عقل بھی تھی اور زمانے کا سرد و گرم بھی معلوم تھا لہٰذا حوصلہ کیا۔ سات اکیاون قابلِ ضمانت گرفتاری تھی، یعنی اگلے ہی دن ضمانت ہو جانا تھی اِس لیے کسی سفارشی کو یا کسی دوست کو خبر دار کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ ٹین ایج لڑکا تھا۔ تھانے کا منہ پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ ایک دم رونا دھونا شروع کر دیا اور چیخیں مارنے لگا۔ کبھی کسی کے پاؤں میں گرتا، کبھی کسی کے پاؤں میں۔ حتیٰ کہ اُنھیں یہ بھی کہا، مَیں اِن سے صلح کرتا ہوں، اِسے بھی چھوڑ دیں اور مجھے بھی چھوڑ دیں مگر تھانے دار نے ایک بھی نہ سنی۔ کہا بیٹا اب تو ہم نے پرچے کا اندراج کر دیا ہے۔ چپ کر کے حوالات میں بیٹھو۔

حولات میں تین ملزم مزید بند تھے۔ اُنھوں نے اُسے ڈرانا شروع کر دیا کہ رات جو کچھ تمھارے ساتھ ہوگا وہ عمر بھر نہیں بھولو گے۔ اِس پر اُس نے آہ و زاری مزید بلند کر دی۔ آخر تھانے دار نے اُس کے رونے دھونے سے بیزار ہو کر کہا، اگر دو منٹ میں رونا بند نہ کیا تو ابھی باہر نکال کر پانچا فٹ کر دیں گے (یعنی پانچ جوتے ماریں گے)۔ تھانیدار کی دھمکی سے وہ ایک دم چپ ہو گیا اور آہستہ آہستہ مجھے منتیں کرنے لگا کہ آپ کچھ کرو۔ مَیں نے کہا بھئی مَیں تو کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک رات کی بات ہے، آرام سے نکال لیتے ہیں۔ کہنے لگا مجھے یہ حوالات میں بند ساتھ والے ملزم اور پولیس والے گندی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ رات بہت بُرا کریں گے۔

مَیں نے کہا، کسی کی جرأت نہیں ایسا کچھ کرنے کی۔ ہاں اگر یونہی روتے رہو گے تو کچھ کر بھی دیں گے۔ لہٰذا خاموش ہو جاؤ۔ پڑوسی ملزم اُس کے خوف سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اتنے میں میرے کولیگ میرے لیے ایک کمبل اور کھانا لے آئے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اُس لڑکے کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ مَیں نے اُسے سمجھایا، دیکھو بیٹا، جب کسی سے پنگا لیتے ہیں تو اُس کے نتائج بھی بھگتنے پڑتے ہیں۔ اب اگر یہ پولیس والے نہ آتے تو تم اور تمھارے ساتھ والے لفنگے میری پٹائی کرتے۔ کہنے لگا خدا کی قسم وہ میرے ساتھی نہیں تھے، نہ ہمارا ارادہ پٹائی کرنے کا تھا ہم تو آپ کو ویسے ہی ڈراتے رہے تھے۔ اگر یہ ساتھی ہوتے تو مجھے اکیلا نہ چھوڑتے اور یہاں سے بھاگ نہ جاتے۔ مجھے اب کسی طرح سے بچا لو۔ آئندہ تمھارا دوست بن کے رہوں گا۔ مَیں نے

کہا، تمھاری دوستی کی تو مجھے خیر کوئی ضرورت نہیں، ہاں البتہ تمھیں یہاں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ بےفکر ہو جاؤ اور یہ کھانا کھالو۔ چنانچہ وہ خاموشی سے میرے ساتھ کھانا کھانے لگا۔

سردی کا موسم تھا۔ سب اپنے کمبل لے کر لیٹ گئے۔ مَیں بھی ایک کونے میں لیٹ گیا۔ اُس کے پاس سردی سے بچاؤ کے لیے کوئی شے نہیں تھی۔ آدھی رات تک تو اکٹھا سا ہو کر بیٹھا رہا اور ٹھٹھرتا رہا اور ڈرتا رہا کہ اُس کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ حوالاتی بھی بہت حرامی ٹائپ تھے اور پولیس والے بھی۔ کبھی اُسے کوئی اپنے کمبل میں جگہ دینے کا اصرار کرتا اور کبھی کوئی لیکن مَیں چپ کر کے لیٹ گیا۔ اتنے میں مجھے یاد نہیں کب نیند آ گئی۔ پھر اچانک مجھے اپنے کمبل میں کوئی گھستا ہوا محسوس ہوا۔ مَیں ایک دم ڈر کے اُٹھا، دیکھا تو وہی لڑکا میرے کمبل میں گھسا ہوا تھا۔ پہلے تو مجھے غصّہ آیا لیکن پھر آرام سے لیٹ کر مسکرا دیا۔ یعنی اُسے میرے علاوہ کسی کا کمبل بھی نہیں بھایا تھا۔ کمبل میں لیٹتے ہی وہ اِس طرح سو گیا جیسے بہت دِنوں کا جاگا ہو۔ اُس کی یہ حرکت دیکھ کر پہرے پر کھڑا کانسٹیبل اور حوالاتی ہنسنے لگے۔

اگلے دن ہمیں حوالات سے کچہری لے جایا گیا اور ضمانت ہوئی۔ مزے کی بات ہے کچہری میں جاتے ہوئے مَیں نے تو اپنی ہتھکڑی اپنی چادر کے نیچے چھپائے رکھی تاکہ لوگ نہ دیکھ سکیں لیکن وہ لڑکا اِس طرح ہتھ کڑی پہن کر بازار سے گزر رہا تھا جیسے بھگت سنگھ وہی تو تھا۔

ہم پھنسے دو بھینسوں میں

حویلی لکھا میں ایک گاؤں ''عدلی کا'' تھا۔ وہاں کا ایک بہت بڑا زمیندار نعیم خاں وٹو تھا۔ اِس کی ایک سو بھینسیں تھیں۔ روزانہ کا چار پانچ سو لیٹر اُن کا دودھ ہوتا تھا۔ وہ دودھ کمپنی اٹھاتی تھی۔ دوسری طرف حویلی لکھا میں دیوان تھے۔ یہ بھی بہت طاقتور لوگ تھے۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ دیوانوں میں اور نعیم خاں وٹو کے درمیان زمین کے معاملہ میں جھگڑا چل نکلا۔ دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی ٹھان لی لیکن اُس سے پہلے دونوں نے ایک دوسرے کے راستے وغیرہ بند کر دیے اور ایک دوسرے کے بندوں کی ٹانگیں بھی توڑیں۔ حویلی لکھا کے لوگوں میں ہر وقت ایک

قسم کا ہراس پھیل گیا جو کئی مہینے قائم رہا۔ کئی بار شہر کے بازار میں دونوں طرف سے فائرنگ کے تبادلے بھی ہوئے۔ ایک بار بے چارے دو راہگیر اُس فائرنگ کی زد میں آئے۔ غرض یہ کہ اچھی خاصی ٹینشن پیدا ہو گئی۔

ہمارے سینئر انچارج سیّد اقرار شاہ تھے۔ اُنھوں نے کہا، بھئی ہم تو دودھ کی کمپنی کے ملازم ہیں۔ ہم دونوں سے دودھ لیں گے۔ مزے کی بات ہے اِس پر اُنھیں اعتراض بھی نہیں تھا لیکن ایک مسئلہ یہ تھا کہ نعیم خاں وٹو نے یہ شرط لگائی کہ دودھ کی پے منٹ اُسے ہر ہفتے گھر میں پہنچائی جائے۔ یہ شرط منظور کر لی گئی چنانچہ ہر ہفتے اُس کے دودھ کی پے منٹ ہم لوگ اُس کے گھر دینے جاتے تھے۔ گھر اُس کا شہر سے دو کلومیٹر دُور حجرہ روڈ پر تھا۔ کافی بڑا گھر تھا۔ چاروں طرف اونچی دیوار تھی اور ارد گرد دس بارہ اسلحہ بردار لوگوں کا پہرہ ہوتا تھا۔ مگر چار پانچ مہینوں بعد یہ پہرہ کم ہوتا گیا اور آدمیوں کی تعداد بھی گھٹتی گئی۔ ہوتے ہوتے صرف تین گن مین رہ گئے۔ اِن میں سے ایک کا قد چھ فٹ اور شہینہ جوان تھا، یہ بڑی بڑی مونچھیں۔ دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ مَیں اکثر سوچتا تھا کہ دس بارہ بندوں کے لیے تو یہ اکیلا ہی کافی ہے۔

ایک دن واقعہ یہ ہوا کہ مَیں اور اقرار شاہ ایک جیپ پر اُس کے گھر پہنچے تاکہ اُس کی پے منٹ پہنچا دیں۔ وہی تین گن مین وہاں موجود تھے جن میں دو تو دروازے پر کھڑے تھے اور ایک گن مین نعیم وٹو کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ ہم نے جا کر نعیم وٹو کو اُس کی پے منٹ اور دودھ کے حساب کتاب کا کاغذ دیا۔ اتنے میں ملازم ہمارے لیے چائے اور برفی لے آیا۔ ہم نعیم وٹو کے ساتھ گفتگو کرنے لگے اور مزے سے برفی کے ساتھ دودھ پتی پینے لگے۔ اتنے میں باہر سے ایک بلوہ ہو گیا اور گولیوں کا مینہ برسنے لگا۔ دشمن نے موقع پا کر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ ایک گن مین بھاگا ہوا آیا اور کہا، میاں صاحب آپ جلدی سے مہمانوں کو لے کر اندر چلے جائیں، دشمنوں کی تعداد تیس چالیس ہے۔ اب جناب ہمارے پسینے چھوٹ گئے۔ ہم بھاگ کر سب اندر چلے گئے اور گن مین بھی ساتھ تھا۔ نعیم وٹو نے اپنے گن مین سے کہا، دروازے پر جا کر فائر کرو۔ ایک رائفل اُس نے خود پکڑ لی اور جوابی فائرنگ شروع کر دی لیکن باہر سے اتنی گولیاں برس رہی تھیں کہ اِن کی گولیاں

وہاں کچھ بھی نہیں تھیں۔

مَیں اور اقرار شاہ ایک ستون کے پچھلی طرف کے پلنگ کے نیچے گھس گئے۔ گھر کی عورتوں نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ نعیم وٹو کا گن مین اتنا ڈرا ہوا تھا کہ مجھے اُس پر غصّہ آنے لگا۔ اُس کی سانس چڑھی ہوئی تھی۔ پسینے چھوٹ رہے تھے اور فائر کرتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ہانپنے لگا۔ نعیم وٹو اُس کی حالت دیکھ کر غصّے میں آ گیا اور اُس کی رائفل خود پکڑ لی اور دروازے کے پاس جا کر فائر کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اِن کا اسلحہ بھی جواب دے گیا۔ گولیاں کم پڑ گئیں۔ باہر کے دونوں گن مین حملہ آوروں نے پکڑ لیے اور اب کچھ ہی دیر میں وہ گھر میں گھسنے والے تھے۔ اِس حالت میں مَیں نے دیکھا نعیم وٹو کے حوصلے اور حواس تو ابھی بھی بحال تھے لیکن اُس کے چھ فٹے گن مین کی حالت مُردوں کی سی تھی۔

اتنے میں خُدا کا کرنا یہ ہوا کہ پولیس کے ہوٹروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جس کے سبب باہر سے گولیاں تھم گئیں اور حملہ آوروں کے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اصل میں نعیم وٹو کے گھر کی عورتوں نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ حملہ آور دیوان گروپ گھر میں گھس کر نعیم وٹو کو قتل کر دیتے اور ہمیں باندھ لے جاتے، پولیس چلی آئی اور تمام طرف سے بچت ہو گئی۔ البتہ اُن بدبختوں نے باہر کھڑے گارڈز کو بہت مارا۔

آج بھی سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ مَیں اور اقرار شاہ کیسے پلنگ کے نیچے گھسے ہوئے تھے۔

جرائم پیشہ لوگ

بصیر پور اور حویلی لکھا کا علاقہ جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ تھا۔ مَیں نے اِن دونوں جگہوں پر چار سال گزارے۔ اِس دَوران بیسیوں واقعات آنکھوں کے سامنے گزرے جو تعجب سے خالی نہیں۔ اِن میں سے ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔

سب انسپکٹر عابد اور احمد علی ڈھبی والا

علاقے میں ڈکیتی اور راہ زنی کی وارداتوں کو ختم کرنے کے لیے آئے دن ڈی پی او کی طرف سے آپریشن ٹیمیں بصیر پور بھیجی جاتی تھیں۔ اِن میں سب انسپکٹر عابد بھی تھا۔ یہ 35 سال کی عمر کا پولیس ملازم تھا۔ بہت نڈر اور تیز طرار شخص تھا۔ اکثر دریائے ستلج کے مضافات میں ڈیوٹی پر رہتا۔ اِسے بھینس کا خالص دودھ پینے کا ہُڑکا رہتا تھا۔ نیسلے کے چلنگ پلانٹ میں چکّر لگاتا رہتا۔ وہیں میری اس کی دوستی ہوئی۔ کبھی کبھی کتاب بھی پڑھ لیتا۔ زیادہ تر ڈائجسٹ پڑھتا، جن میں جرائم پیشہ لوگوں کی کہانیاں ہوتیں۔ وہاں اِس کا کئی ڈکیتوں سے مقابلہ ہوا۔

دوسری طرف میرا ایک اور بھی دوست تھا۔ یہ احمد علی تھا۔ سومیا ایک گاؤں تھا۔ وہیں رہتا تھا۔ یہ کمپنی کے لیے دودھ بھی سپلائی کرتا۔ اچھا اور ملنسار لڑکا تھا۔ اِس کی عمر 25 سال تھی۔

ایک دفعہ ایک گاؤں بہلول پور میں ڈکیتوں اور پولیس کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ اِس مقابلے میں بھی سب انسپکٹر عابد لیڈ کر رہا تھا۔ پولیس کے مطابق اِن میں ایک ڈاکو قتل ہو گیا۔ باقی تین ڈاکو بھاگ گئے۔ حیرت کی بات ہے اُن بھاگنے والوں میں احمد علی بھی تھا۔ میرے لیے یہ بات بہت تعجب کی تھی۔ جو ڈاکو قتل ہوا تھا اُس کے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش ورثا کو دے دی گئی اور باقی ڈاکوؤں کی تلاش شروع کر دی۔ دوسری طرف ڈاکوؤں کا کہنا تھا کہ وہ ڈاکو نہیں تھے بلکہ بہلول پور گاؤں سے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنے گاؤں واپس آ رہے تھے۔ اِسی دَوران ہم پر فائرنگ ہو گئی۔ ہم بڑی مشکل سے جانیں بچا کر بھاگے اور ایک ساتھی قتل ہو گیا۔ مقدمہ عدالت میں چلا گیا۔ دونوں طرف سے وکلا نے دلائل دینے شروع کر دیے

احمد علی نے کہا کہ وہ ہرگز عابد کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ قتل کرے گا اور اُس کے لیے اُس نے کئی بندوبست بھی کیے۔ احمد علی نے مجھے تمام واردات بتائی جس میں وہ اپنے آپ کو معصوم ثابت کرتا تھا۔ دوسری طرف عابد نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ احمد علی کو بھی قتل کر کے ڈکیتوں کا صفایا کرے گا۔ یعنی دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے۔ ستم کی بات یہ کہ دونوں میرے دوست بھی

تھے۔ احمد علی کے خلاف پولیس مقابلہ اور ڈکیتی کی ایف آئی آرز بھی کٹ چکی تھیں۔ چنانچہ وہ فرار بھی تھا اور پولیس نے اُس پر دو لاکھ انعام بھی مقرر کر دیا۔

القصہ مختصر اِن باتوں کو ایک دو ماہ گزر گئے۔ ایک دن مَیں بصیر پور شہر میں اپنی رہائش پر موجود تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا کہ دروازہ کھٹکا، ہمارے ملازم نے دروازہ کھولا تو سامنے سب انسپکٹر عابد کھڑا تھا۔ مَیں نے اُسے اندر بلا لیا۔ دودھ چائے وغیرہ پلائی۔ شام کو کھانا کھلایا۔ مَیں نے اُس کے اچانک چلے آنے کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا، ناطق صاحب مَیں نے آج رات آپ کے پاس گزارنا ہے۔ رات کے چار بجے رانجھا پُل پر ایک آپریشن کرنا ہے۔ مَیں انتہائی خفیہ طور پر یہاں موجود ہوں کیونکہ بصیر پور تھانہ کے کسی فرد کو اِس آپریشن کی خبر نہیں دینی۔ مجھے ایک کمرے میں بس ایک چارپائی دیجیے۔ صبح تین بجے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ پل رانجھا یہاں سے آٹھ کلومیٹر ہے۔ آرام سے پہنچ جاؤں گا۔ مَیں نے کہا کوئی بات نہیں اور اُسے ایک کمرے میں چارپائی لگا دی۔

اب اگلی کہانی سنیے، اُسی دن رات کے آٹھ بجے احمد علی بھی ہماری رہائش پر پہنچ گیا۔ کہنے لگا ناطق صاحب آج رات آپ کے پاس رہنا چاہوں گا۔ ابھی تمام جگہ ناکے لگے ہوئے ہیں۔ مَیں نے چھ بجے لاہور کے لیے نکلنا ہے اور پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ مَیں گھر نہیں جا سکتا اور کوئی اعتماد کی دوسری جگہ نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کسی کے پاس رہوں اور وہ میرے سر کے بدلے دو لاکھ کھرا کر لے۔ مَیں نے کہا کوئی بات نہیں۔ آپ میرے دوست ہیں۔ مَیں نے اُسے ایک دوسرے کمرے میں سُلا دیا۔ یہ کمرہ اُسی کمرے سے ملحق تھا جہاں عابد سویا ہوا تھا۔ مَیں نے احمد سے کہا، آپ اندر سے دروازہ کو کنڈی لگا لیں اور تب تک نہیں کھولنا جب تک مَیں آواز نہ دوں۔ اندر اٹیچ واش روم ہے چنانچہ کسی حاجت کے لیے باہر آنے کی ضرورت نہیں ورنہ کمپنی کے لوگ کہیں گے کہ مَیں ایک ایسے آدمی کو مہمان رکھتا ہوں جو پولیس کا مفرور ہے۔ اُس نے کہا آپ فکر نہ کریں۔ مَیں اندر ہی رہوں گا۔

لیجیے جناب وہ دونوں دشمن اور ایک دوسرے کی جان کے درپے انسان ایک دوسرے کے

بالکل قریب رات بھر سوئے رہے اور صبح اپنی اپنی سمت نکل گئے۔ دونوں کو آج تک خبر نہیں ہوئی کہ اُن کے درمیان صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا

بصیر پور کے چند دوست، اصغر علی عابد

یہ بصیر پور کے ایک گاؤں ڈھپی میں رہتا تھا۔ اِس کا والد گاؤں کی مسجد کا مولوی تھا۔ مَیں نے اِسے دودھ کا کاروبار کروا دیا۔ بہت جی دار آدمی تھا۔ گپ بازی اور شعر فہمی میں طاق تھا۔ آواز بہت اچھی تھی۔ مَیں جب کوئی غزل لکھتا، یہ اُسے کسی نہ کسی راگ میں گا دیتا۔ کھانے پینے کا بہت شوق رکھتا تھا۔ خاص کر بکرے اور دنبے کے گوشت کا عاشق تھا۔ ہفتے بعد دودھ کی پے منٹ ہوتی تھی۔ جیسے ہی اِسے پے منٹ ملتی، مجھے ساتھ لیتا اور دنبے کی کڑاہی بنوا کر کھاتے۔ مَیں اکثر اِسے ساتھ لے کر فیلڈ میں نکلتا تھا۔ یہ بھی کمپنی کے ساتھ کام کرنے کے سبب ایک قسم کا فارغ ہی ہوتا تھا۔ کیونکہ صبح نو بجے کمپنی دودھ اٹھا لیتی تھی۔ اُس کے بعد تمام دن کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اکثر اوقات ہم دونوں مجالس سننے دُور دُور نکل جاتے تھے۔ اگرچہ حنفی فقہ سے تعلّق رکھتا تھا مگر اہلِ بیت سے بہت عقیدت تھی۔ میرے ساتھ تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے سٹپٹا جاتا۔ کیونکہ سادہ مسلمانوں کو عمومی طور پر سچ ہضم نہیں ہوتا لیکن مجالس میں بہت دلچسپی لینے لگا۔ بعض اوقات میری شیعت کے معاملے میں غیر لچکدار طبیعت سے گھبرا کر لڑ پڑتا لیکن اگلے ہی دن سب کچھ بھول کر ہم دونوں پھر فیلڈ میں نکل پڑتے اور میری کسی نہ کسی غزل کو کسی راگ پر فٹ کر کے گانے لگ جاتا، جسے سن کر واقعی مزہ آتا۔ فیلڈ میں نکلنے کے دو فائدے اِسے ملتے تھے۔ ایک یہ کہ طرح طرح کے علاقے اور لوگ دیکھنے اور اُنھیں ملنے جلنے کا موقع ملتا، دوم جہاں بھی جاتے خالص دودھ پتی اور عمدہ کھانے میسر آتے تھے۔ جب مَیں نے نیسلے کمپنی کو چھوڑا تو اِسے بہت دکھ ہوا۔ دو سال بعد اوکاڑہ میں میرے پاس آیا، تو شیعہ ہو چکا تھا، مَیں نے پوچھا آپ تو حنفی تھے، یہ شیعی انقلاب کیسے آیا، بولا، ناطق صاحب اصل میں دل شیعی تھا اور دماغ حنفی سو میں نے دل کی مان لی۔

امانت خاں وٹو

یہ ڈھبی کا تھا، اصغر علی عابد اور یہ دونوں دودھ کے کاروبار میں پارٹنر تھے۔ بہت مخلص اور عام لوگوں کے کام آنے والا اور کسی کا دل نہ دکھانے والا آدمی تھا۔ یہ بھی کھانے پینے کا شوقین تھا۔ کبھی کبھار ڈرنک بھی کرتا تھا بلکہ اِن علاقوں میں جو آدمی ڈرنک نہیں کرتا تھا وہ ولایت کے درجے پر فائز سمجھا جاتا تھا۔ پورے علاقے میں اِس کے عزیز و اقارب اچھے کھاتے پیتے زمیندار اور سیاست میں دخیل تھے۔ اِس کا ایک کزن ڈپٹی کمشنر تھا۔ ایک بار بصیر پور شہر میں ایک آدمی سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ وہ آدمی نہایت بدتمیز اور اجڈ تھا۔ امانت علی نے اُسے بھرے بازار میں یوں گریبان سے گھسیٹا کہ وہ بولایا سا ہو گیا۔ شاعری بھی کرتا تھا۔ شہر اور اردگرد کے تمام مشاعروں میں اپنی پنجابی غزلیں پڑھتا تھا۔ اُردو کی غزلیں مجھ سے لکھواتا تھا اور داد پاتا تھا۔ ادب کا مطالعہ بھی کرتا تھا۔

ایک بار مجھے ایک آدمی نے کہا، ڈاکٹر صاحب آپ رات گئے تک فیلڈ میں پھرتے رہتے ہیں، اِدھر یہاں تو چٹے دن ڈکیتیاں ہوتی رہتی ہیں۔ آپ شام سے پہلے پہلے اپنے آفس نکل جایا کریں اور ویران سڑکوں پر یوں نہ گھوما کریں جیسے بنجارے پھرا کرتے ہیں۔ پاس ہی ایک اور آدمی کھڑا تھا، اُس نے کہا، نہیں سجاول میاں، اِسے کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ امانت خاں وٹو اِس کا دوست ہے۔ اِس کی موٹر سائیکل کون چھین سکتا ہے؟ پھر دونوں ہنس پڑے۔ مجھے اِس بات کی سمجھ نہ آئی۔ ڈاکوؤں کو بھلا کیا خبر امانت خاں کون ہے؟ اِس امر کے چھ سات ماہ بعد پولیس نے دو لڑکے موٹر سائیکل چھینتے ہوئے گرفتار کر لیے۔ اُنھوں نے کہا ہم یہ کام پچھلے پانچ سال سے کر رہے ہیں اور جتنی موٹر سائیکلیں چھینی ہیں وہ فلاں جگہ پڑی ہیں۔ وہ ''فلاں جگہ'' امانت خاں کا ڈیرہ ہی تھا۔ اب پولیس نے تفتیش شروع کی۔ سارا مال پکڑا گیا۔ موٹر سائیکلوں کے ڈھانچے کھڑے تھے، روحیں نکال لی گئی تھیں یعنی اُن کے تمام اندرونی اور بیرونی پرزے کھینچ لیے گئے تھے۔ فقط چیسی نمبر والا حصہ کھڑا رہ جاتا تھا۔ مَیں نے جب یہ خبر سنی تو بہت افسوس ہوا اور اب سمجھ میں آئی کہ میری

موٹر سائیکل کیوں نہیں پکڑی جا سکتی تھی۔ مجھے تشویش ہوئی کہ اب امانت خاں جیل میں جائے گا مگر دوسرے ہی دن امانت خاں مجھے ملا، مَیں نے کہا، یار یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ بولا معاملہ کیا ہے چار سالوں نے میری جگہ کرائے پر لی تھی۔ کرائے کے لیے اسٹام ہوا تھا۔ مجھے کیا پتا یہ حرامی موٹر سائیکلیں لوٹ کر یہاں یہ دھندا چلا رہے ہیں۔ ابھی مَیں پولیس کو اسٹام دے کر آرہا ہوں اور اُن پر ایک ایف آئی آر بھی کٹوا دی ہے کہ میری جائز جگہ کو ناجائز استعمال کر رہے تھے۔ مَیں حیران پر حیران۔ بعد میں خبر ہوئی کہ یہ طریقہ بھی اُسے پولیس نے ہی بتایا تھا کہ پچھلی تاریخوں میں جگہ کے کرائے پر چڑھانے کا اسٹام کروالو۔ خیر اُس کے بعد اِس نے اُس کام سے توبہ کی اور دوائیوں کی ایجنسی کھول لی۔

مقصود چھچھر مرحوم

یہ جب میرا دوست بنا اُس وقت ٹین ایج تھا۔ بصیر پور شہر تو ایک طرف پورے علاقے میں اِس جیسا خوب صورت اور ذہین اور زندہ آنکھوں والا لڑکا مَیں نے آج تک نہیں دیکھا۔ آنکھیں نیلی تھیں، رنگ سرخ و سفید تھا۔ قد نہایت متناسب تھا۔ دراصل جہاں مَیں رہتا تھا، سامنے اِن کا گھر تھا۔ ایک وقت آیا کہ میرے بغیر چند لمحے نہیں رہ سکتا تھا، ہر وقت میرے ساتھ ہی نتھی ہو چکا تھا۔ تمام شہر اِس کے حُسن کا فدائی تھا اور یہ میرا فدائی تھا۔ اُس کی خاص وجہیں تین تھیں۔ ایک تو مَیں خود خوش شکل تھا، اسے یہ احساس شدید تھا۔ مَیں جس کام میں بھی دلچسپی رکھتا تھا، میری اتباع میں ہر وہ کام کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُن دِنوں مَیں کتابیں بہت پڑھ رہا تھا۔ کم و بیش دو دن میں ایک کتاب ختم کر لیتا تھا لیکن اتنی کتابیں خریدنے کی طاقت نہ تھی اور بصیر پور میں کوئی لائبریری بھی نہیں تھی۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے مقصود نے بصیر پور کالج کی لائبیریری سے کتابیں چوری کرنا شروع کر دیں۔ مجھے روز لا کر کوئی نہ کوئی کتاب دے دیتا۔ ایک دن مَیں نے اُسے کہا، مقصود آپ اتنی زحمت نہ کیا کریں۔ کتابوں کی سہی، آخر یہ چوری ہے مگر اُسے جس قدر مجھ سے محبت ہو گئی تھی، وہ اِس کام کو یہ سمجھ رہا تھا گویا میری غذا کا بندوبست کرنا اُس کے ذمّے ہے۔ پھر ایک دن کتاب

چوری کرتا پکڑا گیا۔ پچاس روپے جرمانہ ہوا۔ وہ ہم نے شیلے کا دودھ بیچ کر دیا۔ دوم اسے افسانے، ناول اور شاعری پڑھنے کا بہت شوق ہو گیا تھا اور یہ شوق میرے ساتھ رہنے سے پورا ہوتا تھا۔ کتابیں بہت جلدی پڑھ لیتا تھا۔ ایک بار میرے ساتھ لاہور آیا اور مجلس ترقی ادب کا پورا کلاسیک کتابوں کا سیٹ خرید کر لے گئے۔ میرے ساتھ بیٹھ کے میر اور غالب کے اشعار اس طرح سمجھتا تھا جیسے امتحان دینا ہو۔ سوم اہلِ بیت سے مودت بہت کرنے لگا۔ ہر جگہ مجلس سننے جاتا۔

جب مَیں نے بصیر پور چھوڑا، یہ ہر حالت میں میرے ساتھ اوکاڑہ آنا چاہتا تھا لیکن تب میں دوبارہ مزدوری اور معماری کرنے والا تھا، اسے کہاں کہاں ساتھ لیے پھرتا۔ آخر بی اے کے لیے ایف سی کالج لاہور میں آ گیا اور یہاں سے بی اے کیا۔ وہاں کالج کے ایسے ایسے لوگوں کو چت کیا جو اپنے آپ کو ادب اور شعر کا دیوتا سمجھتے تھے۔ وہ حیران تھے کہ ایک پسماندہ سے شہر کا لڑکا شعر و ادب میں کیسے اتنا تیز نکل آیا ہے۔ بی اے کے بعد پولیس میں سب انسپکٹر بھرتی ہو گیا مگر افسوس ایک ہی سال بعد ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہوا۔ بخدا، یہ بہت بڑا صدمہ تھا جو میرے جی کو لگا۔ سچ تو یہ ہے ایسا دوست زندگی میں دوبارہ مجھے نہیں ملے گا۔

ایک ایسا حادثہ جو قیامت سے کم نہ تھا

1995ء ہی کے دن تھے۔ مَیں بصیر پور ہی میں تھا۔ صبح فیلڈ میں جانے لگا تو اچانک دل میں گھبراہٹ سی پیدا ہوئی۔ مجھے لگا کہ کوئی بڑا صدمہ رونما ہو گیا ہے مگر سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ مَیں نے فیلڈ میں جانے سے پہلے دفتر کے فون سے اپنے گھر فون کیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ گھر میں سب ٹھیک تھا۔ کسی طرح کی کوئی پریشانی یا حادثہ نہیں تھا لیکن جیسے ہی فون بند کرنے لگا، میری بڑی بہن نے بتایا، اکبر چیچہ وطنی سے حاکم علی کی بیوی حاجرہ آئی ہوئی تھی۔ اصغر اُسے موٹر سائیکل پر 9 چک میں چھوڑنے گیا ہے۔ بہن کی یہ بات سنتے ہی یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل پر ایک بڑا زور کا گھونسا مارا ہے حالانکہ وہ اکثر موٹر سائیکل پر پھرتا رہتا تھا اور میرے ذہن میں کبھی کوئی بات نہیں آئی تھی۔ مَیں نے فوراً کہا، تم لوگوں نے اُسے جانے کیوں دیا؟ اُدھر سے میری بہن کے لہجے

میں بھی پریشانی تھی، کہنے لگی، میں نے اُسے دس بار روکا اور امی نے بھی منع کیا لیکن وہ نہیں رُکا اور چلا گیا۔ پھر کہنے لگی کوئی بات نہیں خیر سے واپس آ جائے گا۔

لیکن بہن کی اس خبر سے میرے اندر ایک ڈر بیٹھ گیا۔ بار بار اصغر کی شکل میرے سامنے آنے لگی۔ فیلڈ میں جاتے ہوئے کئی بار رُکا اور کسی ڈھابے پر بیٹھ کے چائے پی۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ کوئی شے میرے اندر سے نکال لی گئی ہے، اور ٹانگوں میں جان نہیں رہی۔ پھر جیسے ہی فیلڈ سے چکر لگا کر اپنی رہائش پر پہنچا میرے کولیگ نے کہا علی اکبر، آپ کے گھر سے فون آیا تھا، آپ کے چھوٹے بھائی علی اصغر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ اُسے لاہور جنرل ہسپتال میں لے گئے ہیں۔ آپ گھر چلے جاؤ یا سیدھا ہسپتال چلے جاؤ۔

یہ اطلاع گویا میں نے توقع کے عین مطابق سنی تھی۔ جسے میرے دل میں کسی نے پہلے ہی الہام کر دیا تھا۔ مَیں اِس خبر کو سن کر ایک دم زمین پر بیٹھ گیا۔ مَیں نے اِسے علی اصغر کا ایکسیڈنٹ نہیں بلکہ موت کی اطلاع سمجھ کر سنا تھا۔ رات کو مَیں گھر پہنچا۔ گھر میں ایک قیامت چل رہی تھی، والدہ، بہن بھائی، سب ماتم اور رونے میں بے سُدھ تھے۔ یہ بیان منظر سے باہر ہے۔ مَیں موٹر سائیکل پر رات کے دو بجے لاہور پہنچا۔

دُنیا ذلیل کتنی ہے

علی اصغر مجھ سے ڈھائی سال چھوٹا تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر انیس سال تھی۔ جنرل ہاسپٹل لے آئے۔ وہ قومے میں چلا گیا۔ بچنے کی اُمید بہت کم تھی، مَیں، میرا والد اور ایک میرا چچا زاد ہاسپٹل میں تھے۔ رات ایک بجے کے قریب ڈاکٹر نے کوئی انجیکشن لکھ کر دیا کہ یہ باہر میڈیکل اسٹور سے لے آؤ۔ مَیں انجیکشن لینے کے لیے جونہی باہر گیٹ سے نکلنے لگا، وہاں دو تین لڑکوں اور ایک لڑکی نے مجھے مارنا شروع کیا اور الزام یہ کہ مَیں نے اُس لڑکی کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ اِسی مار پیٹ کے دَوران میری جیب میں موجود تمام پیسے نکال لیے اور تتر بتر ہو گئے۔ مَیں فوراً بھاگ کر پریشانی میں واپس آیا۔ میرے چچا زاد کی جیب میں کچھ پیسے تھے۔ تب ہم دونوں جلدی سے

روہارو بھاگتے ہوئے میڈیکل سٹور پر آئے اور انجکشن خرید کر واپس ہوئے۔

اُسی رات میرا بھائی فوت ہو گیا۔ میرے لیے یہ صدمہ بہت ناقابلِ برداشت تھا۔ آنکھیں میں مار دینے والا رنج تھا۔ میں اُس کے فوت ہونے کی اطلاع گھر میں دینے کے لیے ایک پرائیویٹ فون بوتھ پر آیا، جہاں ایک آدمی بیٹھا تھا۔ یہ بندہ دیکھنے میں بہت نیک پاک قسم کا لگ رہا تھا۔ اُس وقت ایک منٹ کال کے پیسے دو روپے ہوتے تھے۔ جب مَیں فون پر علی اصغر کے مرنے کی اطلاع اپنی والدہ کو دینے لگا تو میری آواز بھرا گئی اور میں چیخیں مار کر رونے لگا کیونکہ دوسری طرف سے میری والدہ کا ردِعمل نہایت بے حال تھا۔ میرے اِس صدمے کو فون بوتھ کا مالک دیکھ رہا تھا۔ مَیں بمشکل دس سیکنڈ بات نہیں کر سکا اور فون رکھ دیا۔ میری جیب میں سو روپے کا نوٹ تھا اور اُس سے چھوٹی کرنسی میرے پاس نہیں تھی۔ میں نے وہ نوٹ اُس کو دیا اور بقایا لینے کے لیے انتظار کیا۔ اُس نے مجھے کہا کہ پیسے پورے ہو گئے ہیں۔ اِس کال کے سو روپے بنتے ہیں۔

دراصل اُس نے میرے غم کی شدت کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ مَیں اِس حالت میں اُس سے بحث نہیں کر سکوں گا۔ اُس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ مَیں اُس کی دُکان سے باہر نکل آیا۔ واپس ہاسپٹل میں آ گیا۔ علی اصغر کی لاش پولیس رپورٹ مکمل ہونے تک سرد خانے میں رکھ دی گئی تھی۔ صبح جب رپورٹ مکمل کی تو ہم باپ بیٹا اور میرا چچازاد لاش ایمبولینس میں ڈال کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ دو پولیس والے بھی تھے۔ جب ہم پتوکی کے قریب پہنچے (جو لاہور سے بمشکل ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے) تو پولیس والوں نے تقاضا کیا کہ اُنھیں ناشتہ کروایا جائے۔ ایمبولینس والے نے ایک ہوٹل پر ایمبولینس روک دی۔ تب دونوں پولیس والوں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور چائے پی۔ اِس میں اُنھوں نے آرام سے آدھا گھنٹا لگایا۔ اِس دَوران اپنے بوڑھے اور صدمے سے نڈھال باپ کے ساتھ جوان بھائی کی لاش پر بیٹھے ہوئے یہ عرصہ جیسے مجھ پر گزرا اُس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ سپاہیوں کے ناشتہ کرنے کے بعد میرے والد نے اُن کے ناشتے کے پیسے ہوٹل والوں کو ادا کیے، تب ایمبولینس آگے روانہ ہوئی۔ جب ہم اپنے گھر پہنچے تو کیا بتائیں میری والدہ اور بھائی بہنوں کا کیا حال تھا۔

بخُدا مَیں نے اُسی دن سے پاکستانی سماج پر لعنت بھیج دی تھی اور دل میں تہیہ کر لیا تھا کسی ایسے آدمی کی عزت نہیں کروں گا جس کی سوچ اپنی ذات کے مفاد سے آگے ختم ہو جاتی ہو گی۔ کسی ایسے بڑے نام کو بڑا نہ سمجھوں گا جو اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کے مفاد کو روندتا ہوا نکل جائے گا۔ ابھی تک تو اس پر کار بند ہوں آگے کی خُدا جانے۔ اب آپ خود ہی سمجھیں مَیں کیوں اکثر لوگوں کی عزت نہیں کرتا۔

اِس حادثے کے چند دن بعد مَیں نے نیسلے کو خیر باد کہہ دیا اور گھر واپس آ گیا۔ کیونکہ اب میرا وہاں بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔

وہی مزدُوری، وہی روز وشب

نیسلے کمپنی کو چھوڑنے کے بعد کئی دن تک ذات کا خلا دماغی حالت پر بھاری پڑا رہا۔ نہ کچھ کرنے کا دل تھا، نہ کسی سے کہنے کا یارا تھا۔ علی اصغر میرا بھائی شکل صورت کا نہایت خوب صورت، اکثر مجلس اور جلوس میں حصہ لیتا تھا۔ کام کرنے کا اتنا ماہر تھا کہ ہم بھائیوں میں سے ایک بھی اُس کے مقابلے میں نہیں ہے۔ پتھر اور اینٹوں میں سے اکثر اوقات مجسمے نکال لیتا تھا۔ پینٹنگ اور ڈرائنگ میں اُس کا ہاتھ اِس قدر نفیس اور لائن کھینچنے میں اتنا صاف تھا کہ خود مَیں حیران رہ جاتا۔ اکثر جگہ ہم دونوں بھائیوں نے مساجد کی محرابوں میں کام کیا۔ مختلف رنگوں کو ملا کر نئے رنگ بناتے اور اُنھیں ابرق اور سفید سیمنٹ میں ملاپ کر کے ایسے ایسے پھول پتیاں اور بیلیں تیار کرتے تھے کہ کوئی دیکھتا تو داد دیے بغیر نہ رہ پاتا۔ ہمارے گاؤں کے قریب 42 ڈی ایک گاؤں تھا، وہاں ہم دونوں بھائیوں نے ایک مسجد کی محراب میں کام کیا تھا۔ بخُدا اگر کوئی اُسے سمجھ لیتا تو ہمیں سونے میں تول دیتا لیکن بدبختوں نے کچھ سالوں بعد وہ مسجد گرا کر چینی کی ٹائلوں والی مسجد بنا دی جیسے واش روم میں لگائی جاتی ہیں۔ علی اصغر کی قامت اور شکل وصورت اور مزاج کسی طرح بھی نوابین سے کم نہ تھا۔ مہمانداری اُس کے پیچھے ختم تھی۔ ہماری چار بھینسیں گھر میں رہی ہیں۔ اُن کا تمام دودھ آتے جاتے مسافروں اور دوستوں کے لیے دودھ پتی اور لسی بنانے میں خرچ ہوتا تھا۔ اُس

کے دوستوں کی تعداد ہزاروں میں پہنچ گئی تھی۔ ہمارا گھر اُس نے گھر کی بجائے ایک طرح کی سرائے بنا دیا تھا کہ جو آئے رات رہے، مفت کھائے پیے اور چلا جائے۔ اکثر راہ چلتے، پھیری لگانے والے، گداگر اور مسافر رُک جاتے تھے۔ وہ چائے روٹی کے بغیر آگے نہ جاتے تھے۔ اُنھیں معلوم ہو چکا تھا یہاں سب کچھ مفت میسر آ جائے گا۔ مَیں اکثر گھر پر نہیں ہوتا تھا مگر وہ کم ہی گھر سے دُور جاتا تھا۔ یوں سمجھ لیں ہمارے گھر کی روح علی اصغر تھا اور ہم اُس کی ہڈیاں تھے۔ اب جو وہ فوت ہوا تو سرائے ویرانے میں بدل گئی۔ ہزاروں لوگ اُس کے جنازے میں آئے اور اُسے رو رو کر نکلے۔ سچ پوچھیں تو مجھے علی اصغر کا پُرسہ لینے کی ہمت نہ تھی۔

دو تین مہینے اِسی طرح گزر گئے۔ والد صاحب اور والدہ اور دوسرے بہن بھائیوں کا غم بھی سمجھ لیں تو میرے ہی شانوں پر ٹِکا تھا۔ اُس کی موت کے بعد دو چیزیں اتنی تیزی سے رونما ہوئیں جنھیں مَیں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ میری والدہ اور والد ایک دم بوڑھے ہو گئے۔ میرے سر میں سفیدی آنے لگی۔ والدہ کی آنکھیں جواب دینے لگیں۔ والد جنھیں کبھی عینک استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا، ایک دم دونوں کو بڑے نمبروں کی عینکیں لگ گئیں۔ دوستو! کسی نوجوان کے مرنے کا غم کون جان سکتا ہے؟ کاش خُدا جب ایسے صدمے کو وارد کرنے لگے تو عزیز و اقارب کے دل پتّھر بنا دیا کرے۔

بابا جی کے بھوت

قصور کے مضافات میں راجہ جنگ ایک قصبہ ہے۔ اِس چھوٹے سے قصبے میں دُنیا کے ایسے بڑے عجوبے ہیں کہ اللہ بسم اللہ۔ حقے بنانے والے، ٹینک بنانے والے، گوبھی بیچنے والے، ہیروئن بیچنے والے اسی قصبے کے بادشاہ ہیں اور آبادی اِس کی 20 سے 30 ہزار ہوگی۔ قصبے کے سامنے ایک ریلوے سٹیشن ہے۔ سٹیشن پر پیپل کے اونچے اونچے درخت بہار دکھاتے ہیں اور اجڑے دنوں کا نوحہ گاتے ہیں۔ منظر یہاں بہت خوب صورت ہیں۔ سٹیشن کے دوسری طرف ایک مقبرہ نظر آئے گا جس کا گنبدِ گردوں اور بلند مینار صاحبِ مزار کی ولایت اور جلالت کی گواہی دیتے ہیں۔ یہیں کا ایک قصہ سن لیجیے۔

ایک جاننے والے نے کہا: 'بھئی تمھارے لیے ایک کام ڈھونڈا ہے، پیسے مناسب ملیں گے۔ ایک پیر صاحب کا مقبرہ تعمیر کرنا ہے اور ایسا تعمیر کرنا ہے کہ لوگ دیکھتے رہ جائیں اور خود پیر صاحب ششدر ہو کر پہلے بے ہوش ہوں، پھر فوت ہوں۔'

مَیں اُس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے اِسی قصبے میں لے آیا۔ جس جگہ اُس نے مقبرہ بنانے کی غرض سے مجھے لا کر کھڑا کیا یہ جگہ اُن دنوں بالکل خالی تھی اور 30،25 کنال کا کھلا رقبہ تھا۔ ہم ایک احاطے میں داخل ہوئے۔ یہاں دو چار کمرے اور اُن کے آگے تنگ قسم کے دالان در دالان تھے۔ سامنے کھلا صحن، جس کے اردگرد نہایت چھوٹی دیوار تھی کہ باہر دُور تک نظر جاتی۔

ایک دالان میں کالا جانگیہ پہنے، مالائیں اور کڑے اور مختلف پتھروں کی بے شمار انگوٹھیاں اَڑسے ایک نہایت کالا بھجنگ اور ننگ دھڑنگ آدمی بیٹھا تھا۔ دو لوگ چرس کے سگریٹ بھرے جاتے تھے، باقی پیے جاتے تھے۔ بابا جی بھی سوٹے لگائے جاتا تھا اور اُس کے منہ سے دھواں ایسے بہتا تھا جیسے چمنی سے کالے بادل نکل رہے ہوں۔

اِردگرد لوگوں کا ایک ہجوم بیٹھا تھا۔ سب بااَدب اور با ملاحظہ۔ کچھ چہروں مُہروں سے امیر کبیر نظر آئے، کچھ اُسی بابا جی کی طرح موالی تھے اور چرس میں ہم نوائی کر رہے تھے۔ دھواں تھا کہ بھٹہ چمنیوں کے برابر۔ مجھے ایک دم اُبکائی سی آ گئی۔ بڑی مشکل سے دِل کو سنبھالا دیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ بابا جی کے سامنے جلتے بجھتے کوئلوں کا ڈھیر لگا تھا اور مورے داتا پیا کی قوالی چلی جاتی تھی۔ میں ایک طرف تعظیم سے کھڑا ہو گیا۔ میرا دوست ادب سے آگے بڑھا اور بابا جی کے کان میں کہا: 'حضور راج مستری حاضر آ گیا ہے۔'

بابا جی نے ایک نظر مجھے دیکھا، پھر میرے دوست کی طرف، پھر مجھے دیکھا اور پاؤں سے سر تک ایسی نظر سے ٹکٹکی باندھی کہ مجھ پر دُلہن کی سی سُرخی چھا گئی۔ آخر چرس کے طویل دُھویں کی سیاہ دیوار کے سائے تلے سوچ بے چار کے بعد بابا جی فرمانے لگے: 'یہ لڑکا کام کر لے گا؟ بھئی کہاں سے سکول سے اُٹھا لائے ہو؟'

میرے دوست نے کہا: 'بابا جی اِسے چھوکرا نہ سمجھیں۔ بڑے گن ہیں اِس لونڈے میں۔'

اب بابا جی اُٹھے، ان کے اُٹھتے ہی تمام مجمع بھی اُٹھا۔ بابا جی سرکار نے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھا اور ایک طرف کو لے کر چل دیے۔ وہ دوست بھی ساتھ تھا۔ صحن کے درمیان آ کر رُک گئے جہاں گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کا فرش بچھا تھا۔ کہنے لگے: 'یہ جگہ دیکھ رہے ہو؟ یہاں مجھے مدینے والی بڑی سرکار کا دیدار ہوا ہے اور یہیں اس جگہ ایک قبر دکھائی ہے۔ اب یہاں اِس مقام پر مزار بنانا ہے۔ جس پر ایک بڑا عالیشان گنبد ہو اور اُس کے اردگرد چار مینار ہوں۔'

مَیں نے نظر کی تو جگہ بالکل خالی تھی، کسی قبر کا نشان نہ تھا۔ عرض کیا: 'بابا جی یہاں تو کوئی قبر نظر نہیں آ رہی جس پر مزار کی تعمیر کرنی ہے' بولے: 'بیٹا، یہاں میری ہی قبر بنانی ہے۔ آپ قبر بنا کر اُس کے اُوپر مقبرہ تعمیر کر دو۔ جب مروں گا تو یہیں دفن ہوں گا۔'

میں نے کہا: 'بابا جی مرنے والا خیر کا کام آپ پہلے کر لیتے تو کیا اچھا نہیں تھا؟'

بولے: 'زیادہ سیانے نہ بنو، اِس میں ہماری اپنی مرضی ہے، تم اپنا کام کرو، اگر کر سکتے ہو تو۔ مَیں مقبرہ دیکھ کر مروں گا۔ جب میری مرضی کا بنے گا تب ہی فرشتے کو آنے دوں گا۔ اگر پہلے مر گیا تو مقبرہ ایک طرف کسی نے قبر تک پکی نہیں کرنی۔'

میں نے کہا: 'بابا جی ایک چھوڑ آپ پورے خانوادے کے مقبرے کہو تو بنا دوں گا اور جلد از جلد بناؤں گا تاکہ آپ کو دیر نہ لگے۔'

نہیں پہلے میرا بناؤ اور صرف میرا ہی بناؤ۔ بابا جی چرس سرکار نے جلالت سے کہا۔

قصہ مختصر کام شروع ہو گیا۔ مَیں نے اپنے چھوٹے بھائی علی اشرف کو بلا لیا جو اُن دنوں سکول سے نیا نیا بھاگا تھا لیکن پیدائشی آرٹسٹ واقع ہوا ہے۔ ہم دونوں بھائیوں نے کام شروع کر دیا۔ بابا جی کو ہمارا کام پسند آنے لگا، قبر تیار ہو گئی، مقبرہ شروع ہو گیا، ستون اور ڈاٹوں کا کام مکمل ہوا، گنبد تعمیر ہوا، مینار بنے، آٹھ نو ماہ گزر گئے۔ نہ ہماری اُجرت میں تعطل آیا نہ کام میں۔

ادھر بابا جی کا حال سنیے، اِن آٹھ مہینوں میں ہم نے اُنھیں ایک ہی جانگیے میں دیکھا، اُسے اُنھوں نے روح کی طرح جان سے لگا رکھا تھا۔ نہانے کو عیب سمجھتے تھے۔ عبادت کے نام پر صرف قوالی سنتے تھے۔ چرس کو تجلیاتِ الٰہی سے تقرب کا ذریعہ جانتے تھے، پاؤں میں کھڑاؤں کی ٹھک

ٹھک چلتی۔ ملنگنیوں کا رقص اور کھسروں کے مجرے مجاہدۂ نفس کے کام آتے تھے۔ البتہ روٹی روزانہ بھوت کے گوشت کی یخنی اور شوربے سے کھاتے تھے۔ یہ بھوت کہاں سے لیتے تھے۔ یہی بتانے کی اصل بات ہے۔

ہوا یہ کہ ایک دن شام کا دھندلکا سا تھا۔ بابا فتح سرکار بمع مریدین چرس کے شغل کے ساتھ ساتھ قوالی سننے کی عبادت فرما رہے تھے۔ ہلکی ہلکی دُھند اور پالے کا موسم تھا۔ اِتنے میں سڑک سے دو بکرے گزرے۔ مالک ساتھ نہیں تھا، اُنھیں دیکھتے ہی بابا جی کی آنکھیں سُرخ ہوئیں اور ایک ہی دم اللہ ہو کا نعرہ مارا اور کہا: 'جلدی سے یہ دونوں بکرے پکڑ لو۔ اصل میں یہ بھوت ہیں اور بکروں کا روپ دھار کر پھرتے ہیں۔'

چار مرید حکم سنتے ہی میدان میں کودے اور گردنیں دبوچ کر بکرے بابا جی کے سامنے لا کھڑے کیے۔ بابا جی نے حکم دیا: 'اِن کے کان تم نے اُس وقت تک نہیں چھوڑنے جب تک گلے پر چھری نہ پھیر لو ورنہ دوبارہ بھوت بن جائیں گے۔ فوراً برآمدے میں پردہ کر کے اِنہیں ذبح کر دو۔' لو جی چند لمحے میں مریدوں نے دونوں بھوت ذبح کر دیے۔ بھوتوں کے پتالوؤں، رانوں اور گردنوں کا گوشت بابا جی کے لیے فریز کر دیا گیا، باقی چاولوں کی دیگوں میں چلا گیا۔

اُس کے بعد ہر آٹھویں دسویں روز کسی نہ کسی بھوت کی نشاندہی ہو جاتی تھی جو بھیڑ، بکرے، کٹے کے بھیس میں کہیں نہ کہیں پھر رہا ہوتا یا کسی گھر کے کھونٹے سے بندھا ہوتا تھا۔ اب بابا جی نے انسانوں کو بھوتوں سے مکمل نجات دلانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اپنی الہامی طاقت سے اُن کا سُراغ لگانے لگے کہ کہاں کہاں یہ خبیث چھپے بیٹھے ہیں۔ مرید شک کا اظہار کرتے کہ بابا جی لگتا ہے فلاں گھر میں بھی ایک دو بھوت بندھے ہیں جو بکروں کی شکل میں ہیں اور بابا جی کی کشفی نگاہیں اُسے بھانپ لیتیں۔ بھوت کا مالک اگر اُسے بھوت ماننے سے انکار کرتا تو سیکڑوں مریدوں کی ڈنڈا دلیلیں اُسے قائل کر ہی لیتیں۔

راجہ جنگ کا تھانیدار خود بھی بابا فتح سرکار کے معتقدوں میں سے تھا۔ اس کے منہ کو بھی بھوت کا خون لگ گیا۔ اِس کے علاوہ پبلک کی حفاظت کا بھی مسئلہ درپیش تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے

ہیں راجہ جنگ سے بھوتوں کا صفایا ہونے لگا۔ جب کافی صفائی کے بعد بھوتوں کی کمی ہو گئی یا انسانوں نے اُنھیں چھپانا شروع کر دیا یا بیچ باچ کر علاقے سے باہر کر دیا تو بابا جی مضطرب نظر آنے لگے۔

اُن کو اتنے اضطراب میں دیکھ کر ایک دن میری عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ ہو نہ ہو کہیں مَیں بھی اپنے بھائی کے ساتھ بھوت قرار نہ دے دیا جاؤں۔ آخر بابا جی زیادہ جانتے ہیں کہ انسان کون ہیں اور بھوت کون ہیں، چنانچہ ایک رات اچانک اپنے ہفتے بھر کی مزدوری چھوڑی اور اوکاڑہ نکل لیے۔

اِس واقعے کو ایک سال گزر گیا۔ ایک دن مجھے اُسی آدمی کا فون آیا۔ بولا ناطق صاحب کیا آپ راجہ جنگ آ سکتے ہیں؟ ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ مَیں نے پوچھا اللہ خیر کرے کیا ہوا؟ کہنے لگا بابا جی سرکار فوت ہو گئے ہیں۔ ہم نے اُنھیں مقبرے میں دفن کر دیا ہے مگر قبر کا تعویذ ابھی تیار نہیں کیا۔ ہم چاہتے ہیں وہ تعویذ آپ ہی تیار کریں کیونکہ مقبرہ بھی آپ کے ہاتھ سے بنا ہے۔ مَیں نے کہا کیوں نہیں بھائی ضرور تیار کر دیتا ہوں مگر بابا جی اچانک کیسے فوت ہو گئے۔ ابھی تو ٹھیک اور صحت مند تھے۔ وہ نہایت تاسف سے بولا، ہوا یہ کہ دو دن پہلے یہاں ایک گھر میں بابا جی نے چھ سات بھوتوں کی نشاندہی کی تھی۔ ہم پکڑنے گئے تو گھر والے نے ضد کی کہ نہیں یہ بھوت نہیں میرے بکرے ہیں اور قربانی میں بیچنے کے لیے رکھے ہیں۔ ہم نے اُسے سمجھایا، میاں بابا جی کی نگاہیں عرش سے پرے دیکھ لیتی ہیں، وہ کیسے غلط ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم وہ بھوت جو بکروں کی شکل میں تھے زبردستی لے آئے۔ اِس بات پر وہ جاہل آدمی بھڑک اٹھا اور رات اُس نے آ کر بابا جی سرکار کو قتل کر دیا۔ اب وہ تو تھانے میں ہے اور بابا جی قبر میں ہیں لیکن ہمیں فکر یہ ہے کہ بھوتوں کا سراغ لگانے والا نہیں رہا، پتا نہیں راجہ جنگ قصبے کا کیا بنے گا؟

خیر مَیں نے جا کر بابا جی بھوت سرکار کی قبر کا تعویذ تیار کر دیا۔

آج کل راجہ جنگ میں اُس بھوت خور سرکار کا مقبرہ مرجع خلائق ہے۔ کبھی موقع ملے تو آپ بھی زیارت کو جایئے گا۔

خرگوش کا گوشت بی اے کا امتحان

یہ 1997ء کا زمانہ تھا، والد صاحب کسووال کے ایک اور گاؤں 17 چک میں مسجد بناتے تھے۔ مَیں بھی اُن کے ساتھ کام کرنے لگا۔ یہ گاؤں جہلم اور راولپنڈی کے راجاؤں کا تھا۔ تمام گاؤں اہلِ سنت کا تھا، لوگ بہت اچھے تھے۔ گاؤں کے بہت سے لڑکے میرے دوست بن چکے تھے۔ وہ عصر کے بعد چیچہ وطنی میں ایک پروفیسر کے پاس ٹیوشن پڑھتے تھے۔ اُنہی میں سے ایک لڑکا عبدالمجید راجہ تھا، مجھ سے چھ سات سال چھوٹا تھا۔ یہ بھی دوست بن گیا۔ اِس کے پاس ایک سائیکل تھی۔ اس نے مجھ سے طے کرلیا کہ اگر مسجد میں کام کے بعد مَیں بھی بی اے کی انگلش کی ٹیوشن پڑھنا چاہوں تو وہ بھی اپنا ٹیوشن ٹائم بدل کر رات سات بجے کا رکھوا لے گا۔ مَیں نے سوچا چلو مَیں بھی بی اے کا امتحان دے ڈالوں چنانچہ مَیں نے بھی چیچہ وطنی میں بی اے انگلش کی ٹیوشن رکھ لی۔ مَیں شام تک مسجد میں والد صاحب کے ساتھ کام کرتا۔ شام کے بعد ہم دونوں یعنی مجید اور مَیں سائیکل پر کسووال اڈّے پر آتے، وہاں سے بس پر بیٹھ کر چیچہ وطنی آتے۔ سات بجے سے ساڑھے آٹھ بجے رات تک انگریزی پڑھتے اور ساڑھے نو بجے واپس پہنچ جاتے۔ اِسی طرح یہ معمول تین مہینے چلا۔

ایک دن دوپہر کے وقت جب ہم نے کھانے کے وقفے کے دَوران چھٹی کی تو ایک بڑی سی ٹرے میں ایک آدمی کھانا لے کر آیا۔ راجہ وریام خاں کے گھر سے کھانا آیا تھا۔ ہمارے ساتھ دو تین مزدُور بھی کام کرتے تھے۔ وہ اپنا کھانا اپنے گھر جا کر کھاتے تھے جبکہ ہمارا کھانا وہیں مسجد کے حجرے میں آ جاتا تھا۔ ایک مزدُور وہیں رُک گیا، کہنے لگا آج تو مستری صاحب مَیں بھی آپ کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گا۔ والد صاحب نے کہا، کیوں کوئی خاص بات ہے آج کے کھانے میں؟ وہ بولا آج تو آپ کے کھانے میں خرگوش کا گوشت آیا ہے۔ مجھے ایک عرصہ ہو گیا خرگوش کھائے ہوئے۔ ہم دونوں بھونچکے سے ہو گئے۔ جیسے ہی کھانے سے کپڑا ہٹایا، وہی بات ہوئی۔ یہ گوشت عجیب سا سفید سفید نظر آ رہا تھا لیکن ایک دو بار پہلے بھی اِسی طرح کا گوشت آیا تھا جسے کھانے کے بعد مجھے عجیب سی الجھن ہوئی تھی اور والد صاحب نے بھی ایک دن قے کی تھی۔

اب میرا شک یقین میں بدل گیا۔ ہر گھر نے یہاں خرگوش رکھے ہوئے تھے، اور یہ اِن کی مرغوب غذا تھی۔ یعنی یہ ہمیں خرگوش کھلا رہے تھے۔ دل اتنا خراب ہوا کہ کچھ نہ پوچھیں۔ ہمارے ہاں تکیل کے بغیر مچھلی اور خرگوش حرام سمجھا جاتا تھا۔ اب جو چیز انسان حرام سمجھ لے اُسے کھانے میں نہایت دقت پیش آتی ہے بلکہ معدہ قبول ہی نہیں کرتا۔ اب والد صاحب نے اُس مزدُور سے کہا، اپنے باقی ساتھیوں کو بھی بلالو اور یہ کھانا تم ہی کھاؤ۔ تب سے ہم نے سختی سے منع کر دیا کہ ہمیں گوشت نہیں چاہیے صرف سبزی اور دال ساگ چلے گا۔ اتنے میں ہم کسووال سے مسجد کا کام ختم کر کے گھر آ چکے تھے۔ پھر اپنے گاؤں کے پاس ہی 44 چک کی مسجد بنانے آ گئے۔

مسجد کا مولوی اور مرزا رفیع سودا

1997ء ہی کا زمانہ تھا۔ میں مسجد کا مینار بنا رہا تھا۔ وہاں ایک مولوی قسم کا پی ٹی سی سکول ٹیچر روز مجھ پر اپنی علمی دھاک بٹھانے آتا اور عجیب وغریب جہالت زدہ سوالات سے دق کرتا۔ وہ سکول ٹیچر اُس مسجد کا مولوی بھی تھا، اِس لیے سوال علم کی بجائے تبلیغ مذہب سے متعلق ہوتے یعنی سکول ٹیچر کم اور نیم مُلا زیادہ تھا۔ فرماتا 'مسجد میں کام کرتے ہو اور نماز نہیں پڑھتے، اللہ کے گھر سے پیسے کماتے ہو مگر اللہ کی بندگی سے گھبراتے ہو۔'

مجھے نماز پڑھنے سے عار نہیں تھی اور انفرادی طور پر پڑھتا بھی تھا مگر اس کے پیچھے نہیں پڑھ سکتا تھا کیونکہ اس کی تمام عادات سے بخوبی واقف تھا۔ میرا معمول تھا کام کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی کتاب ضرور پاس رکھتا۔ ذرا تھوڑی سی فرصت دم لینے کو یا دوپہر کے کھانے کے وقت ملتی تو کتاب پر نظر مار لیتا۔

اُن دِنوں میرے زیرِ مطالعہ محمد رفیع سودا کی کلیات تھی اور وہ سکول ٹیچر یا مولوی صاحب (آپ اسے جو مرضی سمجھ لیں) ہر قسم کی شاعری کو شرک خیال کرتا تھا اور مجھ سے مسجد کا کام کرانا گناہِ کبیرہ سمجھتا مگر کام سے روک اِس لیے نہ سکتا تھا کہ باقی گاؤں والے میرے کام کو بہت پسند کرتے تھے۔

ایک دن اُس سکول ٹیچر پر مجھے اس کی کسی جہالت کے سبب بہت غصہ آ گیا۔ میں نے کہا، 'یہ

کتاب سامنے پڑی ہے، کہیں سے بھی کھول کر ایک غزل یا قصیدہ پڑھ کے سنا دو؟ ایک ہفتے کی مزدوری کے پیسے آپ کو دوں گا۔ اگر نہ سنا سکو تو اتنے ہی پیسے مجھے دے دینا۔ وہاں جتنے لوگ موجود کھڑے تھے سب نے اِس بات پر صاد کیا اور شرط بندھ گئی۔ اُس نے کتاب کھول کر پڑھنے کی کوشش کی مگر نہ پڑھ سکا۔ ایک تو خطِ نسخ میں تھا، دوم مرزا سودا کی تراکیب اور فارسی مزاج لفظیات نے سکول ٹیچر کی بولتی ٹھپ کر دی اور بصد کوشش کے باوجود وہ مرزا سودا کا لامیہ قصیدہ نہ پڑھ سکا اور شرط ہار گیا۔ تب فی یوم کی مزدوری سو روپے ہوتی تھی، مَیں سات سو روپے کی شرط جیت گیا اور جو کچھ لوگ حاضرین میں سے وہاں کھڑے تھے اُنھوں نے اُسی وقت مجھے وہ پیسے دلوا دیے۔

اب مسئلہ پیدا ہو گیا کہ اتنے سارے پیسوں کا کیا کروں؟ گھر میں آ کر والد صاحب کو خبر دی۔ اُنھوں نے مشورہ دیا کہ اِن پیسوں سے فوراً بی اے کا داخلہ بھیج دو۔

مَیں نے مختلف یونیورسٹیوں سے امتحانی داخلے کی تاریخوں کا پتا چلایا تو خبر لگی کہ فی الحال زکریا یونیورسٹی کی طرف سے داخلہ وصول کیا جا رہا ہے اور دو ماہ بعد امتحان ہو گا۔ تب داخلہ فیس 500 سو روپے کے لگ بھگ تھی۔ اُس وقت تک بی اے پاس کی کچھ قدر باقی تھی۔ خاص کر زکریا یونیورسٹی اُن دِنوں اچھی یونیورسٹی گنی جاتی تھی۔ اب مَیں نے زکریا یونیورسٹی سے بی اے کا پرائیویٹ داخلہ بھیج کر دیگر مضامین کو بھی کچھ وقت دینا شروع کر دیا مگر یہ سمجھیں کہ مَیں اُنھیں سرسری ہی پڑھتا تھا۔ سارا زور انگریزی پر تھا۔

ملنے آؤ اور پیسے لے جاؤ

یہ بھی اِسی گاؤں کا قصہ ہے۔ مَیں اور میرے والد صاحب کام کر رہے تھے کہ اچانک ہمارے سارے مزدور غائب ہو گئے۔ بہت آوازیں دیں مگر کوئی مزدور نظر نہیں آ رہا تھا نہ آواز کا جواب دے رہا تھا۔ ہم حیران کہ کدھر گئے ہیں۔ ہم مسجد کی چھت پر تھے، والد صاحب نے مجھے کہا، ذرا نیچے جا کر پتا چلاؤ، سب کہاں مر گئے ہیں۔ جب مَیں نے نیچے اُتر کر دیکھا تو وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ مسجد کے دروازے سے باہر نکل کر نظر ماری تو کچھ لوگ تیز رفتاری سے ایک گلی میں جا

رہے تھے۔ مَیں نے سمجھا کوئی فوت ہو گیا ہے یا پھر کچھ گڑبڑ ہے۔ مَیں جلدی سے واپس مسجد کی چھت پر آیا اور والد صاحب کو بتایا کہ یہ معاملہ ہے؟ کوئی اہم آدمی فوت ہو گیا ہے۔ ہم بھی کام بند کر کے نیچے چلتے ہیں اور آج کام سے چھٹی کرتے ہیں۔ اوزار سمیٹ کر اور کام وغیرہ لپیٹ کر جیسے ہی ہم سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے تو سامنے سے مزدُور آ رہے تھے۔ اب ہم نے اُن سے پوچھا بھئی کیا قصہ ہے، سب ایک دم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ایک مزدُور نے کہا، راج صاحب یہ دیکھیے پندرہ سو روپیا۔ یہ پورے تین ہفتوں کی مزدُوری مفت میں مل گئی ہے اور ہم سب کو پندرہ پندرہ سو روپے ملے ہیں۔ آپ بھی جلدی سے دونوں باپ بیٹا حاجی نذر صاحب کو سلام کر آؤ۔ ابھی وہ پیسے تقسیم کر رہے ہیں۔ تمھیں وہ تین تین ہزار دے گا۔ جلدی چلے جائیں۔ اِس کے ساتھ ہی سب نے اپنے سو سو کے نئے نکور نوٹ دکھائے۔

والد صاحب اُن کی بات سے ایک دم بھڑک اُٹھے اور بولے، کیوں حاجی نذر صاحب اپنی ماں بیچ کے آیا ہے جو یوں پیسے تقسیم کر رہا ہے؟ کس بات کے پیسے دے گا؟ کیا ہم گداگر ہیں کہ اُسے سلام کرنے جائیں پھر وہ ہمیں پیسے دے۔ چلو آؤ اوپر کام شروع کرو۔

شمے خاں مزدُور کہنے لگا، ایسی بات نہیں راج صاحب، آپ تو غصہ ہی کر گئے ہیں۔ حاجی نذر صاحب ہر سال سعودیہ سے اِسی طرح رمضان کے آخر میں آتے ہیں اور جو بھی اُن سے ملنے جاتا ہے اُس کو اُس کی حیثیت کے مطابق پیسے ضرور دیتے ہیں۔

لیکن والد صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اصل میں اُنھیں مزدُوروں کے پیسے لینے کی ہرگز پروا نہیں تھی لیکن جب اُنھوں نے ایک دو بار ہمیں بھی وہاں سے جا کر پیسے لینے کے لیے اصرار کیا تو یہ بات والد صاحب نے اپنی توہین سمجھی۔

دوسری طرف مَیں تھا، اوّل تو مجھے اِس پورے معاملے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی، دوم یہ کہ آخر والد صاحب نے پیسے نہیں لینے تو نہ لیں، مزدُوروں کو اور حاجی نذر کو تو گالی نہ دیں۔ وہ تو بے چارا آخر غریبوں کی اور گاؤں والوں کی خدمت ہی کر رہا ہے۔ جب مَیں نے اپنی بات کا اظہار والد صاحب سے کیا تو وہ کہنے لگے، تُو بڑا شاعر بنا پھرتا ہے۔ تجھے سمجھ نہیں آ رہی؟ یہ آدمی سعودی

عرب سے زکوٰۃ اکٹھی کر کے لاتا ہے اور عید کے قریب سارے گاؤں والوں کو زکوٰۃ تقسیم کرتا ہے لیکن حرامی اِن غریبوں کو بتاتا نہیں کہ زکوٰۃ دے رہا ہوں۔ یہ بے چارے سمجھتے ہیں کہ وہ انھیں ہدیہ اور نذرانہ دیتا ہے، یہ نہیں پتا یہ سب زکوٰۃ اور صدقہ کھا رہے ہیں۔

والد صاحب کی بات سن کر ایک دم مجھے جھٹکا سا لگا، یعنی اُن کی زیرکی نے حاجی نذر کی کیمسٹری فوراً سمجھ لی لیکن میری سمجھ میں بات نہیں آئی تھی۔

ساہیوال کالج کا واقعہ

امتحان سر پر آ گئے تھے یعنی ڈیڑھ مہینا رہ گیا تھا۔ اب مجھے سلیبس کی کتابوں کو پڑھنا تھا کیونکہ آٹھ گھنٹے مزدُوری کرنے کے بعد ناول، شاعری اور تاریخ یعنی اپنی دلچسپی کی کتابیں تو پڑھی جا سکتی تھیں، سلیبس ہرگز نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ لہٰذا مزدُوری کو فی الحال بند کیا۔ اُن دِنوں مزدُوری چھوڑنے کا مطلب یہی تھا کہ اب کھانا پینا بھی چھوڑ دو اور یہ صرف میری نہیں ہر مزدُور کی مجبوری ہے کیونکہ کسی مزدُور کا ہفتہ بھر کام نہ کرنا خودکشی کے برابر ہے۔ البتہ میرے والد صاحب کے سبب مجھے اپنے بھائی بہنوں سمیت کھانا تو مل ہی جاتا تھا لیکن امتحانات کے اخراجات کی عیاشیاں یعنی آنے جانے کا روزانہ کا کرایہ اور ہوٹلوں سے کھانا کھانے کے معاملات پر عمل کرنا تو ایک طرف، سوچنا ہی معیوب تھا۔

اِدھر مجھے اوکاڑہ کے گاؤں 32 ٹو ایل سے جا کر وہاں پیپر دینے تھے۔ پیسا روپیا نامی چیز میری جیب میں کچھ نہیں تھا، فقط پچاس روپے کہیں سے اینٹھے تھے۔ میں نے سوچا اب روز یہاں سے گھر جانا پھر وہاں سے صبح آٹھ بجے کالج پہنچ کر پیپر دینا ناممکن ہے۔ اُس پر ستم یہ کہ کرایہ بھی جیب میں نہیں، تو کیوں نہ رات کالج میں ہی رُک جایا کروں۔ ساہیوال میں کوئی دوست تو الگ رہا، شناسا تک نہ تھا۔ پیپر دینے کے بعد مَیں نے یہ کیا کہ کالج کے گراؤنڈوں میں پھرتا رہا اور اگلے دن کے پیپر کی تیاری کرتا رہا۔

یہ کالج بہت بڑا، نہایت خوب صورت ہے۔ اِس میں جا بجا جامنوں، امرودوں، لوکاٹوں اور آموں کے پیڑ بھی تھے۔ جامن کے درخت سب سے زیادہ تھے اور بہت بلند و بالا اور وہ موسم بھی

جامنوں کے پھل کا تھا۔ جامن بہت پکے ہوئے اور سیاہ فام قسم کے رسیلے بہت موٹے تازے تھے۔ اس نسل کو ہم پنجابی میں راجامن کہتے تھے۔ میں نے کافی سارے راجامن کھائے، پھر پانی پیا اور پیٹ بھر لیا۔ جیب میں موجود 50 روپے فی الحال میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اِس کالج کے ایک پہلو میں ننگل انبیا ہائی سکول بھی ہے۔ وہاں بہت خوب صورت گراؤنڈ، درخت اور پھولوں کے باغیچے تھے۔ کچھ دیر اُن باغیچوں میں سیر کا لطف اٹھایا۔ باغیچوں میں انار کے بہت پودے تھے۔ انار ابھی کچے تھے لیکن مَیں نے اُن کی نوخیزی کے ساتھ بھی کچھ رعایت نہ کی اور کچے انار ہی کھا کھا کر جامنوں کی مٹھاس کو کھٹاس میں بدلا اور واپس کالج چلا آیا۔

پھر شام ہوئی اور پھر رات۔ پرندوں سے لے کر انسانوں تک سب اپنے گھر، گھونسلوں میں جا دُبکے تھے۔ مَیں نے رات کو سونے کا مسئلہ یوں حل کیا کہ اکیڈیمک بلاک کے پچھواڑے کے برآمدوں میں چوڑے چوڑے ڈیسک پڑے تھے، وہیں سر کے نیچے کتابیں رکھیں اور پڑ رہا۔ پنکھا ونکھا وہاں نہیں تھا اور مچھر ایسا کہ اللہ کی پناہ۔ ہر مچھر پاؤ بھر کا تھا اور ڈنک ایسے مارتا کہ بچھو بے چارے کی کیا اوقات؟ یہ مچھر لاہور یا گوجرانوالہ میں ہوتا تو اِس کی سب اکڑ نکل جاتی۔ بٹیروں کی جگہ روسٹ کیا جاتا۔ مَیں جیسے تیسے وہیں لیٹ رہا اور صبح کی اُمید پر آنکھیں موند لیں لیکن نیند کی پریاں مچھروں کے ڈر سے لوری دینے نہ آئیں۔ یہاں کوئی آدم نہ آدم زاد۔ ہوا دم سادھے چُپ تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ اُسی برآمدے کے ایک کونے میں ایک نئی نکور سائیکل پڑی ہے۔ حیران ہوا کہ اِس ویران خاموشی میں اکیلی سائیکل رکھ جانا کسی باولے کا کام ہے۔

قریب جا کر دیکھا تو اُس کو تالا بھی نہ لگا تھا اور اُسی ماڈل کی تھی جس کا تصور پطرس بخاری کرتا مر گیا مگر اُسے میسّر نہ آسکی۔ سوچا کسی گدھے قسم کے چوکیدار کی ہوگی، ابھی لے جائے گا مگر وہ ساری رات وہیں پڑی رہی۔ پھر رات کے پچھلے پہر نیند آ ہی گئی۔ اللہ جانے کس وقت اذانیں ہوئیں، کس وقت لوگوں نے فجر کی نمازیں ادا کیں۔ مجھے تو کچھ خبر نہ ہوئی۔ جب اُٹھا تو سورج کی روشنی برآمدے میں کھڑی نہاتی تھی۔ مَیں بھی اُٹھا، دیکھا تو سائیکل وہیں کھڑی تھی۔ خیر مجھے کیا، اُسے نظر انداز کر کے باغیچے کے نل سے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اُڑائے، اپنے منہ اور سر پر چھڑکاؤ

کیا، تب ہوا کے نرم جھونکوں میں مکرر جامن کھائے، پانی پیا اور اگلا پیپر دینے نکل گیا۔ دوپہر کو پھر جامن کھائے مگر بھوک نہ مٹتی تھی اور روٹی کی طلب شدید ہونے لگی اور جامنوں سے دل اوبنے لگا مگر مصیبت یہ تھی کہ یہ پچاس گنوا دیتا تو کرایہ کہاں سے لیتا۔ دوبارہ نکل انبیا سکول میں داخل ہوا، اناروں کی شامت لایا۔

وہاں کچھ کچی اور گدرائی ہوئی آلو بخارہ قسم کی لیچیاں بھی مل گئیں۔ کچے آم بھی تھے۔ وہ کھانے میں دل بہلایا اور واپس کالج کے میدانوں میں آیا۔ کچھ گراؤنڈوں میں لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے، کچھ میں باسکٹ بال اور کچھ میں بیڈمنٹن چل رہی تھی۔ مَیں اپنی کتاب پڑھتا ہوا کبھی ایک طرف کے کھیل کا مزا لیتا کبھی دوسرے کا۔ یوں دل سے روٹی کی بھوک کا خیال جاتا رہا۔ اِسی حالت میں یہ شام بھی ہوگئی۔ اب جو اپنے برآمدے میں آرام فرمانے گیا تو سائیکل وہیں تھی۔ مَیں نے ایک نظر آگے بڑھ کر اُسے دیکھا تو پتا چلا کہ وہاں سے اُسے کسی نے ہلایا تک نہیں تھا۔ مَیں نے سوچا، کوئی رکھ کے بھول گیا ہے، چلو جس کی ہوگی آن کر لے جائے گا۔

وہ رات بھی پچھلی رات کی طرح انتہائی اضطراب میں کاٹی اور اگلے دن صبح ہوتے جیسے ہی گراؤنڈ میں پہنچا جامن میرے سامنے پڑے منہ چڑا رہے تھے مگر جی اُن کے کھانے کو نہ چاہتا تھا پھر آپ ہی بتایئے کیا کرتا؟ بھوک سے جسم میں تاب نہ رہی۔ فوراً کالج چوک کے پہلو میں فرید ٹاؤن گیا۔ اُس کی نکڑ پر ایک ہوٹل تھا وہاں سے 20 روپے کا ناشتہ کیا اور واپس آ کر کچھ جامنوں سے پیٹ بھرا اور مکرر پیپر میں آ بیٹھا۔ جب واپس اُسی برآمدے میں گیا تو سائیکل وہیں تھی۔ ایک دفعہ جی للچایا کہ بے وارثی سائیکل کو نکالوں اور مکمل خرچہ بناؤں مگر یہ بس ایک خیال ہی تھا، عمل ہم سے ہو نہیں سکتا تھا اور نہ کیا۔ مگر حیرت تھی کہ سائیکل یہاں کون گدھا چھینک گیا تھا۔

تیسرے دن تو ہمارے ہوش وحواس کی تمام گنگا خشک ہوگئی۔ صبح اُٹھ کے نہ سائیکل کی طرف دھیان دیا نہ دوسری کوئی بات سوجھی۔ آنکھوں میں اندھیرا ناچنے لگا تھا۔ جامن کھا کھا کے معدہ پتھر ہو چکا تھا اور جامنوں سے ایسی نفرت ہوئی کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو آرا پکڑ کر تمام جامن جڑوں سے کاٹ پھینکتا۔ دماغ تھا کہ سب ماؤف ہو چکا تھا۔ اِدھر پیپر دور رہتے تھے لیکن وہ

اس عالم میں ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ سوچا آج چل کر جو تیس روپے بچے ہیں پہلے اُن کا کھانا کھاتا ہوں پھر پیپر دوں گا اور اُس کے بعد جو ہوگی باقی دیکھا جائے گا۔ زندہ رہا تو اگلا پیپر بھی ہو ہی جائے گا اور گھر بھی پہنچ جاؤں گا۔ تیس روپے میں کیا آنا تھا۔ میں نے ایک دال اور دو روٹیوں کا آرڈر دیا، جس کے اتنے ہی پیسے بنتے تھے مگر بیرا گوشت روٹی لے آیا۔

مَیں نے ایک آنکھ ویٹر کو دیکھا اور بولا 'بھائی، بھوک سے سر میرا گھوما ہوا ہے اور پاگلوں سی حرکتیں تم کر رہے ہو۔ تجھے دال کہا اور تُو بکرے کا گوشت لے آیا ہے؟

اُس نے کہا، 'آپ کھا لیجیے پیسے ہو چکے ہیں۔' میں نے کہا، 'کس نے دیے پیسے...'

اُس نے کونے میں بیٹھے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ دیکھا تو بالکل انجان آدمی تھا۔ نہ دوست، نہ واقف کار۔ مَیں اُٹھ کر اُس کے پاس گیا اور کہا 'اے بھائی جو کچھ آپ سمجھے بیٹھے ہوئیں ویسا لڑکا نہیں ہوں، آپ کو مجھے کھانا کھلانے سے کچھ نہیں ملے گا۔

وہ بولا 'لڑکے، تم میرے بیٹے کی طرح ہو، بے فکر ہو کر کھانا کھاؤ، بعد میں بتاتا ہوں'۔

جب میں کھانا کھا چکا تو اُس نے کہا 'بات یہ ہے کہ مَیں اِس کالج میں اکاؤنٹینٹ ہوں اور کالج میں موجود بورڈنگ میں رہتا ہوں۔ پچھلے دو مہینے میں میری دو سائیکلیں چوری ہوئی ہیں اور یہیں سے ہوئیں جہاں تم رات سوتے ہو۔ تیسری سائیکل بالکل نئی لے کر مَیں نے یہاں رکھی تھی اور پچھلے تین دن سے اُس کی خفیہ نگرانی کر رہا ہوں، مجھے تم پر شُبہ تھا مگر آج سحر کے وقت چور پکڑا گیا۔ اِدھر آج صبح کچھ لڑکوں نے بتایا کہ تم یہاں پیپر دے رہے ہو اور تین دن سے جامنوں پر کیسے گزارا کر رہے ہو۔ آج پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ گیا اور تمھیں کھانا کھلا دیا۔

اُس کی بات سن کر میں تو کانپ کر رہ گیا اور خُدا کا شکر کیا کہ سائیکل کا لالچ نہ کیا۔

اگلے دن پیپر دیے اور گھر چلا آیا۔ وہ سائیکل والا احمد علی کافی عرصہ میرا دوست رہا۔ اب بڈھا ہو چکا ہوگا، اللہ اُسے صحت دے۔

باب ہشتم

اوکاڑہ کا ادبی چوبارہ

کافی عرصہ تو روزگار نے فرصت نہ دی کہ ہم بھی شاعروں، ادیبوں اور پروفیسروں کی صحبت میں بیٹھتے۔ آج سوچتا ہوں تو خُدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا ورنہ شعر فہمی اور مطالعے سے پہلے دن ہی کنارہ کش ہو جاتا اور اپنے تئیں میر و غالب کا ہم پایہ کہلاتا۔ اب جب کہ زمانے کے دھکے اور دُنیاداری کے پیچ و خم کو اچھی طرح جان چکا تھا تو شوق چرایا کہ ہم بھی کم از کم اوکاڑہ کی حد تک ہی سہی، کسی مشاعرے میں جائیں، کسی اُستاد سے سخن کا گوہر پائیں۔ اُن دنوں اوکاڑہ میں تین چار نام اچھے گونج رہے تھے۔ ایک ظفر اقبال کا نام تھا، دوسرا اسلم کولسری کا چل رہا تھا، تیسرا صلاح الدین اقبال کا نام اور چوتھا مسعود احمد کا نام تھا۔ ظفر اقبال تب تک لاہور جا چکے تھے۔ اسلم کولسری بھی ریڈیو لاہور سے منسلک تھے اور کبھی کبھی اوکاڑہ آتے تھے۔ مسعود احمد بنک میں ملازم تھے اور دیپالپور جاتے تھے۔ وہاں سے شام کو واپس آتے تھے۔ باقی رہ گئے اقبال صلاح الدین، یہ میتر تھے۔ مجھے ایک دوست نے کہا وہاں جائیں اور اُن سے داد پائیں۔ ایک دن اِن کے ہاں گیا۔ اُنھوں نے میری تعلیم اور دائیں بائیں کی چیزیں پوچھیں، مَیں نے

بتائیں۔ اُنھوں نے تب مجھے ایک کتاب دی اور کہا یہ ایک نئے شاعر کی کتاب ہے، آپ نئے زمانے کی شاعری پڑھیں، میر و غالب کو فی الحال غفلت کے طاق پر دھریں اور ہر مہینے کے پہلے جمعہ ملک انور کے ہاں مشاعرہ ہوتا ہے، وہاں آیا کریں۔ اُس کے بعد میرے شعر سنے اور اُن پر کچھ اصلاح دی۔ اصلاح سے شعر کی روانی تو بڑھ گئی مگر مَیں نے محسوس کیا جو کچھ مَیں کہنا چاہتا تھا وہ غارت ہو گیا۔ خیر مَیں نے آمنا و صدقنا کہا اور گھر آ گیا۔ تب اُن کی دی ہوئی نئے شاعر کی کتاب دیکھی، جو اُسی کا شاگرد تھا، جس کا نام صیغہ راز میں رکھنا چاہیے، اُس کا مطالعہ شروع کیا تو بخدا ایں سٹپٹا کر رہ گیا۔ ایک بھی شعر اِس قابل نہیں تھا جسے صحیح طور پر شعر کہا جا سکتا۔ مَیں نے وہ کتاب وہیں رکھی اور شاگردی سے توبہ کی۔ دوبارہ اُن کے درِ دولت پر نہیں گیا اور اپنی معاشی محنت میں مشغول ہو گیا۔

میاں آزاد سے ملاقات

اِنھی دِنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ یہ واقعہ ایک خواب کا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مَیں ایک باغ میں چلے جاتا ہوں، باغ بہت خوب صورت اور ہرا بھرا تھا، پھلوں سے لدا ہوا اور شاخ شاخ پر طائرانِ خوش پوشاک بیٹھے تھے، عجیب غریب بولیاں بولتے تھے اور ٹہنیوں پر اُڑ اُڑ کر ایک سے دوسری بدلتے تھے۔ جانور اُس باغ میں سب ہرنوں اور گائیوں کی شکل میں تھے۔ کوئی چھوٹے کوئی بڑے، اور خوش رنگ ایسے کہ نظر اُن پر سے پھسلتی تھی۔ اُسی باغ میں ایک چھوٹی نہر چلے جاتی تھی۔ اُس نہر میں ایسے بل اور پیچ تھے کہ ہر پودے اور درخت کو سیرابی دیتی تھی اور پورے باغ میں گھومتی تھی۔ یہ باغ حدِ نگاہ سے بڑا تھا اور ہرا بھرا خوب ہونے کے ساتھ صاف اور روشن بھی تھا۔

اب سنیے کہ مَیں اِس باغ میں جا رہا ہوں اور میرے ساتھ مولانا محمد حسین آزاد چلے جاتے تھے۔ وہ آگے آگے تھے اور مَیں پیچھے پیچھے ہوں اور اُن سے باتیں کرتے جاتا ہوں۔ اُن کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، وہ کبھی اُس چھڑی کو گھماتے جاتے اور کبھی زمین پر ٹیکتے جاتے۔ مولانا کی

شکل ویسی نہیں تھی جیسی تصویر میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ چھوٹی داڑھی میں تھے اور قدرے جوان نظر آتے تھے۔ یہی جیسے کوئی پچاس سال کی عمر کے ہوں۔ مَیں اُن سے کہتا ہوں، مولانا آپ نے مرزا غالب اور اُستاد ذوق کی آنکھیں دیکھی ہیں، اور مَیں نے آپ کی آنکھیں دیکھی ہیں، بھلا بتائیں کیا مَیں آپ جیسا خوش قسمت ہوں کہ نہیں؟

یہ بات سن کر وہ ہنس دیتے ہیں اور فرماتے ہیں میاں علی اکبر! تمھیں کیا خبر اُستاد ذوق اور میرے والد مولوی محمد باقر اور نوشا میاں کیا لوگ تھے؟ مَیں اُن کی پائنتی بیٹھا ہوں، دامن پکڑ کر چلا ہوں، لفظ کا معنی سیکھے ہوئے ہوں، افسوس ہوتا ہے جیسا مَیں اُن سے سیکھ کر چلا، زمانے نے فرصت نہ دی کہ تجھے ویسا سکھا دوں، مگر جو کچھ تُو نے جھولی میں بھر لیا، وہی غنیمت ہے اور خُدا کا بھید ہے، حاسدوں کو تو یہ بھی میسّر نہیں۔ اُس کے علاوہ دہلی، غالب اور اُستاد ذوق کے بارے میں بہت باتیں کیں، کافی ساری بھول گیا۔

ایک موقع ایسا آیا کہ چلتے چلتے ایکدم رُکے اور ایک درخت کی شاخ سے عجیب سا پھل سبز رنگ کا توڑ کر مجھے تھما دیا، بولے اِسے کھا لو۔ مَیں نے اُسے جونہی منہ میں رکھا، وہ گھُل گیا اور چبانے کی ضرورت نہ پڑی، اور ذائقہ تھوڑا کھٹا اور میٹھا تھا، مَیں حیران ہوا، عجیب پھل ہے۔ تھوڑی دیر آگے چلے ہوں گے کہ ایک مکان آ گیا، اُس میں داخل ہو گئے۔ دیکھا تو وہاں میرے والد صاحب بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے چارپائی اور تکیے لگا رکھے تھے۔ حقہ سامنے دھرا تھا۔ تکیے اور چارپائی بالکل سفید تھی۔ والد صاحب مولانا کو دیکھ کر ایک دم اٹھ گئے اور مولانا چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے، میاں بشیر تیرے بیٹے پر آلِ محمد کا بہت کرم ہے۔ اِسے مَیں نے شاگردی میں لے لیا ہے۔ والد صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بولے مولانا، یہ تو آپ کا بہت دان ہوا۔ کچھ دیر میں چارپائی پر تھوڑی دیر بیٹھ کر ہلکا سا لیٹ گئے اور ایسے محسوس ہونے لگا جیسے سردی لگ رہی ہو۔ اُن کے پاؤں پر کچھ مکھیاں بھی بیٹھ رہی تھیں، میرے والد صاحب نے میری طرف ایک نظر دیکھا، مَیں ایک کمرے میں بھاگ کر گیا اور ایک رضائی موٹی اون کی لا کر مولانا کے سینے اور ٹانگوں پر اوڑھا دی۔ اُن کے چہرے پر اِس بات سے بہت اطمینان ہو گیا، کہنے لگے بیٹے علی اکبر، یہ تو نے

بہت اچھا کیا، یہ مکھیاں بہت بدبو پھیلا دیتی ہیں اور پاؤں میں زخم کر دیتی ہیں۔ اب اِن کا رستہ رُک گیا ہے۔ پھر وہ سو گئے۔ مَیں اور والد صاحب اُنھیں سویا ہوا سمجھ کے باہر نکل آئے۔ اتنے میں وہاں نہ مکان تھا، نہ کچھ اور تھا۔ ہم دونوں ایک سڑک پر کھڑے تھے۔

اُس کے بعد اچانک آنکھ کھُل گئی۔ یہ عجیب خواب تھا۔ اللہ جانے اِس میں کیا راز تھا۔ جو باتیں اُنھوں نے باغ میں جاتے جاتے کیں۔

امتحان پاس کا قضیہ

یہ 1998ء کی بات ہے۔ میرے گاؤں کے نزدیک ایک گاؤں مومن والا تھا۔ وہاں مَیں ایک مسجد بنا رہا تھا۔ اُن دنوں گرمی بہت تھی۔ میرے کپڑے پھٹے پُرانے اور سیمنٹ اور گارے سے بھرے ہوئے تھے۔ پاؤں میں نائلن کے ٹوٹے ہوئے سلیپر تھے جیسا کہ عام مزدُوروں کے ہوتے ہیں۔ دن ایک بجے کے قریب مجھے خبر ہوئی کہ بی اے کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا ہے۔ تب بی اے میں لڑکے فیل بہت ہوتے تھے۔ انگریزی ہر ایک کو لے ڈوبتی تھی۔ خاص کر گاؤں میں رہنے والوں کو تو انگلش آتی ہی نہیں تھی۔ مَیں نے بی اے کا امتحان دیا ہوا تھا۔ جیسے ہی رزلٹ آؤٹ ہونے کی خبر ملی میرے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ دل ڈوبنے لگا۔ طے کیا کہ کام یہیں چھوڑو اور پہلے شہر جا کر رزلٹ معلوم کرو۔ اُن دِنوں نیٹ وغیرہ نہیں ہوتے تھے اور مختلف بک سیلرز یونیورسٹیوں اور بورڈوں سے گزٹ خرید لاتے تھے، دس پانچ روپے لے کر رزلٹ بتاتے تھے۔ مومن والا سے اوکاڑہ شہر 10 کلومیٹر تھا۔ مَیں نے اُسی حال میں سائیکل پکڑی اور شہر کی طرف چل نکلا۔ گرمی کے دن تھے۔ جسم تمام ریت مٹّی میں لتھڑا ہوا تھا، کپڑے مہا گندے تھے۔ جب 10 میل سائیکل پر طے کر کے گزٹ والے کے پاس پہنچا تو حالت پسینے کے سبب مزید بے وقار اور قابلِ رحم ہو چکی تھی۔ گزٹ والے نے مجھے جب اپنی دُکان پر کھڑا دیکھا تو متعجب ہوا کہ یہاں کیوں کھڑا ہوں اور بولا بھائی کیا بات ہے؟ یہاں کیوں رُکے کھڑے ہو۔ مَیں نے کہا، میاں ہمارا بی اے کا رزلٹ آیا ہے، ذرا گزٹ میں سے دیکھ کر بتا دیجیے۔ اُس نے کچھ دیر میری طرف غور

سے دیکھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ لڑکا پڑھتا بھی ہے؟ بے یقینی سے بولا تمھارا اپنا رزلٹ ہے؟ مَیں نے کہا جی ہاں میرا ہی ہے۔ بولا لائیے 15 روپے، پھر چیک کرتا ہوں۔ مَیں نے کہا رزلٹ تو چیک کرو، کوئی بے اعتباری تھوڑی ہے؟ بولا نہیں پہلے پیسے دیجیے۔

مَیں نے 15 روپے نکال کر دیے۔ اُس نے میرا رول نمبر پوچھ کر گزٹ دیکھنا شروع کیا اور اِدھر مَیں نے اللہ اللہ اور علی علی شروع کیا۔ دُکاندار ایک ہی دم بولا بھائی ذرا اندر آ جائیے۔ یہاں پنکھے کی ہوا میں بیٹھیے بنچ پر۔ ہم نے کہا بھائی آپ رزلٹ بتاؤ۔ کہنے لگا بتاتا ہوں، آپ اندر تو آئیں۔ اب میں دُکان کے اندر ایک چھوٹی سی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے ملازم سے کہا دیکھو میاں وہاں سے ایک کوک کی بوتل لاؤ، وہ جھٹ کوک پکڑ لایا۔ اُس نے بوتل میرے سامنے رکھی۔ کہا پیو اور 15 روپے بھی واپس کر دیے۔ اب مَیں گھبرایا کہ ہو نہ ہو فیل ہو گیا ہوں۔ یہ بھائی مجھے دلاسا دے رہا ہے۔ اب بے چینی بڑھ گئی، مجھے پسینے آنے لگے، کہا میاں ہمیں پریشان کیوں کرتے ہو؟ یہ بوتل شوتل ہم سے نہیں پی جائے گی جب تک رزلٹ نہ بتاؤ گے۔

کہنے لگا میاں تم پاس ہو اور صبح سے جتنے لڑکے رزلٹ پوچھنے آئے ہیں اُن میں سے تم دوسرے لڑکے پاس ہوئے ہو۔ تمھاری حالت دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ یقیناً فیل ہو جاؤ گے۔ رزلٹ سنانے کے بعد فیل ہونے والے بچّے سے پیسے وصول کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے اسی لیے آپ سے پہلے وصول کر لیے تھے لیکن اب یہ بوتل اور 15 روپے میری طرف سے آپ کو انعام۔ اُس کا یہ بتانا تھا کہ میری جان میں جان آئی۔ خوشی سے ہاتھ پاؤں پھولے۔ اب کے واپسی آیا تو مَیں سائیکل ہی پر، مگر لہراتے ہوئے، گاتے ہوئے اور جھومتے مسکراتے ہوئے۔ واپس آ کر ابا کو بتایا تو وہ بھی جھوم ہی تو گئے کہ اُن کا غریب بیٹا گریجوایٹ ہو گیا ہے۔ فوراً گُڑ والے چاولوں پر مولا حسینؑ کی نیاز دینے کا حکم جاری کیا۔

اِس کے بعد مَیں متواتر اوکاڑہ کی مرکزی امام بارگاہ میں جمعہ پڑھنے لگا۔ یہاں میری ملاقات سیّد غضنفر نقوی اور اُن کے بیٹوں سے ہوئی۔ سیّد غضنفر نقوی اُن دِنوں اوکاڑہ میں تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے صدر تھے۔ اوکاڑہ کی مقامی سیاست میں کافی دخیل تھے۔ اِن کا اصلی قصبہ

دریائے راوی کے کنارے چوچک تھا لیکن پھر اوکاڑہ میں ایک مکان بنالیا۔شاہ صاحب کے تین بیٹے تھے۔تب یہ بالکل نوجوان لڑکے تھے، ایک حسن مرتضیٰ نویں کلاس میں تھا اور دوسرا مہدی مرتضیٰ میٹرک میں پڑھتا تھا تیسرا ابوذر گیارہویں میں تھا۔میرا اِن کے ساتھ بھی بہت ربط ضبط ہو گیا۔اِن کا گھر اوکاڑہ گورنمنٹ کالونی میں تھا۔حسن مرتضیٰ آئی ایس او میں چیف سکاؤٹ بھی بن گیا۔تینوں بھائی مجھ سے بہت شیر وشکر تھے۔تینوں کی شادی بھی ہوگئی،اُن کے بچے بھی ہوگئے۔ آج بھی اِن سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔مہدی مرتضیٰ انجینئر بن گیا ہے۔حسن مرتضیٰ نے ڈی فارمیسی کی اور میڈیکل سٹور بنالیا۔اب پی ایچ ڈی کر رہا ہے اور ابوذر وکیل ہوگیا ہے۔

احمد شہزاد لالہ اور ادبی ماحول

ایک دن مَیں اپنے گاؤں کے لڑکے کے ساتھ اوکاڑہ کالج میں گیا۔ وہاں ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی۔ وہ اوکاڑہ میں ہونے والی ادبی نشست حلقہ ادب کا سیکرٹری تھا۔اُس نے مجھے کہا، ناطق صاحب آپ ادبی نشست میں آیا کیجیے۔ یہ ادبی نشست ملک انور کے مکان پر ہوتی تھی۔اوکاڑہ گول چوک کو جاتے ہوئے مچھلی بازار کے دائیں پہلو اُس کا مکان تھا۔ملک انور ایک ان پڑھ آدمی تھا۔اپنی جوانی میں چاقو چلاتا تھا سینما دیکھتا تھا اور گنڈہ گیری کرتا تھا۔ بوڑھ چوک میں اُس کی پرچون کی دُکان تھی لیکن پھر شاعری کا شوق ہوا۔اقبال صلاح الدین کی شاگردی میں آگیا اور پنجابی شاعری شروع کر دی۔اقبال صلاح الدین اگرچہ میرا اُستاد نہیں ہوسکا مگر آدھے شہر کا اُستاد تھا۔اُس کی اپنی اُردو شاعری تو بے کار تھی مگر پنجابی شاعری میں واقعی اُستاد کے درجے پر تھا۔امیر خسرو پر بہت کام کیا تھا اور بنیادی طور پر ایک محقق تھا۔ تمام شہر کو عروض سکھانے کا اُس نے گویا تہیہ باندھ لیا تھا۔انور ملک جب سے اُس کا شاگرد ہوا تھا،شاعری کا شوق اُس پر جنون کی حد تک سوار تھا۔نیفے سے چاقو پھینک کر ہاتھ میں قلم لے لیا اور فاعلاتن فاعلاتن فعلن کی تکرار شروع کر دی۔ پنجابی نظمیں اور غزلیں لکھنے لگا تھا۔ جو غزل لکھتا اُس کے ساتھ اُس کے اوزان وارکان کی تفصیل بھی لکھتا تھا۔اُس نے ادبی نشستوں اور

شاعروں کی چائے پانی کا ذمہ اپنے اوپر لے لیا چنانچہ ایک عرصہ سے ماہانہ مشاعرہ اُسی کے مکان پر ہوتا تھا۔ اُن نشستوں کی سرپرستی اقبال صلاح الدین کرتے تھے۔ لالہ احمد شہزاد کا اصل نام احمد شہزاد تھا، لالہ کا لقب اقبال صلاح الدین نے دے رکھا تھا۔ جب میری کالج میں احمد شہزاد سے ملاقات ہوئی تب یہ اٹھارہ سال کا نوجوان تھا، نہایت خوب صورت اور شعرفہمی سے صاف کورا تھا۔ اقبال صلاح الدین نے ادبی مجلسوں کی سیکرٹری شپ اِسے کیوں سونپ رکھی تھی؟ اِس بارے میں صرف اقبال صلاح الدین کا جمالیاتی ذوق ہی کارفرما تھا۔

لالہ احمد شہزاد کی دعوت پر میں نے مشاعرے میں شرکت کی لیکن وہاں اقبال صلاح الدین نے گویا مجھے اِس طرح نظرانداز کیا کہ آئندہ وہاں جانا میرے لیے ممکن نہ رہا۔ اُس کا رویہ ایک طرح سے توہین آمیز تھا۔ وہاں موجود تمام لوگ بھی صرف اُسی کو داد دیتے تھے جنھیں اقبال صلاح الدین داد دیتا۔ اگر کسی شعر پر وہ خاموش رہتا تو دوسرے لوگ بھی خاموش رہتے۔ میرے ساتھ اِس سے بھی اگلی بات ہوئی کہ مَیں نے جتنے شعر پڑھے اقبال صلاح الدین نے کسی پر منہ بنایا اور کسی پر ہنس دیا۔ اُس کی پیروی میں ایک دو لوگ اور بھی ہنسے اور ایک دوسرے کو کن اکھیوں سے اشارے بھی کیے۔

اِس بات کو احمد شہزاد نے شدّت سے محسوس کیا۔ اُسے یہ توہین اپنی توہین لگی لیکن وہ اقبال صلاح الدین کے زیرِ اثر تھا لہٰذا خاموش رہا البتہ ردِعمل میں احمد شہزاد اور اُس کا دوست وقاص میرے قریبی دوست بن گئے۔ یہ اگرچہ چھ سات سال مجھ سے چھوٹے تھے لیکن اب مَیں اکثر شہر میں اِنھی کو ملنے آتا اور یہ میرے گاؤں مجھے ملنے چلے آتے تھے۔ مَیں اپنے شعر اِنھی دونوں کو سناتا تھا مجھے اِن دونوں کی محفل میں شعر پر بات کرتے ہوئے بہت لطف آتا تھا۔ ہماری محفلیں روزانہ ہونے لگیں۔ اوکاڑہ شہر میں گول چوک کی دائیں بغل میں صرافہ بازار تھا، وہاں رچنا بیکری کے پہلو میں چائے کی دُکان تھی۔ یہ چھوٹی سی دُکان تھی لیکن اِس کی چائے بہت عمدہ تھی۔ لکڑی کی چوکیاں پڑی ہوتی تھیں۔ ہم تینوں دوست وہیں بیٹھ جاتے۔ گھنٹوں بیٹھے رہتے، چائے

پیتے رہتے۔ کبھی کبھی رفیق کاشمیری کے ہاں بھی چلے جاتے۔ اُن دِنوں شاعری میں میرا مطالعہ فاروقی صاحب کی کتاب ''تفہیم غالب'' اور ''شعرِ شور انگیز'' کا مکمل ہو چکا تھا۔ مَیں اِن کے سامنے غالب کے بقیہ شارحین کا موازنہ فاروقی صاحب کی شرحوں کے ساتھ کرتا، پھر شعر میں سے نئے نکتے نکالتے اور ہم لطف لیتے۔ میری دیکھا دیکھی اِنھوں نے بھی شعر کی تفہیم پر دماغ سوزی شروع کر دی اور چند ہی مہینوں میں ہماری گفتگو نہایت عالمانہ دائرے میں داخل ہو چکی تھی لیکن اقبال صلاح الدین کے ہوتے ہوئے مَیں دوبارہ کبھی ملک انور کے مکان پر نہیں گیا، نہ مشاعرے میں کوئی شعر پڑھا۔

معروف شاعر مسعود احمد سے ملاقات

مَیں نے اوکاڑہ کے کئی دوستوں سے مسعود احمد کا نام سنا تھا لیکن ابھی اُن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن احمد شہزاد نے کہا، ناطق آپ کو اوکاڑہ کے اصلی شاعر سے ملواتے ہیں۔ مَیں نے کہا، رہنے دیجیے، مجھے بزرگ شاعروں سے دُور ہی رکھیے، کہیں وہ بھی اقبال صلاح الدین نہ نکلیں۔ وہ بولا نہیں یار چلتے ہیں۔ ایک تو وہ اتنے بزرگ نہیں ہیں، دوم اُن کا مزاج مشفقانہ ہے۔ تمھیں فوراً پہچان لیں گے کہ لونڈا خراب ہے۔ مَیں نے کہا چلیے بھائی لیکن یاد رکھیے یہ کسی شاعر سے میری آخری ملاقات ہو سکتی ہے۔ اگر اُنھوں نے بھی منہ بنا کر رخصت کیا تو سمجھیے آئندہ میر و غالب سے بھی نہیں ملوں گا۔

مَیں احمد شہزاد لالہ اور وقاص ہم تینوں سہ پہر اُن کے ہاں جا پہنچے۔ مسعود صاحب اُن دِنوں گورنمنٹ کالونی کے بڑے سے گھر میں رہتے تھے۔ جیسے ہی ہم گئے وہ تپاک سے ملے۔ اُنھیں میری خبر نہیں تھی اور مجھے اُن کی طبیعت سے بےخبری تھی۔ ہم وہاں ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھے رہے۔ اُنھوں نے بالکل محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ہم سے شعر اور عمر میں بزرگ ہیں۔ گفتگو میں لطیف طنز اور اُس پر اُن کا جسمانی سبھاؤ، اس پر شعر کی خوبی نے محفل کو خوب تر رکھا۔ بالکل خبر نہ ہوئی وقت کتنا نکل چکا ہے۔ اُس دن مَیں نے اپنی ایک نظم سنائی۔ اُس کی بہت تعریف کی۔ مجھے اقبال

صلاح الدین کی بے مروتی بھول گئی۔ لالہ احمد شہزاد نے بھی چند مصرعے نظم کے سنائے۔ اُس نے زندگی میں ایک دو ہی نظمیں کہی ہیں۔ وہ ایک یا دو سال بعد کسی محفل میں سنا دیتا ہے، یہاں بھی یہی کیا۔ اُس کے بعد مسعود صاحب نے اپنی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ بہت لطف آیا اور یہ طے ہوا کہ اب مستقل محفل ہوا کرے گی اور تب سے اب تک مسلسل محفلیں چلی آتی ہیں۔ خُدا اُنھیں صحت اور سلامتی سے رکھے باوجود اِس کے کہ وہ خود اپنی صحت کے حق میں نہیں ہیں۔

اِس پہلی ملاقات میں جو کچھ حاصل ہوا اُس کا خلاصہ سن لیجیے۔

مسعود صاحب شاعر بے پناہ ہیں۔ غزل موہنی کہتے ہیں۔ روزمرہ کے حالات کو شعر میں ملا دیتے ہیں اور مصرع کی چاشنی بڑھا دیتے ہیں۔ نظم لمبی کہتے ہیں، سناتے ہیں تو سانس اُکھڑ اُکھڑ جاتی ہے مگر سنا کے دم لیتے ہیں۔ سننے والوں کی بھی سانس اُکھڑ جاتی ہے۔ مسعود صاحب اسلم کولسری کے شاگردِ خالص ہیں، ظفر اقبال سے تعلقات اِن کے دوستانہ ہیں۔ میرے ساتھ مشفقانہ ہیں، اِن کے گھر میں ایک علیؑ کا ملنگ رہتا تھا۔ وہ اِن کے چچا کا بیٹا ہے۔ جب اُسے خبر ہوئی کہ مَیں بھی اُنھی کا بندہ ہوں تو بہت خوش ہوا۔ جب بھی مجھے آتا دیکھتا ضیافت کو دوڑ پڑتا۔ مسعود صاحب کی بیگم کو اللہ صبر دے، ہماری بڑی بھابھی ہیں اور ایسی سنی مسلمان ہیں کہ کچھ نہ پوچھیے، ہمیں ڈر رہتا ہے کہیں ایک دن اُنھیں ہماری شیعت پر ثواب کمانے کا خیال نہ آ جائے۔ خدمت بہت کرتی ہیں، اگرچہ ہم ہمیشہ ڈائننگ میں رہتے ہیں مگر اُن کے ہاتھ کے آلو والے پراٹھے ایسے دل پذیر ہوتے ہیں کہ مسلمان تو کم از کم کھائے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔ مسعود صاحب کو اگر ہاتھی تصور کر لیا جائے تو اِن کی دُم احمد جلیل صاحب ہیں۔ احمد جلیل صاحب بہت کنجوس ہیں مگر ہم نے ایک بار اُن سے اکبر روڈ کی برفی کھا ہی لی تھی۔ شاید یہ اُن کی پہلی اور آخری سخاوت تھی۔ جی بہار آدمی ہیں، مسعود صاحب بینک منیجری کرتے ہیں۔ احمد جلیل صاحب دن چڑھے وہیں آ جاتے ہیں۔ ایئر کنڈیشنر میں دن کاٹتے ہیں۔ 50 سال پُرانے شعر سناتے ہیں اور شام کو چلے جاتے ہیں۔ مسعود صاحب اُن کے بغیر بینک نہیں چلا سکتے اور احمد جلیل صاحب مسعود صاحب کے بغیر روٹی نہیں کھا سکتے، دوپہر کو بینک میں ہی کھاتے ہیں۔ جس دن مسعود صاحب نے دوپہر کا کھانا بند کر دیا تو مسعود صاحب کی صحت

بہتری کی طرف چل پڑے گی اور جلیل صاحب کی صحت کہتری کی طرف۔

ایک دن کا ذکر ہے،ہم مسعود احمد کے پاس گول چوک اُن کے بینک پہنچے۔اُنھوں نے مرغ کڑاہی منگوائی۔ہم نے مل کر کھائی۔احمد جلیل صاحب نے زیادہ کھائی۔اُسی شام املاک جدران نے اپنے گھر مشاعرہ رکھا۔مسعود صاحب نے کہا آج املاک جدران کے ہاں مشاعرہ پر چلو، صدارت میری ہے۔ہم نے ہامی بھر لی۔جیسے ہی مشاعرہ شروع ہوا، پہلے تلاوت ہوئی، پھر تلاوت ہوئی۔ اُس کے بعد نعت پڑھی گئی، پھر نعت پڑھی گئی، پھر نعت پھر نعت، چار نعت گو مزید آئے جو املاک جدران ہی کے بیٹے بھتیجے اور بھائی تھے۔ہم نے کہا مسعود صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ بولے ناطق میاں چپ کر کے بیٹھے رہیں،نعت پر اعتراض کیا تو ابھی گستاخ کہہ کر مروا دیں گے۔

مسعود صاحب کے ایک بھائی نعیم جج صاحب ہیں۔یہ اوکاڑہ اور ساہیوال کے تمام دُکانداروں میں مستند خریدار کے طور پر معروف ہیں،یعنی کنزیومر کورٹ کے جج ہیں اور مست بھینسے کی طرح جس دُکان میں چاہتے ہیں گھس جاتے ہیں۔بُرے اُدھار پر اچھی خریداری کرتے ہیں۔مگر دل کے بہت اچھے ہیں۔البتہ اِن کی تاریخ کا مطالعہ پاکستانی اسلامیات اور مطالعہ پاکستان سے آگے نہیں ہے۔ بہت اونچا بولتے ہیں۔اِن کی ایک خامی ہے محفل کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں اور ایک ہی خوبی ہے کہ اِن کے بغیر محفل آباد نہیں ہوتی۔مسعود صاحب کے ایک اور بھائی ندیم اصغر ہیں۔یہ بہت زبردست مطالعہ والے،نستعلیق، مہمان نواز اور گفتگو میں سُلجھے ہوئے ہیں۔کتابیں بہت پڑھتے ہیں۔سٹیج پر کھڑے ہوں تو گفتگو میں پیدائشی ماہر لگتے ہیں۔اِن سے مل کر بھی بہت خوشی ہوتی ہے۔

مَیں جب بھی اوکاڑہ جاؤں مسعود صاحب اور اُن کے بھائیوں کو ملے بغیر شہر سے نہیں نکلتا۔ اُس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مسعود صاحب نازک اندامی کے سبب گھر سے نکلنے سے قاصر ہیں یعنی اُن کا وزن ہاتھی سے تھوڑا ہی زیادہ ہے۔جب جائیں اُنھیں گھر ہی میں پاتے ہیں بلکہ گھر کے ایک کونے میں بغیر تلاش کے مل جاتے ہیں۔پھر ہماری بھابھی یعنی مسعود صاحب کی بیگم ہمیں اچھا شاعر بھی سمجھتی ہیں اور ہماری نظمیں بھی سنتی ہیں۔مسعود صاحب کا گھر مجھے تو بھائی اپنا ہی گھر لگتا ہے۔

شفقت رسول قمر

شفقت رسول قمر سے میری پہلی ملاقات انور ملک کے گھر میں ہوئی۔ یہ بھی وہاں مشاعرہ پڑھنے آئے تھے اور پہلے ہی مشاعرے میں میرے بارے میں کہنے لگے، 'اے تمام اہلِ مشاعرہ دیکھ لیجیے گا۔ یہ لڑکا علی اکبر ناطق ایک دن تمھارے سامنے اُردو کا بڑا شاعر بن کر کھڑا ہوگا۔ آج کے دن یہ میری بات لکھ رکھیں۔' شفقت کی یہ بات اُس وقت تو کسی نے نہیں لکھی کہ سب نے اسے مذاق سمجھا تھا لیکن مَیں نے اُن کے یہ محبّت بھرے لفظ دل میں لکھ کر رکھ لیے تھے۔ جنھیں موسموں کے سرد و گرم نہیں مٹا پائیں گے۔ شفقت رسول منڈی احمد آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ بصیر پور میں اِن کی شادی ہوئی اور اوکاڑہ ڈی سی آفس میں سولہویں گریڈ میں کام کرتے ہیں۔ آفیسر کالونی اوکاڑہ میں اِن کا گھر ہے اور میرا وہاں صبح شام کا ڈیرہ ہے۔

شفقت رسول قمر پنجابی اور اُردو کے شاعر برابر ہیں، ظفر اقبال صاحب کے شاگرد ہیں اور اُن دنوں کے ہیں جب ظفر اقبال کی نمبرداری کا کیس اوکاڑہ ڈی سی آفس میں چل رہا تھا اور شفقت وہیں کام کر رہا تھا اور بہت کچھ اُسی کے ہاتھ میں تھا۔ تب سمجھیے ظفر اقبال کی نظر میں اوکاڑہ میں دو ہی شاعر تھے۔ ایک شفقت رسول قمر اور دوسرا طارق کریم کھوکھر۔ طارق اُسی دفتر میں ڈی ای سی او تھا۔ اُنہی دنوں ظفر اقبال نے شفقت رسول قمر کو اپنا شاگرد بنایا تھا اور مٹھائی بھی اپنے ہی پلے سے کھائی تھی بلکہ شاگرد کو بھی کھلائی تھی۔ اب پتا نہیں ظفر اقبال اپنے اِس ہونہار شاگرد کو پہچانتے بھی ہیں کہ نہیں۔ شفقت رسول قمر پنجابی زبان میں ماسٹر ہیں یعنی پوسٹ گریجوایٹ ہیں اور اُن کتابوں پر مقالے لکھ چکے ہیں جن کے مسوّدے ابھی تک شاعروں کے گھروں میں پڑے ہیں۔

شفقت صاحب ریڈیو پاکستان پر پنجابی خبریں بھی پڑھتے تھے۔ آواز بہت رعب دار اور باوقار تھی۔ اُنھیں ایک معمولی لغزش پر نکال دیا گیا۔ وہ چُپ چاپ نکل گئے، کبھی نہیں کہا، مجھے کیوں نکالا۔ بات صرف یہ تھی، ایک دفعہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب نے ایک سڑک کا افتتاح کرنا تھا۔ یہ سڑک

پچاس کروڑ کی لاگت سے تیار کی جاتی تھی۔ جب خبریں لکھنے والے نے خبر کا مسودہ شفقت کو دیا کہ انھیں ایک بجے دن کی آل پاکستان ریڈیو بلیٹن میں پڑھ دیں تو انھوں نے وزیر اعلیٰ کے سڑک کے افتتاح کو ٹرک کا افتتاح بنا دیا۔ وہ بھی پچاس کروڑ کی لاگت سے تیار ہونے والا ٹرک۔ جب ڈائریکٹر نے پوچھا کہ پچاس کروڑ میں کون سا ٹرک تیار ہوتا ہے؟ تو شفقت صاحب نے فرمایا، آپ پچاس کروڑ کی بات کرتے ہیں، مَیں آپ کو پچاس ارب میں تیار کر کے دکھا سکتا ہوں۔ ڈائریکٹر نیوز نے کہا، اوّل تو ہمیں ٹرک کی ضرورت نہیں، دوم اتنے پیسے نہیں، سوم یہ کہ آپ کہیں ریڈیو میں ایسا منصوبہ شروع ہی نہ کر دیں اس لیے ہم آپ سے آئندہ کے لیے معذرت کرتے ہیں۔

اوکاڑہ کے ایک قصبے منڈی احمد آباد کے دریائی باشندے ہیں۔ اس لیے دل بھی دریا جیسا رکھتے ہیں۔ 25 سال سے اوکاڑہ ہی میں ہیں۔

ایک دفعہ ہم نے شفقت رسول قمر کے گھر غیر رسمی افطاری کی جس میں انواع و اقسام کے کھانے موجود تھے۔ افطاری کے وقت یہ بھی کہے جاتے تھے، مہنگائی بہت ہو گئی۔ یہی کچھ دال ساگ ہے۔ ہم پینک میں آ کر کہہ گئے کہ چالیس کھانے سامنے رکھ کر اللہ میاں سے اور ہم سے مشترکہ اپنی غربت کا سیاپا ڈال رہے ہیں کچھ خدا کا خوف کھائیں۔ اللہ نے تو خیر نوٹس نہیں لیا البتہ شفقت نے ایک بار پھر رسمی افطاری کی۔ اُس میں نہایت غصے کی حالت میں فرمایا ناطق صاحب آپ ہماری کردار کشی کرتے ہیں یاد رکھیں، کل چالیس کھانے ہرگز نہیں تھے، صرف تیس تھے۔ وہ بھی آپ کی مہمانداری میں رکھنے پڑے۔ آج مَیں ثابت کروں گا کہ مَیں واقعی غریب آدمی ہوں اور روزے کی افطاری انتہائی کسمپرسی سے کرتا ہوں۔ اس پر اُنھوں نے دو گواہ بھی پیدا کیے۔ ایک اپنے بیٹے اور ہمارے بھتیجے وجاہت رسول کو ساتھ بٹھایا اور دوسرا احمد شہزاد لالہ کو۔ اُس کے بعد افطاری آنا شروع ہوئی۔ ایک دو پکوڑے سامنے رکھ کر فوٹو کھینچے، وہ ہمارے ان باکس میں بھیجے کہ یہی لگائیں۔ اُس کے بعد زیتون کے تیل میں تلے ہوئے پکوڑے، اُسی تیل میں بنائے ہوئے کباب، دس قسم کے پھلوں کی فروٹ چاٹ، چپس، دہی بڑے، شربت فالسہ، شربت بزوری،

دودھ سوڈا، شکنجبین، جامِ شیریں، پھلوں میں آم انور رٹول، خوبانی اور آلو بخارا۔ بعد میں میز خالی کر کے روٹی رکھنے لگے تو ہم نے توبہ باشی سے جان چھڑائی اور مان گئے کہ آپ واقعی مفلس بہت ہیں۔ ہم غلطی پر تھے۔ خُدا اِنھیں جیتا رکھے اور تمام پریشانیوں سے بچائے۔

احمد اقبال مربی کے دستر خوان کا قصہ

لالہ احمد شہزاد کے سبب کچھ اور دوستوں سے بھی راہ ورسم چلی۔ ذرا اُن کی بھی ایک مزے کی جھلک دیکھ لیجیے۔ اُنہی زمانوں میں ہم اوکاڑہ کے خودساختہ دانشوروں میں بھی اٹھنے بیٹھنے لگے۔ اُن میں سب قبیلوں کے ارسطو جمع تھے۔ جاوید نقوی، قاری خالد، باؤز مسیح، اور دوسرے کئی احباب۔ روز شام 6 سے رات 12 بجے تک ہماری محفل جمتی اور یہ محفل اُن دنوں احمدیوں کی مسجد سے ملحق اُن کے مہمان خانے میں گرم ہوتی۔ یہ جگہ ٹھنڈی سڑک پر پریس کلب کے بالکل سامنے مسلم راجپوت ہائی سکول کے پچھواڑے میں تھی۔ اُن دِنوں احمدیوں کا مربی وہاں پر اِقبال مربی ہوا کرتا تھا۔ یہ آدمی بہت حاضر جواب، ملنسار، شفیق اور دوست پرور ادبی مزاج کا تھا۔ رات کا کھانا ہم اُسی کے ساتھ اُس کے مہمان خانے میں کھاتے اور رات گئے تک شعروادب اور مذہب و مارکس تک سے لے کر دُنیا جہان کی گپ اُڑاتے۔ اکثر ختمِ نبوت اور مذہب کی ضرورت و بے ضرورت پر بے تکی دلیلیں چھوڑی جاتیں۔

اقبال مربی صاحب کے علاوہ اکثر دوست مارکسی، وہابی، دیوبندی، بریلوی اور کرسچن گھروں سے تھے۔ مَیں واحد اِن میں شیعہ تھا۔ مذہب کے معاملے میں ہم سب چونکہ نیم مُلا تھے اِس لیے جو بات کرتے اُس پر یقین سے ڈٹ جاتے۔ مَیں تو کسی کی بھی نہ مانتا کہ شیعہ کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ بحث جب کئی کئی الجھنوں میں پھنس جاتی تو سب متفقہ طور پر احمد اقبال مربی صاحب کو ثالث مقرر کر لیتے جو بڑے تحمل کے ساتھ اِدھر اُدھر سے کھینچ تان کر سنی دوستوں کے مقابلے میں مجھے جھوٹا ثابت کرتے پھر احمدیوں اور سنیوں کو، ہم ایک ہیں، کہہ کر مطمئن کر دیتے۔

میں نے اکثر دیکھا کہ میرے مقابلے میں سنی دوست اقبال مربی صاحب کی بات کا دفاع کرتے نظر آتے مگر اِس کی واحد وجہ رات کا عمدہ ترین کھانا ہوتی تھی۔ یہ بات مربی صاحب بھی

جانتے تھے لیکن وہ محفل گرمائے رکھنے کے عادی تھے۔ بعض اوقات قبلہ غلام احمد یعنی اپنے پیغمبر پر پھبتی کسنے سے بھی باز نہ آتے۔ یہ سلسلہ تین سال چلتا رہا اور لذیذ کھانوں کے ساتھ مزے مزے کے بہت قصے ہوئے۔ پھر ایک دن اقبال صاحب کا سرگودھا میں تبادلہ ہو گیا اور وہاں نیا مربی آ گیا۔ مگر ہم نے وہ محفلیں جاری رکھیں کیونکہ باقی کا عملہ وہیں تھا جو ہمارا اچھا خاصا شناسا ہو چکا تھا۔ نئے مربی کے آنے پر آٹھ دس دن معاملہ اور کھانا یونہی چلتا رہا۔ مربی صاحب تھوڑی دیر کے لیے ہمارے پاس بیٹھتے پھر اُٹھ جاتے۔ آخر ایک دن اُنھوں نے اپنی انتظامیہ سے پوچھ ہی لیا کہ بھئی یہ کون لوگ ہیں؟ مجھے تو احمدی نہیں لگتے؟

اُن کے انتظامی ہیڈ ساجد صاحب نے اُنھیں بتایا کہ حضورِ والا یہ سب دین کے دوست نہیں، اقبال مربی صاحب کے دوست ہیں اور احمدی نہیں ہیں۔ پچھلے تین سال سے روزانہ یہاں محفل لگاتے ہیں اور رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھاتے ہیں۔ اُنھوں نے پوچھا، پھر کھانے اور تبلیغ کا نتیجہ نکلا کچھ؟ ساجد صاحب نے کہا سرکار، نتیجہ بس اتنا نکلا کہ خود اقبال مربی صاحب بھی اب کچھ کچھ بے دین سے ہو گئے ہیں۔ مَیں نے اِن آنکھوں سے اُنھیں خود جنابِ مسیح موعود کا مضحکہ اُڑاتے دیکھا ہے اور یہ احباب تو جیسے تھے آج بھی ویسے ہی ہیں۔ نمک کا کچھ اثر نہیں ہوا۔

لیجیے صاحب اُس سے اگلی شام جیسے ہی ہم سب دوست وہاں پہنچے تو مہمان خانہ بند تھا اور ایک لڑکے نے کہا، مربی صاحب فرماتے ہیں، ہم نے لنگر خانہ دین کی تبلیغ کے لیے جاری کیا تھا، لفنگوں کی پرورش کے لیے نہیں۔ آپ آئندہ یہاں تشریف نہ لائیے۔

اوکاڑہ کا مختصر احوال

اوکاڑہ ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن بڑے شہروں کو آنکھیں دکھاتا ہے۔ مَیں جب کالج میں داخل ہوا تو متواتر یہاں کی گلی گلی گھوما پتا پتا چوما۔ اوکاڑہ کالج میں آئے دن سٹرائیک کر کے ٹھنڈی سڑک سے ہوتے ہوئے گول چوک تک جایا کرتے تھے اور کشمیر کی آزادی کے جلوس نکالا کرتے تھے۔ رستے میں جو کچھ کھانے پینے کی اشیا پائی جاتیں، ہم مجاہدین کے لیے وہ مفت حلال سمجھی

جائیں کہ کشمیر کی آزادی کی قیمت ہر حالت میں غریبوں نے ادا کرنا ہے۔ آج بھی کر رہے ہیں۔ کالج کے سامنے کمپنی باغ تھا۔ یہیں کمپنی باغ سے چرچ بازار کی طرف جائیے تو دوسری گلی میں امام باڑہ ایوانِ حسین ہے جہاں ہم نے بیسیوں نمازیں پڑھیں، سیکڑوں مجلسیں سنیں، جلوس میں ماتم داری کی۔ اِسی کے پیچھے عطر والوں کی گلی ہے اور بہت بھلی ہے، جہاں سیّد باقر صفوی کا مکان تھا اور ہماری مجلس گاہ تھی۔ یہاں سے سیدھا بائیں ہاتھ کو نکلیں تو ایک طرف غوثیہ بازار آتا ہے اور دوسری طرف اِس کے ٹھنڈی سڑک رہ جاتی ہے۔ ٹھنڈی سڑک پر ایک سکول سی ایم آر تھا۔ ہم نے اپنے میٹرک کے امتحان اِسی سکول میں دیے تھے۔ ابھی تک یاد ہے اُن دنوں بہار میں پھول بہت کھلے ہوئے تھے اور کمپنی باغ پھولوں سے اور نرم ہواؤں سے مہک رہا تھا۔ تھوڑا اور آگے جائیں تو سرور سوڈا آتا تھا۔ یہ چھوٹی سی سوڈے کی بوتلوں کی ہوٹل ہوتی تھی۔ یہ مقامی پانی تھا اور بہت مزے کا تھا۔ اُس وقت ہمارے ذہن میں سوڈے کا مطلب صرف سرور سوڈا ہی ہوتا تھا۔ اس سے آگے کسی بوتل کو ہم نہیں جانتے تھے۔ اِس چوک سے لے کر وینس چوک تک کو کچہری بازار کہتے ہیں، یہیں تانگوں کا وہ اڈا تھا جس پر ہم نے اپنا ایک افسانہ لکھا تھا۔ آگے جائیے تو غلّہ منڈی آتی ہے، جہاں مجید امجد مشہور نظم کے شاعر روزانہ ساہیوال سے سائیکل پر سوار ہو کر آتے تھے اور سارا دن حاجی شفیع کی آڑھت پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ پُرانی کچہریاں بھی یہیں ساتھ لائل پور روڈ پر موجود تھیں، جہاں غزل کے مشہور شاعر ظفر اقبال وکالت کے لیے آتے اور شام کو کیس نہ ملنے پر ناکام واپس لوٹ جاتے تھے ہاں مگر دس بارہ غزلیں ضرور لکھ جاتے تھے۔ یہاں اُن کی سب شاعری عمدہ تھی اور نئے آہنگ کی تھی، لاہور جا کر خراب ہو گئے۔

آگے بڑھیں اور گول چوک چلیں جہاں مسعود احمد بنک میں نوکری جماتے تھے اور کسٹمروں کو غزلیں سناتے تھے۔ یہ گول چوک ایک تاریخی قطعہ ہے کہ یہاں ایک بھاری گول مسجد مولوی شبیر عثمانی کی موجود ہے۔ ہر اچھی جگہ پر اِن کا قبضہ ہے۔ گول چوک کے جنوب مغرب میں مشہور انارکلی بازار ہیں۔ اوکاڑہ کا اچھا اور معیاری حُسن یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ آگے چلیں تو کنواں چوک کو عبور کر کے ایم اے جناح روڈ آ جاتا ہے، جہاں اختتام پر ایک طرف پہلوانوں کا باغ ہے،

آگے نہر ہے، جو پورے شہر کو کاٹ کر جنوب کی طرف بہہ جاتی ہے۔ نہر کا پل عبور کر کے نکلیں تو نئی کچہریاں آتی ہیں اور نقشے میں دل کو بہت بھاتی ہیں۔

اوکاڑہ ادبی مقام میں اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ ظفر اقبال، اسلم کولسری، ناصر شہزاد گیلانی، مسعود احمد، اقبال صلاح الدین اور راقم کے علاوہ یہاں کچھ مزید نام بھی موجود ہیں۔ جن میں حفیظ صدیقی، جاوید نقوی، سخن ور نجمی، رفیق کشمیری، احمد جلیل، ندیم احسن، صابر رضوی، شفقت رسول قمر، املاک جدران، انور ملک، کاشف مجید، اکرم دانش، محبوب عالم طارق، صدیق دردی، صدیق ثانی، صابر حیدری، ڈاکٹر عبدالستار شاہد، احمد ساقی، فضل احمد خسرو، مصطفیٰ مغل، لالہ احمد شہزاد، قمر حجازی، حیدر علی ساحر اور ڈاکٹر طارق قمری شامل ہیں۔

اوکاڑہ کے نواح کے معروف قصبے اور لوگ

گوگیرہ:

گوگیرہ اوکاڑہ سے بیس کلومیٹر شمال کی طرف دریائے راوی کے کنارے ایک قصبہ ہے۔ یہ انگریز سرکار کا تب کا ضلعی مقام تھا جب ساہیوال ضلع نہیں تھا بلکہ ایک بستی تھی۔ یہاں پنجابیوں کے بقول مشہور فریڈم فائٹر رائے محمد خاں کھرل ایک ہیرو تھے لیکن آج تک مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی، اگر خُدانخواستہ وہ آزادی کی جنگ جیت جاتے تو خطے کا کیا بنتا؟ اور وہ کون سا منشور پیش کرتا۔

یہاں ضلعی دفاتر کی نہایت عالی شان عمارت تھی، جسے بعد میں سکول میں تبدیل کر دیا گیا۔ گوگیرہ میں ایک ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر برکلے کو مقامی لوگوں نے قتل کر دیا تھا جس کے بعد یہاں سے ضلعی مقام منٹگمری میں منتقل ہوا۔ مَیں نے اپنے ایک دوست کامران اعوان کے ساتھ کئی بار یہاں کی سیر کی اور عہدِ رفتہ کی نشانیوں کو عبرت کی نگاہ سے دیکھا۔ برکلے کی قبر ابھی بھی وہاں موجود ہے۔

شیخو شریف:

اوکاڑہ سے تیس کلومیٹر شمال ہی کی طرف دریائے راوی کے کنارے یہ قصبہ ہے۔ یہاں گیلانی فیملی رہتی ہے، جس کے پنجاب بھر میں ہزاروں مریدین ہیں۔ اُردو کے مشہور گیت نگار سید ناصر شہزاد گیلانی یہیں کے تھے۔ میرا یہاں شیخو شریف کو نمایاں کرنے کا مقصد ناصر شہزاد گیلانی ہی کے سبب تھا۔ مَیں یہاں متعدد مرتبہ گیا ہوں۔ یہ علاقہ بہت خوب صورت اور زرخیز ہے۔

ملکہ ہانس:

اوکاڑہ سے چالیس کلومیٹر جنوب مغرب کی طرف ایک قصبہ ہے۔ یہ بہت مشہور قصبہ ہے۔ یہاں وارث شاہ نے بیس سال گزارے اور اپنی مشہور کتاب ''ہیر وارث شاہ'' یہیں ایک مسجد کے حجرے میں بیٹھ کر لکھی۔ ملکہ ہانس میں دراصل وارث شاہ کے ایک مدرسہ کے ساتھی رہتے تھے۔ ایک دفعہ اُنھیں ملنے کے لیے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ساہیوال سے بیس کلومیٹر اور اتنے ہی کلومیٹر پاکپتن سے اِس کا فاصلہ ہے۔ مَیں متعدد بار یہاں گیا ہوں۔ اُس حجرے میں بیٹھا ہوں جہاں بیٹھ کر وارث شاہ نے ہیر لکھی۔ یہ علاقہ زرعی اعتبار سے ایک زرخیز علاقہ ہے۔ کبھی یہاں جنگلات ہوتے تھے۔ ملکہ ہانس، ہانس اور ہندو لوگوں کا گاؤں تھا۔ یہاں خوب صورت مندر بھی تھے، گردوارے بھی تھے۔ گلیاں تنگ تھیں مگر آج کل یہ گاؤں تباہ ہو رہا ہے۔ آثار ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ حکومت کی توجہ بالکل نہیں ہے۔

چک 49 تھری آر:

یہ ظفر اقبال کا گاؤں ہے۔ ظفر اقبال سے کون واقف نہیں۔ اوکاڑہ سے دلّی تک جس کے شعروں کی گونج نے جدید اُردو شاعری کے علم کا پھریرا بلند کیے رکھا۔ آج اُن کے شعر زبانِ خلق پر محاروں کی طرح رہتے ہیں۔ ظفر اقبال صاحب سے میری کئی ملاقاتیں ہیں۔ نہایت مہمان نواز اور دل ربا شخصیت ہیں۔ نوے سال کے ہو چکے ہیں۔ مَیں اِس گاؤں میں کئی بار گیا ہوں۔ اوکاڑہ سے

گوگیرہ جاتے ہوئے 18 کلومیٹر پر آتا ہے۔ یہ علاقہ بھی دوابے کا ہے اور بہت زرخیز ہے۔

دیپالپور:

اوکاڑہ سے 25 کلومیٹر جنوب مشرق کی طرف پاکپتن کو جاتے ہوئے رستے میں آتا ہے۔ دیپالپور کو سری چند نے آباد کیا تھا اور اس کا نام سری نگر رکھا تھا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے ہرے سنگھ نے یہاں فصیل تعمیر کرائی اور بعد ازاں اس کا نام دیپالپور ہو گیا۔ دیپالپور کا موجودہ نام دیپا کے نام سے منسوب ہے، جو راجا سالواہن کا بیٹا تھا۔ اس نے شہر کو دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔

لودھیوں کے دَور میں یہاں تین ہزاری ہوتا تھا۔ ملتان سے دلّی کے درمیان یہی ایک معروف شہر تھا۔ یہاں متعدد قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ان میں لالو جسراج کا مندر، شاہ جہاں دَور کے وزیر خانِ خاناں کی تعمیر کردہ مسجد، امام شاہ اور محمود شاہ نامی بزرگوں کے مزارات قابلِ ذکر ہیں۔ مَیں نے بہت دفعہ یہاں کی سیر کی ہے۔ یہاں کوئی معروف ادبی شخصیت نہیں ہے۔

پاکپتن:

یہ اوکاڑہ سے جنوب مغرب کی طرف ایک شہر ہے۔ مشہور چشتی بزرگ بابا فرید گنج شکرؒ کا مسکن یہیں تھا۔ یہ علاقہ دریا کے قریب قریب ہوتا ہے۔ بہت زرخیز ہے۔ وارث شاہؒ اور بلھے شاہؒ کی راہ گزر رہا ہے۔ یہاں سے دلّی جانے کے لیے یہ ایک ٹھہراؤ کا مقام تھا۔ بابا فریدؒ کی خانقاہ سات سو سال پُرانی ہے۔ وہ معین الدین چشتیؒ اور قطب الدین بختیار کاکیؒ کے بعد اس کے تیسرے سربراہ تھے اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مرشد تھے۔ عظیم صوفی بزرگ تھے۔ اجودھن (پاکپتن) میں رہے، وہیں دفن ہوئے اور بہشتی دروازے کا رواج دیا۔

ساہیوال (منٹگمری):

مشہور برٹش جرنیل منٹگمری کے نام پر اِس کا نام منٹگمری رکھا گیا۔ پہلے یہ علاقہ ساہی قوم کی

نسبت سے ساہیوال کہلاتا تھا۔ تقسیم کے بعد واپس ساہیوال کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ مَیں نے اِس شہر کا گوشہ گوشہ گھوما پھرا۔ میرے ایک ناول کماری والا کا بیشتر حصہ یہاں پر مشتمل ہے۔ ساہیوال کے مغرب میں بیس کلومیٹر کے فاصلے پر دُنیا کا مشہور آثارِ قدیمہ ہڑپہ کے کھنڈرات موجود ہیں۔ اوکاڑہ سے اِن کھنڈرات کا فاصلہ پچپن کلومیٹر ہے۔ مَیں نے اِن کھنڈرات کی متعدد دفعہ سیر کی ہے بلکہ ایک دفعہ اِنہی کھنڈرات میں ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے پڑے ہوئے پتھر پر بیٹھ کر ہندوستان سے آئے ہوئے مشہور داستان گو اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے بھتیجے محمود فاروقی صاحب، اُن کے دوست دارین شاہدی، دانش حسین اور اُسامہ صدیق کو اپنی مشہور نظم ''سفیرِ لیلیٰ'' سنائی اور وقت کی لگامیں کھینچنے کی کوشش کی۔

ساہیوال میں اُردو کے مشہور شاعر مجید امجد نے اپنی تمام زندگی کے شب وروز گزارے ہیں۔ یہاں ریلوے سٹیشن کے قریب مجید امجد ایک جگہ بیٹھا کرتے تھے اور چائے پیتے تھے، دوستوں سے باتیں کرتے تھے۔ اب وہاں مجید امجد پارک بنا دیا گیا ہے۔ افسوس یہاں ایک برگد کا پیڑ تھا وہ کاٹ کر گرا دیا گیا۔

رینالہ خورد:

رینالہ خورد اوکاڑہ سے 14 کلومیٹر مشرق کی طرف ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ میری جنم بھومی ہے، میری والدہ یہیں کی ہے۔ دُنیا کا مشہور مچلز فارم یہیں پر ہے۔ سرگنگا رام کا بنایا ہوا 25 میگا واٹ کا بجلی گھر بھی یہیں ہے۔ میرے ناول ''نولکھی کوٹھی'' کا مشہور کردار ولیم بھی یہیں انجام ہوا۔ یہاں بہت سی نہری کوٹھیاں تھیں۔ دو نہریں پہلو بہ پہلو یہاں بہتی ہیں۔ بہت ہی خوب صورت شہر ہے۔ مَیرا بچپن یہیں گھومتے پھرتے گزرا ہے۔ یہاں کوئی ادبی شخصیت نہیں ہے۔

بابِ نہم

شہروں ملکوں میں پھرے ہیں بگولہ صورت

پھر اچانک مَیں ملک سے باہر چلا گیا یعنی عرب و عجم کی سیاحی میں اور کافی عرصہ ملک میں نہیں لوٹا۔ یہ باہر جانا بھی ایک اتفاقیہ امر تھا۔ اِس میں دخل تو اصل میں میری بُری معاش کا تھا، وہ تو ویسی ہی رہی البتہ اِس سفر نے مجھے بہت کچھ پڑھا دیا، سکھا دیا۔ یہ سب کچھ تو مَیں اپنے سفر نامے میں لکھوں گا مگر آپ کو غریب الوطنی میں گزارے دِنوں کی دو چار باتیں سنا دوں۔ لطف سے خالی نہیں ہیں۔

دو خوابوں کی حقیقت

ایک دن عصر کے وقت مَیں اپنے گھر سویا ہوا تھا۔ مَیں نے خواب دیکھا، سامنے بڑا نیلا آسمان ہے۔ دھوپ چمک رہی ہے لیکن اُس میں تپش بالکل نہیں ہے لیکن یہ دھوپ سردیوں کی دھوپ جیسی بھی نہیں تھی۔ بس ایک طرح کا سفید پرتَو تھا۔ آسمان پر سامنے دائیں ہاتھ روضہ رسول ہے اور بائیں ہاتھ خانہ کعبہ تھا۔ میرے ایک طرف ایک آدمی کھڑا تھا، اُس کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا

اور وہ خود سفید لباس میں اِس طرح موجود تھا کہ مَیں نہ اُسے انسان سمجھ رہا تھا نہ انسان کے علاوہ کوئی دوسری شے۔ مگر ایسے تھا جیسے اِس سے بہت زیادہ مانوس ہوں۔ مَیں اُسے مخاطب کر کے کہتا ہوں، دیکھو یار یہ دونوں جگہیں جو ابھی چند قدم پر ساتھ ساتھ دکھائی دے رہی ہیں، ایک دوسرے سے کم و بیش چھ سو کلومیٹر دُور ہیں۔ خُدا کی قدرت دیکھیے مَیں اِن دونوں کو ایک ساتھ اپنی اِنہی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

اُس آدمی کی طرف سے ایک آواز سنائی دیتی ہے، کیا تم یہاں جانا چاہتے ہو؟ مَیں واپس آواز کی سمت مُڑ کر اُسے دیکھتا ہوں تو مجھے وہاں کوئی چیز نظر نہیں آتی، نہ وہ آدمی نما شے لیکن مجھے اُس کے اچانک غائب پر بھی کوئی تعجب نہیں ہوتا جیسے یہ معمول کی بات ہو۔

جیسے ہی مَیں خواب سے بیدار ہوا، ہر چیز مجھے یاد تھی اور مَیں تمام دن اور رات اُسی کی سرشاری میں رہا۔ اُسی رات مَیں سونے لگا تو تمام واقعے کو اچھی طرح حفظ کر لیا، کیونکہ مجھے پتا تھا کہ جب بھی بعض اوقات سونے سے پہلے آپ جس شے کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں، وہ خواب میں عملی طور پر فلم کی صورت میں چلنے لگتی ہے لیکن مجھے رات بھر نہ کوئی خواب آیا اور نہ دوبارہ وہ تصویریں۔ تین دن چھوڑ کر رات سحر کے وقت مجھے دوبارہ ایک خواب آیا، مَیں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوں اور حجرِ اسود کو چوم کر رُکنِ یمانی کو تلاش کر رہا ہوں، اُس جگہ بہت ہجوم ہے لیکن مَیں کسی طرح قریب جاتا ہوں تو وہ جگہ بالکل سامنے خالی نظر آتی ہے۔ مَیں جھک کر اسے بوسہ دیتا ہوں اور اسی دَوران سوچتا ہوں، شکر ہے مَیں خواب نہیں دیکھ رہا بلکہ حقیقت میں یہاں موجود ہوں۔ پھر تھوڑی دیر بعد پیدل چلتا ہوا رسولِ پاک کے روضہ پر آتا ہوں اور روضہ کو سامنے دیکھ کر درود پڑھتا ہوں اور ڈر رہا ہوں کہ یہ خواب ہی نہ ہو ورنہ تو مکہ سے مدینہ پہنچنے کے لیے مجھے کافی دیر لگتی مگر پھر خیال کرتا ہوں بھئی جس خُدا کی یہ جگہیں ہیں وہ سب کچھ ممکن کر سکتا ہے۔ مَیں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا، بلکہ حقیقت میں ہی یہاں موجود ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میری آنکھ کھل گئی اور مَیں مایوس ہو کر رہ گیا۔

جدہ کا محلہ بنی مالک

اُس خواب کی صبح جمعہ کی صبح تھی۔ مَیں اُس دن کام پر نہیں گیا اور جمعہ پڑھنے بارہ بجے کے قریب شہر میں چلا آیا۔ شہر کی مرکزی امام بارگاہ ایوانِ حسینؑ میں جمعہ پڑھا۔ اب اوکاڑہ کے بہت سے لوگوں سے دوستی ہو چکی تھی۔ وہاں ایک حاجی الطاف تھا۔ اُس نے کہا، علی اکبر آپ کو مَیں اپنے بیٹوں کے ہاں جدہ نہ بھیج دوں۔ مَیں نے کہا بسم اللہ۔

لیجیے اِس بات کے ٹھیک دسویں دن مَیں جدہ میں تھا اور اگلے دن مکہ میں کعبہ کے حجرِ اسود اور رُکنِ یمانی کو بوسہ دے رہا تھا۔

جدہ ایئرپورٹ کا معاملہ بس اتنا کہوں گا کہ عرب بدو تب تک بدو ہی تھے۔ ایئرپورٹ پر امیگریشن کا عملہ کام چوری میں ہمارا نقیب تھا۔ ایئرپورٹ سے باہر نکلنے میں چار گھنٹے لگے۔ کام کرنے والے سب لڑکے نوعمر تھے، اَن پڑھ تھے۔ بے وقوف تھے اور راشی تھے۔ یعنی جب رسول نے اِن کے بارے میں الراشی و المرتشی من النار فرمایا تھا تب تک یہ بلا شاید ہمارے ہاں متعارف نہیں ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے اب ہم اِس کام میں اُن سے بازی لے گئے ہیں۔

جدہ کے محلہ بنی مالک میں حاجی الطاف کے تین بیٹے رہتے تھے۔ یہ تینوں صراف تھے۔ بازار میں زیورات کی دُکانیں تھیں۔ مَیں اِن کے ہاں پہنچا لیکن جاتے ہی محسوس ہوا کہ یہاں رہنا میرے بس میں نہیں ہوسکتا۔ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس میں دھوپ ہی دھوپ تھی۔ تین سے چار کمرے تھے۔ سب کمروں میں ایئرکنڈیشنڈ تھے۔ اِن کی ٹھنڈک کمروں کے اندر ہوتی تھی لیکن جیسے ہی صحن میں نکلتے تو شدید گرمی کا احساس ہوتا تھا۔ باہر نکل کر سڑکوں میں چلا پھرا تو یوں لگا جیسے گرم ہواؤں کے چکّر میں ہوں۔ جدہ چونکہ سمندری علاقہ تھا۔ ہوائیں تیز تھیں۔ شام کے وقت ذرا موسم اچھا تھا۔ شام کو مجھے حاجی الطاف کے بیٹے نے کہا، ابھی موسم ٹھیک ہے یہ لیجیے پیسے ذرا سامنے والے دو موڑ کاٹ کے ایک ہوٹل آئے گا وہاں سے کھانا لے آیئے۔ جب میں مختلف گلیاں گزر کے وہاں پہنچا تو ایک چوک سا آیا۔ یہ نوعمر لڑکوں کا ایک ہجوم سا کھڑا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں

سی ڈیز تھیں، چوک میں کھڑے سی ڈیز بیچتے تھے اور خود بھی بکتے تھے۔ عرب لوگ یا وہ جو کئی عرصے سے یہاں کام کرتے تھے اور اُن کے بیوی بچّے پاکستان میں یا دوسرے ملکوں میں تھے، وہ اِن نوعمر لڑکوں کے ساتھ سودا کر کے اِنھیں لے جاتے تھے۔ یہ سب باتیں مجھے کچھ عرصہ بعد پتا چلیں۔ ورنہ پہلے دن تو مَیں سمجھا تھا کہ یہاں کوئی میلا لگا ہے۔

کھانا لے کر واپس پلٹا تو خبر ہوئی کہ دو بندوں کا کھانا پانچ لوگ کھا سکتے ہیں۔ جس قدر کھانا سعودی عرب میں ضائع کیا جاتا ہے شاید ہی دُنیا کے کسی ملک میں ضائع کیا جاتا ہو۔ غرض یہ کہ ایک تو عربوں کی گرمی، اُس پر شہر میں اتنے زیادہ ائیر کنڈیشنز، جدّہ ایک قسم کا جہنّم بن چکا تھا اور اِدھر 'مَیں درختوں کے ہرے دیس کا رہنے والا' اِس حالت سے سخت گھبرا گیا۔ اب مجھے تمام چیزیں بھول گئیں۔ اپنی معاش کی فکر ثانوی حیثیت اختیار کر گئی جس کے لیے یہاں پہنچا تھا۔ سب سے پہلے یہ شوق ہوا کہ کسی طرح مکہ پہنچوں پھر مدینہ جاؤں۔ حاجی الطاف کے بیٹوں سے کہا، دوستو بات یہ ہے کہ آپ کی ملازمت تو ہوتی رہے گی سب سے پہلے مجھے مکہ جانا ہے اور مدینہ میں حاضری دینی ہے۔ جلد مجھے وہاں پہنچانے کی کوشش کیجیے۔ جدّہ سے مکہ کا فاصلہ محض ساٹھ میل ہے۔ مجھے حاجی الطاف نے دوسو درہم دیا اور کہا، لیجیے اور یہاں حطیف کے چوک میں ٹیکسیاں کھڑی ہوں گی وہاں جائیے، ایک ٹیکسی میں چار لوگ اکٹھے بیٹھیں تو کرایہ کم لگے گا۔

لیجیے صاحب مَیں مکہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ دس ریال ٹیکسی والے کو دیے۔ تین مزید لوگوں نے دس دس روپے دیے اور مکہ چل دیے۔ آپ کچھ نہ پوچھیے شوق کو کیسے پر لگے ہوئے تھے۔ جی مَیں تھا کہ دیکھیے خُدا کی قدرت ابھی ایک گھنٹے میں مکہ یعنی کعبہ خانے میں پہنچ جاؤں گا۔ جیسے اپنے گاؤں سے اوکاڑہ پہنچتا ہوں، بس اُس سے تھوڑا سا وقت زیادہ لگے گا۔ تمام راستہ عجیب جذبے کا عالم تھا۔ چونکہ میرا تاریخ سے بہت واسطہ رہا تھا، جیسے جیسے مکہ کے قریب ہو رہا تھا، عجیب بات ہے مجھے جنابِ ابوطالب کی یاد زیادہ آ رہی تھی۔ میرا خیال ہے چونکہ میرے تاریخ کے مطالعے میں مکہ میں حضرت ابوطالب کا کردار مرکزی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھا، اِسی لیے میرے لاشعور میں مکہ وادی کے تمام مناظر جناب ابوطالب کے حوالے سے یاد تھے۔ مجھے کوہِ ابوقبیس، جس کے دامن

میں ابوطالب کا گھر تھا، شعبِ ابی طالب، کعبہ کے صحن میں وہ ندوہ، جہاں ابوطالب نے مکہ کے سرداروں کو دھمکی دی تھی، یہ سب باتیں اور جگہیں اپنی طرف شدّت سے کھینچ رہی تھیں۔ اُس کے بعد پانچ ہزار سال کی مکہ کی تاریخ میرے سامنے تھی۔ پھر رسولِ خُدا کا مکہ کی گلیوں میں چلنا پھرنا، غارِ ثور، غارِ حرا اور مقامِ حجون۔ کس کس چیز کو یاد نہیں کر رہا تھا، اِنہی خیالوں میں مگن تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا، لیجیے جناب حرم آ گیا۔ ہائیں یہ حرم ہے۔ یہ تو بالکل ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ اتنے بڑے بڑے پہاڑوں کے دامن میں ایک چھوٹی سی وادی اور اُس میں اُس سے بھی چھوٹی چوکور نما عمارت۔ یہ کعبہ ہے۔ جگہ شہر تو ہمارے گاؤں سے کچھ ہی بڑی ہو گی۔ حرم کا دروازہ بھی تب ایک عام مسجد کے دروازے کے برابر تھا۔ ہماری لاہور کی شاہی مسجد کا دروازہ تو اِس سے کئی گنا بڑا تھا۔ البتہ یہاں کبوتروں کی اتنی بہتات تھی کہ لاکھوں ہی تو ہوں گے اور آسمان اتنا صاف تھا کہ کیا بتائیں۔ گرمی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک سُرمئی فضا ہر طرف پھیلی ہوئی تھی جس میں ہر شے کا وجود اپنی تمام جزیات کے ساتھ نظر آتا تھا۔ مَیں احرام جدّہ سے ساتھ لے گیا تھا۔ کعبہ کے باہر ہی ایک حجام سے بال کٹوائے، غسل کیا، پھر احرام باندھا اور حرم کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ سامنے خانہ کعبہ کی عمارت کھڑی تھی۔ اچھا تو یہ وہی خانہ کعبہ ہے، اور وہی جگہ ہے جہاں ہزاروں واقعات اپنے عجائبات کے ساتھ رونما ہو چکے ہیں۔

زیادہ خلقت نہیں تھی۔ طواف کرنے کے لیے مَیں نے کعبہ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ ہر چکّر پر حجرِ اسود اور رُکنِ یمانی کو بوسہ دیتا رہا۔ حجرِ اسود ہرگز سیاہ پتھر نہیں ہے۔ یہ کلیجی رنگ کا پتھر تھا جو اندر سے ٹکڑے ہوا تھا۔ کونڈے کی شکل میں تھا جسے چاروں طرف سے چاندی کے فریم میں باندھ دیا گیا ہے تاکہ پتھر بکھرنے نہ پائے۔

طواف کے بعد غلاف سے لپٹ کر مَیں نے اپنے دل کی تمام حاجات کہہ ڈالیں اور بخُدا حاجات کو بیان کرتے ہوئے تین شخصیتیں میرے تصور میں تھی۔ جنابِ ابی طالبؑ، رسولِ خدا ﷺ اور مولا علیؑ۔ یعنی مَیں اپنی حاجتیں تو خُدا کے سامنے پیش کر رہا تھا، ہاتھوں میں کعبے کا غلاف تھا اور ذہن و دل میں تصور اِن مقدس ہستیوں کا تھا جن کے سبب مجھے کعبہ کی خبر ہوئی تھی۔ یہاں سے کچھ

قدم کے فاصلے پر مقامِ ابراہیمؑ ہے۔ یہاں ایک پتھر شیشے کی ضریح میں بند پڑا ہوا ہے جس پر روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے قدموں کے نشان ثبت ہیں۔ اِسی پتھر پر حضرت ابراہیمؑ نے کھڑے ہو کر کعبہ کی دیواریں تعمیر کی ہیں۔ مَیں کافی دیر اس پتھر کی زیارت کرتا رہا۔ اِس سے آگے مشرقی سمت زم زم کا وہ کنواں ہے جسے سیدنا محمد ﷺ اور علیؑ کے دادا نے مکرر کھودا تھا۔ اُس کا پانی یعنی ہزاروں سال سے آج بھی جاری ہے۔

وہاں سے اور آگے بڑھا تو صفا و مروہ کے مقام آ گئے۔ یہاں سات چکّر لگائے۔ سات چکروں کا فاصلہ کم و بیش تین کلومیٹر بنتا ہے۔ صفا کی پہاڑی ابھی موجود تھی جبکہ مروہ کی پہاڑی ختم کر دی گئی تھی۔ صفا و مروہ کی سعی کے بعد مَیں دارلندوہ کی طرف بڑھا۔ یہ دارلندوہ کعبہ کے صحن کے اندر ہی ایک مقام ہے جہاں قریش کے بزرگ بیٹھتے تھے اور اہم فیصلے کرتے تھے۔ یہیں بیٹھ کر اُنھوں نے ابوطالب کے ساتھ معاشرتی اور سماجی مقاطعہ کیا تھا۔ یہیں بیٹھ کر جنگ کے فیصلے کیے جاتے تھے اور یہیں بیٹھ کر رسول کے قتل کا فیصلہ کیا تھا۔ مَیں اُس مقام پر کھڑا ہو کر مکہ کے اُن واقعات کو یادداشت میں پلٹنے لگا جو دارلندوہ میں کیے گئے فیصلوں کے سبب رونما ہوئے تھے۔ یہاں کا ایک واقعہ مجھے شدّت سے یاد آیا اور مَیں نے تصوّر کیا کہ گویا مَیں بھی اُس وقت وہیں پر ہوں۔ آپ بھی سنیے۔

دارلندوہ میں ابوطالب اور اہلِ مکہ کا ایک واقعہ

اعلانِ نبوت کے بعد دسویں سال کا واقعہ ہے۔ رسولِ خدا ﷺ اکثر مکہ کے اردگرد کی چھوٹی بستیوں میں نکل جاتے تھے کہ اُنھیں اسلام کی طرف دعوت دیں۔ بعض اوقات آپ کو پلٹنے میں دیر ہو جاتی تھی۔ حضرت ابوطالبؑ ہمیشہ آپ کے ساتھ اپنے بیٹے علی اور دو طاقتور حبشی غلام محافظت کے طور پر مقرّر کر دیتے۔ وہ غلام تلوار اور نیزے کے ماہر اور نہایت جنگ آزما تھے۔ اُنھیں ہدایت تھی جب آپ کو خطرے میں دیکھیں تو ایک غلام حفاظت کے لیے وہاں ٹھہر جائے اور دوسرا جلد واپس آ کر ہمیں خبر دے۔ مکہ کے دس میل کے اردگرد کا علاقہ حرم کہلاتا تھا۔ اِس دائرے

میں آپ ﷺ کی جان کو خطرہ کم تھا کہ یہاں خون بہانے سے قریش عموماً گریز کرتے تھے لیکن اِس سے آگے حِل شروع ہو جاتا تھا جہاں کچھ بھی ممکن تھا۔ ایک بار جنابِ ابو طالب کا ایک غلام بیمار ہو گیا۔ آپ ﷺ اُسے آرام کی خاطر ساتھ نہ لے گئے اور تبلیغِ توحید کے واسطے مکہ کی دُور وادیوں میں نکل گئے یہاں تک کہ حِل کی چھوٹی بستیوں میں چلے گئے۔ چونکہ دُور تک چلے گئے تھے اِس لیے واپسی میں دیر ہو گئی۔ اِدھر جنابِ ابو طالب کو اندیشہ ہوا کہ قریش نے میرے بھتیجے کو گزند تو نہیں پہنچا دی۔ علیؑ بھی ساتھ تھے۔ آپ نے رسولِ خدا ﷺ کی تلاش میں کئی لوگوں کو بھیجا مگر وہ ناکام واپس آ گئے۔ جنابِ ابو طالب کا گمان پختہ ہو گیا کہ آپ کو شہید کر دیا گیا ہے اور اُس کے ذمے دار قریش ہیں۔

کعبے کے مغربی سمت میں یہی دارلندوہ تھا جہاں شام کے بعد قریش کے تمام سردار بیٹھ کر صلاح مشورے کرتے تھے اور شاعروں اور داستان گوؤں سے داستانیں سنتے تھے۔ جنابِ ابو طالب نے بنی ہاشم کے تمام جوانوں کو اکٹھا کیا اور اُنھیں کہا، سب اپنی عباؤں میں ننگی تلواریں چھپا لو اور میرے ساتھ دارلندوہ چلو۔ پھر جب میں تمھیں حکم دوں فوراً تلواریں نکال کر سردارانِ قریش کے سر قلم کر دینا۔ خُدا کی قسم میرے بھتیجے کے خون کا ایک قطرہ پوری کائنات کے خون بہا سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ اگر میرا بھتیجا نہیں رہا تو یہاں کوئی زندہ نہیں بچے گا، پھر چاہے ہم بھی نہ رہیں اور نہ یہ کعبہ رہے اور نہ یہ مکہ کی وادی رہے۔ بنی ہاشم کے تمام بائیس جوانوں نے اپنی تلواریں لیں اور جنابِ ابو طالبؑ کے پیچھے ہو لیے۔ آپ جیسے ہی اُن کو لے کر دارلندوہ پہنچے آپ کا غلام بھاگتا ہوا آیا اور پکار کر کہا، یا شیخِ بطحا! محمد رسول اللہ ﷺ گھر لوٹ آئے ہیں۔ آج وہ دُور کبسہ کی بستی تک چلے گئے تھے اور وہاں سے ابھی لوٹے ہیں۔ آپ ایک دم رُک گئے اور اُس غلام سے کہا، ٹھیک ہے تم جاؤ اور محمد رسول اللہ ﷺ سے کہو میرے آنے تک گھر ہی میں رہیں۔

اِدھر جب سردارانِ قریش نے جنابِ ابو طالبؑ کو بنی ہاشم کے جوانوں کے ساتھ اپنے سر پر کھڑے دیکھا تو حیران ہوئے کہ معاملہ کیا ہے؟ جنابِ ابو طالب نے اُنھیں کہا اے اہلِ مکہ تمھیں پتا ہے آج کیا ہونے والا تھا، عتبہ نے کہا یا شیخِ بطحا بتائیے؟

آپ نے بنی ہاشم کے جوانوں سے کہا اپنی عباؤں کو اٹھا کر انھیں ننگی تلواریں دکھاؤ۔ سب جوانوں نے اپنی عبائیں اٹھالیں۔ تب قریش نے دیکھا کہ ننگی تلواریں چمک رہی ہیں۔ وہ ہونق ہو کر ابوطالب کا منہ دیکھنے لگے۔ تب آپ نے فرمایا۔ اے اہلِ مکہ آج کچھ دیر پہلے تک میرا بھتیجا گھر نہیں آیا تھا۔ مَیں نے گمان کیا تم نے اُسے قتل کروا دیا ہے۔ پھر مَیں نے ایک فیصلہ کیا کہ آج تم سب کے سر قلم کر دوں اور اِس مکہ کے باشندوں کو برباد کر دوں۔ اُس کے بعد چاہے ہم بنی ہاشم میں سے بھی ایک فرد زندہ نہ بچے مگر تمھارے تمام قبیلے بھی نہ رہتے۔ اِس سے پہلے کہ یہ واقعہ ہو جاتا، ابھی مجھے میرے بھتیجے محمد رسول اللہ ﷺ کے گھر لوٹ آنے کی خبر ملی ہے۔ اب یاد رکھو اگر کسی نے میرے بھتیجے کا ایک قطرہ بھی خون بہایا تو یہ مکہ خون سے بھر جائے گا۔ کعبہ کی دیواریں سُرخی میں ڈوب جائیں گی۔ اِس کے چاروں طرف کے رستے اور شام اور یمن کی جانب جاتے ہوئے کجاوہ دار اونٹوں کی بجائے تمھاری لاشوں کو کتے کھینچتے پھریں گے۔ یہ کہہ کر جنابِ ابوطالبؑ نے اپنے جوانوں سے کہا، چلو اب گھر چلیں۔

وہاں بیٹھے تمام سردارانِ قریش کانپ کر رہ گئے۔ اُن کی زبانوں میں کانٹے پڑ گئے اور کسی کے لب تک نہیں مل سکے۔ چنانچہ اِس واقعے کے بعد پھر کبھی کسی ملعون کی جرأت نہیں ہوئی کہ جنابِ رسالت مآب ﷺ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے۔ ہاں جب ابوطالبؑ فوت ہوئے تو اللہ نے کہا اے میرے حبیب (ﷺ)! اب تو ہجرت کر جا کہ یہ جگہ محفوظ نہیں رہی۔

مَیں بہت دیر یہاں بیٹھا رہا اور اِن واقعات کو یاد کرتا رہا۔ اگرچہ یہ سب چیزیں کسی سفرنامے میں آنی چاہئیں مگر مَیں نے خیال کیا کچھ یہاں درج کرتا چلوں۔

تین چار روز تک مَیں کعبہ کے صحن، اُس کے دالانوں، برآمدوں اور حرم سے منسلک دُکانوں میں گھومتا رہا۔ اُس کے بعد باہر نکلا، اور پورے مکہ شہر کی کھوج میں چلا۔ مقامِ حجون پر پہنچا، جہاں ابوطالبؑ، عبدالمطلب، بی بی خدیجہ اور جنابِ رسولِ خدا کے بیٹے مدفون تھے۔ پھر شعبِ ابی طالب میں گیا جو کعبہ سے تین میل کے فاصلے پر تھی۔ یعنی ہر اُس جگہ جانے کی کوشش کی جس کا ذکر تاریخ میں موجود تھا۔ غارِ حرا اور غارِ ثور میں گیا۔ کوہِ ابی قبیس پر چڑھا جہاں کھڑے ہو کر رسول نے

چاند کے شق کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پاس ہی ابوطالب کا گھر تھا، وہاں گیا۔ جہاں رسول پیدا ہوئے تھے، وہاں پہنچا۔ اب تو یہ جگہیں شاید نہیں ہیں اور صحنِ کعبہ میں لے لی گئیں ہیں۔

مدینے کی جانب

مکہ میں کافی دن رہنے کے بعد مَیں نے مدینہ کا رُخ کیا۔ اُس کی تفصیل بہت طویل ہے کہ وہاں کیا کچھ حالات گزرے۔ یہ الگ سے ایک سفرنامے میں آئیں گے۔ البتہ ایک واقعہ مجھے نہیں بھولتا جو مدینہ میں جاتے ہوئے ایک بس میں میرے ساتھ پیش آیا۔ سن لیجیے اور بطور پاکستانی غور کیجیے ہماری زمانے میں کتنی عزت ہے

جب مَیں بس میں بیٹھا تو میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک حبشی لڑکا بھی بیٹھ گیا۔ اِس کی عمر مشکل سے پندرہ برس ہوگی۔ اِس کے ساتھ اِس کی ایک بہن بھی تھی جو دس یا بارہ سال کی تھی۔ وہ اکیلی ہمارے سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ یہ لڑکا مکہ ہی کا رہنے والا تھا۔ اِس کی والدہ مدینہ میں تھی جسے ملنے کے لیے بہن بھائی جا رہے تھے۔ لڑکا مجھ سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ اِس کے پاس بہت سے ملکوں کے کرنسی نوٹ تھے۔ مجھے دکھانے لگا کہ یہ فلاں ملک کی کرنسی ہے، یہ فلاں ملک کی ہے۔ کم و بیش سو ملکوں کی کرنسیاں اِس نے مجھے دکھائیں لیکن اُن میں پاکستانی کرنسی نہیں تھی۔ مَیں نے اُسے پوچھا کہ آپ کے پاس پاکستانی کرنسی کیوں نہیں ہے؟ وہ ایک دم غصے میں آیا اور بولا، لاأحب الروبیۃ الباکستانیۃ علی الطلاق، کل الباکستانیین الصوص وکل سارق، یعنی تمام پاکستانی حرامی ہیں، تمام چور ہیں۔ اُس پندرہ سالہ لونڈے کی یہ بات سن کر مَیں بالکل خوش ہوگیا۔ پھر کافی دیر بعد اُس لڑکے نے خموشی توڑی اور کہنے لگا ہل انت الا یرانی۔ مَیں نے جواب دیا، لا، انا الباکستانی۔ میرا جواب سن کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور معذرت کرنے لگا۔ پھر مدینہ تک میری تالیفِ قلب کے لیے کبھی کوئی چیز مجھے کھانے کو پیش کرتا اور کبھی کوئی شے۔

بس جیسے ہی مدینہ کے مضافات میں پہنچی اور سبز گنبد و بلند مینار نظر آنے شروع ہوئے تو دل میں دھڑکنوں کا سلسلہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے مشابہہ ہوگیا۔ آنکھیں جھپکنے پر دل کی ملامت کا نامہ متا

تھا۔ مدینہ ایک وسیع اور کشادہ شہر تھا۔ آبادی بہت ہی کم تھی لوگ اِکا دُکا تھے مگر دن کی روشنی سورج سے دو ہاتھ آگے محسوس ہوتی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے سفید ٹکڑے تختِ سلیمانی کی طرح پھر رہے تھے۔ بس ایک جگہ رُکی اور مَیں اشتیاق سے باہر نکلا۔ سب سے پہلے رسول ﷺ کے روضہ کی سمت چلا، درود و سلام کا نغمہ میرا ہمنوا تھا اور دل کی سواری پر چلا جاتا تھا۔ اللہ اللہ یہ تو وہی جگہ ہے جہاں رسول ﷺ کا گھر تھا، فاطمہؑ کا گھر تھا۔ آج بھی اِسے صحنِ فاطمہؑ کہا جاتا ہے۔ یہاں پچیس گھنٹے رُکا رہا۔ اُس کے بعد مدینہ کے بازاروں اور مختلف علاقوں میں پھرنے لگا۔ یہ بھی ایک لمبی داستان ہے کہ وہاں کیا کیا پیش آیا۔ سب لکھوں گا۔ بس ذرا فرصت پاؤں۔ تب تک تو کچھ جگہیں بہت سلامت تھیں۔ مسجد الغمام، مسجد قبلتین، مسجد قبا، مسجد سلمان فارسیؓ، امام زین العابدینؑ کا گھر، بیت الحزن، میدانِ اُحد میں تمام معروف نشانات۔ وادی العقیق، غرض ہر وہ مقام جہاں کچھ سلسلے تھے سب جگہ گیا اور اہلِ بیتؑ کی مصیبتوں کے نوحے پڑھتا گیا۔

مَیں کئی روز تک تو یونہی پھرتا رہا۔ میری کوشش تھی کہ واپس حاجی الطاف کے بیٹوں کے ہاں نہ جاؤں۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ایک تو جدّہ میں مجھے گرمی کے جھونکے بہت شدید لگے اور گھٹن کا احساس جان لیوا لگا، دوم مَیں جانتا تھا کہ اگر وہاں رہا تو شاید ایک ہی کمرے اور ایک ہی دُکان میں ساری عمر نکل جائے، اِدھر مَیں ایک بنجارہ آدمی تھا۔ چند گھنٹے ایک جگہ بیٹھنے سے ڈپریشن ہونے لگتا اور جسم سے جان نکلنے لگتی۔ سوم مَیں نے سوچا اگر ادھر پہنچ ہی گیا ہوں تو بجائے جدّہ کے صحراؤں میں جان دینے کے حجاز کی زمینوں میں رہوں۔ چنانچہ واپس جدّہ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور مکہ مدینہ ہی میں قیام کرنے کی ٹھانی۔ اب سب سے پہلے تو یہ تھا کہ کافی دن گزار لینے کے بعد مستقل طور پر یہاں اپنی معاشی مصروفیات کے لیے کوئی حل ڈھونڈنا تھا۔ میرے پاس عمرے کا ویزہ تھا۔ یہ ویزہ چوری چھپے کام کرنے کا موقع تو دیتا تھا مگر کھلے عام ہرگز نہیں۔

الغرض مَیں نے وہاں مختلف کام کرنے شروع کر دیے جس کے نتیجے میں عجب قصے رونما ہوئے۔ اب کچھ قصے ایسے سن لیجیے جو وہاں مجھے کام کرنے کے دَوران پیش آئے۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ ہیں مگر چند ایک یہاں بیان کر دوں تا کہ سند رہے۔ یہ واقعات دلچسپ ہونے کے ساتھ

ساتھ سبق آموز بھی ہیں اور اُن حضرات کے لیے بہت زیادہ عبرت خیز ہیں جو ابھی نوجوان ہیں اور اِن دیاروں میں معاش کے لیے بھاگ نکلنا چاہتے ہیں۔

عرب کے گدھوں کی بدتہذیبی

اونٹ عربوں کا قومی جانور ہے کیونکہ اس ملکِ وسیع کے صحراؤں، بیابانوں میں اس کے بغیر بار برداری ناممکن ہے مگر عربوں کی دیہی ثقافت میں گدھوں کی اہمیت پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔ آج میں آپ کو دو واقعات سنا کر یہ کمی پوری کیے دیتا ہوں۔

مَیں پہلے بتا چکا ہوں جب آپ کے پاس کام کرنے کا ویزا نہ ہو، جسے عرب لوگ اقامہ کہتے ہیں تو آپ شہروں میں کام نہیں کر سکتے، فقط حج اور عمرہ کر سکتے ہیں، ورنہ شرطے پکڑ کر باندھ لیتے ہیں۔ عمرے کے ویزے پر آئے ہوئے بندے کو کام کرنا ہے تو دیہی علاقوں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں عربوں کو سستی لیبر چاہیے ہوتی ہے، وہ ان سے غلاموں کی طرح کام لیتے ہیں۔ مَیں اُن دنوں مدینہ کے مضاف الغابہ میں تھا۔ یہ علاقہ مدینہ سے 20 کلومیٹر شمال کی طرف ہے۔ یہاں مَیں ایک عرب کے کھجوروں کے باغ میں کام کرتا تھا اور روزانہ 60 ریال وصول پاتا تھا۔ میرے ساتھ بہت سی حبشی عورتیں بھی کام کرتی تھیں، جن کا کام کھجوروں کی صفائی اور چنائی وغیرہ تھا۔

میرے کام کی نوعیت کچھ یوں تھی کہ حبشنیں کھجوریں توڑ کر ایک پہاڑ لگا دیتی تھیں، جسے مدینہ منتقل کرنے کے لیے ایسے ٹیلے عبور کرنا پڑتے تھے جہاں پہیے والی گاڑی نہ چلتی تھی۔ ٹیلے چونکہ پتھریلے اور نوکدار بھی تھے اس لیے اونٹ بھی کام نہ دیتا تھا۔ اب ایک گدھا ہی تھا جو ہر جگہ فٹ ہو جاتا۔ مجھے یہ کھجوریں گدھوں کے ذریعے ٹیلوں سے پار لا کر وادی العقیق کی منڈی میں پہنچانا ہوتی تھیں، جہاں سے بڑی ٹرانسپورٹ پر شہر میں منتقل ہوتیں۔

میرے قبضے میں تین گدھے تھے اور یہ بہت گدھے تھے۔ آپ سمجھیں انڈین یا پاکستانی گدھے ان عربی گدھوں کی نااہل اولاد ہیں کہ ویسا گدھا پن ان میں نہیں آ سکا۔ یہ زیادہ تر کھجوروں پر گزارا کرتے ہیں اور جو بھی کھاتے ہیں اور کھا کھا کر اتھرے بے تحاشا ہوئے ہیں۔

ئیں نے پاکستان میں دیکھا تھا کہ ایک ہی کمہار ساٹھ، ستر گدھوں کو ہانکے لیے جاتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ غلط لائن پکڑے، مالک جدھر چاہتا ہے انھیں پھراتا ہے۔ ئیں نے اسی غلط فہمی میں تین گدھے اپنے ذمّے لے لیے، تین گدھوں کو قابو کرنا کون سا مشکل کام تھا۔

لیکن جیسے ہی کھجوریں لاد کر میں نے ان گدھوں کو آگے لگایا، میرا دل عذاب میں آیا۔ تھوڑی دیر تو شریفانہ چلے مگر باغ کی حدود سے باہر ہوتے ہی خرِ بے مہار ہو گئے۔ اگر ایک تیز دوڑتا تھا تو دوسرا سست رو چلتا تھا، اُسے ڈنڈا مار کر ہانکا تو وہ ایسا سرپٹ بھاگا کہ پہلے دونوں گدھوں سے کہیں آدھا میل آگے نکل کر عجیب سمت مُڑ گیا۔ اُسے واپس ہانک کر لایا تو پہلے دونوں گدھوں کو غائب پایا۔ اب ماسبق گدھے کو ایک پتّھر سے باندھ کر دوسروں کی تلاش میں نکلا تو واپس آنے تک پہلا گدھا کھجوروں سمیت زمین پر استراحت فرما چکا تھا اور کھجوریں یتیموں کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔ لیجیے اُسے الصلوٰۃ خیر من النوم کہہ کر جگایا، کھجوریں مکرر لادیں اور بڑی احتیاط سے تینوں کو لے کر پھر روانہ ہوا۔ یہاں مجھے وہ آیت بہت یاد آئی، جہاں قرآن نے کہا ہے، 'یہ گویا بہکائے ہوئے وحشی گدھے ہیں جو ایک شیر کو دیکھ کے بھاگتے ہیں۔'

یہ پہاڑ بھی ایسے سیاہ اور سخت تھے کہ سبزے کی ایک پتی تک نظر نہ آتی تھی۔ اگر کہیں تھیں تو کانٹے دار ایسی جھاڑیاں جن کی نوکیں نیزوں سے کلام کرتی تھیں۔ اِن میں چلنے کے لیے مجھے باغ کے مالک نے ٹائروں کے جوتے دیے تھے۔ عام تام جوتوں کی تو یہاں گنجائش ہی نہیں تھی اور یہ ٹائروں کے جوتے ایسے بھاری تھے کہ اونٹ کے پاؤں میں باندھ دو تو دو گھنٹے میں چیں بول دے۔

طبیعت ایسی بے زار ہوئی کہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر بھاگ جانے کو جی چاہا، مگر کم از کم عربوں میں بھاگ جانے کا تصور ممکن نہیں کہ پاسپورٹ کام کرانے والا عرب اپنے قبضے میں لے چکا ہوتا ہے۔ غرض اِسی وبال میں جب کھجوریں اپنے اصلی مقام تک پہنچا کر میں پانچ گھنٹے بعد لوٹا تو عرب بدو نے گالیاں دینا شروع کر دیں کہ اتنے میں تو تین چکّر لگ جاتے ہیں، تم نے سارا دن غارت کر دیا۔ اب دیر ہوئی تو مزدُوری کاٹ لوں گا اور شرطوں کے حوالے کر دوں گا۔

خیر بھائی صبح سے رات گئے تک کوئی چار چکّر لگائے اور چالیس پچاس کلومیٹر پیدل جان تھکا کر اور نڈھال ہو کر وہیں باغ میں پڑ رہا۔ آدھی رات تک حبشی عورتیں آگ پر دُنبہ رکھ کر رز میں گاتی اور طبلے پیٹتی رہیں اور اُس کے بعد گوشت کھاتی رہیں۔ رات کچھ نہ کچھ رومان انگیز ہوگئی۔

ایک دن کا قصہ ہے کہ میں ایک جگہ ٹیلوں میں کھجوروں سے بھرے گدھے لیے جا رہا تھا۔ ایک جگہ ٹیلوں کے درمیان گھری ہوئی چھوٹی سی وادی میں پہنچا۔ یہاں دو چار مختلف اشیا کی دُکانیں تھیں۔ اِنہی میں ایک سبزی اور پھل کی دُکان تھی۔ درمیان میں کشادہ سا صحن تھا اور صحن کے درمیان سے سیدھی سڑک نکلتی تھی۔ یہاں ایک گدھے کو اللہ جانے کیا جوش آیا۔ اچانک ہنہنانا شروع کر دیا اور سرپٹ دوڑ لگا دی اور ایسی چال سے بھاگا کہ سمجھیے گدھے کی کھال میں چیتا چھپا ہے۔ سبزی کی دُکان میں نہایت خوب صورت اور ہری بھری سبزیاں اور پھل چمک رہے تھے۔ دُکان پر ایک عرب اور اس کا کمسن لڑکا جبہ پہنے، سر پر گول چکّر باندھے بیٹھے تھے۔ گدھا بے قابو ہو کر کھجوروں سمیت اُسی دُکان میں گھس گیا۔

میں اُسے روکتا رہ گیا مگر گدھا نہ ٹلا۔ سبزی کی ٹوکریوں اور شیشے کے خانوں کو ایسے روند ڈالا جیسے بدمست سانڈ آئینہ خانے میں گھس جائے۔ اس دَوران خود گدھے پر لدی کھجوریں کینچوں کی طرح بکھر گئیں اور لڑھکتی پھرتی تھیں۔ آلو، سیب، پیاز گیندیں بن کر پورب پچھم میں پھیل گئے۔ اب گدھے نے ہینکنا بھی شروع کر دیا جیسے جنگ کا نقارہ بجا رہا ہو اور ایک پَل میں عربی کی دُکان کو وزیرستان بنا دیا۔ کسی سبزی کی شکل پہچانی نہ جاتی تھی اور شیشے ٹوٹ پھوٹ کر کرچیاں ہو گئے۔ مفت کا تماشا کسے بُرا لگتا ہے، آن کی آن میں آس پاس کے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے اور اس ہیئت کذائی پر ہنسنے لگے۔ میں ایک کونے میں ڈرا سہما ایسے کھڑا تھا جیسے سزائے موت کا قیدی پھانسی چڑھنے والا ہو۔

گدھے نے جب ساری دُکان تلپٹ کر دی تو آرام سے نکل کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ایک دفعہ تو یقین جانیے مجھے ایسے لگا جیسے یہ دُکان دار اور گدھا آپس میں پُرانی عداوت رکھتے ہیں جس کا گدھے نے انتقام لے لیا ہے۔ جیسے ہی گرد بیٹھی اور بدو کو ہوش آیا تو اُس نے فوراً میرے

گریبان پر ہاتھ رکھ دیا اور پل کی پل میں مجھے باندھ لیا۔ بازار میں تماشا دیکھنے والے سب لوگ فقط تماشا دیکھنے میں مصروف رہے یاد رکھیں اگر کوئی عرب کسی عجم کو باندھ رہا ہو تو تماشائی صرف باندھنے میں مدد کرتے ہیں چاہے آپ اپنے ملک کے وزیر اعظم ہی ہوں۔ عربوں میں ایک بدو بھی آپ کو باندھ سکتا ہے۔

بندھنے کے بعد میں نے دُکاندار کو اپنی درد بھری کہانی سنائی۔ اُس نے سنی اور کہا اب تو بیٹا یہ تینوں گدھے اور تم ایک، چاروں میرے غلام ہو۔

تو ہوا یہ کہ وہاں سے ایک آدمی باغ کو روانہ کیا گیا کہ جا کر باغ کے مالک کو سب واردات بتائے اور کہے کہ نقصان کا ازالہ کر کے بشمول میرے چاروں گدھوں کو واپس لے جائے۔ وہ مالک آیا اور کہیں شام تک جا کر مسئلہ حل ہوا۔ اللہ جانے میرے والے بدو نے دُکاندار بدو کو کتنا جرمانہ بھرا، پھر مجھے اور اپنے گدھوں کو چھڑایا۔ باہر نکل کر اس نے تین دن کی مزدُوری کاٹ کر مجھے 240 ریال تھمائے اور چلتا کیا کہ عرب کے گدھوں کو قابو کرنا تیرے بس کا روگ نہیں۔

تب میں شام کو مسجد نبوی ﷺ میں آیا اور ستے میں جان چھٹنے کا شکر فرمایا اور سوچا واقعی عرب کے گدھے سنبھالنا آسان کام نہیں۔

والد صاحب کا سنایا ہوا گدھے کا قصہ

کویت میں گدھے کی اہمیت کا ایک قصہ ایک دفعہ والد صاحب نے سنایا تھا، لگے ہاتھوں وہ بھی سن لیجیے۔

وہ کہتے ہیں مَیں ایک دفعہ الفروانیہ میں تھا۔ یہاں ایک کنسٹرکشن کمپنی کے ساتھ کام پر لگا ہوا تھا۔ یہ جگہ کویت شہر سے پچاس میل تھی۔ تیل کی ایک کمپنی یہاں اپنے دفاتر بنا رہی تھی۔ یہاں پچاس میل تک ارد گرد آبادی کا نشان تک نہیں تھا۔ کام کرنے والوں کی 80 فیصد نفری یوگوسلاویہ کے لوگوں پر مبنی تھی۔ یہ لوگ بہت اونچے لمبے، طاقتور اور سخت جان تھے۔ ہر طرح کا گوشت کھاتے تھے اور گدھے کے گوشت سے خاص رغبت رکھتے تھے۔ مگر گدھا عربوں میں

بہت مہنگا ہے اور کھانے کے لیے نہیں۔ یعنی ایک عام سا گدھا بھی ڈیڑھ سو دینار سے کم نہیں ملتا تھا۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا، ایک گدھا کہیں سے بھٹکتا ہوا ادھر آ نکلا۔ اُسے دیکھ کر یوگوسلاویوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ سب نے ایک دم حملہ کیا اور گدھا پکڑ لیا۔ مجھے اُن کے ساتھ رہتے ہوئے تھوڑی بہت اُن کی زبان آتی تھی۔ مَیں نے کچھ بول کر اور کچھ اشاروں کنایوں میں سمجھایا کہ یہاں گدھا بہت معزز جانور ہے اور آپ لوگوں سے زیادہ قیمت رکھتا ہے، اسے مت کھائیں مگر اتنے میں گدھے کی کھال کھینچی جا چکی تھی۔ رات کے وقت صحرا میں ایک گڑھا کھودا، اُس میں آگ جلا کر بڑے بڑے انگارے تیار کیے گئے۔ گدھے کی انتڑیاں نکال کر اُن میں اُبلے ہوئے چاول بھرے گئے، تب مسالے وغیرہ لگا کر اُسے کوئلوں میں داب دیا اور دو تین گھنٹے بعد نکال کر صحرا کے چاند کے سائے میں کھاتے رہے اور جشن مناتے رہے۔ اِس کے بعد اُنھوں نے کھال اور ہڈیاں اُسی گڑھے میں دفن کر دیں اور گدھے اور آگ کے تمام نشانات مٹا دیے۔

اگلے دن سب یوگوسلاوین رات کی زبردستی کی دعوت کو بھلا کر کام پر لگ گئے۔ گاہے گاہے گدھے کے مزیدار گوشت اور چاولوں کی قصہ بیانی بھی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ سہ پہر کے وقت کچھ عرب کویتی دو گاڑیوں پر گدھے کو کھوجتے کھوجتے ادھر آ گئے۔ بعض جگہ بہت ریت تھی اور قدموں کے نشان نہیں رہتے تھے مگر عربوں جیسے کھوجی آپ کو دُنیا بھر میں کسی اور جگہ نہیں ملیں گے۔ اُنھوں نے ہر بات کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ سنا دیا کہ ہمارا گدھا یہاں سے آگے نہیں گیا، بتاؤ کہاں ہے؟ اِدھر اِن کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اب سب کو خبر ہوئی کہ جس مال کو انگاروں پر لٹا کر کھا گئے ہیں اُس کے عوض اب وہ اُنھیں انگاروں پر لٹانے والے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ ان کے پاس دو کتے تھے۔ کتوں نے پانچ ہی منٹ میں ہر طرف سے سونگھ کر ایک جگہ منتخب کر دی۔ جگہ کھودی گئی تو گدھے کی کھال اور ہڈیاں برآمد ہو گئیں اور بجھے ہوئے کوئلے برآمد ہو گئے۔ لیجیے حضرت اب یوگوسلاویوں کے لیے نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن۔

کمپنی انچارج کو فوراً حاضر ہونے کا پیغام دیا۔ دو گھنٹے میں وہ وہاں پہنچ گیا۔ حکم دیا گیا کہ گدھے کی قیمت جرمانے کے ساتھ ادا کی جائے جو بیس ہزار ریال بنتی ہے۔ اس کے علاوہ گدھا کھانے والے تمام یوگوسلاوین کو واپس بھیجا جائے اور نیا عملہ بھرتی کیا جائے۔ کمپنی انچارج کی کیا مجال کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرتا۔

چوری کا کھائیے مگر بھیڑیے سے بچیے

اُن دنوں موسم گرمی کا تھا اور مکہ کا گرد و نواح صوفی تبسّم کا تندرو ہو گیا تھا۔ آوارگی میں معیشت کے اسباب تلاش کر رہا تھا۔

میرے پاس پیسے بالکل نہیں تھے، فقط دس ریال تھے جو بس والے کو دے چکا تھا۔ بس کا کرایہ مکہ سے مدینہ کا 45 ریال تھا مگر مَیں نے دس ہی دیے، کہ یہی میری تمام ملکیت تھی، صاحبِ بس نے وہی قبول کر لیے جس کا سبب یہ ہے کہ وہاں بسیں اِکا دُکا ہی چلتی ہیں اور سواری خورد بین سے بھی نہیں ملتی۔ اگر آپ نے مکہ سے مدینہ جانا ہے یا مدینہ سے مکہ آنا ہے تو بس پر بیٹھ جائیے۔ یہ بس صبح چلے گی، مدینے کی گلی گلی سواریاں ڈھونڈتی پھرے گی اور کہیں شام تک جا کر بھرے گی، تب مکہ کی راہ لے گی۔ وہاں عربوں میں سے ہر ایک کے پاس اپنی سواری ہے۔ بسوں پر بدیسی لوگ ہی بیٹھتے ہیں۔ حج کے دِنوں میں سواریاں عام مل جاتی ہیں۔ اگر حج کے علاوہ گئے ہیں تو یہی کچھ آپ کا نصیب ہے۔

اب میری سنیے۔ مکہ سے مدینہ کی طرف جانا تھا۔ بس ڈرائیور سے التجا کی، کنڈیکٹر سے سماجت برتی اور کوئی گھنٹہ بھر کی گدا گرانہ گفتگو کے بعد طے یہ ہوا کہ جو دس ریال ہیں، وہ دے دو، مدینہ لے چلیں گے۔ اگر مدینہ میں کوئی مددگار ملے تو اُس سے بقیہ وصول کر کے دے دیجیو۔ اگرچہ ایک دن کا بھوکا تھا اور یہی پیسے بچا کر رکھے تھے کہ جب فوتگی کے قریب ہوں گا تو اِن سے جرعہ جرعہ دو ایک دن نکال لوں گا مگر اب کسی آس میں مکہ سے مدینہ جانا پڑا تو اِن پیسوں کو ٹھکانے لگانے کے سوا چارا نہ تھا۔

بس پر بیٹھ گیا۔ وہ سارا دن مکے کی گلیوں کا طواف کراتے اور سواریوں کو تلاش کرتے جب عصر کے قریب مدینہ کی طرف نکلی تو سب لوگوں نے خُدا کے گھر سے نکلنے پر شکر کیا۔

مکہ سے مدینہ کا فاصلہ 550 کلومیٹر ہے۔ جب دو سو کلومیٹر طے ہو چکا تو سواریاں بھوک کے مارے بلبلا اُٹھیں کہ سارا دن سفر میں گزرا تھا اب کھائے بغیر آگے نہ چلا جائے گا۔ بھوک تو مجھے بھی بے پناہ لگی تھی مگر میری جیب میں سوائے صبر کے کچھ نہیں تھا۔

آخر ایک ہوٹل پر بس رُک گئی۔ تمام سواریاں اُتر کر ہوٹل شریف میں داخل ہو گئیں۔ میری حالت یہ تھی کہ کھانوں کی خوشبوئیں باؤلا کیے دے رہی تھیں مگر کر کچھ نہیں سکتا تھا۔ جب سب لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے تو اُن کی صورت نے بھوک کی اشتہا بڑھا دی اور جی سے بے بس ہو گیا۔ اللہ جانے اِس میں کیا حکمت ہے مکہ میں آ کر لوگ بہت بے مروت ہو جاتے ہیں۔ سب یہی خیال کرتے ہیں مسافر اللہ کے گھر کا مہمان ہے، وہی دے گا مگر اللہ تو بے نیاز ہے اُسے کھانے پینے جیسی علتوں سے علاقہ نہیں۔ چنانچہ مہمان کے پاس پیسے نہیں تو اللہ معافی دے بندہ سدا کے لیے اللہ کا مہمان ہو سکتا ہے یعنی خاکِ مکہ میں دوام سو سکتا ہے۔

ہم نے ہمیشہ کے لیے اللہ کا مہمان ہونے سے بچنے کے واسطے اپنی عقل سے کام لیا۔ بغیر سوچے سمجھے ایک میز پر براجمان ہو گئے۔ وہاں ایک بڑا مسئلہ ہوٹلوں کا یہ ہے کہ چیزوں کے نرخ مقرّر ہیں، نہ چیز کم دیتے ہیں نہ پیسا کم لیتے ہیں۔ ایک آدمی کے کھانے کو جو کچھ دیتے ہیں وہ پانچ بندے بھی کھا لیتے ہیں۔ اب ایک آدمی کہاں تک پانچ بندوں کا کھانا کھائے آخر چھوڑنا پڑتا ہے اور وہ سارا کھانا اُٹھا کر کچرے دان کی راہ کر دیتے ہیں۔ میرے میز پر بیٹھتے ہی ایک بیرا مینیو رکھ گیا۔ دیکھا تو دس ریال سے نیچے کی کوئی شے وہاں نہیں تھی اور دس ریال میں ایک مرغِ مسلم، ایک تھال چاولوں کا، کچھ سلاد، رائتہ اور ایک ٹن پیک پیپسی۔

اب مسئلہ میرے لیے یہ نہیں تھا کہ یہ چیزیں مہنگی ہیں یا سستی، اِس طرح کا حساب تو اُس وقت کیا جاتا ہے جب بندے میں خریدنے کی کچھ استطاعت موجود ہو اور آنجناب کے پاس مکمل فراغت تھی، پھر بھی نہ جانے کیا جی میں آئی کہ مَیں نے دس ریال کے مینیو کا آرڈر دے دیا۔

تھوڑی دیر میں کھانے کا سامان آ گیا جسے تسلی سے بیٹھ کر کھا لیا، بقیہ جو بچا (آپ سمجھیے کہ چار بندوں کا بچ ہی گیا تھا)، اُسے پیک کرنے کا آرڈر دے دیا۔ اگرچہ یہ بات وہاں معیوب خیال کی جاتی ہے مگر میری اِس میں حکمت تھی، جس کی خبر آپ کو ابھی ہو جائے گی۔ جب بچا ہوا کھانا پیک ہو کر میز پر آ گیا تو مَیں وہاں سے واش روم کے بہانے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ سعودی عرب میں واش روم کھانے کے ہوٹلوں سے باہر کچھ فاصلے پر بنائے جاتے ہیں۔

باہر نکل کر مَیں نے تیز قدموں سے اُس کھجوروں کے باغ کی طرف راہ لی جو بالکل خشک تھا اور دھوپ سے جل سڑ کر تباہ ہو چکا تھا۔ یہ باغ ایک گھاٹی میں تھا اور ہوٹل سے کوئی سو فٹ نیچے تھا۔ مَیں تیزی سے اِس کی طرف اُترتا چلا گیا۔ ایسے لگتا تھا جہاز لینڈ کر رہا ہو۔ اب یہ تھا کہ کھانا پیک ہو کر میز پر رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے بیرا یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ایک غلام کھانا کھا کر پیسے دیے بغیر بھاگ گیا ہے۔ اُنھیں یہی لگتا کہ وہ آ کر اپنا کھانا تو اٹھائے گا، تب ہی جائے گا اور یہاں سے جانے کے لیے بھی تو یہی لاری ہے۔ وہ اپنی لاری چھوڑ کر کہاں نکلے گا مگر مَیں اُن کے ایسے تصورات کو روندتا ہوا نکل چکا تھا اور سوکھے سڑے باغ میں بھاگ رہا تھا۔ کھجوروں کے درخت ایسے خشک، اُکھڑے اور گرے پڑے تھے جیسے اُن پر ہزاروں سال گزر چکے ہوں یعنی یہ باغ مکمل ویران تھا اور سڑک کے ساتھ ساتھ جاتا تھا اور چار پانچ کلو میٹر تک پھیلا ہوا تھا۔

مَیں سڑک سے تھوڑا فاصلے پر رہتے ہوئے قریب قریب اس ویران باغ میں بھاگ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بیرے کو یقینِ واثق ہو گا کہ میں واش روم میں گیا ہوں اور جلد واپس آ کر اُسے ادائیگی کرتا ہوں ورنہ کھانا پیک کروا کر میز پر کیوں رکھتا؟

اِدھر میں اِس کھنڈر باغ میں بھاگے چلے جا رہا تھا۔ کھانا کھانے کے باعث مجھ میں توانائی در آئی تھی اور جوان مَیں ویسے بھی تھا۔ لہٰذا ایک گھنٹے کے اندر اندر آٹھ دس کلو میٹر کر گیا۔ مجھے ڈر تھا اب تک ہوٹل مالکان کو میرے فرار کا پتا چل گیا ہو گا اور وہ پولیس کو لیے روڈ پر چکر لگا رہے ہوں گے۔ اِس لیے مَیں نے اِن ویران اور ٹنڈ منڈ کھجوروں کو نہ چھوڑا۔ روڈ اور باغ کے درمیان اونچے ٹیلوں کی دیوار تھی۔ لہٰذا سڑک پر سے کچھ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ شام پڑ گئی، سورج ڈوبنے لگا۔ اُس کی

سُرخی اِس ویرانے اور سُرخ پہاڑوں کو اتنا سُرخ کرنے لگی کہ جی وہیں مست ہو گیا۔ اِدھر میں نے چلنا نہ چھوڑا۔ آپ جانیے میرے پچھلی طرف مکہ تھا، سامنے مدینہ کی منزلیں تھیں اور ان دونوں کے بیچ میں اِن وادیوں میں تنہا تھا۔ نہ میری مدد کو یہاں مہاجرین تھے، نہ انصار۔

دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت کے بعد بالآخر دوبارہ روڈ پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اِکا دُکا کاریں گزر رہی تھیں، دُور کہیں کہیں ایک آدھ اونٹ بھی پہاڑی ریگستان میں جاتا نظر آ رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور منظر اتنا مَوب صورت تھا کہ اُس میں ڈوبنے کو جی چاہتا تھا۔ اُس وقت سمجھ میں آیا کہ عرب لوگ ریگزاروں سے باہر نکلنا کیوں پسند نہیں کرتے۔ کچھ دیر روڈ پر کھڑا رہنے کے بعد میں پھر چل پڑا۔ کوئی آدھ گھنٹے کی مزید مسافت کے بعد جب اندھیرا بڑھ گیا اور ریت ٹھنڈی ہونے لگی تو مجھے احساس ہوا میں واقعی اکیلا ہوں اور مسافر ہوں، تنگدست و مفلس ہوں لیکن اس سے بھی ہیبت ناک بات جو نظر آئی وہ دُور چمکتی ہوئی آنکھوں والا ایک بھیڑیا کھڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرے رونگٹے جاگ گئے۔ سارا عالم آنکھوں میں اندھیر ہو گیا۔ یہ بھیڑیا صرف مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری ٹانگوں کی سکت چلی گئی۔ دل ڈوبنے لگا۔ مجھے سورجوں اور صحراؤں کے مناظر بھول گئے۔ حتیٰ کہ فرزدق کا وہ قصیدہ بھی بھول گیا جس میں اُس کا سامنا ایک بھیڑیے سے ہوتا ہے اور وہ اُسے گوشت کا ایک ٹکڑا دیتا ہے۔ بھیڑیا گوشت کا ٹکڑا کھا کر جب دوبارہ فرزدق پر غراتا ہے تو فرزدق اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ لیتا ہے اور کہتا ہے، دیکھ میں نے تیری مہمان نوازی ایک گوشت کے ٹکڑے سے کی اور آگ سے راحت دی۔ اگر دوبارہ تیرے دانت دیکھوں گا تو اُن کے لیے میرے پاس یہ تیز لوہے والی دھار ہے۔ تب بھیڑیا وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے مگر یہاں تو نہ تلوار تھی، نہ میرے پاس گھوڑا تھا اور نہ آگ۔ پھر کس برتے پر بھیڑیے سے مخاطب ہوتا۔ مَیں اُس دَور والی موت کو قریب ہوتے محسوس کر ہی رہا تھا کہ عین اُسی وقت ایک بس آتی دکھائی دی۔ میری روح جو پرواز کرنے ہی والی تھی، واپس آئی۔ مَیں نے اُسے ہاتھ سے رُکنے کا اشارہ دیا۔ چند لمحوں میں قریب آ کر رُک گئی۔ یہ ایرانی مسافروں کی کوسٹر تھی۔ اللہ اِن کا بھلا کرے، اُنھوں نے مجھے سوار کیا اور مدینے کی طرف نکلے۔ ایک آدمی نے بتایا اگر آپ اکیلے دو گھنٹے اور گزار لیتے تو

بھیڑیوں کی تواضع اچھی ہو جاتی۔ اُس کی یہ بات سن کر میرے رونگٹے کیل بن گئے اور چہرے پر پسینہ آ گیا۔ اب اندھیرا ہو چکا تھا۔ بس میں بیٹھتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ مَیں نے خواب دیکھا مَیں اُس بھیڑیے کو تلوار سے پچھاڑ رہا ہوں۔

حفر کشب کی منڈی اور امراؤ القیس کے قصیدے

مدینہ سے چار سو میل جنوب مشرق کی طرف اور اتنا ہی فاصلہ مکہ سے طے کیجیے تو یہ چھوٹا سا ایک قصبہ ہے۔ قصبے کے ارد گرد صحرا اور صحرا کے بیچ کہیں کہیں سُرخ و سیاہ پہاڑیاں تھیں۔ اِن کا رنگ اتنا گہرا اور سیاہی مائل سرخ ہو چکا تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا آگ میں جلی ہوئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کھجوروں اور انگور کے باغات تھے۔ اُن کے ارد گرد کھجور کے پتوں کی باریں یا دیواریں کی گئی تھیں۔ یہاں کھیتی باڑی بھی ہوتی تھی اور اونٹوں کی چراگاہیں بھی تھیں۔ کھیتی باڑی میں جَو تھے اور زیادہ تر سبزیاں اور سلاد کے کھیت تھے۔ یہ سلاد پالک نما ہوتا تھا جنھیں پہلے پہل مَیں پالک ہی سمجھتا تھا اور حیران تھا کہ یہ لوگ کچی پالک کیسے جانوروں کی طرح کھا لیتے ہیں۔ گھروں کے بڑے بڑے اِن کے احاطے تھے جن کی دیواریں کھجوروں کے پتوں سے بنائی گئی تھیں۔ بیچ میں کہیں کہیں کھجوروں کے ستون تھے۔ اِن احاطوں کے اندر عربوں کے جھگیاں نما گھر تھے۔ گھروں کے مکان کچی اور موٹی دیواروں کے تھے اور اونچائی اتنی کم تھی کہ ایڑیاں اونچی کرنے سے انسان کا سر چھت سے ٹکرا جاتا تھا۔ مگر بجلی کی انھے واہ بہتات اور کھپت تھی۔ یہ کچے اور چھپر قسم کے کمرے اندر سے شاہی محلوں کی طرح سجے ہوئے تھے۔ یمنی چادروں اور قالینوں سے آراستہ و پیراستہ کمروں کے فرشوں پر صاف ستھرے تکیے اور عنبر اور کستوری کے دھوئیں اٹھ رہے ہوتے تھے۔ گوشت اور چاول اِن کی مرغوب غذا تھی۔ زیادہ تر شب دیگ پکاتے تھے۔ یہاں ایک بڑی سی منڈی تھی۔ یہ منڈی بھی ایک چار دیواری کے اندر تھی۔ اِس میں کھجوروں کے ڈھیر، سبزیوں کے ڈھیر، جَو اور بھیڑ بکریاں اور دنبے اِس کے علاوہ بھی بہت سی اجناس تھیں۔ اکثر سامان حبشیوں کے سے مزاج کا تھا۔ چونکہ عرب میں حبشیوں کی تعداد بہت ہے اور حبشنیں بھی بہت زیادہ ہیں لہٰذا اُن

کے کھانے پینے اور استعمال کی چیزیں عربوں میں اور حبشیوں میں ایک جیسی ہیں۔ کھانے پینے کے برتنوں اور کام کاج کے اوزاروں میں بھی حبشی پن تھا۔ مَیں یہاں منڈی میں ایک عرب کے ساتھ کام کرتا تھا۔ منڈی میں اُس کا مال دوسرے چھوٹے قصبوں میں بڑے بڑے ڈالوں میں بھر کر جب لے جاتے تھے تو مَیں اُن کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ مجھے منڈی میں ایک کمرہ رہنے کو دے دیا گیا تھا جہاں ائیر کنڈیشنر بھی تھا۔ کھانے پینے کو بھی وافر چیزیں تھیں اور شاعری کا لطف بھی تھا۔

ہر شبِ جمعہ یہاں منڈی سے آدھا میل دُور ایک صحرا پر شب منائی جاتی تھی۔ اکثر چاند جوبن پر ہوتا تھا۔ صحرا کے کھلے میدان میں راگ و رباب اور قرنے بجائے جاتے۔ نفیریاں اور شہنائیاں جاگ اٹھتیں اور ایک خاص قسم کا دف بجتا، اُسی کے ساتھ شاعری شروع ہو جاتی۔ پہلے کسی بڑے شاعر کا کلام پڑھا جاتا۔ کلام کی بحر کے مطابق دف بجایا جاتا۔ یہ ایسا منظر تھا جس میں شاعری کی روح گویا صحرا میں داخل ہو جاتی اور ہر شے میں ایک حرکت پیدا ہو جاتی۔ بعض اوقات ایک بہت کھلا دائرہ بنا لیا جاتا، جس کے درمیان میں آگ جل رہی ہوتی۔ دائرے کے کناروں پر لوگ یعنی عورتیں مرد اور بچے بیٹھ جاتے اور شاعر ایک اونٹ پر بیٹھ کر دائرے میں پھرتا اور اپنی شاعری کو دف کی آواز سے ملا کر اِس طرح پڑھتا کہ ہر شعر کا ایک ایک لفظ اپنے معنی اور جمالیات کے ساتھ دائرے میں گونجتا تھا۔ صحرا کا چاند اور دائرے میں جلی ہوئی آگ اور درمیان میں اونٹ پر بیٹھ کر شعر خوانی کا عمل ایسا جادو تھا جو تمام لوگوں کے حواس کو اپنے قبضے میں لے لیتا۔ مجھے اگرچہ عربی زبان کے اُن بدوی استعاروں سے آشنائی نہیں تھی جن پر وہ لوگ پھڑک اٹھتے تھے لیکن مَیں اُس شاعری کے موٹے موٹے استعاروں اور آواز کے زیر و بم سے ہی اتنا لطف کشید کر لیتا تھا کہ میرے لیے وہی چیز کافی ہوتی تھی۔ اگر کوئی عرب میں گیا اور اُس نے وہاں کی صحرائی راتوں کے جشن نہیں دیکھے، سمجھ لیں وہ عرب کی زندگی سے یکسر غافل ہے اور اُن کے مزاج کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

ایک رات اِسی طرح کا جشن چل رہا تھا۔ ایک آدمی نے دف کے ساتھ امراؤالقیس کا قصیدہ شروع کر دیا۔ کچھ نہ پوچھیے ظالم نے کیسا سماں باندھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے امراؤالقیس کی محبوبہ سامنے موجود ہے اور امراؤالقیس اُسے شعر سنا رہا ہے۔ اُس شخص کی آواز اور شعر خوانی کا انداز ایسا

تھا کہ سب کچھ ایک تمثیل کی شکل اختیار کر گیا۔ گاہے گاہے وہیں دائرے میں بیٹھے لوگوں میں سے ایک شخص اور کبھی ایک عورت اپنے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر کچھ ایسی آوازیں نکالتی تھیں جیسے صحرا کے جانوروں کو بلانے کے لیے نکالی جاتی ہیں۔ اِس میں بھی ایک بہت لطف تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ خنجر کے ساتھ حبشیوں کا رقص اُس شب کی بزم کا خاص جز تھا۔ یہ حبشی بھی رقص میں ایسے ماہر تھے کہ مَیں کبھی شعر کو بھول کر رقص میں ہی گم ہو جاتا تھا۔

امراؤالقیس کے قصیدے کے بعد ایک شاعر ابی حماد نے چند شعر پڑھے جن کا خلاصہ یہ تھا:

ہم جنگ میں مارے جانے پر فخر کرتے ہیں، حالانکہ بنی عامرہ اور بنی سلول اِس کو عیب جانتے ہیں۔ ہم موت کے قریب قریب چلتے ہیں اور جنگ کی آگ بھڑکانے میں تیز ہیں۔ ہماری عمریں کوتاہ ہیں۔ بنی عامرہ موت سے بھاگتے ہیں اور دراز زندگیاں پاتے ہیں۔ ہمارا کوئی سردار بستر پر نہیں مرا۔ نہ ایسا کوئی مقتول چھوڑا جس کا انتقام نہ لیا ہو۔ ہمارے خون تلواروں کی دھاروں پر بہتے ہیں۔ ہم اپنے عمل میں غبار آلود نہیں۔ ماؤں اور باپوں نے ہمارے نسب کو محفوظ رکھا۔ ہم لطافت میں آب و باراں کے مانند ہیں، نہ ہم میں کوئی بخیل ہے نہ غبی۔ کسی کو حکم دیں تو اُسے انکار کی مجال نہیں۔ ہمارے سردار کا جانشین ایسا ہی سردار ہوتا ہے جس کا دل اور زبان شریفوں کی طرح ہو۔ مہمانوں کے لیے ہماری آگ کبھی نہیں بجھائی گئی، نہ کسی مہمان نے ہماری شکایت کی۔

میرے اندر شاعری کا فطری رجحان اصل میں عرب استعاروں سے ماخوذ ہے اور اُن میں اِسی طرح کے صحراؤں کی بازگشت اِس لیے کہ میرے ذہن میں وہاں کے مناظر نقش ہو گئے ہیں۔ میری ایک غزل کے چند شعر سنیے یہ تمام شعر گویا اُنہی دِنوں کی یاد ہیں جب مَیں نے اِن صحراؤں میں عرب کے بدوؤں کے شب خیزی کے منظر دیکھے، جو صحرا میں آگ کے استعارے اور سفر کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں۔

کسے کجاوے محملوں کے اور جاگا رات کا تارا بھی
چھوڑ دی بستی ناقوں نے خاموش ہوا نقارا بھی

چاند سے آنکھیں کھیل رہی تھیں سرخ پہاڑ کی اوٹوں سے
پورب اُور سے تاک رہا تھا اُٹھ کر ابر کا پارہ بھی

قافلے گردِ سفر میں ڈوبے، گھنٹیوں کی آواز گھٹی
آخری اونٹ کی پشت پہ ڈالا رات نے سیاہ غرارہ بھی

شہر کے چوک میں ویرانی ہے آگ بجھی، اندھیر ہوا
راکھ سروں میں ڈال کے بیٹھے، آج ترے آوارہ بھی

کوئی نہ رستہ ناپ سکا ہے، ریت پہ چلنے والوں کا
اگلے قدم پر مٹ جائے گا پہلا نقش ہمارا بھی

عرب کے نئے لونڈے اور ہمارا امتحان

ایک دفعہ مَیں مکہ میں تھا۔ بہار کے دن تھے مگر عرب کی بہار کو گرمی سردی کا امتزاج سمجھ لیجیے۔ میں سعودی عرب میں ابوقبیس پہاڑ کے دوسری طرف ایک ہوٹل کے برتن مانجھ رہا تھا کہ ایک کالا عرب سفید جبہ پہنے نمودار ہوا۔ سر پر اُس کے کالے عقال کی بجائے سفید صافہ بندھا تھا، جسے اکثر عرب باندھ لیتے ہیں۔ اُسے دیکھ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بولا، 'أین جواز سفرک یا فتی؟ یعنی لڑکے تمھارا پاسپورٹ کہاں ہے؟

میں ڈر گیا کہ پکڑے گئے۔ اپنا پاسپورٹ نکال کر دکھایا، ظاہر ہے عمرے کا تھا اور اقامہ نہیں رکھتا تھا۔ پاسپورٹ دیکھ کر اُس نے ایک لمبی 'ہوں ں ں' کر کے سر ہلایا اور کہا 'اتبعنی' یعنی میرے پیچھے آ۔

میں ڈرتا ہوا پیچھے چل پڑا۔ تھوڑی دُور جا کر ایک تنگ سے گھر میں داخل ہو گیا۔ اندر ڈرائنگ روم تھا اور کافی قیمتی سامان سے مزین تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو عرب اور چار مزید لڑکے بیٹھے

ہیں۔ میں حیران کہ اللہ جانے اب کیا ہوگا۔ یہ عرب تو پولیس کی بجائے عام لوگ تھے اور چار لڑکے انڈین تھے۔ اُس نے مجھے اشارے سے ایک جگہ بٹھا دیا، عربی مَیں پوری سمجھ لیتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک عرب بولا، 'دیکھو لڑکے، تم نے آج ہمارے لیے کام کرنا ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک میلہ ہے، وہاں چلنا ہے۔ ہم آپ کو لے جائیں گے اور چھوڑ بھی جائیں گے، کھانا بھی دیں گے۔ اِن باتوں کے علاوہ فی کس تین سو ریال بھی دیں گے۔'

میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا، 'کام کیا ہے؟' اُس نے کہا، 'وہیں جا کر بتائیں گے۔ آپ یہاں بغیر اقامے کے کام کرتے ہیں۔ بات نہ مانی تو شرطوں کے حوالے کر دیں گے۔ اب جو تمھاری مرضی۔'

مجھ سے پہلے پکڑے ہوئے لونڈے تو پہلے ہی تیار بیٹھے تھے، میں نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔ اُس کے بعد وہ اُٹھ کر چل دیے۔ میں نے دوسرے لڑکوں سے سن گن لی تو ایک بولا، 'اونٹوں کے پیچھے باندھ کے دوڑائیں گے۔' دوسرے نے خبر دی بیوی کا کام لیں گے۔ غرض سب نے بُری بُری خبریں سنائیں یعنی جو کچھ اُن نے پہلے سن رکھا تھا یا تجربہ کر رکھا تھا، بتانے لگے اور مجھے ہَول آنے لگے۔

یہ شام کا دھندلکا سا تھا۔ ایک گھنٹہ رُک کر کھانا آ گیا۔ کھانا اگرچہ عمدہ چاول گوشت تھا مگر میرے تو حلق میں اٹک اٹک جاتا تھا۔ کھانے کے بعد عشا کی اذان گونجنے لگی۔ تب ایک عرب داخل ہوا اور بولا، 'نماز پڑھ لو، پھر چلتے ہیں۔'

اب آپ جانیے مَیں نے وہ نماز کیسے پڑھی ہوگی۔ اُس کے بعد ایک اور عرب داخل ہوا، یہ پہلے والوں میں سے نہیں تھا۔ اِس نے ہمیں باہر نکال لیا اور ایک ڈبل کیبن ڈالے میں ڈال لیا اور لے کر چل پڑا۔ دس یا پندرہ منٹ بعد وہ ایک جگہ پہنچ گیا۔ یہ جگہ مکہ سے شمال کی جانب بارہ پندرہ میل پر تھی۔ النور یہ اس کا نام تھا۔ لیجیے جناب چاروں انڈین کیرالوی اور میں پاکستانی لونڈا، پانچوں اِس کالے عرب بھینسے کے رحم و کرم پر تھے۔

وہ عربی بولتا تھا مگر اِس کا لہجہ گینڈے کی طرح تھا۔ گلے سے ایسی آواز نکالتا جیسے چاول

صاف کرنے کی مشین چلتی ہے۔ رستے میں ایک جگہ شرطے ملے مگر اُس نے ڈبل کیبن ڈالے سے فقط تربوزے والا سر نکالا اور بنس کے دکھا دیا اور جانے کا رستہ پا لیا۔ تھوڑی دُور سڑک پر گاڑی چلنے کے بعد وہ بائیں طرف سے نیچے اُتر گیا اور ریت پتھروں کے اونچے نیچے راستوں سے ہوتے ہوئے ایک وسیع اور دُور تک کھلے میدان میں آ گیا۔ یہ ایک قسم کا ریت کا صحرا تھا۔

یہاں کیا دیکھتا ہوں کہ پھٹے پُرانے ٹائروں کا جنگل آباد ہے۔ ٹائروں کے پہاڑ لگے ہیں، جہاں تک نظر جاتی ہے، ٹائر ہی ٹائر۔ اِدھر اُدھر دو چار کھجوروں اور ایک دو کیکروں کے پیڑ تھے۔ ایک کمرہ تھا۔ باہر سے کمرے کی حالت ہمارے ہاں کے دلتوں یا چوہڑوں کے کچے کوٹھوں جیسی تھی۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہاں تو سماں ہی اور تھا۔ تازہ دم اے سی لگا تھا اور برف کی طرح ٹھنڈ اُلٹا رہا تھا۔ نیچے لال پیلی دریوں کا سا قالین بچھا تھا۔

ہم تھوڑی ہی دیر بیٹھے تھے کہ ایک کالا بھجنگ حبشی اندر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں پانی کا بڑا ڈولکا سا تھا۔ دوسرے کے پاس چاولوں کی لبالب بھری پرات تھی۔ حبشی نے عربی میں کچھ کہا، جس کا اُردو صاف مطلب یہ تھا کہ 'ہندوستانی مسکین لونڈو، جلدی سے یہ کھا جا کھالو اور قربانی کے لیے تیار ہو جاؤ۔'

دُور سے طبلے پیٹنے کی آواز برابر آتی تھی۔ ہمیں اپنی قربانی کا اندازہ تو نہیں تھا کہ کس قسم کی دینی پڑے گی، البتہ تین سو ریال دیہاڑی کا پتا تھا کہ کھانے کے علاوہ ملے گی۔ تین سو ریال کا مطلب اُس وقت یہ تھا کہ چار ہزار روپیا کے برابر۔ تب اتنے پیسوں میں پاکستان کا غریب آدمی بیگم کو حق مہر ادا کر کے طلاق دینے کے قابل ہو جاتا تھا۔ آدھ گھنٹے میں جب ہم دوبارہ کھا پی کر فارغ ہو گئے تو وہی بھینسا داخل ہوا اور ہمیں ایک طرف لے کر پیدل چل دیا، ہم احاطے سے باہر نکل کر مغرب کی طرف ہو لیے۔

تھوڑی ہی دُور پہنچے تھے کہ وہاں بیس کے قریب موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں اور کوئی ایک سو کے قریب عرب لونڈے تھے۔ کافی سارے مرد بھی تھے۔ چند حبشی لڑکیاں تھیں۔ ان میں کچھ کالے تھے اور کچھ گندمی رنگ کے تھے۔ ہر موٹر سائیکل پر دو لڑکے چڑھے بیٹھے تھے۔ اُن سب

کے پیچھے ایک ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ پیچھے والے تمام کے تمام ہماری طرح مسکین تھے یعنی غیر عرب، کوئی بنگالی تھا، کوئی ہندی نژاد تھا۔ اُن میں فقط میں غالباً پاکستانی تھا۔ کچھ حبشی ڈھول کی تھاپ پر خاص قسم کا عرب رقص کر رہے تھے اور گا رہے تھے۔ چاندنی رات سویرے کی طرح روشن تھی اور ریت کافی ٹھنڈی تھی۔ میں حیران کہ یہاں مجھ سے کیا کام لیں گے۔ ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ہمیں اُن میں سے چار موٹر سائیکلوں کے لیے تقسیم کر دیا گیا۔ ایک کالے عرب لڑکے کے پیچھے مجھے بٹھا دیا اور کہا کہ دیکھو آپ نے گرنے سے بچنا ہے۔ ذرا مضبوط ہو کر بیٹھو۔

موٹر سائیکلیں گھوں گھوں کیے جاتی تھیں۔ اب مجھے سمجھ آئی کہ میرا مصرف کیا تھا۔ اِس ریگزار میں ہائی پاور موٹر سائیکلوں کا مقابلہ تھا، کھُلے ریگستان میں ڈبل سائلنسر موٹر سائیکلوں کو پاگلوں کی طرح چلانا تھا اور پیچھے بیٹھے ہوؤں کو نیچے گرانا تھا۔

مقابلہ کرنے والے عرب لڑکے تھے، کچھ شاہی اور کچھ سپاہی خاندان سے تھے اور پُشت بانی کرنے والے تمام ہم جیسے پرائے ملکوں کے مسکین تھے۔ مجھے حیرانی یہ تھی کہ اس کام میں ہمیں فی مسکین تین سو دینے کی بجائے یہ خود اپنے جیسا اشراف ہی کیوں پیچھے نہیں بٹھاتے۔ خیر یہ بات بھی جلد کھل گئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

موٹر سائیکل کا مسئلہ یہ تھا کہ اِس کے پیچھے بیٹھنے کو اصولاً جگہ نہیں تھی۔ فقط آدمی کو رسوا کرنے کے لیے بٹھایا جاتا تھا۔ چلیے پہلے اِس موٹر سائیکل کے بارے میں سن لیجیے۔ کمبخت موٹر سائیکل کیا تھی فقط دو ٹائروں پر ایک پٹرول ٹینکی، ایک ہینڈل اور ایک کاٹھی رکھی تھی، باقی اللہ اللہ۔ نہ بریک، نہ کیریئر، نہ ڈھنگ کی سیٹ، نہ بتی، نہ اشارہ۔

بیٹھنے والی سیٹ آگے سے تو چوڑی تھی کہ ڈرائیور کے بیٹھنے کو جگہ پوری تھی مگر پیچھے سے اتنی تنگ اور چھوٹی کہ فقط پانچ سالہ بچّے کا پچھواڑہ اُس پر آ سکتا تھا۔ ستم پر ستم یہ کہ پیچھے بیٹھنے والے کے لیے کچھ سہارا پکڑنے کا بھی نہیں تھا اور سہارے کے لیے عرب لڑکے کو پکڑنا گناہِ عظیم تھا۔ یہ بات ہمیں سمجھا دی گئی تھی۔

یہ سمجھ لیجیے آپ نے موٹر سائیکل کے چلنے کے دَوران عرب ڈرائیور لونڈے کو سہارے کے

لیے ہاتھ لگا یا نہیں کہ آپ کا تین سو ریال کا کریڈٹ گر کر صفر ہو گیا۔ یعنی پہلی غلطی پر مزدوری سلب اور اگلی غلطی پر سزا شروع۔ عذاب یہ تھا کہ سہارے کو اور کوئی شے بھی نہیں تھی۔ موٹر سائیکل کے آخری حصے میں ایک دُم سی تھی۔ یہ دُم ہلکے اور نرم پلاسٹک کی سمجھ لیں، جسے آپ پکڑ تو سکتے ہیں مگر گرتے ہوئے بچ نہیں سکتے۔ یہی ہوتا تھا کہ جب موٹر سائیکل جمپ لیتی تو آپ کے ہاتھ میں یہی دُم رہ جاتی، جسے مضبوطی سے پکڑے آپ ریت کنکروں میں کافی دیر تک پٹڑی سے اُتری ریل کی مانند لُڑھکتے چلے جاتے آخر کسی کھڈے یا ٹیلے سے بھڑ کر رُک جاتے تھے اور موٹر سائیکل عرب سمیت آگے نکل جاتی تھی۔

جس موٹر سائیکل کا پچھلا سوار سب سے پہلے گر جاتا، اُسے اوّل سمجھا جاتا، جس کا سب سے آخر میں گرے اُسے پھاڈی اور جس کا نہ گرے اُسے بھاری جرمانہ کیا جاتا۔ موٹر سائیکلوں کے ساتھ ساتھ گاڑیاں دوڑ رہی ہوتی ہیں، یہ دیکھنے کو کہ کوئی روندی تو نہیں مار رہا یعنی پُشت بان جان بوجھ کر نیچے تو نہیں گر رہا۔ ڈھول تاشے، شور شرابا، اور نعرے اور کان پھاڑنے والی عربی زبان میں گالیاں بلند آہنگی سے ایسے دی جاتی تھیں کہ گنواروں نے بھی کیا سنی ہوں گی۔

اِس سب کچھ کا پتا مجھے اُس وقت چلا جب ریس کے لیے سب موٹر سائیکلیں دوڑ پڑیں۔ جس موٹر سائیکل پر میں تھا اُس کا ڈرائیور اللہ جھوٹ نہ بلوائے کوئی اوّل درجے کا پاگل تھا۔ ایسی ایسی ریسیں دیے جاتا تھا کہ چھلاوے کی طرح اُڑ اُڑ جاتا تھا۔ اِدھر میں چھپکلی کی مانند کاٹھی سے چمٹا بیٹھا تھا۔ رہ رہ کر اُس کے کندھے پکڑنے کو ہاتھ جاتا تھا مگر تین سو ریال ضائع ہوتے خیال کر کے رُک جاتا تھا۔ اللہ قسم اُس مزدوری میں سب سے مشکل یہی جبر تھا جو مجھے اپنی طبیعت پر کرنا تھا۔ رہ سہ کر موٹر سائیکل کی وہی دُم میرے ہاتھ میں تھی۔ زمین اگرچہ ریتلی تھی مگر کچھ نہ پوچھیے کہ کیسے موت آنکھوں میں پھری ہوئی تھی۔ آنکھیں میری بند تھیں۔ اُدھر وہ سالا سیدھے سبھاؤ چلانے پر آمادہ نہ تھا۔ جان بوجھ کر مجھے دھڑن تختہ کرنے کی طرف مائل تھا۔

اب مجھے ساری گیم سمجھ آئی کہ میری یہاں کیا ضرورت تھی۔ جب آنکھ کھولتا تھا تو کسی نہ کسی مسکین کو لڑھکتے پاتا تھا۔ پھر شتابی آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ اُدھر ہر جمپ پر دو دو فٹ اچھل کر اُس

چڑی قسم کی کاٹھی پر گرتا تھا۔ کچھ نہ پوچھیے میرا جی کیسے رو رہا تھا اور کیونکر عذاب میں اللہ اللہ ہو رہا تھا۔ مجھے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ گرنا بہر حال ہے مگر دعا مسلسل یہ تھی کہ کسی پتھر کی بجائے ریت پر گروں تاکہ مزید دہاڑی لگانے کے قابل ہوں۔

اسی عالم میں پندرہ بیس منٹ نکال لیے پھر اچانک ایسا جھٹکا اُس نالائق نے دیا کہ میرا پچھواڑا کاٹھی سے کوئی تین فٹ اُوپر اُٹھ گیا، اِسی عالم میں موٹر سائیکل نیچے سے ہوا ہو گیا اور میں ریت پر قلابازیاں کھاتا ہوا ایک ٹیلے پر چڑھتا چلا گیا۔ میرا گرنا تھا کہ تالیوں اور باجوں کا ایسا شور اُٹھا جیسے پسندیدہ گلیڈی ایٹر فاتح ہوا ہو اور فتح کے شادیانے میرے لیے بجائے گئے ہوں۔ گرنے کے سبب ریت میرے ناک، کان، منہ، غرض ہر جگہ گھس گئی۔ کچھ پہچانا نہ جاتا تھا۔ تھوڑا سنبھلا تو دیکھتا ہوں کوئی یہاں پشت ملتا ہوا اُٹھ رہا ہے، کوئی وہاں سے اُٹھ رہا ہے اور عرب لونڈے ہزار ہزار شوخیوں کے ساتھ گھوں گھوں کرتے نعرے لگا رہے ہیں۔

ایک بنگالی لڑکا بے چارا ٹانگ پکڑے بیٹھا تھا اور ذبح ہوتے اونٹ کی طرح چیخ رہا تھا۔ اُس کی ٹانگ موٹر سائیکل کے پہیے میں رگڑی گئی تھی، جسے ایک کالا حبشی مزید مروڑ رہا تھا اور پٹی چپکا رہا تھا۔

مَیں ابھی اپنی چوٹیں سہلا رہا تھا، تھوڑی دیر میں تمام صحرا کے جانور یعنی ہم کو اکٹھا کر لیا گیا اور اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے مجاہدوں کو ایک قطار میں اکٹھا کر دیا گیا۔ ایک عرب آگے بڑھا، سب کے ہاتھوں میں نئے نکور ریال تھمائے گئے۔ میں ایک ہاتھ سے پیٹھ سہلا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے ریال پکڑ رہا تھا۔

یہ ایک شان دار اور بے مثال خودنوشت ہے جس میں کھرا سچ ہے، ایک ایسا سچ جس کی لپیٹ میں علی اکبر ناطق کے آباؤ اجداد، اُس کی اپنی ذات اور زمانہ بھی آتا ہے۔ اس کی نثر پنجاب کی دھرتی کی طرح زرخیز اور پُرمایہ ہے۔ اس داستانِ حیات میں فکشن اور کہانی جیسی دل فریب دل چسپی ہے۔ یہ خودنوشت رنگین قصوں کی من موہنی مالا ہے، البتہ یہ فقط واقعہ نگاری نہیں، واقعات کی تہ میں، تہ در تہ میں گنجینۂ معانی مخفی ہے۔ اس گنجینے تک فقط صاحب نظر رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ خودگزشت اِس دَور کی کہانی ہے، یہ رُودادِ حیات ہر ہر دور کی بے مثال حکایت ہے۔

اس کتاب کو پڑھنا رُوح کو سرشار کر دینے والا تجربہ ہے کہ یہ اُردو اَدب میں اپنی نوع کی واحد خودنوشت ہے، ایک امر ہو جانے والی لازوال تخلیق!

عرفان جاوید

WWW.
BOOK
CORNER
.COM.PK
Standard House of Publishing

Abad Hue, Barbad Hue
ISBN: 978-969-662-484-4
Rs.1500.00

BookCornerJlm
bookcornershowroom
bookcornerjhelum
bookcorner
0321-5440882
Jhelum, Pakistan